

نوجہورت کسانوں کا مجموعہ

سنسنی ڈائجسٹ

ماہنامہ

جون 2017

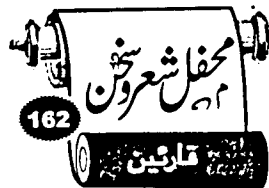
میراج شول

A contact loved ones.

ایک رابطہ اپنوں سے
Aik Rabta Apno Se.



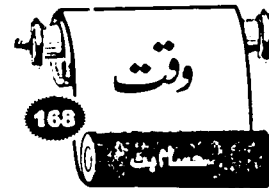
www.PakistaniPoint.Com



آپ کے ہاتھوں ہی ایک نئے رنگ
آپ کی پسند آپ کے ذوق سے ہم آہنگ



دوسروں کو سمجھنے کا دعویٰ کرنے
والوں کا خود سے بے خبری کا انداز



ایک عمر بازیگری کی بازی گری..... سننی
خیز و اچھٹ پر شعل ایک طر باطل ہواستان



چوٹ کھا کر دوستی کی فتنہ کرنے
والے دو بے وقوفوں کا انداز نظر سر



دنیا داری کو بھرانے والے اور آرائشوں میں
خوش رہنے والے ایک ملی کا قصہ



بھولی بھری یادوں کو حال ہے
ملائی ایک چونکاٹی کہانی



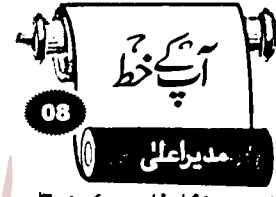
دنیا بھرے بھرے لطیفہ بچکے آتیاں
مسکرائیں اور قہقہے بکھیریں



روح کا روح سے مل تال اور جیتوں کے
مثال نور لا زوال جذبوں کی حرا کی داستان



سیریں میں ہمیشہ زندہ
سلف کی یادگار تحریر



سپنس کی تلاش اور ت قارئین کی تحو
شیر باتیں گلے گلے اور پر خلوص مشورے



معانی شناس اور سچ کی تلاش
میں ایک مسافر کا فلسفہ



تاریک ذہنوں میں امید
کی کرن جگاتی ایک دلچسپ تحریر



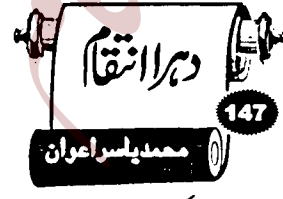
ماضی کا آئینہ یا مستقبل اور باختیار
ماضی کے سبق آموز اور عبرت آمیز واقعات



اسرار و خیر کے پردوں میں ملفوف مہر طوط
بدلتی واردات قلبی کی عکاس دلچسپ داستان



محبتوں اور اپنائیت کا ادھار واپس کرنے
والے ایک خوش قسمت انسان کا ماجرا



خون کی بولی کہیلے والی ایک دو شیرہ
کے مہیر کی بے چینی کا احوال



ایک مائل جہان کی سنگدلی اور خود
عنصری کا دلچسپ تراش واقف



جرائم کی دنیا میں دیانت داری کی تلواریں
پرکھنے والے آئینہ کی جرات مندی

جون 2017

[illegible]

۱۰ محمد محمود مہاراجہ نے طلحہ خاندان سے لکھو رہے ہیں۔ "سردار کو گنہگار نہ تھی اور عرق ریزی کے ساتھ بتایا گیا، خوبصورت دو شیر و اور ساتھ ایک مرد ہے۔ جیسے آج کل جنت کدیمات کو رکھا ہوتا ہے ویسے یہی لگتا ہے طویل مسافت کے بعد تھک کر بیٹھ گیا ہے۔ بہر حال بہت اچھا سردار و قہار تھا۔ کوئی ان کا فیصلہ نہیں کیا اور پھر قوم کو ان کا تذکرہ سولی پر لٹکا دیا گیا۔ جو سات اہم حقیقتات مکمل نہ کر سکے، وہ دو ماہ میں کون سا تیرا لیں گے؟ عوام کو بے خوف بنانے کے لیے سب اہلیانہ کی کے پاس آئے تو ان کی فتنہ کو گلاب باب یہ تھا کہ ہمیں خودی سے باہر لکھنا ہوگا۔ ایک ہونہاری ہمارے لیے اور ملک کے لیے قاعدہ مند ہے۔ آپ کے ادارے پر آئے تو آپ کا کافی دھم لگے کہ ملک میں کوئی چیز بھی خفیک نہیں ہے۔ آپ کا ان باتوں کا ردنا ہوا بالکل جائز کی۔ پس اللہ آپ کا یہ کیا بھی دعویٰ ہے؟ سلامت رکھے اور خوشیاں آپ کے آئین میں ملتی ہیں۔ محفل میں آئے تو لاہور سے عاصر خان آفریدی کی پہلی بی بی عی کو شہر میں کرسی صدارت کے تخت پر اتر آئے۔ آپ کی بات ہمیں معلوم ہوئی کہ کوکھ میں نے خود دیکھا ہے کہ کچھ لوگ کھینے سے بچا تھے۔ آپ کو مبارک ہو۔ آپ نے بہت خوبصورت تبرہ لکھا۔ آگے روئی جہاں کو بہت ہی پیارے انداز میں تبرہ کرتے پائے۔ تاہم یہ سب صاحبہ بھی اپنے تین انداز میں موجود ہے۔ کھازی خدا کو ہموکا لانے کے چکر میں تھیں۔ یہی بچ ہے سسٹن پڑھتے ہوئے کسی اور کا دل نہیں کرتا پر بانی کام کرنے ہیں، مجبور ہیں۔ پہلے چار میں سے تین تھروں پر لاہوری اربعان ہیں۔ اشفاق شاہین بھی تھوہ انداز میں محفل کی رونق ہے۔ سید عالم شاہ پہلے سلطان میں وہی مبارک اور پھر آپ کا فخر تبرہ بھی انجی بھی جو بڑے ساتھ قاضی زین آفریدی پیش قدمی بھی محفل کی رونق اپنے حضور اح کے ساتھ حائے ہوئے۔ بہترین تبرہ لگا دی، پانچیں میری ماں سزمد میں کدھر غائب ہوئی ہیں۔ اللہ ان کو اپنی امان میں رکھے، آمین۔ حاضری لگوا لیں ماں مجھے آپ کا انتظار ہے۔ اسرار سانی جہاں آپ بھی محفل میں تھیں، آ رہے تھے تو نہ پائے۔ باہر جہاں ماہین باہر فضل عباس کا فخر انداز بہت پسند آتا ہے۔ بہت ہی پیارے اور حضور اح سے ہمدردی سے لگتے ہیں، ویلڈن، رمضان پاشا کی خوش نظر آ رہے ہیں، اللہ آپ کو مدد خوش رکھے۔ بہترین تبرہ لکھا آپ نے۔ محمد شہباز زاد کو یوذا کاٹنے پر ناخوش نظر آئے۔ باہر جہاں پڑھو کھانے سے بھی انہوں نے کبھی مھر کی دعا دی ہو۔ مہتاب اچھو بھی اپنے سرے سے محفل کی رونق بے نظر آئے۔ کہنا ہیں محفل حاضری دی تو شیش میں پر پینچے جو اپنے پورے جون پر ہے۔ جولیت اور اسد اللہ ایک باہر مھر ملے تو وہ بھی جاننا تو اور عارف سے بھی ملاتے ہوئی۔ اعلیٰ سطحوں میں جاننا تو لاڈلہ طور پر جولیت کے سامنے بے عیوب کا نام لے لی تو اس پر تینوں نے بے پناہ نوش گئے۔ اھر قارقو جہاں اپنے آخری فکس راور مھر ک پیچ کیا لیکن آخر میں سسٹن پیچا کر قرقو کو تم گریا۔ اھر سے راور کو مدد بھی پہنچے۔ اے اھر قارقو کا قاعدہ اسے لڑنے کا موقع دے رہا ہے۔ ابتدائی سختیات پر ڈاکٹر ساجد اچھو کی ح کر پر بھی پہلی دفعہ تانس میں یہ تحریر پڑھی جس نے بہت خون خرابے سے حکومت محمودک جا بھٹی۔ سسٹن کو جہاں اچھے سوار گئے، فریاد وہی دوائے باشاہ انجی لکھیں کے پاس پہنچا۔ اس نے بہترین بٹنے سے حکومت کی اور اراجا کو شکست دی اور پھر مسلمانوں کے لیے ایک بہتر مطلب کہ اپنے بیٹے کو عرفی نوئی کی صورت چھوڑ گیا۔ خور پاش کی تماشا تھا جس کو کہ ایک ایجنٹ بھی اور جنف کو کچھ ناں کا شمن تھا، پر وہ مکمل طور پر کامیاب نہ ہوئی۔ اب خود اسے مقدمے کا سامنا تھا اور وہ برائے ہو جانے لگی تھی۔ ظفر اقبال ظفر کی ناسور پڑی۔ ہاں یہ بچ ہے کہ ہم لوگ بھیرے کی ثبوت کے کسی کو کچھ بھی کہتے ہیں جہاں پر کوئی تان نظر نہیں آتا۔ پھر پانچ ماہ ہاں پر اور اسکی جگہ پر جری کا دل مل جاتا ہے۔ اس سفر سے ہمدردی کے بجائے اسے کیسے کیسے القاب سے نواز ڈالا اور پھر سب سے بڑا دواں لے گیا۔ اس کو اھر سے اٹھا کر باہر چھوٹک دیا۔ یہ تحریر ہمارے حاشرے کے تان پر لکھا پھرنے کے تھام کے قلم سے کئے انجی کو کھاکر کہہ دیا۔ دو دیگر جی کہ جس میں بھی۔ یہاں ایک تانی سے لے کر انسان کے ٹخن تک ہر جڑ دوہرے سے تو وہاں پر خدا کی رحمتیں اور رحمتیں آئیں گی۔ سلیم نور کی تحریر بہترین تحریر بھی۔ لی وہ دوسری صورت بھی جس نے میرے نا کا کھرازا دیا۔ سزمد میں کدھر غائب ہوئی ہیں۔ اللہ ان کو اپنی امان میں رکھے، آمین۔ حاضری لگوا لیں ماں



گھنٹہ عبدالغفار اور خالد مقبول نے کوئی کسر نہ چھوڑی، دوحہ خان کو چھانے میں پرکئی ایسی فاش غلطیاں کیں جو کہ بیک صاحب نے ہدایت میں ثابت کر کے اپنے سوشل کو صرف بری کر یا ایک بلکہ دوسرے کے اسل فاشوں کو بھی انجام تک پہنچایا۔ ڈاکٹر شریف شاہ عید اس مرتبہ انوکھی قربت لے کر آئے جس میں عمر کی محبت بھی لڑائی والی کی اس نے طبع کا ساتھ چھوڑنے کے بجائے زندگی کا ساتھ چھوڑ دیا اور دعت کو اسمر کردیا پر طبع کو انصاری سولی پر لٹکا دیا۔ شرعاً اس کی دھکا بھی خیر تھی۔ ساندہ نے جس وجہ سے پروفیسر کمال کیا، اس کو مقدمہ حاصل نہ ہوسکا، انکا قتل میں بیٹھی اور بیٹھی کے حوسے ہو گئے۔ مختل شعروہم جن شریف سیال سحر سے لے کر حلقہ شاہ سحر تک بہترین اشعار سے مزین دی۔ ویری ٹائٹل علی اختر حسیان لے کر آئے۔ پہلے ایک ہنگام چھوڑ کر پردیس جانا اور پھر بچوں پر پابندی لگانا جہاں پر یہ ممکن نہیں، پرشائے اچھا فیصلہ کیا کہ اس اپنے ملک پاکستان جاؤں کی۔ اس کے پھر بائیں مکمل ہوں۔ فوڑیہ طبع کی مکتا مسکہ پریمی۔ دافن کرکے نے سمجھا کہ باپ نے مکمل کیا اور اس کا الزام اسے سر نہ لایا۔ باپ سے محبت کا اچھا انداز تھا پر قاتی کو لڑا۔ اندھا۔ اینڈ کوئی خاص حوسے کا نہیں تھا۔ وقت کی دوسری قسط پر ہی جہاں شادو اٹھو تو وہیں انکل سلطان کے گھر چوری اور پھر اسطی کے ہاموں کی لو گیا۔ قسط اچھی دی۔ آخر میں بھگت سرن کے نام پر چونکا یقیناً کسی پرانے واقعے کا یاد آتا ہوگا۔ محمد الیاس کی تعزیت لے کر آئے۔ یقیناً برائی کرنے والا آخر کار دلی میں ہوتا ہے۔ نوڑنے تو پھر پٹھان اور انکار کے علاوہ کئی کوسو کے منہ میں پھنچا دیا تھا، اس کا بھی انجام ہوا تھا۔ کوزہ گرد رویش نیا نسیم بکرمی ایک دلی کال کا باز لے کر آئے۔ بابا خواجہ نے نوجوان حسن الدین کی دنیا بدل کر رکھ دی اور پھر اس سے دنیا رویش ہوئی۔ شاکر لطف عورت کا انتقام لے کر آئے۔ انشاں سلطان احمد نے اپنے شوہر سلطان احمد سے بدل لیا۔ اپنے بیٹے کے کڈر لیے اس کو مرادیا اور اپنا انتقام پورا کر لیا۔ آخری صفحات پر سلیم قاروقی صاحب کی تحریر بھنور کی۔ اللہ سلیم قاروقی کے درجہ بات بلند فرمائے (آمین) نوجوان عمران نے بڑی بہادری کے ساتھ ویڈیو بنانے کے بعد اس کی حفاظت کے لیے جان کی بازی تک لگادی۔ شملانے بھی بچی پر وہ اس کی بڑی مدد کی کو یہ بڑا اٹھا کر آئی تھی تک پہنچائی اور گولی کھائی۔ محمدہ تحریر کی۔

✽ ظاہرہ گلزار کی پشاور سے آمد۔ آج یعنی 19 اپریل کو ایک بار پھر ڈیوٹی کے بعد جا کر پتا محبوب سسٹنس لے لیا۔ واقعی گرمی کے اس موسم میں سسٹنس ٹھنڈی چھوڑا بن جاتا ہے۔ اس بار میرا خط جلدی پہنچ گیا ہوگا۔ اب تمام دوستوں کے خطوط سے مطمئن ہو جائے گا کہ کون کتنا خوش تھا اور کس کو دکھ ہوا، میرے بھروسہ آنے پر۔ ہاں ایک بات تمام دوستوں کے ساتھ شیئر کر دی ہوں کہ جب یہ خط شام ہوگا بھی تو اس وقت ہمارا برادر میرے ہاتھ پر ڈھکنا ڈھکنا سلطانی خول 23 اپریل کو مجھ سے ملنے پشاور آئے گا۔ انشا اللہ میں جون الیاس اس بار اسٹوڈی کا تھیں کرتے نظر آئے اسامہ کے لفظ سے تو اب مجھے بھی نفرت ہوگئی ہے۔ اس لفظ نے مجھے تھک دیا۔ اللہ اس ملک اور اس کے لوگوں پر رحم کرے آمین۔ سمر ارجان انکل آپ کے ایک ایک لفظ تیر کی طرح دل و دماغ میں گھس گھس لیکن ہم کوزہ عوام بھی کیا کریں۔ عاصم خان آفریدی کی پہلی انٹروی اور وہ بھی پہلے نمبر پر رواہ کتنے خوش قسمت ہو۔ ویلکم اینڈ مارکاں۔ بہت زبردست تبصرہ لکھا ہے۔ واقعی یہ جواب ضرور دینا تھا کہ آپ کے لیے کرائے استخام میں کون جاتا تھا۔ بیگ بتانا بھولت نہیں۔ ہاں میرے سویت دوست عبدالجبار روی میں بہت خوش ہوں۔ اللہ آپ کو بھی خوش رکھے، آمین۔ بیٹھ کی طرح بہت جاسج بیٹھ اور دلچسپ تبصرہ رواہ۔ ناہید یوسف بہت دلچسپ انداز لے کر حاضر تھیں۔ ناہید جی دوستوں کے ساتھ اچھی باتیں رکھو۔ ذرین بی میں نے کوئی منت نہیں مانی تھی۔ یہ میرے نصیب میں لکھا تھا اس لیے میں بھروسہ آئی تھی۔ آپ اتنی زوریں کیوں ہیں۔ میں تو بہت خوش رہتی ہوں۔ اب آپ کی خوش ہو، آخر میں ادارے سے منہ من لگا دی دیا۔ آخر میں باہر ماس سے لگے۔ بھائی تو آپ اپنی عمر بھی بتا دیتے کیوں لڑکیوں کی طرح عمر چپاتے ہو کہ بھائیوں میں پہلے شیش لگ۔ اس بار تو اسامہ قاروقی باقی بہت رولا دیا۔ پاکستان کے اس وقت کے حالات کی ایسی سحرش کی جیسے اس وقت ہم بھی وہیں تھے۔ جوایت اسد اللہ کی، بہت اچھا ہوا۔ جوایت بہت ہور دار دعت کرنے والی شخصیت ہے۔ چاند پانوی پاکستان کی اور اب جولی اس کو مگر لے کر جانے کی۔ ہاں عارف کو اس حالت میں دیکھ کر دکھ ہوا لیکن ایسے کمزور، سستی اور بزدل انسان کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔ قاروقی نے سحران کو پاکستان بھیج دیا اور اب راحور سے جنگ جاری ہے۔ پلیز قاروقی کو پلہ پاکستان پہنچا دیں لیکن پہلے وہ راحور کو کھانا لگا دے۔ قاروقی کو صرف جوایت ملنا چاہیے۔ حسام بہت صاحب کی تحریر وقت دوسری قسط بھی کافی ایشیٹن والی رہی، شادو اٹھو گئی۔ دو بندے انکل سلطان کو کتر یا پانچ ہزار ڈالرز کا چوٹا لگائے۔ علی اور اساتر بننے کے پھر میں پہلے چیلو کرنا چاہتا اور اب لگتا ہے کہ وہ ڈیلمیا بھی بلا کے جنگ میں بھٹنے جا رہے۔ آہستہ آہستہ یہ تحریر ابھر کے آئے گی۔ ویلڈن حسام بہت صاحب۔ محمد الیاس کی مختصر تحریر تقریر اچھی کہانی رہی اور لادکی اور خاص کر کہنے کی سبب تربیت نہ کرے گا ہی انجام ہوتا ہے۔ شاکر لطف کی مختصر تحریر عورت کا انتقام اچھی تحریر تھی۔ سلطان احمد جیسے شوہر اور باپ کے نام پر داغ ہوتے ہیں، اچھا دی اینڈ تھا۔ سلیم انوری کی مختصر تحریر نیزگی کھر وائی مرد کے ساتھ ساتھ دوسری عورت بھی عورت ہی کی دشمن ہے۔ اپنے سحران ام انکل اس بار پھر چالاکي دکھا کر ہمیں لوسڑی کی کہانی سنا کر جان بچائے۔ پلیز آپ کو بھی کہانی کیوں نہیں لکھتے۔ ہمیں انصاف دے گا۔ مظفر اقبال غفری تحریرے ماسورے تو دروہ تک کوڑی کر دیا۔ معلوم نہیں خود کو مسلمان کہنے والے اس معاشرے کے بے حس اور خود مرضی لوگ۔ ایک مظلوم لڑکے کو انکی اڈ تھیں دے دے کر بار دیا۔ ماسورہ لڑکا نہیں ہے بے حس معاشرہ ماسورہ ہے۔ مرزا احمد بیگ صاحب اس بار کا کیس کافی شاندار اور جاسوسی سے بھر پور ہے۔ آخر بیگ صاحب نے دوحہ خان کو باعزت رہائی دلائی دی۔ سلیم قاروقی صاحب کی یہ آخری تحریر بھنور ہمیشہ یاد رہے والی تحریر۔ واقعی ہمارے ملک کو شہلا، نوشین اور عمران جیسے کرداروں کی سخت ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ سلیم قاروقی صاحب کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے آمین۔ ہمیشہ کی طرح اس بار میں نیا نسیم بکرمی دل و دماغ اور روح کو تسکین دینے میں

✽ باب۔ اللہ ان کو اس کا اجر دے۔ امید کرتی ہوں کہ جون کے سیشن میں ہمیں ایک بار پھر بیٹھوں کا سلسلہ پڑ سکے گا۔ روزوں کا خرہ بھی دہلا ہوا ہے۔ بانی سسٹنس بھی لا جواب ہے، مگر میں بھی اس بار بہت زبردست تھیں۔

✽ اور لیس احمد خان، ناظم آباد، کراچی سے شامل محفل ہیں۔ سسٹنس کا حصول بروقت ہوا۔ سرورق بھی خوش رنگ تھا اور ہاں حال ہے۔ آپ اپنی سائنس کر رہا تھا۔ اتنا بیٹے سے بھی آگاہی کے در مکملے۔ ادارے بھی حسب حال تھا۔ سرپرست عاصم خان آفریدی تھے۔ ہاں ادارہ زین آفریدی بھی محض مصداق کا ٹکڑا ہے تبصرہ پسند کیا، بانی دوست بھی شاداں دفرہاں دکھائی دے رہے تھے۔ ڈاکٹر ساجد احمد کی "فتح کرا" نے تاریخ کے صبر دلوں سے پردہ اٹھایا۔ تیوہر ریاض کی قاتلہ شادو نے ماسورے کے دو مکمل کرداروں کا پردہ چاک کیا۔ اس کے بعد "شیش لک" پر ہی جگہ پلہ پلہ پلہ کی انتہائی بلند ہوں پر ارجاعاں ہے۔ کہانی آہستہ آہستہ اپنے انجام تک خوبصورت انداز میں جاری ہے۔ اچھی تحریر کوئی سند کی ضرورت نہیں ہوتی اور وہ مقبول عام بن جاتی ہے۔ "نوکی قربت" بہترین سبق آموز کہانی تھی۔ ڈاکٹر شریف شاہ سید کی تحریر دیکر دلوں پر قتل دیا ہے۔ شرعاً اس کی "دھکا" بھی اچھی تحریر ثابت ہوئی۔ خوبصورت اور معیاری اشعار سے مزین مختل شعروہم نے بھی بہت خوبصورت اشعار سے روشناس کیا۔ "دھیان" تانے بہت اچھا فیصلہ کیا۔ چاہے کئی ہی دھنیں و سنہری دنیا میں پہنچ جائیں گے یا نہیں، ان کا ہر ایک انداز انہیں کر سکتے کہ اپنے اقدار سے ہی جڑے رہنے میں بھلائی ہے۔ کھوٹا مگر بھی بہتر تھی۔ حسام بیٹ کی "دقت" جاری ہے۔ امید ہے یہ تحریر بھی سارے قارئین کی توجہ مبذول کر لے گی۔ "تعزیت" نے بھی ستا کر کیا۔ "کوزہ گرد رویش" نے بھی دل کا ایمان کی روشنی سے منور کیا۔ دنیا میں راہ سے بھٹکے ہوئے لوگوں کے لیے دلی اور اہمیر آتے رہے اور آتے رہیں گے۔ "عورت کا انتقام" بھی اثر انگیزی کی۔ آخری صفحات کی کہانی بھی بہترین کہانی تھی۔ سنہری باتوں سے ستا کرنے والی کتوں نے بھی کافی لطف اندوز کیا۔

✽ محمد شہباز ناز کا مگر کالونی شاہ پر صدر، مصلح سرگودھا سے تبصرہ۔ "بڑی بے چینی کے ساتھ وقت گزارا۔ اتنی تیز دھب میں تین چار بار 15 کلومیٹر کا فاصلہ لے کر سسٹنس لینے کے لیے جاتا اور جواب تھا کہ ایک سیشن میں نہیں آتا۔ 24 اپریل کو اللہ اللہ کر کے بڑی مشکل سے ملا۔ سسٹنس ملے ہی سارے شکوے دور ہو گئے۔ (مگر پڑ چوہر دعت مارکیت میں آچکا تھا۔ پھر آپ کو یہ سہیے لگا؟) مکمل گرل پر جیسے ہی نظر پڑی تو بھی عروس ہوا کہ وہ اپنے محبوب کو لکھتی تھیں انہوں سے دیکھ کر ہی مجھے جیسے پچھتا رہی ہو کہ میں نے بے وفائی کیوں کی اور دوسری طرف اس کا محبوب بھی اس سے متعیر سے کی ہو چکا تھا کہ کاش! یہ میری زندگی میں نہ آتی۔ اب چلتے ہیں مکمل کی طرف۔ جون الیاس کا انشا نیہ پڑھا۔ جہاں جہاں کے بارے میں بہت ہی اہم باتیں لکھیں۔ سب سے پہلے مظفر اقبال کی کہانی اس ماسورہ پر ہی شروع۔ آخر تک ایک ہی انسان کا کردار تھا۔ اس کے بعد مرزا احمد بیگ کی کہانی عزت دار پریمی۔ بیگ صاحب نے اس بار بھی بڑی مہارت سے دوحہ خان کو کچا۔ اسے اہمیر اور اس کی بیٹی گھنٹ کی پوری کوشش کی کہ دوحہ خان سب کا قاتل قرار دے۔ جبکہ اس کوشش میں IAG اور دوحہ خان کا بغیر خالد مقبول بھی تھا۔ جہاں جہاں سے نہیں چھڑتا۔ سانسے آ کر رہتا ہے۔ دلچسپ کہانی تھی۔ شرعاً صاحب کی کہانی دھکا پڑھ کر دل کو دکھا گا۔ اچھی کہانی تھی۔ سحران صاحب کی کہانی کئے انور پریمی۔ سحران صاحب اس بار ایک انوکھی کہانی لے کر آئے لیکن سب بھی آئے ہیں چھا جاتے ہیں۔ ہمارے لیے اس میں اور بھی پتلا ہوتے ہیں اگر کوئی لکھے تو۔ اپنی پسندیدہ کہانی شیش لک پریمی۔ سرگی، یقین کریں بالکل بورنگ عروس نہیں ہوتی۔ قاروقی اب ایکٹن میں آ گیا ہے۔ ایسا کہ بعد میں انٹرین فلم دیکھ جائیں۔ چاند پانوی نے دوحہ خان کی زندگی ترک کر کے نیک زندگی اختیار کی اور دوسری طرف ماجدہ شریف ہونے کے باوجود قربت کی وجہ سے اپنے بھائی کا طعنہ کر دیا۔ اسے خاطر خاطر ہوں کی دلدل میں گھسی۔ اسامہ قاروقی صاحب! کہانی بہت اچھی جاری ہے، جسب کہانی ہے۔ محمد الیاس کی تعزیت اور ڈاکٹر شریف شاہ سید کی کہانی انوکھی قربت پریمی، بہترین کہانیاں ہیں۔ سلیم قاروقی کی کہانی بھنور پریمی۔ ایک چوٹا دے والی کہانی تھی۔ ڈاکٹر ساجد احمد کی کہانی فتح کھر پریمی۔ اسلامیہ تحریر کے حوالے سے ایک سبق آموز کہانی تھی۔ باہر ماس صاحب کا بہت بہت بھرپور کہانیوں نے مجھے برا کہا اور میرے بارے میں اتنے اچھے الفاظ بولے۔ خدا اور تو سب دے۔ تمام دوستوں کے تبصرے بہت اچھے لگے۔ دھکا کو ہوں کہ اللہ پاک اس مختل کتا بادشاہ رکھے اور اس ادارے کو بڑی نصیب فرمائے۔ آمین۔

✽ عبدالجبار روی انصاری کی، جو بگ سٹی لاہور سے محفل کی زینت بن رہے ہیں۔ "مچھوٹی مچھوٹی آنکھیں، جب تیرھی ہو جاتی ہیں دل میں بے چینی اور انداز بد نہ لگتے۔ نہ پچھوٹا کرتی رہی جب پیار سے پیار بھجوتے لگتے۔ شاید ایسا ہی کچھ احوال سرورق کی دوشیزہ کی تیرھی نظریان کر دی ہے۔ تم کہو ہوا اور تم کون ہیں؟ بحث ہوئی چاہے بھٹوے شکایت بھی ہوا کرتے ہیں۔ اصل بات ہے "احمد" کی کہ کم کر ہی کس قدر احماد کر سکتے ہیں اور جون الیاس کی ایک احماد وہی کہ کم ان کی بھی باتوں پر کس قدر احماد کے ساتھ مل کر تے ہیں۔ عاصم خان آفریدی کی پہلی شرکت مبارکبادی سچ ہے اور ساتھ میں روکی کی حوصلہ افزائی بھی عمدہ رہی۔ ناہید یوسف کو بھی ناظم تو بھر پور تبصرہ دیا۔ جگہ جگہ انکا اور اشفاق شامین کی بے چینی کتنی ہوئی تو دوستوں سے ملاقات بھی ہوگئی۔ شادو پلٹ سید شاہ عالم زرد کی حاضری اچھی لگی۔ ذرین آفریدی اور بیتش حد بھی ظاہرہ کو بھائی ہوئی اچھی لکھی لیکن ظاہرہ گلزار شاہ اچھی بان نہیں رہیں تھیں تو سسٹنس میں نظر نہیں آ رہیں۔ محفل میں چاند چاند گے محمد منصور سجاد سیدی انٹری بھی باریک طرح عمدہ رہی۔ احسان عمر کی خوشگوار سوسائٹی اچھی لکھی اور آخر میں مہتاب احمد بھی روکی کی نوکری سے بچتے بچتے اپنی جگہ بنا گئے۔ زبردست۔ باطل کے خلاف جہاد اور اپنی رعایا کی بہتر جگر گیری ہی بادشاہوں کو نیک نام اور کامیاب بناتی ہے۔ رحم دل بادشاہ ماسورہ الدین بھگتین کی جنگی حوالوں سے حکمت عملی تو عمدہ تھی ہی، اس کے بیٹے محمود فزونی ان سے بھی بڑھ کر تھے۔ خوبصورت تاریخی کہانی پڑھ کر بہت

دردی صاحب قاضی ہیں۔ ردی صاحب کا تبصرہ ۱۷ ماہ پر ہے۔ حامد یوسف کا طویل تبصرہ بھی کافی جاچار ہے۔ اظہار ثانی، ۱۶ ماہ ۱۰ ص ۱۰۰
 زین آفریدی کے تبصرے بھی عمدہ اور جاچار تھے۔ اس کے بعد "جنگ کر" میں ڈاکٹر ساجد امجد صاحب سے ملاقات ہوئی۔ ساجد امجد
 صاحب کی تحریر ہمیشہ دلچسپ اور جاچار ہوتی ہے۔ اس مرتبہ انہوں نے سبکدین کے بارے میں لکھ کر ہماری معلومات میں اضافہ کیا۔ ایک
 برقی کی دماغ نے سبکدین کو غلامی کے تحت شہنشاہی تک پہنچا دیا۔ سلطان سبکدین کج سحتوں میں سرور تھا اور کامل مسلمان تھا۔ اس کے بیٹے سلطان محمود کی زندگی
 بھی ہمیشہ جہاد کے لیے وقف رہی۔ آپ سے گزارش ہے کہ اگر جہاد پر ردی صاحب کی تحریر شامل کی جائے تو سبکدین کے ابتدائی صلوات میں ان
 کی تحریر چار جاچار لگتی ہے۔ مصلح امام صاحب کی تحریر "کھلے گور" انتہائی دلچسپ تحریر تھی۔ بے چاری لومڑی انگوٹھ حاصل کر کے بھی غالی ہار رہی۔ جس
 طرح لڑکی کے بال مصنوعی تھے اور انگوٹھا پلاسٹک کے تھے، اسی طرح اب تو ہر چیز مصنوعی اور لذات بھری ہوئی ہے۔ دختران، مگروں اور عمارتوں میں
 مصنوعی پودے جن پر مصنوعی پھل لگے ہوتے ہیں اور پلاسٹک کے پھول ہوتے ہیں۔ ہماری زندگی مصنوعی اور بناوٹ سے بھری ہوئی ہے۔ میرے پاس
 پرانے سبکدین اور سرگزشت کافی تعداد میں ہیں کیونکہ میں کافی سالوں سے سبکدین پڑھ رہا ہوں اور ہر ماہ کا ڈاکٹسٹ محفوظ کرتا ہوں۔ دوست احباب
 مذاکرے کرتے ہیں اور کہتے ہیں یا رخاں، کیسے فضیلتی انسان ہو، یہ کتابیں اور پرانے سبکدین اور سرگزشت کا ذکر تم نے لکھا ہے، ان کے علاوہ مغرب میں تبلیغ
 اور قادیان وقت گزارنے کے اسباب ہیں۔ انٹرنیٹ ہے، فیس بک ہے، اور بھی جو بیڈ ذرائع ہیں۔ تو میں ان سے کہتا ہوں کہ میں مصنوعی اور بناوٹ سے بھرپور
 چیزوں سے بیزار ہوں۔ یہ کتابیں سبکدین اور سرگزشت کا ڈیویری میرا قیمتی اثاثہ ہے۔ (بہت خوب آپ نے درست کہا۔ کتابیں اٹاتے ہیں) سے کم
 نہیں ہوتیں۔) خبر بتا کہیں چلی گئی۔ "حزت دار" میں جس طرح بیک صاحب نے خاندان مجبور، اسے نئی اور رکھنے کے جرم کو عیاں کیا، وہ قابلِ تحسین
 ہے۔ بیک صاحب نے بے شمار کتابوں کو چاکس کے چھندے سے بچایا۔ یقیناً یہ بڑا نیکی کا کام ہے۔ اللہ انہیں جزائے خیر دے۔ بیک صاحب کی جگہ کوئی
 اور دیکھ لو ہوتا تو دینچ خان کو بھی سزا ہو جاتی اور بے چاری سحرے کے قاتل بھی گرفت میں نہ آتے۔ "کوزہ گرد و لیل" میں فیاض نسیم بھگاری نے
 ہمارے ایمان کو کھانا بخشی۔ امیر کمال کے حالات زندگی پڑھ کر ایمان تازہ ہو گیا۔ امیر کمال پر تصور کے رب کا کوئی اثر نہ ہوا۔ شریعہ سے روکنے نے بھی
 آپ کا احترام کیا۔ اولیاء کی کرامات تو بہت ساری ہیں جو کہ تحریروں کے ذریعے ہم تک پہنچتی ہیں۔ فیاض نسیم بھگاری کا ٹکڑیہ کہ ہمیں اولیاء کو کرام کے ایمان
 اور ذواحقات پڑھنے کو ملے ہیں۔ ڈاکٹر شیر شاہد کی تحریر "الو کی قربت" بھی ایک لازوال تحریر ہے۔ اس میں ہمیں ایک طرف تو ڈاکٹر سبکدین اور ڈاکٹر
 کیتھن جیجے کرادوں کا پتا چلتا ہے جن کی انسانیت سے بے لوث اور بے پناہ محبت اور جذبہ خدمت انسانیت کے کھلی سے کھلی انکشاف و انکار کا نمونہ بلکہ
 اس سے بھی زیادہ ہے کیونکہ اس کے لیے الفاظ نہیں ہیں۔ علم کی بنیاد کے باوجود ہمارے اس سے محبت و وقار رکھ کر ملے جان دے کر ہمیشہ کے لیے زندہ
 ہو گیا۔ یہ محبت کی ایک اہل مثال ہے۔ ڈاکٹر شیر شاہد کی ایسی تحریریں دیکھی انسانیت کی خدمت کا سبق دیتی ہیں جو کہ خود خدمت کا ایک اہل روج
 ہے۔ "دعنا" شرمسار کی بہترین تحریر ہے۔ سادہ اور گفتنی روپ کے بجائے اگر شہت سوچ رکھتی تو کلام ہو جاتی۔ پروفیسر کی جگہ بے بسی کا فقر ہو گیا۔
 سادہ پروفیسر کی موت کی ذمے دار ہو کر بھی جو برکت و خود حاصل نہ کر سکی۔ "تقریرت" میں شیخ نواز اگر قربت روپ اختیار کرتا تو اسے مولوی صاحب کی بنی
 زینب بھی مل جاتی اور نہ وہ اصل گل اور نہ ہی کہنے کا قاتل بن جاتا نہ زینب جان سے جاتی اور نہ خود بھیج کے اقصاں پٹنا۔ "دعنا" اور "تقریرت" کا حاصل
 سبق فقرہ ایک جیسا ہے۔ یعنی فنی اقدام سے حاصل ہونے والی باتیں بلکہ سادہ سادہ حقائق سے مزین اور خیر خواہوں اور نقصان کا باعث بننے ہیں۔ اسی طرح کی "رحمان"
 اچھی تحریر ہے۔ ہمارے سادہ سادہ میں الیہ بھی ہے کہ ہم جو کہہ کریں اس پر تو کوئی خدمت نہیں لیکن جب اولاد و اجواں ہو جائے تو ان سے توقع کی جاتی
 ہے کہ جو کہہ کر لکھ لکھ کر سزا دے، وہ ہماری اولاد و اختیار نہ کرے۔ حالانکہ اگر سبب میں ہمیں ہم اگے رہا وہ ردی کے بجائے اپنے کارکردہ کے داغ
 رکھیں تو اپنی اولاد کو بھی نصیحت کرنے کا جواز ہوتا ہے اور اس کا یقیناً اثر بھی ہوتا ہے۔ شائے آخر میں ملک جانے کی بات کر کے اپنے باپ کو دور بھیجی اور
 منافقت کے نقصانات کا نیکو دیکھا دیا اور اپنی قربت سوچ اور کمرے میں نہ لگاتو دیا۔ "عورت کا انتقام" شاکر گلف کی دلچسپ، سبکدین سے بھرپور اور
 سبق آموز تحریر ہے۔ آخر میں پتا چلتا ہے کہ سلطان احمد بے رحمی ہے اور اس عورت کا خاندان ہوتا ہے۔ اپنے انسانی ظلم کے باعث سلطان احمد اپنے بیٹے
 باہو کی کوئی کاٹنا نہ دیتا ہے۔ یہ بات باعثِ عبرت ہے۔ آغا نجف سے بھرپور ہے اور آخر میں بھی سبق موجود ہے، یہ بے رحمی یقیناً دلچسپ ہے۔ کٹر میں بھی

تحریم شادی لاہور کینٹ سے خط لکھ رہی ہیں۔ "ہائل گرل تو تیار کھڑی کہیں جانے کی تیاری میں لگتی ہے۔ شاید اپنے محبوب سے ملنے کے لیے جو پیچھے کھڑا انجی کا انتظار کر رہا ہے۔ اس لیے انہیں ایک دوسرے کے ساتھ صرف چھوڑ کر آئے بڑی توجہ اٹھایا ہے مگر انکی وہ ہمیشہ کی طرح دانش مندی کا خزانہ لیے کھڑے تھے اور ہم نے ان سے تمہارا سا چن لیا۔ آج کل جو لوگ جمہوریت کے علم بردار بن کر رہتے ہیں انہیں تو شاید اس کی الف، ب، ج بھی نہیں معلوم کہ جمہوریت حقیقت میں اعتبار کرنے کا اور ہر ایک کی برابری کا نام ہے لیکن وہ لوگ صرف اپنے آپ کو سب سے اعلیٰ اور سچا سمجھتے ہیں۔ پیٹک ہم میں سے کوئی بھی نہیں کہہ سکتا کہ ہم نے بھی جمہوریت بولا ہی نہیں۔ جمہوریت یہی ہے کہ ہمیں ایک دوسرے پر اعتبار کر کے اطمینان سے ایک دوسرے کی بات سنی اور سنی جاوے کہ لازم ترقی کرنی چاہیے۔ خیر سیاست کو چھوڑ کر اپنی محفل کی طرف آتے ہیں۔ میں مصروفیت کی وجہ سے پچھلے کئی ماہ محفل میں شرکت نہ کر سکی لیکن انہوں کو یہ ہے کہ کسی نے مجھے یاد ہی نہیں کیا۔ لیکن خوشی یہ ہے کہ ہم نہ کسی تو کیا ہوا، اس ماہ لاہور سے ہمارے بھائی، وصال خان آفریدی نے لاہور میں کا نام بلند کر دیا۔ مصادرات پر قبضہ جاکر "لالہ" آفریدی کی طرح پہلی ہی ہال پر چھٹا مار دیا۔ بہت مبارک ہو۔ ارے یہ کیا، وہاں بھی وہ آج تو وزارت پر بھی لاہوری ہی چھانے ہوئے ہیں۔ باقی سب کے تہمے بھی اچھے رہے۔ اب آتے ہیں کہاں کہاں پر۔ شیش گل کی تیز رفتاری سے چل رہی ہے۔ بس جلدی سے فاروق بھی کراچی پہنچ جائے۔ باقی سارے کردار تو وہاں اکٹھے ہو ہی گئے ہیں۔ ماروی قسم ہو گئی اور نئی قسط دار کہانی "وقت" ابھی شاید آہستہ آہستہ سنسنس اور ایکشن بکڑے گی کیونکہ کئی احوال کوئی بڑا واقعہ نہیں ہوا۔ کئے گئے اگر تو زبردست رہی۔ واقعی آج کل ہر چیز بنانا ہی ہو گئی ہے لیکن بھاری لٹری پر بڑا اثر آیا۔ آخر میں انوکھی قربت درویمری کا جواب کہانی۔ وہ کتابیں ایسی ہی عام رہی تھیں۔ کوئی خاص بات نہیں سمجھائی گئی اس کے جوہر کا ہے اسے برا انجام ہی ملتا ہے۔ دھیان واقعی والدین کے لیے سبق آموز کہانی کہ جیسا انہوں نے کیا ان کی اولاد بھی دیباغی سمجھتی ہے اور وہی کرتی ہے اس لیے جو ہم نہیں چاہتے کہ ہماری اولاد دکرے، وہ ہمیں نہیں کرنا چاہیے۔ مگر وہ سب کی سب بھاری کام آجاتا ہے۔ وہ دروہات ہے کس کے پاس محفل نہ ہو۔ جیسے کہ لارٹن کریم۔ عورت کا اقامت بھی سنسنس بھری دلچسپ کہانی تھی۔"

✽ پانندہ خان سلیمان خیل، غیر مزدوروں مسلح شیخوہرہ سے شاہنشاہ محل میں آئے تھے اللہ تعالیٰ آپ کے ادارے کو دن دوئی رات جو کچھ ترقی عطا کرے۔ اس ماہ ستمبر دودن کی تاخیر سے ملا۔ ستمبر کا انتظار میں بڑی شدت سے کرتا ہوں اور یہ انتظار مجھے انتہائی کوفت میں جلا کرتا ہے لیکن جب بھی ستمبر ملتا ہے جو طبیعت ایک مرتبہ تازہ ہوجاتی ہے۔ امی کو کا ستمبر ملا تو سب سے پہلے جون الیلا صاحب کا انتقال ہے "امی" ذرا بچا۔ یقیناً اگر ہم دوسروں کے الفاظ میں سچائی تلاش کریں اور صرف اپنی ذات کو ہی سچائی کا معیار ثابت کرنے پر تیں میں تو اس کی فضا نہ بنیادوں پر قائم ہوئی ہے۔ جون صاحب کی بات جب بھی پڑھتا ہوں تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاید کسی کا دل کی چو پال میں تھپتھپتے ہوئے کسی سیانے باپے کی باتیں سن رہا ہوں۔ بڑوں سے تاجے کہ پڑانے تو میں باپے بڑی پر حکمت دانستانہ باتیں کرتے تھے جن میں سے اکثر ضرب الملح کی حیثیت اختیار کرتی تھیں۔ غیر اس کے بعد غلطو کی محفل میں پیچھے تو عامر خان آفریدی کو پہلی انگری کے ساتھ کرپی صدارت پر براجمان پایا خوش آید یہ عامر صاحب۔ گزشتہ ماہ کرپی صدارت کا اعزاز پانے والی طاہرہ گزرا اس مرتبہ محفل سے غائب ہیں۔ فضا شاہ داؤل ناؤن لاہوری محفل میں غیر حاضر ہیں۔ کرپی وزارت پر عبد الجبار



کافی دلچسپ قسم۔ شیش محل، وقت اور آخری صفحات کی تحریر کو میں آخری دنوں کے لیے بچا کر رکھتا ہوں۔ جب سسٹمز لٹ ہو جاتا ہے تو ان کو پڑھ کر اپنے اشتکار کو فٹم کرتا ہوں۔ سسٹمز کے تمام اسٹاف اور لکھنے والوں اور قارئین جو کہ ایک جہلی کے مانند ہیں، سب مہار کباد کے سختی ہیں۔ جو کہ اس دور میں جبکہ ہر جگہ انٹرنیٹ کا میڈیا، سوشل میڈیا، انٹرنیٹ اور دیگر ثقافت کا دور دورہ ہے ایسے وقت میں سسٹمز اور سرگزشت جیسے پرچوں سے وابستہ نوشتہ سوچ ہونے کی عکاسی کرتا ہے۔ (رسالے کی پسندیدگی کا بے حد شکر ہے)۔

✽ ناہید یوسف اسلام آباد سے مغل محل میں شامل ہو رہی ہیں۔ "اف۔۔۔۔۔ مگر کی صفائی تھری بھی اک کا رحال ہے۔ آج ہم نے سوچا کہ جلدی جلدی سارا کارڈ ہٹا کر سسٹمز کا عیار کریں گے لیکن اف۔۔۔۔۔ بس ایک چیز کو چھوڑنے کی دیر تھی کہ پورا گھر اٹ پلٹ کے کھڑا ہو۔ خیال تھا کہ کتنا ہی ہوا کہ شوہر صاحب وقت سے پہلے ہی گھر پہنچے اور پھر ہم دونوں نے مل کے جلدی جلدی سب چیزیں نکالیں، تنگ ہمارے قہوڑی ویرا رام کا بھر اس کے بعد جانے سے خود کو تازہ کرنے کی کوشش کی اور اس میں کافی حد تک کامیابی بھی ہوئی۔ مگر سوچا کہ تسلسل نہ تو اس لیے لگے تھے ہمارا ت کا کھانا تیار کر ڈالا۔ اب کہیں جا کر ہم نے سسٹمز تھما۔ واہ بھی۔۔۔۔۔ اس دفعہ فہرست دیکھ کر خوشی سے نہال ہو گئے کیونکہ ہمارے فیورٹ رائٹسلیم قاروڑی مرحوم کی کہانی جو بھی کوئی تھی۔ اللہ تعالیٰ قاروڑی صاحب کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین۔ سلیم قاروڑی کی ہمنوا آئی اے جی سسٹمز کی کہانی نے خلقت مواقع پر ہمارے دل کی جھڑپیں زور و زبریں تاہم ایڈٹ میں جیت جاتی کی ہوئی۔ ویڈیو۔۔۔۔۔ آپ سے گزارش ہے کہ ہمارے ایک اور فیورٹ رائٹس طاہر جادوید مغل کی کوئی طویل کہانی لکھیں اور پھر ان کا کوئی سلسلہ شروع کریں کیونکہ طاہر صاحب کے قلم کا جادو ہر چیز کے لیے ہوتا ہے اور ایک غفلت (قارئین) ان کے قلم سے نکلے الفاظ کے سحر میں کھو جاتے ہیں۔ خیر، امید کرتے ہیں ہماری درخواست پر غور کیا جائے گا۔ انیسویں میں جن الیہا استاد کے بارے میں گفتگو کرتے نظر آئے اور انہوں نے ایک دوسرے پر اعتماد کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ مگر پیچھے ڈاکٹر ساجد صاحب کی بات سچی کہانی حق کر رہے۔۔۔۔۔ اور پھر قہوڑی دیر کا وقت لینا پڑ گیا یہاں کیونکہ شوہر صاحب کو بھوک کے ساتھ شروع کر دیا تھا۔ خیر کھانے سے فراق کے بعد سے خوف و خطر اور کسی راز عمارت کے داہے کے بغیر سسٹمز کو دوبارہ تمام کیا۔ کہانی میں بہت سے نشیب و فراز تھے۔ قلام منڈی کے پانچاس شروع کرنے والا قلام۔۔۔۔۔ بادشاہ کے تخت پر براجمان ہوا۔ سسٹمز نے عدل و انصاف کی تردید میں بڑا حصہ لیا اور قلم کی بیخ کنی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ کھا۔ کافی مطواری تحریر تھی۔ حرہ آگیا۔ پھر شیش محل کی طرف دوڑ پڑے۔ واہ بھی اسلامی کہانی کو کافی تیز تر کر دیا ہے۔ جولیت اسد اللہ سے جاملی، بہت خوشی ہوئی اور جادو کو میں اپنے ساتھ گھر میں لے آئی۔ زبردست۔۔۔۔۔ اصر قاروڑی رہن کے قاتلوں سے تھوڑا سا بے۔ آخری قاتل کے خاتمے کے لیے جان کی بازی لگائی ہوئی ہے۔ کہانی نے سسٹمز کی جھینپے نہیں دیں۔ اگلی قسط کا حکمت سے انتظار رہے گا۔ شیش سید صاحب کی قمار پر ختم کر مگر جامع اور پڑا ہوا ہوئی۔ انوکھی قربت پڑ کر محبت کی گہرائی اور سچائی کا اندازہ ہوا۔ مگر میرے محبت کی اگلی مثال قائم کی۔ سلیم انور، سطر امام، جہاں الیاس کی کہانیاں بھی بہتر رہیں۔ سطر محاسن کی دھماکہ بہت شاندار کہانی تھی۔ مگر آج ساجد صاحب کی محبت دار کے ساتھ حاضر ہوئے۔ تاہم کہانی نے کوئی خاص تاثر قائم نہ کیا۔ وہی دعا تھی جیسے۔ مگر تھوڑے ہو گئے۔ خیر حسام بٹ کی وقت نے پوری محبت میں شام کی۔ سطر امام جو پیر یاس، فوزیہ طیبہ، ملی اختر کی کہانیاں بہترین رہیں۔ مجموعی طور پر سسٹمز نے پورے ہاکی ٹھن اناردی۔ بہت اچھا رہا۔ شاکر لطیف کی کہانی وہ مٹی پڑھنے سے۔ تاہم سسٹمز سے ورناسا پر بھی تبصرہ کرتے۔ اللہ پاک ادارہ جاسوسی کو مزید ترقی عطا فرمائے۔ آمین۔"

✽ مہتاب احمد، حیدرآباد سے خط لکھتے ہیں۔ "اس دفعہ تو گری نے دماغ پلپا کر ڈالا ہے۔ کچھ کچھ ہی نہیں آ رہا کہ کیا کریں، کیا نہ کریں۔ خواص باختہ سے ہونے کا کام پر جاتے ہیں اور بڑا حال ہو کر گھر لوٹتے ہیں۔ لیکن اس حالت میں بھی سسٹمز کا خیال ایک لمحے کے لیے دل و دماغ سے کھنڈ ہوا۔ بس تھوڑا سمر ویت نے قدم بٹھڑے کر کے لیکن ہم نے بھی ہمت نہ ہاری اور جتنی جھپ میں سسٹمز لینے کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ مصروفیت کو بھی خاطر میں نہ لائے اور سسٹمز تھے کشاں کشاں گھر کی طرف چل پڑے۔ راستے ہی میں فہرست پر نگاہ دوڑائی شروع کر دی۔ اس چکر میں ایک دو جگہ ٹھکر کھا کر گرنے سے بھی بچے۔ خیر، مگر چھپنے کے بیگم صاحبہ کو جانے بنانے کا کہا اور خود فہرست ہو کر گری پر بیٹھ گئے۔ سسٹمز کی فہرست کئی ناموں سے ہماری پڑی تھی۔ اپنے پسندیدہ رائٹرز کے نام دیکھے تو دل میں لہو بھونگے۔ اسی دوران میں چائے آئی تو حوہ دوپالا ہو گیا۔ بس پھر کھا تھا، چائے کے ساتھ ساتھ سب سے پہلے اپنے من پسند رائٹر کی کہانی دھوڑی۔ ویسے تو میں تمام رائٹرز ہی اچھے لگتے تھے اور ایسا انداز کی بات یہ ہے کہ ہر رائٹر ہی بہت محنت سے ایک تحریر لکھتا ہے۔ جس کے لیے الفاظ کا چننا، کہانی کا کردار، شکر و فیکر تمام چیزوں کا خیال رکھ کر قاری کی دلچسپی کا سامنا کیا کرتا ہے۔ سب سے پہلے اپنے محنت فیورٹ لکھاری ڈاکٹر ساجد صاحب کی قسط کمر سے آغا کر لیا۔ ساجد صاحب تاریخی موضوع کو اٹھاتے، اچھے پیرائے میں بیان کرتے ہیں کہ پڑھ کے کہیں بھی بیزار کی احساس نہیں ہوتا اور تاریخ سے بھی آگاہی ہوتی ہے۔ اس دفعہ سسٹمز کے بارے میں لکھا۔ اس کی دانش مندی اور بہادری کی بدولت اسے مسند حکومت عطا ہوئی۔ حالانکہ وہ ایک قلام تھا۔ بہت ہی زبردست تحریر تھی۔ یقین جانے ہم بہت محفوظ ہوئے۔ اس کے بعد حسام بٹ صاحب کی وقت کو وقت" دیا۔ یہ ہمارا ذاتی خیال ہے کہ ان کی اگلی کہانی میں ایسی کوئی خاص بات نظر نہیں آ رہی۔ مطلب یہ کہ کہانی اپنی جانب توجہ مبذول کرانے سے قاصر ہے۔ ہو سکتا ہے کہ سب سے پہلے کہانی میں دلچسپی پیدا ہو۔ اس کے بعد دوسرا سلسلہ شیش محل پڑا۔ واقعی اس قاری نے جس طرح آغا کر لیا تھا، ایسی کہانی بہت ست رفتاری سے چل رہی تھی کہ مگر کہانی کی رفتار اتنی ہی تیز ہے۔ کہانی میں انکیشن بھی بھر پور ہو گیا ہے۔ ابھی کہانی مزید دلچسپی کی طرف بڑھ رہی ہے۔ ویڈیو اسلامی۔ سلیم قاروڑی مرحوم کی کہانی



منور بس شیک لگی۔ چھوٹی کہانیوں میں میں ملی اختر کی دھیان اور ڈاکٹر شہزاد سید کی انوکھی قربت نے کافی متاثر کیا۔ ڈاکٹر شہزاد سید واقعات میں حقیقت کا رنگ بھر دیتے ہیں۔ بہر حال کہانی پڑھ کر انھیں تم ہو گئیں۔ واقعی اس دنیا میں محبت کرنے والے ہائی ہیں اور انہی کے دم سے دنیا میں اچھائی کا وجود ہے۔ شاکر لطیف کی محبت کا انتقام بھی بہت زبردست لگی نہیں۔ محبت کمزور کسی لیکن جب تپہ کر لے تو بڑے بڑا کام سر انجام دے سکتی ہے۔ فیاض نسیم بھگاری کی کوڑہ گرد و دیش میں ایلانا مالشہ کے ایمان افروز واقعات سے مستفید ہوئے۔ فوزیہ طیبہ کی کھوکھو سبھی اپنا رنگ بھانے میں کامیاب ہوئی۔ واقعی سچ ہے کہ بعض دفعہ کھوکھو سبھی کام آتا ہے۔ باقی رسالہ زیر مطالعہ ہے مگر ہم بغیر دیکھے بغیر پڑھ کر کہتے ہیں کہ دیگر چیزیں بھی معیاری ہوں گی کیونکہ ادارہ جاسوسی نام ہے معیار کا۔۔۔۔۔!"

✽ ہمیش کمار کا سب، بلوچستان سے پچھلے شمارے پر تبصرہ۔ "مغل یار میں اپنا تبصرہ دیکھ کر بہت خوش ہوئی اور اس سے زیادہ خوش اس وقت ہوئی جب اپنا نام اپنے بلوچستان کے ساتھ دیکھا (شکر ہے) تاریخ کے حوالے سے ایک بار پھر آپ کا شکر گزار ہوں میری ایک فرمائش ہے کہ دنیا کی تمام قومیں اپنی اپنی تاریخ رکھتی ہیں، ان پر بھی قہوڑی نظر رکھیں اور ہمارے علم میں بھی اضافہ فرمائیں۔ معاً کے لیے معاہدہ ریکٹ عنوان تھا۔ کرشمہ کی کارنگری بہت دلچسپی۔ چارلی اور مین دونوں اپنے اپنے کام میں ماہر لگے لیکن مغل محل کی کچی چڑھتی ہے۔ مہتاب خان کی کاوش بہت بہترین لگی اور انہوں نے مجھے ایک گانا بھی یاد دلایا (امیروں کی شام غریبوں کے نام) ملک مسند حیات نے مجھے کہانی کے آخر تک اپنے سحر میں جکڑے رکھا اور وہ بے گناہوں کی مٹی جانوں کا آفس بھی ہو۔ چ کا بدلہ نہ لیا ہی بہترین انتقام تھا، کیونکہ استاد کا ختم ہو ہی انسان کی حقیقت موت ہے۔ سطر امام صاحب۔ طاہر قہوڑی سے الفاظ کی تہلی سے بہترین بنائے تھے کہ شوہر نہیں بلکہ بیوی دھکا دے کر شوہر کو شیش میں سوار کر ادیتی۔ بہر حال لغت ایک حرہ انوکھی مسند اور خوبصورت نام تھا لیکن اس کے اوپر ایک شیطان کا قبضہ تھا۔ ایڈ وکٹ۔۔۔۔۔ اس کو اپنی بی بی جگہ بچا دیا۔ باعث زہت ایک مغل مندر اور دلچسپ کہانی تھی۔ وقت کے لیے وقت ڈیل سا۔ نہیں تو تبصرہ لکھنے کا وقت نکل جاتا۔ اسل اور بخت کی دوستی بے مثال رہی لیکن بخت جذبات میں بہہ بلکہ دلچسپ کیا اور اسل کو ایک خطرناک بیماری میں مبتلا کر دیا لیکن اسل نے دوستی کا حق پورا پورا ادا کیا۔"

✽ رانا حبیب الرحمن کی ٹیپ بک سگھ سے پچھلے شمارے پر خیال آرائی۔ "اپریل 2017ء کا سسٹمز ڈائجسٹ 22 تاریخ کو کمرے موت کے سیل کے بارے میں لایا ان میں دوڑوں کے درمیان اخبار جہاں کے ساتھ بڑا ہوا نظر آ گیا۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ تقریباً دو دنوں ہی آن پڑھ تھے۔ اخبار جہاں پر مصنف نازک جو صرف دیکھنے میں لگی ہیں، ہوتی نہیں، کو دیکھنے میں مصروف تھے۔ چپکے سے قریب جا کر سسٹمز اٹھا یا اور اپنے سیل کے اندر غائب ہو گئے۔ ادارے سے ناراضگی تو پہلے سے یوں کی توں سے اور دوستوں سے بھی لیکن ان دونوں سے محبت میں کی ابھی تک نہیں آئی۔ اسی چیز کو مد نظر رکھتے ہوئے سطر امام مرحوم کی تبصرہ اور سسٹمز کی ایڈیٹر میسج احمہ کے بقاوں میں سے ہوتے ہوئے اپنے پیارے دوستوں کی مغل میں آن وارد ہوئے۔ یوں تو ہم خود پڑانے ہی ہیں مگر ہمارا ڈاکٹر صوفیہ مہمانوں کی طرح ہی ہوتا ہے اس لیے پڑانے دوست جاتے ہیں کہ سننے شامل ہونے والے اور دلوں کے لیے ہمارے ہاگل نئے ہیں۔ ادارے کے لوگ اور تمام قارئین کی لکھاری ایمانداری سے بتائیں کہ چاروں ڈائجسٹوں کے سرورق نہایت ہی بے جا نہیں ہوتے۔ اگر ان میں جان بھری ہوئی ہے کہ کچھ حق موجود کر دی جائے تو کیا قیامت وقت سے پہلے ہی آجائے گی۔ خدا کا خوف کر کے سرورق کی تصویریں میں زعمی نظر آئے۔ وقت سلسلہ اور کہانی کی مٹی چلی بہترین تھی۔ شروعات میں ہی بہت سی معلومات سے ہم پر دھمکی۔ میرے خیال میں تو ایسی ہی کہانیوں میں رہ گئی، معنی، معلومات و فیروہ سب چیزیں ہوئی جاتیں مگر اب تو وی ڈرامے، فلمیں اور کہانیاں صرف اور صرف گھریلو مسئلوں کو ہی اجاگر کرتی نظر آتی ہیں۔ شیش محل کی قسط بھی بہترین تھی۔ گولو کا کردار ختم کر دیا گیا لکھا سب تو آہستہ آہستہ کی کرداروں کو ختم کر کے اسٹوری کو سینا جا رہا ہے۔ ٹھکانہ کہانی میں یہ سب موجود تھا کہ کٹھ باندھ کر کیا ڈرامے کے بعد کچھ خدا کیا کرتا ہے۔ کا فرقت میں قارئین کے لیے سب سے آواز اور محبت کا آواز تاریخی واقعات تھے۔ کرشمہ، شاکر اور انور نے ہوئے لوگ بھی اچھی کہانیاں تھیں۔ سراسلوں میں دو مگر خان، سمیرا سعید، ریاض بٹ اور رضوان خولی کے سراسلے بھی بہترین تھے۔ شہر و جن میں جادو اختر، ناہید یوسف، گنگنا زرخس، قدرت اللہ نیازی، فضا شاہ لاہوری، حنظلہ شاہ کے انتخاب اچھے تھے۔ مغل میں ہماری بہت پیاری اور دلی دوست طاہرہ گھگھار کا تبصرہ پہلے نمبر پر مہار کاں ہو۔ اللہ آپ کو سدا سستی سکراتی چھپی کر کے، آمین۔ مگر خواجہ کوگی شہباز نازکی حاضر تھے۔ زبیر ساگر بھی کسی سے کیوں گھگھروں۔ آپ سے توجہ زیادہ دھکے سے آپ تو میرے شہر کو گرجہ کے دہانے والے ہیں مگر۔۔۔۔۔ اگلے بار عباس دونوں اولادوں کی مہارک۔ ہمیش بھگاری کی آ یاں نون کھدے آں۔ فضا شاہ بھی بہت خوش نظر آئیں۔ ابراہیم سہتی بہت دیر بعد۔ اتم کمال بیک لسٹ میں، اف گھگھار انہیں۔ سراسل اور مغل محل کی غائب تھیں۔ حالانکہ پتا ہے ہمارا دل اداس ہوتا ہے۔ آخر میں قارئین سے ایک سوال۔۔۔۔۔ سب پر جواب دینا لازم ہے کہ شادی محبت کی کامیاب ہے یا رنج بربج؟ اور دوش کی شادی کامیاب ہوتی ہے یا کدو دوسری؟ سوال کا جواب سب ضرور دیں۔" (بھائی اس کو سنی کی ضرورت کیونکہ شیش آگئی؟ آخر یہ توتے؟)

ابن قارین کے نام جن کے مغل میں شامل نہ ہو سکے۔ سید جاوید بخش اقبال کراچی، صبرین لاشاری، لندن۔ پلو خان، مانسہرہ۔ صاحبہ، کراچی۔ ناہیدہ، اسلم، نواب شاہ۔ فرحان شج، متن۔ عام خان، کراچی۔ اتم کمال، حیدرآباد۔

شکُن شکُن

ڈاکٹر صاحب محمد

طبقہ کوئی بھی ہو ... حق وراثت تمام طبقات میں یکساں اصولوں پر رائج ہے ... خواہ بادشاہ ہو یا ادنیٰ غلام ... "تلوار خط سے زیادہ سچی اور مضبوط ہوتی ہے ... حلق تلغی کے تناظر میں مسعود کا اپنے باپ محمود غزنوی کو یہ کھرا جواب تاریخ میں اپنا ایک مقام بنا گیا۔ اگرچہ محمود غزنوی کو بخوبی اندازہ تھا کہ نظام حکومت چھوٹے بچے کے بس کا روگ نہیں، اس کے باوجود اس نے ایک غلط فیصلے کو بولادی جس کے نتیجے میں اسی طرح بغارت کو ابھرا اور تباہی پھیلنا تھی۔ جس طرح محمود غزنوی کے سترہ حملے مملکت میں اضافے کا سبب بنے اسی طرح مسعود کا ایک باغیانہ حملہ بکھری ہوئی مملکت کو منظم کرنے کی وجہ بن گیا۔ کوئی چھوٹا سا گھر ہو یا ایک وسیع مملکت ... نظام تو ایک ہی طرح سے چلتا ہے یہ اور بات منصف اور منظم گفتی اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ورنہ تاریخ نے ثابت کر دیا ہے کہ شکُن در شکُن کا سلسلہ یونہی دراز ہوتا رہا ہے۔ ماضی کے گمشدہ کردار آج بھی اپنے حالات و واقعات سے آنے والی نسلوں کو عبرت کا سامان مہیا کیے ہوئے ہیں۔

ماضی کا آئینہ اختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اور واقعات



خلیفہ بغداد کا قاصد ابھی ابھی خط لے کر پہنچا تھا۔ محمود اس وقت اپنی بارگاہ میں بیٹھا ہوا تھا۔ غلام ہاتھ باندھے سامنے کھڑے تھے اور دربار کے سامنے کواہ پیکر ہاتھیوں کی قطاریں لگی ہوئی تھیں۔ قاصد نے باریابی کی اجازت ملنے کے بعد نشست سنہالی تھی کہ حاجب نے شہزادہ مسعود کے حاضر ہونے کی اطلاع دی۔

"ان سے کہنا، اس وقت باریابی کا عمل نہیں۔ پھر کسی وقت حاضر ہوں۔"

حاجب نے یہ جواب سن کر دروازے سے باہر قدم نکالا ہی تھا کہ معطلات خارجہ کے وزیر ابو نصر روزنی اندر داخل ہوئے۔ تسلیات بجالانے کے بعد ایک نظر قاصد پر ڈالی اور اس وقت تک نہیں بیٹھے جب تک محمود کی چشم القات نے انہیں سہارا نہیں دے دیا۔

"خلیفہ بغداد کی جانب سے آنے والے قاصد نے مجھے مجبور کیا کہ میں آپ کو حاضری کی زحمت دوں۔"

"غلام حاضر ہے۔"

"ذرا اس خط کو کھول کر پڑھو اور جو مناسب جواب ہو وہ تحریر کیجیے۔"

"بے شک سلطان معظم۔" ابو نصر روزنی نے خط

قاصد کے ہاتھ سے لے لیا۔ ابھی وہ خط کی مہر کھول ہی رہا تھا کہ حاجب پھر اندر آیا۔ اس کی اس ناوقت حاضری پر محمود کے ماتھے پر گھٹنیں ابھر آئیں۔

"جلدی کہو کیا کہنا ہے؟"

"شہزادہ امیر محمد آپ سے ملنے کے متنی ہیں۔ میں نے بہت عذر پیش کیا لیکن۔"

"عذر پیش کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ ہماری طرف سے باریابی کی اجازت ہے۔"

حاجب اٹک قدموں لوٹ گیا۔

شہزادہ امیر محمد نے اندر آ کر ایک مرتبہ پھر اجازت طلب کی۔ آگے بڑھ کر باپ کے ہاتھ کو بوسہ دیا اور خاموشی سے ایک طرف بیٹھ گیا۔

"آپ کیوں رک گئے۔ خط پڑھیں۔ ہم بہت دن گزر گئے ہیں۔"

"حضور! میں حیران ہوں کہ کیا پڑھوں اور کیا مطلب افہم کروں۔"

"ایسی کیا عبارت مرقوم ہے جس کا مطلب کشید کرنے میں آپ کو تامل ہے؟"

"حضور! بسم اللہ کے بعد چند سطور حروف متقطعات

الم۔ الم میں لکھی ہوئی ہیں اور ان سطور میں لکھا ہے، الحمد للہ



رَسَبُ الْعَالَمِينَ وَالصَّلَاةُ عَلَيْهِ رَسُولُهُ وَآلِهِ جَمْعِينَ۔“
اس عجیب و غریب خط کو پڑھ کر ادریس رحمہ اللہ کی حالت
کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا۔ قرآن مجید کی وہ تمام آیات جن کا
ان مقطعات سے کچھ بھی تعلق تھا وہ سب پڑھی گئیں اور ان
کے معانی و مطالب پر غور کیا لیکن کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں
آیا۔ اس وقت وہاں خواجہ ابوبکر قسطنطینی بھی موجود تھے۔
انہیں ابھی محمود کی بارگاہ میں زیادہ رسوخ حاصل نہیں ہوا تھا
اس لیے وہ خاموش بیٹھے تھے۔ جب کچھ دیر گزر گئی تو خواجہ
ابوبکر نے کچھ بولنے کی ہمت کی۔

”جان کی امان پاؤں تو میں کچھ عرض کروں؟“
”اجازت ہے۔“

”کچھ عرصہ پہلے آپ نے خلیفہ بغداد سے گزارش
کی تھی کہ ایک فرمان کے ذریعے سرحد آپ کے حوالے
کر دیا جائے۔“

”اس کے جواب میں خلیفہ نے نہایت سخت الفاظ
میں آپ کو پیغام بھجوایا تھا۔“
”مجھے وہ بھی یاد ہے۔“

”تو پھر یہ بھی یاد ہوگا کہ آپ نے وارانہ خلاف کو
ہزار ہا کدو پیکر ہاتھوں سے روند ڈالنے کی دھمکی دی تھی۔“
”دی تو تھی۔“

”اس لیے ممکن ہے خلیفہ نے اس کے جواب میں
سورۃ فیل کی طرف اشارہ کیا ہو۔“

سلطان محمود نے جب یہ بات سنی تو اس کا ہوش جاتا
رہا۔ جب ہوش آیا تو بہت رویا اور خلیفہ بغداد کے قاصد
سے معافی مانگی۔ اسے بیش قیمت تحائف دے کر بغداد
روانہ کیا اور ابوبکر قسطنطینی کو قیمتی خلعت دے کر اپنے امیروں
کے گروہ میں شامل کر لیا۔

محمود نے بد مزہ ہو کر محفل برخاست کر دی اور آرام
کرنے چلا گیا۔ اس کا بیٹا محمد شاید کوئی بات کرنے آیا تھا
لیکن محفل کا رنگ دیکھ کر چپکا بیٹھا رہا۔ محفل برخاست ہوئی تو
خود بھی اٹھ کر چلا گیا۔

محمود پر اس خط کا ایسا اثر ہوا تھا کہ وہ دن بھر خواب
گاہ سے باہر نہ نکلا۔ شام ہوئی تو خدام اور کیزوں کے ہمراہ
خانہ باغ کی سیر کو نکلا۔ یہ اتفاق تھا یا مسودہ کی چینی اسے
تلاش کرنی پھر رہی تھی کہ وہ بھی اسی باغ کی طرف نکل آیا۔
محمود اس وقت فارغ تھا اور تفریح کی غرض سے نکلا تھا لہذا
مسودہ کی آمد نے اس کی طبیعت پر خوشگوار اثر ڈالا۔ اس نے

بیٹے کو خوش آمدید کہا اور چہل قدمی میں اسے بھی اپنے ساتھ
شریک کر لیا۔ اب مسودہ کو اپنے دل کا حال سنانے کا موقع
مل گیا۔

”ابا جان، مجھے آپ سے ایک شکایت ہے۔“

”جنہیں شکایت کب نہیں ہوتی؟“

”آپ شکایت کا موقع دیتے تو شکایت ہوتی ہے۔“

”مسودہ! بہادر ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ آدمی

تیز بھی ہو۔“

”اگر آپ سچائی کو تیزیری کہتے ہیں تو میں کیا

کر سکتا ہوں۔“

”کون سی جگہ بات ہے جو آپ کہنا چاہتے ہیں؟“

”جب میں نے آپ کی خدمت میں حاضر ہونا چاہا تو

آپ نے پیغام بھجوایا کہ یہ ملاقات کا مکمل نہیں لیکن کچھ ہی

دیر بعد امیر محمد آیا تو آپ نے طلب فرمایا۔“

”بس یہی فرق ہے تم میں اور امیر محمد میں۔ اگر میں

نے جنہیں بلایا ہوتا اور امیر محمد کو منع کر دیتا تو وہ ہرگز مجھ سے

اس لمحے میں بات نہ کرتا۔ باپ کی بیوری کو بھگتا۔“

”میں وہ بیوری ہی تو پوچھنا چاہتا ہوں۔“

”ضروری نہیں کہ میں اپنی بیوری بھی بتاؤں۔“

مسودہ کے چلے جانے کے بعد بہت دیر تک وہ امیر

محمد اور مسودہ کے درمیان موازنہ کرتا رہا۔ امیر محمد کتنا

سعادت مند ہے۔ میں جو کچھ کہتا ہوں اس سے بھی اختلاف

نہیں کرتا۔ اس کے برخلاف مسودہ کا حال یہ ہے کہ کج کا

سہارا لے کر گستاخی کی حدود کو چھوئے لگتا ہے۔ اس کی

بہادری کو دیکھتے ہوئے میری نظروں میں تو اس کی عزت

ہو سکتی ہے، دل میں نہیں۔

کسی ایک واقعے پر منحصر نہیں۔ مسودہ بات بے بات

محمود سے درشت کلامی کریشٹا تھا۔ سلطان اسے سخت ناپسند

کرتے لگا۔ اس ناپسندیدگی نے اس قدر طول کھینچا کہ وہ ہر

طرح سے مسودہ کی حق تلفی کرنے لگا۔ امیر محمد کو ہر طرح سے

اہمیت دینے لگا۔ مسودہ نے وجہ جاننے کی کوشش نہیں کی، وہ

تو بس اس نتیجے پر پہنچا کہ باپ اس کے بھائی امیر محمد کو زیادہ

چاہتا ہے۔ وہ یہ بھی سوچنے لگا تھا کہ باپ کی یہ چاہت تخت و

تاج کی وراثت کے وقت بھی بڑا جھگڑا کھڑا کرے گی۔ وہ

اپنی اہمیت جتانے کے لیے مزید درشت اور جھگڑا ہو گیا۔

امیر محمد اور مسودہ دونوں بھائی ایک ہی دن پیدا ہوئے

تھے۔ مسودہ اپنے بھائی سے چند لمحوں جتن تر اس دنیا میں آیا تھا

اس لیے وہ خود کو بڑا بھائی تصور کرتا تھا جبکہ امیر محمد کو بڑے

شکین در شکین
ہوئے۔ کالونی خیال نہیں تھا۔ شاید باپ کی بے پناہ توجہ کی
بے پناہ پکائی ہوئی تھی۔ باپ کے سامنے سراپا نیاز بنارہا تھا
”ابن“۔ خود کی فطری عزت نہیں کرتا تھا۔ مسودہ اس کا قصور وار

باپ دیکھتا تھا کہ دونوں مل کر اس کی حق تلفی کر رہے ہیں۔

یہ کشیدگی اس وقت انتہا کو پہنچ گئی جب محمود نے خلیفہ

بغداد کے نام خط لکھوایا جس میں یہ سفارش کی گئی تھی کہ

فراتین اور خلیفات میں امیر محمد کا نام مسودہ کے نام سے پہلے

لکھا جائے۔

دربار محمودی آراستہ تھا۔ تمام امراء و وزراء و تشریف

لائیے تھے۔ امیر محمد اور مسودہ بھی موجود تھے۔ ان سب کی

موجودگی میں اس خط کو پڑھا گیا۔

اس خط کا مضمون سن کر تمام درباریوں کو سخت افسوس

ہوا۔ تمام درباریوں میں توڑی دیر کے لیے بے چینی پھیل گئی۔

سلطان محمود کے سامنے کسی کو احتجاج کی جرأت نہیں تھی لیکن

سرکشوں میں اسے حق تلفی اور ناموزوں خیال کیا جا رہا تھا۔

مسودہ زیادہ دیر اپنی بے عزتی برداشت نہ کر سکا اور

دربار سے اٹھ گیا۔ ایک امیر ابوالضر نے اسے اٹھتے ہوئے

دیکھا تو وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے آگئے اور اس سے اظہار

افسوس کیا۔

”سلطان عالی وقار! سلطنتوں کا انتظام تو بہادر

دیکھتے جن کی گرم ہوائیں

جانغز جاسوسی کی ششدری فضا میں

نیلا دانرہ

کنجش خیز داستان امجد رنیں کی زبردست قلم نگاری

شرف توی کو بدعاش بننے پر مجبور دینے ملا قانون شکن من کی نہانی

چشم لینے ملا ہولناک سلسلہ طاہر جاوید مغل قلم سے

انگاری

چالپاتی دھوپ میں بے آسرا تباہ مسافر کی آبلہ پانی

عبدالرب بھٹی کی طبع آزمائی

آوارہ گرد

سیرورق کی کہانیاں

آپ کے تہرے

مشوے مجھیں دکھائیں

رگ و پے میں چلن پائینے والا تجھ ذکر داروں کی جلیلا زیاں

اور حق کی لپچ پائیں... کھائیں

دوسرا رنگ

کاڈی اور دیوی معاملات میں کامیابی کا زبردست نمونہ کی فتنہ انگیزی

سپنس ڈائجسٹ

جون 2017ء

سے جنگ کیے بغیر چارہ نہیں۔ اس نے اپنا زہر تلخ تیار کر اور غزنی سے روانہ ہوا۔ وہ ابھی "کلیا ہاؤ" نامی مقام پر پہنچا تھا کہ رمضان کے چاند نے جھلک دکھائی۔ رمضان کے احترام میں وہ اسی مقام پر خیمہ زن ہو گیا۔

امیر ایاز اور ابوعلی دایہ اپنے چند ساتھیوں کی قربانی دینے کے بعد نیشاپور پہنچا اور مسعود سے ملاقات کی۔ مسعود ان دونوں کو دیکھ کر حیران ہوا تھا لیکن وضاحت ہونے پر مطمئن بھی ہو گیا۔

"غزنی میں بہت بے چینی پھیلی ہوئی ہے۔ تمام لوگ آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔"

"میں نہیں جانتا کہ ہم دونوں بھائیوں میں خون ریزی ہو لیکن مجھ سے کڑے مرنے پر تلا ہوا ہے۔"

"ہم نے اس کی حکومت سے بغاوت کر دی ہے، اب اسے ختم تک آپ پہنچائیں گے۔"

"میں بھی تم کو اس کا ہم دونوں کے درمیان جنگ نہ ہو۔ تمام محاللات پر امن فضا میں طے پا جائیں گے۔"

"آپ کچھ بھی سوچیں لیکن امیر محمد لڑائی کا ارادہ کر چکا ہے۔"

"بائی امراء کیا کہتے ہیں؟"

"وہ از خود کوئی قدم نہیں اٹھا سکتے۔ آپ نے اگر پہل کی تو وہ ضرور آپ کا ساتھ دیں گے۔"

ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ کسی نے اطلاع دی کہ امیر محمد ایک زبردست لشکر کے ساتھ "کلیا ہاؤ" میں خیمہ زن ہو گیا ہے۔

ایاز کو حیرت ہو رہی تھی کہ اسے نیشاپور آئے ہوئے صرف چار دن ہوئے ہیں اور امیر محمد کیا بادبخت کیا۔ اس سے بھی زیادہ حیرت کی بات یہ تھی کہ مسعود کو یہ اطلاع دانا کے دل لگ گئی۔

"مالک! یہ کیا ماجرا ہے۔ ادھر امیر محمد کلیا ہاؤ میں خیمہ زن ہوا اور آپ کو اطلاع مل گئی۔ ایسا انتظام تو جنگ کے دنوں میں بھی نہیں ہوتا۔"

"میں نے یہ ہنرا اپنے اور جہارے آقا سلطان محمود غزنوی سے سیکھا ہے۔ ایسے آدی مقرر کر رکھے ہیں جو دن بھر ارد گرد کے علاقوں میں گھومتے ہیں اور خبریں جمع کر کے مجھ تک پہنچاتے ہیں۔ یہی قاعدہ اباجان کا بھی تھا۔ ممکن ہی نہیں تھا کہ کسی علاقے میں آندی آئے اور انہیں خبر نہ ہو۔ مجھے تو یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ "بست" سے کچھ پہلے امیر محمد کے آدیوں سے تمہاری جھڑپ ہوئی ہے۔ اب یہ بھی معلوم

"ہم اسے روک بھی تو نہیں سکتے۔"

"ہم اسے روک نہیں سکتے، اسے ہٹا سکتے ہیں۔"

"آہستہ ہو لیے۔ کسی نے تو لیا تو غضب ہو جائے گا۔"

"اگر کچھ لوگ ساتھ دیں تو میں نے کچھ سوچ لیا ہے۔"

"آپ نے کیا سوچا ہے۔ اگر قابل عمل ہو تو میں ضرور ساتھ دوں گا۔"

ایاز نے ابوعلی دایہ کو اپنے منصوبے سے آگاہ کیا لیکن اتنی خاموشی اور احتیاط سے کہ کسی کو کچھ معلوم نہ ہو سکا کہ دونوں کے درمیان کیا طے ہوا۔

ایاز نے ابوعلی دایہ کے علاوہ چند بہادر غلاموں کو اپنے ساتھ ملا اور دن دن داڑے شامی اصطبل میں داخل ہو کر خائے کے گھوڑوں کو قبضے میں کر لیا اور تمام لوگ ان گھوڑوں پر سوار ہو کر "بست" کی طرف روانہ ہو گئے۔

داروغہ اصطبل نے اس واقعے کی اطلاع فوراً امیر محمد تک پہنچائی۔ امیر محمد نے ایک چھوٹا لشکر ایاز کو گرفتار کرنے کے لیے روانہ کر دیا۔

ایاز اپنے ساتھیوں کے ساتھ ہوا پر سوار بھاگا چلا جا رہا تھا کہ اسے پیچھے کر دو غبار اٹھا ہوا دیکھ کر چونک گیا۔

"ساتھیو! امیر کو خبر ہو گئی ہے۔ اس نے ہماری گرفتاری کے لیے آدی دوڑائے ہیں۔"

"کیا خبر لکھتا ہوا ہے۔" ایک غلام نے کہا۔

"اب مقابلہ کیے بغیر چارہ نہیں ہوگا۔" ایاز نے کہا۔

ابوعلی دایہ باہر چنگو تھا۔ اس نے گھوڑا پھیرا اور غبار کے چھٹنے کا انتظار کرنے لگا۔ ہوائے اپنی قیمتی سے غبار قطع کیا تو بچپن سے تیس آدمیوں کا گروہ سامنے تھا۔

"ساتھیو! دشمن کی تعداد زیادہ نہیں۔ امیر نے ہماری طاقت کا غلط اندازہ لگایا ہے۔ آگے بڑھو اور انہیں کواروں پر رکھ لو۔"

طرفین میں زبردست لڑائی چڑھ گئی۔ دونوں طرف کے بہت سے لوگ اس معرکے میں کام آ گئے۔ دشمن کے لشکر میں جو لوگ بچ گئے تھے ایاز نے انہیں غیر مسلح کر کے غزنی واپس بھیج دیا تاکہ وہ اپنے ساتھیوں کی بربادی کی داستان ناکیں۔ متو لوں کے سر کاٹ کر ان کے حوالے کر دیے۔

"یہ سر اپنے امیر کے حوالے کر دینا۔ کہیں وہ تمہیں نہا نہ کچھ لے اور یہ بھی کہہ دینا کہ ایاز اپنے آقا امیر مسعود کے پاس پہنچ گیا ہے۔"

یہ ساری جب اپنے ساتھیوں کے کئے ہوئے سر لے کر امیر محمد کے پاس پہنچے تو اس نے سمجھ لیا کہ اب امیر مسعود

لیکن وہ اقتدار کے نشے میں پھر تھا۔ اس نے نہایت سخت جواب اسے لکھ بھیجا۔

"اس امید میں مت رہنا کہ میں ایسا کوئی حکم جاری کروں گا۔ تمہارا نام میرے نام کے بعد لکھا جاتا ہے، اسی طرح لکھا جاتا رہے گا کہ تم اسی لائق ہو۔ تمہیں اگر اپنی بہادری پر ناز ہے تو مجھے اپنی ہر دل مزیزی پر۔ میری رعایا مجھ سے محبت کرتی ہے، میرے لیے یہی بہت ہے۔ میں اپنے والد کی وصیت پر عمل کر رہا ہوں۔ تم اس میں دخل مت دو۔ جو تمہارے ممالک تمہارے پاس ہیں، وہ بھی اب شاید تمہارے پاس نہ رہیں۔"

اور بہت سی ایسی سخت باتیں لکھ دیں کہ مسعود ہوشیار ہو گیا۔

امیر محمد نے اپنی رعایا کو اپنا فرمانبردار بنانے کے لیے خزانے کے من گھڑل دیے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک میں ہر شخص خوش حالی کی زندگی بسر کرنے لگا اور بظاہر فوج سمیت ہر طبقہ مطمئن نظر آنے لگا لیکن لوگ دل سے اس کے ساتھ نہیں تھے۔ وہ اب بھی مسعود کو پسند کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ کسی طرح حکومت مسعود کو مل جائے۔

محمود کا پسندیدہ غلام ایاز اس صورت حال سے سخت تالاں تھا۔ اسے اپنے مرحوم آقا کا یہ قول اچھی طرح یاد تھا کہ مسعود ہر لحاظ سے امیر محمد سے بہتر ہے۔ اسے اپنے آقا کا یہ کہنا بھی یاد تھا کہ میرے بعد سلطنت مسعودی کے قبضے میں آئے گی۔ وہ دن رات اس فکر میں لگا ہوا تھا کہ کسی طرح سلطنت مسعود کو مل جائے۔ اس نے ایک امیر ابوعلی دایہ سے ملاقات کی اور اس سے مدد کا وعدہ لیا۔

"جلدی میں امیر محمد کو سلطان کی جگہ بٹھا دو یا کیا ہے لیکن وہ کسی اعتبار سے بھی موزوں نہیں۔ سلطان بھی امیر مسعودی کو ترجیح دیتے تھے۔"

"تمہارا کہنا ٹھیک ہے۔" ابوعلی دایہ نے کہا۔ "لیکن سوال یہ ہے کہ امیر محمد بھی تخت کا وارث ہے۔"

"جب دوسرا وارث بھی موجود ہے تو ہم بہتر کا انتخاب کیوں نہ کریں۔"

"تمہارے خیال میں اب بہتر کے انتخاب کا وقت گزر نہیں گیا؟"

"آپ دیکھ رہے ہیں اپنی نااہلی چھپانے کے لیے امیر محمد کسے دردی سے خزانہ لٹا رہا ہے۔ میرے آقا نے جان جو کموں میں ڈال کر جو خزانہ جمع کیا تھا، وہ یوں ضائع جا رہا ہے۔"

حکمرانوں کے مہوون مت ہوتا ہے۔ مسعود کی بہادری میں کوئی کلام نہیں۔ لوگ اسے "رحیم خانی" کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔"

محمود نے اس کے جواب میں خاموشی اختیار کی۔ ابو نصر نے بھی سمجھ لیا کہ اب وہ اس موضوع پر کلام کرنا نہیں چاہتا۔ اس نے اجازت لی اور سامنے سے ہٹ گیا۔

حق تلفیوں کے اس بازار میں مسعود نے کسی بغاوت سے تو گریز کیا لیکن باپ کی طرف سے من پھیر کر کھڑا ہو گیا۔

فاصلے بڑھتے گئے۔ سلطان نے اس کی آنکھوں کی پٹش سے بچنے کے لیے اسے اصفہان بھیج دیا۔

مسعود فرامین اور خطبوں میں امیر محمد کا نام اپنے نام سے پہلے دیکھتا رہا اور کڑھتا رہا۔

"کوار..... خط سے زیادہ بگڑی اور مضبوط ہوتی ہے۔"

☆☆☆

سلطان محمود غزنوی کا انتقال ہوا تو امیر محمد گورگان میں تھا اور مسعود اصفہان میں۔ دونوں بیٹوں میں سے کوئی بھی اس کے قریب نہیں تھا۔ دونوں کو ایک ساتھ بلانے میں خون ریزی کا خطرہ تھا۔ محمود زیر زمین تھا اور تخت خالی پڑا تھا۔

دربار یوں میں تخت نشینی کے مسئلے پر اختلافات بڑھتے جا رہے تھے۔ معرکہ آرائیوں کے اس دور میں مسعود سے بہتر سلطان کا جانشین اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا لیکن سلطان کی وصیت امیر محمد کے حق میں تھی۔

سلطان کے داماد امیر علی بن ارسلان نے خسر کا انتقال ہونے ہی کا صدمہ کو گورگان کی طرف دوڑا دیا تھا۔

امیر محمد جو بنی غزنی پہنچا، اسے تخت پر بٹھا دیا گیا۔ مسعود نے جب باپ کے انتقال اور بھائی کے تخت نشین ہونے کی خبر سنی تو عراق و دھم میں اپنے قابل اور تجربہ کار نائب اور عامل مقرر کر دیے اور خود خراسان پہنچ گیا۔ یہاں پہنچ کر وہ سوچتا رہا کہ غزنی پر لشکر کشی کر دے یا یہیں بیٹھ کر حالات کا مشاہدہ کرتا رہے۔ اس نے بہت کچھ سوچنے کے بعد امیر محمد کے نام خط لکھا۔

"تمہیں مجھ سے خائف ہونے کی ضرورت نہیں۔ والد گرامی نے جو ملک تمہیں عطا کیے ہیں، میں ان کو اپنے قبضے میں لانا نہیں چاہتا۔ میرے لیے خود اپنے متو حرم مالک یعنی جبال، طبرستان اور عراق کافی ہیں۔ میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم اپنے ممالک میں بھی یہ ہدایت کر دو کہ خلیے میں میرا نام تمہارے نام سے پہلے پڑھا جائے۔"

امیر محمد کو اس کا جواب دانش مندی سے دینا چاہیے تھا

ہو گیا کہ مجھ پر حملہ آور ہونے کے لیے نکلا ہے اور ”کلیا باؤ“ کے مقام پر آ کر روک گیا ہے۔“

”امیر معظم! میں اور میرے آدمی آپ پر جان نچاؤ کرنے کے لیے بے چین ہیں آپ تیاری فرمائیں۔“

”میں اب بھی یہ چاہوں گا کہ ہمارے درمیان جنگ نہ ہو۔“

”اگر اس کا لشکر حملہ آور ہو گیا؟“

”تو ہم مقابلہ کریں گے۔ ویسے میرا یہ خیال ہے کہ وہ رمضان کے احرام میں جنگ سے گریز کرے گا۔ ابھی پورا مہینہ بڑا ہے تیاری ہم بھی کر لیں گے۔ اس دوران میں یہ بھی کوشش کرتا رہوں گا کہ اسے راہ راست پر لے آؤں۔“

مسعود دل سے یہ چاہتا تھا کہ بھائی سے جنگ نہ ہو اور تمام معاملات بات چیت سے طے ہو جائیں۔ وہ صرف یہ چاہتا تھا کہ فراتین و خطبات میں اس کا نام امیر محمد سے پہلے لکھا جائے۔ یہ کوئی ایسا بڑا مطالبہ نہیں تھا لیکن امیر محمد نے اسے اپنی انا کا مسئلہ بنالیا تھا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر امیر محمد کی خدمت میں ایک خط روانہ کیا۔ اس خط کا بھی وہی شر ہوا جو پہلے خط کا ہو چکا تھا۔ اس نے صاف لکھ دیا۔

”خاطر جمع رکھو۔ میں نے رمضان کے احرام میں پاؤں روک لیے ہیں۔ حمید کا جشن بیہن مناؤں گا۔ اس کے بعد تم سے ملاقات ہوگی اور جشن فتح مناؤں گا۔ اپنے لشکر کو تیار رکھو۔ جلد ملاقات ہوگی۔“

اس خط کے بعد صلیح کی امیدیں نہیں رہی تھی۔ اس نے بھی جنگ کی تیاری شروع کر دی لیکن دل میں تہیہ کر لیا کہ وہ خود حملہ نہیں کرے گا۔ اگر امیر محمد نے حملہ کیا تو وہ اپنا دفاع ضرور کرے گا۔

امیر محمد جنگ کا اعلان کر کے جو ”کلیا باؤ“ میں پڑا رہا، یہ اس کے لیے نقصان کا باعث بنا۔ اس کے امیروں اور وزیروں کو سوچنے کا موقع مل گیا۔ وہ غزنی سے یہاں تک دیکھتے آئے تھے کہ خلق خدا کے دل مسعود کے ساتھ ہیں۔ بھر وہ کیوں اپنی جانوں کو خطرے میں ڈالیں۔ اس کے علاوہ ان پر مسعود کی بہادری کا رعب بھی تھا۔ جیسے جیسے دن گزرتے جا رہے تھے، وہ سوچنے لگے تھے کہ یا تو یہ جنگ ٹل جائے یا وہ مسعود سے جا کر ٹل جائیں۔ امیر محمد کے نامور امراء امیر علی خوشاوند، امیر یوسف، میر حسین وغیرہ اس کے سخت خلاف ہو گئے۔

رمضان کا مہینا اسی کش مکش میں گزر گیا۔ عید کے روز

نماز ادا کرنے کے بعد امیر محمد نے دربار منعقد کیا۔ سر پر تاج رکھ کر وہ جزاؤں کی سر پر بیٹھا تھا کہ اس کے سر سے تاج گر گیا۔ لوگوں نے اسے قابل بد سمجھا اور اس سے ٹیٹھہ ہونے کا پکا ارادہ کر لیا۔

امراء نے آپس میں مشاورت کی اور عید کے تیسرے دن امیر مسعود کی حمایت کے نعرے لگاتے ہوئے امیر محمد کے خیمے کے گرد جمع ہو گئے۔ امیر محمد کے لشکر خاص کے کچھ لوگوں نے جو خیمے کی حفاظت کے لیے متعین تھے مزاحمت کا ارادہ کیا لیکن ابو علی خوشاوند اور امیر یوسف سبکیں نے آگے بڑھ کر انہیں سبھا یا۔

”ہم کسی غلط ارادے سے نہیں آئے ہیں۔ ہمیں امیر سے ملاقات کرنے دو۔ اگر وہ ہماری بات مان لیتے ہیں تو شیک در نہ ہم واپس چلے جائیں گے۔“

”آپ لوگ ابھی امیر مسعود کی حمایت کے نعرے لگا رہے تھے۔ اسے ہم کیا سمجھیں؟“

”یہی بات تو ہم کرنے جا رہے ہیں۔ امیر مسعود سے جنگ کرنا حماقت ہے۔ ہماری جانوں کا مفت میں نقصان ہوگا۔ اس میں تمہارا بھی فائدہ ہے بلکہ زیادہ فائدہ ہے کیونکہ تم لوگ امیر کے خاص لشکر کی ہو مگر جنگ ہوئی تو سب سے پہلے تم پر مصیبت ٹوٹے گی۔“

”آپ لوگ امیر سے کیا بات کرنا چاہتے ہیں؟“

”یہی کہ مسعود سے صلح کر لی جائے۔“

”آپ لوگ تو صلح ہو کر، اپنے لشکر کے ساتھ آئے ہیں۔ یہ صلح کا کون سا پیغام ہے؟“

”کچھ اور نہیں بس ہم امیر کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ لشکر بھی اس جنگ کے خلاف ہے۔ اگر ہمارے حکم پر وہ جنگ کا اندھن بنا بھی تو بے دلی سے لڑے گا۔“

”اس کے باوجود ہمیں امیر سے پوچھنا پڑے گا۔“

”ظاہر ہے۔ اجازت کے بغیر ہم امیر کی خدمت میں کیسے حاضر ہو سکتے ہیں۔“

امیر محمد کو اپنے امراء سے ملنے میں کیا تکلف ہو سکتا تھا البتہ امیر مسعود کی حمایت میں لگنے والے نعروں سے اسے تشویش ضرور تھی۔ پہرے داروں نے اسے یہ کہہ کر مطمئن کر دیا کہ امراء کی کبار اسی سلسلے میں آپ سے ملاقات کے متنبی ہیں۔ امیر نے اجازت دے دی۔

امراء نے عظام اسی عاجزی اور انکسار سے پیش ہوئے جو ان کا دستور قدیمی تھا۔

”غالباً آپ لوگ اسی مشورے کے لیے حاضر ہوئے

ہیں کہ عید بھی گزر گئی، اب لشکر کو بے روانہ کیا جائے۔“
 ”ہمیں مشورہ تو یہی کرنا چاہیے تاہم اب حالات بدل گئے ہیں۔“
 ”حالات بدل گئے ہیں یا آپ لوگ؟“ امیر محمد نے کڑک کر پوچھا۔
 ”امیر معظم! ہماری وفاداری پر شک نہ فرمائیں۔ ہم نے آپ کا نمک کھا یا ہے۔ ہم تو وہ بات کریں جس سے آپ کا اقبال مزید بلند ہو۔“
 ”کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟“
 ابوعلی خوشاند سناے آیا اور کہنا شروع کیا۔
 ”گستاخی معاف، بات سخت ہے لیکن کہے بغیر چارہ نہیں۔ ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ تمام حلقوں امیر مسعود کی مصلحت ہو چکی ہے۔ اس لیے یہ یقین ہے کہ آپ اس کے مقابلے کی تاب نہ لائیں گے۔“
 ”یہ تم نے سوچ بھی کیسے لیا۔ کیا ہم اتنے بزدل ہو گئے ہیں..... کیا تم اتنے کمزور ہو گئے ہو؟“
 ”امیر معظم! ہماری اپنی کوئی طاقت نہیں۔ ہم نہیں ہمارا لشکر لڑتا ہے۔ بے دلی ان پر بھی عاری ہے۔“
 ”کیا آپ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ میں مسعود کے سامنے جا کر گڑگڑاؤں یا بے غزنی سے غزنی چھوڑ کر بھاگ جاؤں۔“
 ”ہم آپ کے وقار پر آغوش نہیں آنے دیں گے۔“
 ”میں لڑنے سے پہلے اپنی شکست مان لوں اور تم کہتے ہو میرے وقار پر آغوش نہیں آئے گی۔“
 ”یہ سب آپ نہیں ہم کریں گے۔ آپ اپنی جگہ بیٹھے رہیں، ہم اس کے پاس جائیں اور آپ کی طرف سے معذرت چاہیں۔ پھر وہ آپ کو اپنے پاس بلائے۔ اس طرح ہماری اور آپ کی جانب محفوظ رہیں۔“
 اب امیر محمد کے پاس ان کی بات ماننے کے سوا چارہ نہیں تھا۔ جب ہاتھ میں تلوار ہی نہ ہو تو لڑا کیا جائے۔
 ”لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں۔“ اس نے دونوں ہاتھوں سے ہتھیار کھد دیے۔
 یہ سفارت کامیاب ہوئی تو لشکر کے دوسرے سردار بھی آگئے اور امیر محمد کو ”قلعہ دج“ میں لے جا کر بٹھا دیا۔
 امیر محمد یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ گرفتار ہو چکا ہے۔ سرداران لشکر امیر مسعود کے استقبال کے لیے روانہ ہوئے۔ وہ نیشاپور سے ہرات آیا ہوا تھا کہ یہ لوگ اس کے پاس پہنچے۔

تمام لشکر اور خزانہ امیر مسعود کے پاس پہنچ گیا۔ اس کی یہ آرزو پوری ہوئی کہ دونوں بھائیوں میں جنگ نہ ہو۔ معاملات بات چیت سے طے ہو جائیں۔
 اس نے امیر محمد کے لشکر اور اس کے سرداروں کو ساتھ لیا اور ہرات سے بچ آ گیا۔ یہاں پہنچ کر اس نے چند انتظامی معاملات درست کیے اور بچ سے غزنی کی راہ لی۔
 غزنی کی وادیوں کی طرح صحارا کی طرح تھا۔ درجوں میں دروہیہ قطاروں میں مرد شہری اپنے بادشاہ کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے کھڑے تھے۔ جنگی باجوں پر وطن کی محبت کے نغمے گائے جا رہے تھے۔ جو بھی اعلان ہوا کہ سلطان مسعود کی سواری بادبھاری دردازہ شہر میں داخل ہوئی ہے تو نعروں اور نفوں کی گونج میں اضافہ ہو گیا۔ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ بادشاہ کی طرف سے درہم و دینار فچھارہ کیے جا رہے تھے۔
 ”شکوہ خط سے زیادہ سچی اور مضبوط ہوتی ہے۔“
 اس کا کہا ہوا یہ مقولہ آج سچا ثابت ہو رہا تھا۔ اس کے باپ نے خلیفہ بغداد سے سفارش کی تھی کہ فرامین و خطبات میں اس کا نام امیر محمد کے نام کے بعد لکھا جائے لیکن آج اس نے اپنی تلوار سے اس سفارش کو چاک کر دیا تھا۔ اس کے باپ کی وصیت کے مطابق امیر محمد کو تخت سونپا گیا تھا لیکن مسعود کی تلوار نے فیصلہ کر دیا کہ تخت پر بیٹھنا کسے زیب دیتا ہے۔ امیر محمد ایک سال بھی حکومت نہ کر سکا اور اب تخت غزنی اس کے قدموں تلے تھا۔ اس کے باپ کا کہنا بھی سچ ثابت ہو رہا تھا۔ محمود نے کہا تھا، مجھے اس کا یقین ہے کہ میرے بعد سلطنت مسعودی کے قبضے میں آئے گی۔
 وہی بارگاہ تھی جہاں کبھی محمود بیٹھا کرتا تھا۔ وہی امراء تھے، وہی غلام۔ اس نے پہلا دربار منعقد کیا تھا۔ وہ اس بیش قیمت تخت پر بیٹھا تھا جس پر ملکوں ملکوں سے لائے ہوئے زمرود جڑے ہوئے تھے۔
 ”احمد حسین مہندی کو پیش کیا جائے۔“
 جس شخصیت کو طلب کیا جا رہا تھا اسے گرفتار پہلے ہی کیا جا چکا تھا۔ اب تو صرف الہی بار کے سامنے پیش کرنا تھا۔
 مسعود کی زبان سے الفاظ اٹھائے اور ایک پاکیزہ صورت شخصیت جیسی ظاہر ہوئی۔ ہمارے زنجیروں میں جکڑا اور بارشیں پیش کر لیا گیا۔ اس کی نظر ناک جرم نہیں تھا جو اس طرح پیش کیا جا رہا تھا۔ اس کی تہذیبیل مسعود تھی۔

مسعودی کے حکم پر ابوعلی خوشاند کو دربار میں لایا گیا۔
 ”آپ امیر محمد کے ملازم تھے۔ آپ نے اس سے بے وفائی کی اور اسے دھوکے سے قید کر دیا۔“
 ”میں نے تو آپ کے حق میں آواز بلند کی تھی۔“
 ”کل کسی اور کے حق میں آواز بلند کرو گے۔“
 مسعود نے اسے بھی لٹکی سزا سنائی۔ امیر یوسف کو قید کی سزا دی۔
 مسعود نے چند دنوں کے اندر اندر ان تمام لوگوں کو نیست و نابود کر دیا جنہوں نے امیر محمد کی حمایت میں آواز بلند کی تھی۔ اس کے بعد وہ قلعہ دج میں امیر محمد سے ملے گیا۔
 ”کیا میں نے تمہیں پیش کش نہیں کی تھی کہ اقتدار اور حکومت اپنے پاس رکھو، میرے ساتھ صرف اتنا حسن سلوک کرو کہ خطبات میں میرا نام اپنے نام سے پہلے لکھنے کی اجازت دے دو۔“
 ”اس کے بعد تم یہ دعویٰ کرتے کہ اقتدار میں بھی اولیت کا شرف تمہیں حاصل ہے۔“
 ”اب کیا کہتے ہو تم تو اقتدار بچانے نکلے تھے۔“
 ”مجھے شکست نہیں ہوتی ہے۔ میرے ساتھ بے وفائی ہوئی ہے۔ اگر میں جنگ کرتا تو میں نہیں تم یہاں ہوتے۔“
 ”اگر میں یہاں ہوتا تو تم میرے ساتھ کیا سلوک کرتے؟“
 ”وہ آکھیں ہی نکلو اور دینا جن میں ہمیشہ میرے لیے نفرت رہی ہے۔“
 ”نفرت تو تمہاری آنکھوں میں بہت ہے۔“ مسعود نے کہا اور اس کے پاس سے اٹھ کر آیا۔ کچھ دیر بعد اس کمرے کا تالا کھلنے کی آواز آئی جس میں اسے قید رکھا گیا تھا۔ اس نے آٹھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ کوئی ملازم ہوگا جو مصافحہ تھرائی کے لیے آ گیا ہوگا۔
 اس نے نیم دا آنکھوں سے پلٹ کر دیکھا۔ یہ وہ نہیں تھے جو مصافحہ کی فرض سے روز آ یا کرتے تھے۔ ملازموں کو بدلے کیا دی رہی تھی، یہاں تو بادشاہ بدل جاتے ہیں۔
 ”مکون ہو تم لوگ..... یہاں کیا لینے آئے ہو؟“
 ”ہم آپ کو لینے آئے ہیں۔“
 ”کیوں؟“
 ”قلعے کے باہر تازہ ہوا میں..... جہاں آپ کو سب کچھ نظر آنے لگے گا۔“
 ”کیا میری رہائی کا پروانہ آ گیا؟“

شکں دد شکں

مرنے سے پہلے

ڈاکٹر ذہبی خیالات رکھتا تھا۔ جس مریض کو دوا دیتا اسے کوئی روحانی ہدایت بھی کر دیتا۔ ایک نوجوان کے لیے کھینچنے کے بعد اس نے کہا۔
 ”نوجوان! مجھے بتاؤ کسی کو جنت میں جانے کے لیے کیا کرنا چاہیے؟“
 ”مر جانا چاہیے۔“ نوجوان نے جواب دیا۔
 ڈاکٹر کچھ پریشان ہوا اور پھر بولا۔
 ”لیکن مرنے سے پہلے کیا کرنا چاہیے؟“
 ”آپ کو بلایا چاہیے۔“ نوجوان نے جواب دیا۔
 مرسلہ: وزیر محمد خان، محل ہزارہ

”جی ہاں۔“

”آخر بھائی کو بھائی کا خیال آ ہی گیا۔“ اس نے اپنے آپ سے کہا۔ ”رہائی کے پردانے میں اور کیا لکھا ہے؟ مجھے کہاں لے جایا جائے گا؟“
 ”یہ تو ہمیں نہیں معلوم۔“
 ”ہماری زنجیریں کھلی جائیں۔“

ان لوگوں نے آگے بڑھ کر اس کے بندوں میں بڑی بھاری زنجیریں کھول دیں۔ زنجیریں کھول دی گئی تھیں لیکن دوا دی اسے ادھر ادھر سے پکڑے ہوئے چل رہے تھے۔ کمرے سے نکلنے ہی اسے نیچے اترنے والی سیڑھیوں کی طرف لے جایا گیا۔

”یہ رات تو غالباً خانے کی طرف جاتا ہوگا۔ تم تو کہہ رہے تھے مجھے قلعے سے باہر لے جایا جائے گا؟“
 ”آپ اس قلعے سے واقف نہیں ہیں۔ سیڑھیاں اتر کر ایک سرنگ ہے جو سیدھی گل کی طرف جاتی ہے۔ آپ کو اسی سرنگ کے ذریعے گل میں پہنچا دیا جائے گا۔ یہ خفیہ راستہ اس لیے اختیار کیا جا رہا ہے تاکہ آپ کو دشمنوں سے محفوظ رکھا جاسکے۔“

سیڑھیاں ختم ہوئیں تو اس نے خود کو ایک گول کمرے میں پایا جہاں کوئی فرنیچر نہیں تھا، بس ایک پتھر کی میز پڑی تھی۔

وہ شاہی خاندان کا فرد تھا۔ بادشاہ وہ چکا تھا۔ ایسے کئی قلعوں اور ان کی بناوٹ سے واقف تھا۔ یہاں کے ماحول کو دیکھ کر اس کا ہاتھ ٹھکا۔ اس نے حراست کی کوشش

بھی کی لیکن کارندوں نے اسے بری طرح دیوچ لیا اور زبردستی پتھر میز پر لٹا دیا۔

وہ آٹھ گھنٹے تک گھسیں جس میں مسود کے لیے نفرت تھی۔ اپنے راستے کے تمام کانٹے ہٹانے کے بعد وہ کئی انتظام کی طرف متوجہ ہوا۔ اس کی بہادری کی دھماک ایسی بیٹھی ہوئی تھی کہ اور گرد و علاقوں کے حکمران اور سرداران بھی فوجی امداد کے لیے اس کے پاس آنے لگے۔ یہ امداد بھی توسیع سلطنت کا اچھا بھانہ بن گئی۔ اس وقت کے دستور کے مطابق جو ملک کسی کی مدد کرتا تھا وہاں اپنے نام کا سکہ جاری کرتا تھا اس کے نام کا خطبہ پڑھا جاتا تھا اور وہ ملک ہمیشہ کے لیے اس کا اطاعت گزار ہو جاتا تھا۔

☆☆☆

کچ اور کمران کے حاکم نے جب وفات پائی تو اس کے دو بیٹوں میں اقتدار کے حصول کی جنگ شروع ہو گئی۔ ایک بھائی عسکی سلطنت پر قابض ہو گیا۔ دوسرا بھائی ابو الحسا کہ عسکی کا مقابلہ کرتا اور زبردستی اسے تخت سے اتار دیتا۔ اس نے ملاقات کی اور ایک مناسب تجویز سامنے رکھی۔

”دیکھ بھائی! ہم ایک ہی باپ کے دو بیٹے ہیں۔ جتنا تمہارا حق ہے اتنا میرا بھی حق ہے۔ کیوں مذہم ایسا کریں کہ سلطنت دو حصوں میں بانٹ لیں۔ نصف تم رکھ لو، نصف میرے پاس رہے اور ہم ہمیشہ خوش رہیں۔ اگر کوئی حملہ آور ہوتا ہے تو ہم مل کر اس کا مقابلہ کریں۔“

عسکی اپنی طاقت کے گھمنڈ میں اس کی اس تجویز پر زور سے ہنسا۔

”کہا تم نے یہ نہیں سنا کہ دو فقیر ایک کبیل میں گزارہ کر سکتے ہیں لیکن دو بادشاہ ایک سلطنت میں نہیں رہ سکتے؟“

”ساتو میں نے بھی ہے لیکن کیا ہم اس مثال کو غلط ثابت نہیں کر سکتے؟“

”تمہاری اس بات پر میں ہنسنے کے سوا کیا کر سکتا ہوں۔ اقتدار کو ادھر کی نوک سے حاصل کیا جاتا ہے، باتیں بنانے سے نہیں۔ اگر تم میں طاقت ہے تو بڑے وزیر شمشیر مجھ سے یہ سلطنت چھین لو۔“

”اگر جنگ ہوئی تو ہم میں سے ایک ضرور ضائع ہو جائے گا۔ کیا تمہیں یہ اچھا لگے گا؟“

”مجھے تمہاری یہ دھمکی اچھی لگی۔ میں خود مرنے یا تمہیں مارنے کو تیار ہوں۔ اگر ہمت ہے تو اپنے لشکر کو

میرے لشکر کے مقابل لے آؤ۔“

ابو الحسا کرنے سمجھ لیا کہ اب بھائی کو سمجھانا بے کار ہے۔ وہ بظاہر خاموش ہو کر بیٹھ گیا لیکن سوچتا ضرور رہا کہ اب اسے کیا کرنا ہے۔

ایک روز عسکی سیر و شکار کے لیے نکلا تو اسے موقع مل گیا۔ اس نے چند باغیہ سواروں کو ہمراہ لیا اور خفیہ راستہ اختیار کرتے ہوئے محل سے باہر آ گیا۔ باہر نکلنے ہی سپاہیوں کے ایک گروہ نے اس کا راستہ روک لیا۔

”امیر عسکی کی ہدایت کے مطابق آپ محل سے باہر نہیں جاسکتے۔“

”میں قیدی نہیں شہزادہ ہوں۔“

”ہمیں اس سے انکار نہیں لیکن ہمیں بھی علم ملا ہے۔“

”کس نے دیا ہے تمہیں یہ علم؟“

”اس سلطنت کے حاکم امیر عسکی نے جس کے ہم ملازم ہیں۔“

”اگر میں پھر بھی جاتا ہوں؟“

”ہم آپ کو جبراً روکنے پر مجبور ہوں گے۔“

”تمہاری یہ مجال۔“ ابو الحسا کرنے کھنکھار کر بے

خیاں کر لیا۔ اسے دیکھ کر اس کے ساتھیوں نے بھی کھنکھار کر بے

خیاں کر لیا۔ اسے دیکھ کر اس کے ساتھیوں نے بھی کھنکھار کر بے

خیاں کر لیا۔ اسے دیکھ کر اس کے ساتھیوں نے بھی کھنکھار کر بے

خیاں کر لیا۔ اسے دیکھ کر اس کے ساتھیوں نے بھی کھنکھار کر بے

خیاں کر لیا۔ اسے دیکھ کر اس کے ساتھیوں نے بھی کھنکھار کر بے

خیاں کر لیا۔ اسے دیکھ کر اس کے ساتھیوں نے بھی کھنکھار کر بے

خیاں کر لیا۔ اسے دیکھ کر اس کے ساتھیوں نے بھی کھنکھار کر بے

خیاں کر لیا۔ اسے دیکھ کر اس کے ساتھیوں نے بھی کھنکھار کر بے

خیاں کر لیا۔ اسے دیکھ کر اس کے ساتھیوں نے بھی کھنکھار کر بے

خیاں کر لیا۔ اسے دیکھ کر اس کے ساتھیوں نے بھی کھنکھار کر بے

خیاں کر لیا۔ اسے دیکھ کر اس کے ساتھیوں نے بھی کھنکھار کر بے

خیاں کر لیا۔ اسے دیکھ کر اس کے ساتھیوں نے بھی کھنکھار کر بے

خیاں کر لیا۔ اسے دیکھ کر اس کے ساتھیوں نے بھی کھنکھار کر بے

خیاں کر لیا۔ اسے دیکھ کر اس کے ساتھیوں نے بھی کھنکھار کر بے

خیاں کر لیا۔ اسے دیکھ کر اس کے ساتھیوں نے بھی کھنکھار کر بے

خیاں کر لیا۔ اسے دیکھ کر اس کے ساتھیوں نے بھی کھنکھار کر بے

شکل دو

ملا پکایا اور ان کے سامنے کمران کی صورت حال رکھی۔ اس نے طویل بحث کے بعد بالآخر یہ طے ہوا کہ سال کی انتظامات قبول کر لی جائے۔ اس کا فائدہ ہمیں یہ ہوگا کہ کچ اور کمران کی طرف سے ہمیں ہر خطرے سے نجات مل جائے گی۔ دوسرے لشکروں میں ہماری سلطنت کمران تک وسیع ہو جائے گی۔

سلطان مسعود نے ان مشوروں کی روشنی میں امیر اور کمران کی سربراہی میں ایک لشکر ابو الحسا کے ساتھ روانہ کر دیا۔ لشکر کی روانگی کے وقت اس نے التوتاش کو ہدایت کی کہ اگر عسکی صلح پر آمادہ ہو اور سلطنت میں سے نصف علاقہ ابو الحسا کو دے دے تو تیار ہو تو اس سے جنگ نہ کی جائے لیکن اگر وہ جنگ پر آمادہ ہو تو اس سے جنگ کی جائے اور ملک اس کے قبضے سے نکال کر ابو الحسا کر کے حوالے کر دیا جائے۔

یہ لشکر جب کمران کی حدود میں پہنچا تو سلطان کی ہدایت کے مطابق التوتاش نے امیر عسکی سے..... بات چیت کے لیے ملاقات کی۔ امیر عسکی نے استقبال تو شاندار کیا لیکن جب یہ سوال آیا کہ ابو الحسا کر کے صلح کر لی جائے اور اس کے نتیجے میں سلطنت کا نصف علاقہ اسے دے دیا جائے تو اس نے پوری بات ہی سننے سے انکار کر دیا۔ اسے اپنی طاقت پر اتنا گھمنڈ تھا کہ اس نے صلح پر جنگ کو ترجیح دی۔ نہایت بے ہودگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس نے التوتاش کی موجودگی میں اپنی فوج کے افسر اعلیٰ کو طلب کیا اور اسے لشکر کو تیار رکھنے کی ہدایت کی۔

التوتاش مایوس ہو کر اٹھ آیا۔ اس نے لشکر میں آتے ہی اپنی فوج کو مصف آراہونے کا حکم دے دیا۔ امیر عسکی بھی اپنا لشکر لے کر نکلا۔ لڑائی کی ابتدا ہی میں یہ ظاہر ہونے لگا تھا کہ مسعود کا لشکر بھاری پڑنے لگا ہے۔ عسکی کو اب بھی عقل آ جاتی چاہے تھی لیکن اس نے خود کو بھی جنگ کی آگ میں جھونک دیا۔ وہ گھوڑے سے کود گیا اور صفوں کے درمیان ٹھس گیا۔ اس کی بہادری دیکھ کر مسعودی لشکر حیران تھا۔ ایک جنگی کھلی جو چاروں طرف کوند رہی تھی۔ اس کی کھوار کے سامنے جڑ یا مارا گیا لیکن اس کی بہادری بھی کسی کام نہ آئی۔ اس کا لشکر پیٹھ دکھا گیا۔ وہ کسی صورت میدان چھوڑنے کو تیار نہیں تھا۔ بالآخر مارا گیا۔ اس کے مرتے ہی اس کے رہے بے پائی بھی بھاگ کھڑے ہوئے۔

ابو الحسا نے مسعودی امداد کے مل بوتے پر ملک پر قبضہ کر لیا اور حسب وعدہ اپنے ملک میں امیر مسعود کے نام

کا خط لکھا اور اس کا پتہ لکھا۔ اس نے اس خط کو اس کے نام کا خطبہ غزنی۔ بلوچان کی سرزمین تک پڑھا جا رہا تھا۔

سلطان اپنے لیے بعد یہ اس کی پہلی فتح تھی۔ اس کا لشکر ادا کرنے کے لیے وہ ”عروس فلک مسجد“ گیا تاکہ لشکر ادا کرنے کے نوافل ادا کر سکے۔ یہ مسجد سلطان محمود نے تعمیر کرائی تھی۔ وہ جب ہندوستان کے کئی راجاؤں کو شکست دے کر، مال غنیمت بنور کر غزنی واپس آیا تھا تو نعمت خداوندی کے شکر یہ کہ طور پر یہ جامع مسجد تعمیر کرائی تھی اور اب اس کا بیٹا چٹل لشکر ادا کرنے آیا تھا اور مسجد کے دروازے پر کھڑا اس بڑے پتھر کو دیکھ رہا تھا جو اس کے باپ کے حکم سے یہاں ڈالا گیا تھا۔ یہ کوئی معمولی پتھر نہیں تھا۔ جب سلطان محمود نے سومات کا مشہور مندر رنج کیا تھا اور بت خانے میں اس کی نظر سومات کے بت پر پڑی تھی تو اس کی غیرت اسلامی نے جوش مارا تھا۔ اس نے گرز سے جو اس کے ہاتھ میں تھا، ایک کاری ضرب لگائی اور اس بت کا منہ توڑ دیا اور پھر حکم دیا کہ اس بت میں سے پتھر کے دو ٹکڑے کئے جائیں اور غزنی بھیج دیے جائیں۔ اس کے حکم کی تعمیل کی گئی۔ یہ دو پتھر غزنی بھیجے گئے۔ انہی میں سے یہ ایک پتھر تھا جو جامع مسجد کے دروازے پر پڑا تھا۔ مسعود اس سے پہلے بھی اس پتھر کو دیکھ چکا تھا لیکن اس وقت اس کی کیفیت ہی دوسری تھی۔ ان راجاؤں کا خیال آ رہا تھا جنہیں اس نے بھی نہیں دیکھا تھا۔ یہ پتھر اس کے لیے نشان عبرت تھا۔ اس نے دل میں تہیہ کیا کہ وہ ہندوستان کو فتح کرنے کے لیے ایک دن ضرور روانہ ہوگا، اس کا باپ غزنی واپس آ گیا تھا لیکن وہ وہاں اپنی حکومت قائم کرے گا۔ اس نے حقارت سے اس پتھر پر پاؤں رکھا اور مسجد میں داخل ہو گیا۔

بادشاہ کی آمد کی خبر سن کر پورا شہر اٹھ آیا تھا۔ اسے سخت مخالفتی پہرے میں اعلیٰ صف تک پہنچایا گیا۔ اس کے وائیں بائیں اس کے دونوں وزیر کھڑے تھے۔ اس نے ادھر ادھر نظر دوڑائی تو اپنے وزیر کے برابر ایک کبیل پوش کو کھڑا دیکھا۔ گریوں کے دن تھے لیکن وہ شخص سرے پاؤں تک ایک موٹا کبیل اوڑھے ہوئے تھا۔ اس کے منہ کا کچھ حصہ بھی اس کبیل میں چھپا ہوا تھا۔ مسعود نے اس کی طرف دیکھا اور چاہتا تھا کہ اسے وہاں سے ہٹا دے۔ نہ جانے کیوں وہ اسے مشکوک سا لگا تھا۔ اسی وقت امام نے نیت

باندھی۔ مسود کو بھی نیت باندھنی پڑی۔ جب امام نے سلام پھیرا تو مسود کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہ شخص صف میں موجود نہیں تھا۔ اس کی جگہ کسی اور شخص نے لے لی تھی۔ مسود کو ایک اور دھچکا لگا۔ وہ مکمل پوش نیت باندھنے تک موجود تھا پھر نماز کے دوران کہاں غائب ہو گیا؟

امام صاحب نماز کے بعد مسود کے پاس آ کر بیٹھ گئے۔ مسود بھی شکرانے کے نفل ادا کر چکا تھا۔ اب مسجد خالی ہونے کا انتظار تھا تا کہ مسود یہ آسانی باہر نکل سکے۔ مسود کی نظر پھر اس مکمل پوش پر پڑی۔ وہ ابھی تک مسجد میں موجود تھا۔ مسود نے امام کی توجہ اس طرف دلائی۔ ”اس شخص کو یہاں بلائیے۔“ امام نے اس طرف دیکھا جس طرف مسود نے اشارہ کیا تھا اور اشارے سے اس شخص کو بلا لیا۔ وہ شخص مسود کے قریب آیا تو کوئی اور تھا۔ اس کے بدن پر مکمل پوش تھا۔ مسود نے پھر اس طرف دیکھا۔ مکمل پوش اپنی جگہ موجود نہیں تھا۔

”تم ابھی مکمل اوڑھے بیٹھے تھے۔ وہ مکمل کہاں چھپا دیا؟“

”سلطان محترم! گرمیوں کے دن ہیں، میں مکمل کیوں اڑھوں گا؟ آپ نے کسی اور کو دیکھا ہوگا۔“

”تم کیا کام کرتے ہو؟“

”میں تاجر ہوں مگر بہت معمولی۔ میری تجارت میں مسلسل گھٹا ہوا ہے۔ اب تو نوبت قانون تک آگئی ہے۔“ اس شخص نے بادشاہ کو سامنے دیکھ کر اپنی حالت بیان کی تاکہ بادشاہ اسے انعام سے نوازے۔

مسود محتاجوں اور غریبوں کا بہت خیال رکھتا تھا اور ہمیشہ انہیں صدقہ اور خیرات دیا کرتا تھا۔ ایک دفعہ واقعہ ہے کہ رمضان کے مہینے میں اس نے صرف ایک دن میں ایک لاکھ سے زیادہ روپے خیرات کیے۔

اس شخص کا حال سن کر مسود نے اشارہ کیا اور اس کے آدی نے اشرافیوں کی ایک قہیلی اس شخص کے حوالے کر دی۔ وہ دو عا میں دیتا ہوا اس کے پاس سے اٹھ گیا۔

مسود ایک مرتبہ پھر حیرانی کے سمندر میں غوطے کھانے لگا تھا کہ اس مکمل پوش کا کیا اجراء ہے لیکن اس نے اس حیرانی کا کسی سے ذکر نہیں کیا۔ کچھ دیر بعد وہ مسجد سے باہر آیا۔ باہر ایک جہوم اسے دیکھنے کے لیے جمع تھا۔ اس نے ایک نظر جہوم پر ڈالی، وہی مکمل پوش اسے پھر نظر آیا لیکن جیسے ہی اس کی نظر اس مکمل پوش پر پڑی، وہ پراسرار شخص جہوم میں کہیں غائب ہو گیا۔ مسود کو پھر تعجب ہوا لیکن اس

مرتبہ اسے یقین ہو گیا کہ اس آکھ بھولی میں کوئی راز ضرور پوشیدہ ہے۔

اس کے آدمیوں نے راستہ بنایا اور وہ سواری ہو گیا۔ اسے محل کی طرف جانا تھا لیکن کوئی بات ایسی دل میں آئی کہ اس نے ارادہ بدل دیا۔ اب وہ اس باغ کی طرف رواں دواں تھا جو سلطان محمود نے اپنے باپ بھگپن کے لیے آراستہ کیا تھا اور اس باغ میں ایک شاندار عمارت تعمیر کرائی تھی۔ اس کا ارادہ تبدیل ہوتے ہی اطلاع کر دی گئی۔ فوجی دستے نے اس باغ کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ کینزیریں اور غلام بیچ گئے۔ خیانت کے اہتمام ہونے لگے۔ مسود کی سواری پہنچنے ہی سپاہیوں کی بھاگ دوڑ دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ ایک ایک درخت کی تلاشی لی جارہی تھی۔ مسود اس عمارت کے اس کمرے میں پہنچا جو اس کے لیے مخصوص تھا۔ غلام ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔ کینزیریں حکم کی خاطر بھیں کے باہر شور کی آواز سنائی دی۔ پھر ایک فوجی بارگاہ میں حاضر ہوا۔

”سلطان ذی جاہ! سخت پہرے کے باوجود ایک شخص اندر گھس آیا ہے اور خند کر رہا ہے کہ اپنے بادشاہ سے ملو۔“

”اسے آنے دو۔ ہم خود اس سے پوچھیں گے کہ اس نے اندر آنے کی جرأت کیسے کی۔“

جب سپاہی اسے لے کر مسود کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور مسود کی نظر اس پر پڑی تو وہ گھبرا کر اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ اب حیران ہونے کی باری غلاموں کی تھی۔ بادشاہ اور اس معمولی آدمی کے استقبال کے لیے کھڑا ہو جائے۔ انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ اس کا کھڑا ہونا استقبال نہیں بلکہ سخت گھبراہٹ میں وہ یہ حرکت کر بیٹھا ہے۔ اس کے سامنے وہی مکمل پوش کھڑا تھا جو اسے مسجد میں نظر آیا تھا۔

”تم یہاں کیسے آئے اور کیا کہنا چاہتے ہو؟“ مسود نے دوبارہ اپنی جگہ بیٹھے ہوئے کہا۔

”پہلے ان ناخروموں کو اپنے پاس سے ہٹاؤ۔“ اس شخص نے کینزیروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ مسود کا وزیر بھی وہیں تشریف فرما تھا۔ اس نے اس شخص کو ڈانٹا۔

”بادشاہوں سے کلام کرتے ہوئے پاپاں اوبھ کرنا۔“

”میں بادشاہ سے نہیں، اپنے داماد سے مخاطب ہوں جسے برات لے کر ہواں پہنچا تھا اور یہاں تک پہنچے۔“

یہ عجیب و غریب جواب سن کر مسود کو یقین ہو گیا کہ یہ شخص یا تو پاگل ہے یا مجنوں ہے جو استعاروں کی زبان

شکل دو شکل

میں بات کر رہا ہے یا پھر بہرہ دیا ہے۔ اس نے کینزیروں کو باز جانے کا حکم دے دیا۔

”میں نے ناخروموں کو ہٹا دیا۔ اب کو کیا کہنا ہے؟“

”ہواں کے راستے میں کانٹے بچھے ہوئے ہیں۔ تم اپنے برائی سمجھو تاکہ وہ کانٹے ہٹا کر پھول بچھا سکیں۔“

”اے شخص! تو یا تو خود پاگل ہے یا مجھے پاگل بنانے کی کوشش کر رہا ہے۔ سچ بتاؤ کہ کون؟“

”حقوق خدا شکل میں ہے اور تو کہہ رہا ہے میں کون ہوں۔“

”حقوق کو میری ذات سے کیا تکلیف ہے؟“

”ہواں میں ایک شخص علاء الدولہ ہے جس نے تجھ سے زیادہ لشکر جمع کر لیا ہے۔ ادھر سے ادھر لوٹ مار کرتا پھرتا ہے۔ غلطی خدا اس سے سخت تک ہے۔ تجھے وہاں ہونا چاہیے تھا اور تو یہاں عیش و عشرت میں مشغول ہے۔“

”میں پھر بھی یہ پوچھوں گا کہ آپ ہیں کون؟“ مسود غالباً خوف زدہ ہو گیا تھا کہ ”تو“ سے ”آپ“ پراگم تھا۔

”ابھی تھوڑی دیر میں بادل چھا جائیں گے، بجلی چمکے گی، بارش ہوگی پھر تو خود سمجھ جائے گا کہ میں کون ہوں۔“

اس نے کہا اور آدھیں بند کر کے بیٹھ گیا۔ مسود کو سخت الجھن ہو رہی تھی لیکن وہ اتنا خوف زدہ ہو گیا تھا کہ اسے دھکارتے ہوئے ڈر رہا تھا۔ اچانک بادلوں کی گرج سنائی دی۔ بادل اتنے گہرے تھے کہ دن میں رات نظر آنے لگی اور پھر ایسی طوفانی بارش ہوئی کہ ہر طرف جل جل ہو گیا۔ یہ بارش کا موسم نہیں تھا۔

”حضرت! میں آپ سے گستاخی پر حضرت خواہ ہوں۔ میں اب سمجھ گیا آپ صاحب کرامت بزرگ ہیں۔“

”اب میرے نہیں، تیرے کرامت دکھانے کے دن ہیں۔ حیرتی یہاں نہیں، ہواں میں ضرورت ہے۔ علاء الدولہ کی موت تیرے ہاتھوں لکھی ہے۔ اس کی تقدیر کا فیصلہ جلد کر اور حقوق خدا کو کجانت دلا۔“

”حضرت! میں ضرور آپ کی نصیحت پر عمل کروں گا لیکن میں پھر بھی آپ کے بارے میں جانتا چاہوں گا۔ میں نے آپ کو آج سے پہلے غزنی میں نہیں دیکھا۔“

”میں خرقان سے چل کر یہاں تک پہنچا ہوں۔“

تیرے والد سلطان محمود نے شیخ ابوالحسن خرقانی سے ملاقات کی تھی۔ انہی کے حوالہ کردہ خرقے کی بدولت اس نے روایات کا مندرجہ کیا تھا۔ اسی سورج کا معمولی سا ذرہ اس نے شیخ ابوالحسن، سلطان محمود سے بہت خوش تھے۔ اس نے کچھ حصہ میری بدولت تم تک پہنچا ہے۔ تجھے چاہیے

”ایک شخص علاء الدولہ نے ایک بہت بڑا لشکر جمع کر لیا ہے۔ اس لشکر کے ساتھ اس نے چاروں طرف تباہی اور بربادی کا مکمل کھیلنا شروع کر دیا ہے اور ان علاقوں میں جو ہمارے عامل ہیں ان پر حملہ آور ہو کر کسی کو کھل کر رہا ہے اور بہت سوں کو علاقے سے نکلنے پر مجبور کر رہا ہے۔ اس طرح وہ اپنے لیے علیحدہ سلطنت قائم کرنے کے درپے ہے۔ لوگ اس کی لوٹ مار سے بہت تک ہیں اور آپ کے نام کی دہائی دے رہے ہیں۔“

مسود کے لیے بس اتنی معلومات کافی تھیں۔ اب اس فقیر کے الفاظ کا مطلب اچھی طرح اس کی سمجھ میں آ گیا تھا۔ برائی سمجھنے کا مطلب لشکر بھیجنا تھا۔

اس نے اپنے سپہ سالار کو نشان و حکم دیا کہ ایک لشکر

شیکسپیر کے احوال

- 1- محبت الہی شیرینی ہے بس کو پھل لینے ۔۔۔
- 2- شخصیت کی ایک جھلک آواز میں بھی ہے۔
- 3- جب تک قدم اٹھتا رہے گا، فاصلے طے ہوتے رہیں گے۔
- 4- مرد محبت میں موسم بہار کی طرح ہوتا ہے اور شادی کے بعد موسم سرم کی طرح ہوتا ہے۔
- 5- لاشعوری خوف شعوری خوف سے زیادہ ہے۔
- 6- ہر وعدہ ایک فرض ہے اور عزت ایک چیخ۔
- 7- لہجے کا اثر آواز سے بھی زیادہ ہوتا ہے۔
- 8- اپنی محبت اپنے بچوں کو دودھ جتنی دے سکو مگر اپنا تخیل نہیں۔ ہر بچہ اپنا تخیل اپنے ساتھ لاتا ہے۔
- 9- دل اداس ہو تو گوشتی شہنائیاں بھی انسان کو متوجہ نہیں کر سکتیں۔

وقت

وقت کی پابندی میں کامیابی کا راز پنہاں ہے کیونکہ وقت بھی نہیں رکتا، نہ ہی لوٹ کر آتا ہے لہذا وقت کا صحیح استعمال ہی عقلمندانہ فیصلہ ہے۔ اگر ہم غور کریں تو معلوم ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی ہر چیز اپنا کام مقررہ وقت پر انجام دے رہی ہے۔ مثلاً سورج، چاند، ستارے، پھول، پودے اور پرندے وغیرہ جبکہ انسان اپنی زندگی میں تبدیلی لے آتا ہے۔ رات کو دیر تک جاگتا اور دن کو دیر تک سوٹا یا ہے وقت کھانا تب ہمارا معمول بن گیا ہے تو ہمیں بوڑھے تو کیا بچوں اور جوانوں کو لاقح ہونے والی بیاریوں یا معاشرے میں مبروہ کی کی ہر جان نہیں ہونا چاہیے۔ کوشش کیجیے کہ وقت کو تمام کرپٹیں اور زندگی کے ہر قدم پر اپنے اور دوسروں کے وقت کی قدر کریں۔

مرسلہ: کل ناز رہیں، گلستان جو ہر، بکراہی

اس کی جاگیریں ضبط کر لیں اور ان علاقوں کو اپنی ملکیت میں شامل کر لیا۔

ہمدان میں ابھی جنگ جاری تھی کہ سلطان مسعود کو وہی صفایان اور ”رے“ کی طرف روانہ ہوا۔ وہ اہل بیت میں تھا، مسلمانوں کا نجات دہندہ سمجھ کر ”سرخس“ اور با آواز دے کے باشندے اس کے پاس آئے اور ترکمانوں کے ظلم و ستم کی شکایت پیش کی۔ مسعود یہ سن کر اس وقت سے سن رہا تھا جب وہ تخت پر بھی نہیں بیٹھا تھا۔ اس وقت وہ مجبور تھا لیکن اب با اختیار تھا لہذا اس کا مضمر ملامت کر رہا تھا کہ وہ اس فتنے کو کیوں نہ جڑ سے اکھاڑ پھینکے۔

ترکمان دراصل وسط ایشیا میں رہنے والے ترک تھے۔ رفتہ رفتہ ترک اور ترکمان دو مختلف گروہوں کے لیے استعمال ہونے لگے۔ ترکمان بھی ابھی اپنی علیحدہ حکومت قائم نہ رکھ سکے۔ مختلف حکومتوں مثلاً ایران، خوارزم، بخارا، افغانستان کے علاقوں میں سکونت اختیار کر لی لیکن جہاں بھی رہے، اپنی آزادی کو برقرار رکھا۔ دوسرے علاقوں میں لوٹ مار ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ بے حد بہادر تھے۔ بسا اوقات ان کے خلاف عسکری ہمیں روانہ کی گئیں جنہیں ترکمانوں نے شکست دی۔

ترکمانوں کی بڑی مٹی ہوئی فتنہ انگیز یوں کو دیکھ کر مسعود نے اپنے ایک سالار عبدالرہمن بن عبدالعزیز کو ایک زبردست لشکر کے ساتھ ترکمانوں کی سرزنش کے لیے روانہ کیا اور خود غزنی چلا آیا۔

عبدالرہمن نے بارہا ترکمانوں کے ساتھ جنگیں لیں لیکن ان کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ بس اتنا ہوا کہ عبدالرہمن انہیں پیچھے دھکیلا رہا اور سلطان کے علاقوں میں داخل نہ ہونے دیا۔

غزنی آنے کے بعد وہ ایک روز محل کی چھت پر بیٹھا تھا۔ پھولوں بھی تھا کیونکہ اس کا سالار عبدالرہمن، ترکمانوں کے مقابلے میں کوئی خاص کامیابی حاصل نہیں کر سکا تھا۔

ان میں جو کامیابی اسے حاصل ہوئی تھی، اس کا خیال آ رہا تھا۔ یہ خیال آتے ہی اسے وہ مکمل پوش بھی یاد آیا جس کے ساتھ وہ ہمدان کی طرف گیا تھا۔ کاش! وہ فقیر پھر مل جاتا۔ شاید اس کی دعا سے کوئی کام بن جائے۔ ابھی وہ یہ سوچ رہا تھا کہ آسمان پر گہرے بادل چھا گئے اور بوند بوند بارش شروع ہوئی مگر یہ بوند باندی ایسی نہیں تھی جو اسے دیکھ لیتی۔ وہ اس ہلکی پھار سے لطف اندوز ہوتا رہا۔

نے اس کا انجام اسے دکھا دیا۔ اس کا لشکر پیچھے ہٹنے لگا۔ اس کے جوش دلانے پر بھی لڑنے کو تیار نہیں تھا۔ اس نے گردن کھما کر دو رنک پہلے ہوئے کو ہستی سلسلے کی طرف دیکھا اور اپنے لشکر کو پیچھے چھوڑ کر اپنا گھوڑا پہاڑوں کی طرف دوڑا دیا۔ لشکر پہلے ہی پسپا ہو گیا تھا۔ اس نے بھی بھاگنے ہی میں عافیت جانی۔

اسے لشکر کی جنگ میں نہیں مارے گئے جیتے تعاقب کے دوران قتل ہو گئے۔ تقریباً ایک فرسنگ کے فاصلے پر علاؤ الدولہ کو ایک درہ نظر آیا جس میں داخل ہو کر وہ پہاڑوں میں غائب ہو گیا تھا لیکن اس کی بدقسمتی کہ وہاں التوتاش نے ایک چھوٹا سا دستہ پہلے ہی منہمک کر دیا تھا۔ علاؤ الدولہ نے چاہا کہ ہتھیار چھینک دے۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو اس کا شکست خوردہ لشکر بھاگ چلا آ رہا تھا۔ اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ اس کے لشکر کا تعاقب کیا جا رہا ہے۔ اپنے لشکر پر نظر پڑتے ہی اس کی دھارس بندھ گئی۔ اس نے ایک مرتبہ پھر جنگ کا ارادہ کر لیا۔ اس درے میں جو لشکر چھپا ہوا تھا اس کی تعداد بہت کم تھی۔ علاؤ الدولہ کو یقین تھا کہ وہ انہیں بھگادے گا اور پھر جس طرف چاہے گا نکل جائے گا۔ اپنے لشکر کے پیچھے ہی اس نے ہلا بول دیا۔ دونوں طرف سے گھوڑا ریں چڑھ گئیں۔ علاؤ الدولہ پھر بھاری پڑنے لگا۔ اتنی دیر میں شاہی لشکر پہنچ گیا۔ اب علاؤ الدولہ اور اس کا لشکر دونوں طرف سے گھر چکا تھا۔ اب فرار کا کوئی موقع نہیں تھا۔ اس نے یہی بہتر جانا کہ لڑتے لڑتے جان دے دی جائے۔ ایسا ہی ہوا۔ کئی گھوڑا ریں ایک ساتھ اٹھیں۔ اپنی پیاس بجھا کر واپس آئیں تو اس کا سر اس کے تن سے جدا ہو چکا تھا۔ اس کے پیچھے لشکر کا بھی یہی حال ہوا۔ جنہیں موقع ملا، وہ فرار ہو گئے۔ ختم ہونے کو بھی اور پہاڑ کے دامن میں لاشیں بکھری پڑی تھیں۔

التوتاش نے علاؤ الدولہ کا سر مسعود کے پاس غزنی بھیج دیا۔ اس کے بعد اس نے حکم دیا کہ کوئی نرم جگہ دیکھ کر گڑھا کھود جائے اور اسے ان لاشوں سے باٹ دیا جائے۔ اس نے ان لاشوں کی اجتماعی نماز جنازہ کا بھی حکم دیا۔

”مرنے والے تمام لوگ چونکہ مسلمان تھے اس لیے ہم ان کی بے حرمتی گوارا نہیں کر سکتے۔ ان کی نماز جنازہ بھی ادا کی جائے اور انہیں دفن بھی کیا جائے۔“

شاہد کی جنگ میں یہ اہتمام کسی نے نہ کیا ہو۔ التوتاش نے کچھ عرصے کے اندر اندر اس ملک کو علاؤ الدولہ کے عاملوں کے قبضے سے نکال لیا۔ محمود کے خراسانی

لے کر فوراً ہمدان پہنچے اور تمام کاٹنے ہٹا کر پھول بچھا دے۔ اسے اس لشکر کو بھیجے ہوئے نہایت خوشی ہو رہی تھی۔ وہ ایک مجذوب کی خواہش کی تکمیل کر رہا تھا۔

یہ لشکر ابھی ہمدان کے نواح میں پہنچا تھا کہ اسے معلوم ہو گیا کہ یہاں عسکری کسی کی ہے۔ علاؤ الدولہ ایک بہت بڑے لشکر کے ساتھ راء رو کے کھڑا تھا۔ التوتاش کو بھی اس کے لشکر سے کچھ فاصلے پر رکنا پڑا۔ غلاہ گروہوں نے آگے بڑھ کر جائزہ لیا۔ لوٹے تو یہ خبر لائے کہ علاؤ الدولہ ذرا بھی خائف نہیں۔ یہ موقع بھی دینا نہیں چاہتا کہ مسعودی لشکر ٹھکن اتار لے۔ وہ اپنی فوج کو تربیت دے رہا ہے اور کسی بھی وقت حملہ آور ہو سکتا ہے۔

التوتاش نے سرداروں کو مخاطب کیا۔

”ہمیں جنگ کے آغاز ہی سے یہ عزم کرنا ہے کہ آج کا یہ معرکہ ہمیں ہر صورت جیتنا ہے اور علاؤ الدولہ کو شکست دے کر یہاں سے بھاگنا ہے۔ اس کا جو لشکر ہے، وہ سامنے آ کر لڑنے کا عادی نہیں۔ وہ ہمارا مقابلہ زیادہ دیر نہیں کر سکے گا۔ وہ بھاگ کر ادھر ادھر پوش ہو جائے گا اور وقفہ وقفہ سے جنگ کرتا رہے گا۔ اس لیے ہمیں ایسی حکمت عملی تیار کرنی ہے کہ علاؤ الدولہ کو بھاگنے کا موقع نہ مل سکے۔ میرے آدھی وہ مقامات دیکھ کر آئے ہیں جہاں سے وہ فرار ہو سکتا ہے لہذا اپنے لشکروں کو چند حصوں میں تقسیم کر لو۔ ایک حصہ جنگ کرے اور باقی حصے ان مقامات میں پیچھے رہیں۔ اگر علاؤ الدولہ کا لشکر بھاگ کر اس طرف کا رخ کرتا ہے تو وہ اس کا مقابلہ کریں۔ اس کے ساتھ ہی جنگ پر بھی نظر رکھیں۔ اگر ہمیں شکست ہو رہی ہے تو تازہ کمک کے طور پر ہماری مدد کو پہنچیں۔ یاد رکھو، ہمارا سامنا بہادر دشمن سے نہیں چالاک دشمن سے ہے۔ یہاں لڑائی کے روایتی اصولوں پر چلنا نہیں ہوگا، اپنے اصول وضع کرنے ہوں گے۔“

ابھی وہ یہ تقریر کر رہی رہا تھا کہ علاؤ الدولہ کے لشکر میں ملبل جنگ زور زور سے بجائے جانے لگے۔

”علاؤ الدولہ لڑائی میں پہل کرنا چاہتا ہے، لہذا ہمیں آگے بڑھنا چاہیے۔“

التوتاش نے اپنے لشکر کو آگے بڑھنے کا حکم دیا۔ باقی سرداروں کے لشکر دائرے کی شکل میں ادھر ادھر پھیل گئے تاکہ علاؤ الدولہ کے فرار کے راستے مسدود ہو جائیں۔

التوتاش آندھی طوفان کی طرح روانہ ہوا اور علاؤ الدولہ کے لشکر سے ٹکرا گیا۔ علاؤ الدولہ کا لشکر اب بھی پامردی سے مقابلہ کر رہا تھا لیکن کچھ ہی دیر میں اس کی خند

یہی سمجھ رہا تھا کہ وہ اس کے مقابلے کے لیے تیار تھا۔ لیکن اس نے اپنے ہاتھوں میں ہتھیار نہیں لیے۔ اس نے دوسرا ہاتھ اٹھایا اور اس کے ہاتھ پر پڑا ہوا تھا۔ اس نے سر پر بندھا ہوا لڑائی لڑا۔ اس نے زخم فائدہ کھایا ہوا تھا جس پر خون جم گیا تھا۔

”سردار! یہ کیا ہوا؟“ انہوں نے کوئی غصہ چھپا ہوا تھا جس نے آپ کا یہ حال کیا؟ میدان جنگ میں تو آپ ٹھیک ٹھاک تھے۔“

”یہ زخم مجھے میدان جنگ میں ہی لگا تھا لیکن میں نے کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیا تھا کہ کہیں لشکر میں پریشانی نہ پھیل جائے۔“

”آخرین ہے آپ کی دلاوری اور وفاداری پر۔ آپ نے ابھی تک جراح کو کیوں نہیں بلایا؟ ٹھہریے ہم بلائے ہیں۔“ توکب بن حسین یہ کہتے ہوئے خیمے سے باہر نکل گیا۔

”اب کسی طبیب یا جراح کو بلانے کی ضرورت نہیں رہی۔ یہ زخم بہت کاری ہے۔ اب میں بچنے والا نہیں۔ چند سانس میرے بچنے میں ہیں، سوچتا ہوں تم لوگوں سے کچھ باتیں کر لوں۔ ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ اب مجھ پر ہمدردانہ کرنا۔ میں کسی بھی وقت تم لوگوں سے بچ سکتا ہوں۔ اب تم لوگ آزاد ہو۔ اپنے حالات دیکھ کر اس لڑائی کے بارے میں جو چاہو کرو۔“

آئی دیر میں طبیب اور جراح خیمے میں داخل ہوئے۔ انہوں نے زخم کا اچھی طرح سے معائنہ کیا۔ اس وقت تک التوتاش پر بے ہوش طاری ہو چکی تھی۔

”زخم کی حالت بہت خراب ہے۔“ طبیب نے آگاہ کیا۔ ”یہ ہوش میں رہتے تو اچھا تھا لیکن بے ہوش ہو گئے ہیں۔ اگر یہ چوبیس گھنٹے میں ہوش میں آگئے تو ٹھیک ہے ورنہ اسی بے ہوشی کی حالت میں ان کا انتقال ہو سکتا ہے۔ کاش! یہ زخمی ہوتے ہی میدان سے نکل آتے۔ اس وقت ان کا علاج ہو سکتا تھا۔ سر کی چوٹ تھی، خون بہتا چاہے تھا۔ انہوں نے زخم چھپانے کے لیے خون کو روک دیا جو زہر بن گیا۔ بہر حال، اللہ بڑا کارساز ہے۔“

طبیبوں نے بیچ خاطر کے لیے مرہم پٹی کر دی لیکن جاتے جاتے بھی مایوسی کا اظہار کر دیا۔

”التوتاش کی حالت نازک ہے اور صبح بھر دم سے مقابلہ کرنا ہے لہذا ہم ابھی طے کر لیں کہ کیا کرنا ہے۔“ حسین میکل نے سوال اٹھایا۔

چالاک سے اپنی فوج کا ایک دستہ اس پہاڑ کے پیچھے چھپا دیا اور مقابلے کے لیے تیار کرنے لگا۔

مسعود کی فوج نے بھی اسی میدان میں آکر پڑاؤ لیا۔ دیکھا تو علی بن حسین مضطرب پاندے سے تیار کھڑا تھا۔ التوتاش نے بھی اپنے سرداروں کو حکم دے دیا کہ وہ سینہ اور پیٹھ کو ترتیب دے کر تیار رہیں۔ وہ خود اپنے خاص لشکر کو لے کر ”قاب“ میں آگیا۔

دونوں فوجیں قدم قدم کر کے آگے بڑھنے لگیں اور ہر سامنے آتے ہی کھڑکیں چنگاریاں اٹھنے لگیں۔ کبھی ایک طرف کی صفیں بے ترتیب ہو جاتیں، کبھی دوسری جانب کی یہ صفیں گھٹنوں جاری رہی اور اسے شدہ منصوبے کے تحت کبھی گاہ میں پیٹھے ہوئے علی بن حسین کے دستے نے مسعودی لشکر کی پشت سے حملہ کر دیا۔ اس کا چابک افغانہ نے مسعودی لشکر کو بھلا کر رکھ دیا۔ انہوں نے پلٹ کر اس حملے کو روکنے کی کوشش کی تو سامنے سے دباؤ بڑھنے لگا۔ اب نہ فرار کا راستہ قانہ مقابلے کی سکت۔

اس کا چابک حملے میں غزنی فوج کے بے شمار سپاہی مارے گئے۔ التوتاش بھی زخمی ہوا۔ اتفاق سے یہ زخم جسم کے ایک ایسے حصے پر لگا جہاں پہلے ہی زخم لگا تھا۔ یہ زخم اس وقت آیا تھا جب التوتاش سلطان محمود غزنوی کے ساتھ ہندوستان میں معرکہ آرائی کر رہا تھا۔ وہاں ایک پتھر اس کے سر پر آگیا تھا۔ اب یہ دوسرا زخم بھی اسی جگہ لگا تھا۔

وہ زخم کھاتے ہی کچھ دیر کے لیے لڑ کھڑا ہوا اور پھر ایک کپڑے کے زخم پر اچھی طرح باندھ لیا۔ کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیا کہ وہ زخمی ہوا ہے۔ اگر یہ خبر پھیل جاتی تو لشکر میں بددلی پھیل جاتی۔ وہ اسی زخمی حالت میں میدان میں ڈٹا رہا بلکہ اب اور جانشانی سے لڑ رہا تھا۔ وہ اس جنگ کو جلد سے جلد انجام تک پہنچانا چاہتا تھا۔ اس کے لشکر میں یوں بھی اس کی بہادری کو دیکھ کر گناہ جوش اور دلولہ پھیل گیا۔ غزنی لشکر نے بے شمار افراد کو فتح کیا۔ باقی لوگوں کو میدان جنگ سے ہٹا دیا۔

التوتاش نے اسی زخمی حالت میں دن کی روشنی گزار دی تھی۔ میدان میں اندھیرے نے قدم رکھا تو علی بن حسین نے اپنے لشکر کو واپس بلا لیا۔ غزنی لشکر بھی اپنے خیموں میں واپس آگیا۔

اپنے خیمے میں پہنچتے ہی التوتاش نے فوجیوں کو طلب کیا۔ کب تقدی، حسین میکل، توکب بن حسین اور دوسرے سردار اس کے خیمے میں پہنچ گئے۔ وہ

”سلطان معظم! سرقد کا حاکم علی بن حسین اپنی عسکری طاقت میں اضافے کے بعد کبیر اور محمد بن جلال ہو گیا ہے۔ اس نے ہمارے علاقوں کی طرف بھی ہوس کی نگاہ سے نہیں دیکھا تھا لیکن اب سرقد اور بخارا کو کسی میں بند کرنے کے بعد ہنگامہ آرائی پر اتر آیا ہے۔ اگر اس کی روک تھام نہ کی گئی تو ہمارے سرحدی علاقے اس کی دستبرد سے محفوظ نہیں رہ سکیں گے۔“

مخبر خبریں دے رہے تھے اور اس کا ذہن ”کبیل ہوش“ کے دیے ہوئے کاغذ میں الجھا ہوا تھا۔ سرقد اور علی بن حسین کا نام آتے ہی عمارت کا مفہوم اس کی سمجھ میں آگیا۔ عمارت میں کجاہا رہا تھا کہ سرقد کے حاکم علی بن حسین کی چہرہ دستیوں کی روک تھام کے لیے کمر کس لو۔ اس فقیر کے اس طرف توجہ دلانے کا مطلب یہ تھا کہ سامانی اسی کی ہوگی۔ وہ اپنے خیالوں سے اس وقت چڑکا جب التوتاش کی آواز اس کے کانوں میں آئی۔

”سلطان معظم! ان حالات میں ہمارے لیے کیا حکم ہے؟“

”اگر علی بن حسین یہ خیال کرتا ہے کہ اس نے اپنی طاقت اور قوت میں بہت زیادہ اضافہ کر لیا ہے اور کوئی اس کی راہ نہیں روک سکتا تو ہم اس کے وہم کو حقائق میں تبدیل کر کے رکھ دیں گے۔ علی بن حسین کی سرکوبی کے لیے بہت بڑا لشکر یہاں سے جائے گا۔ اس لشکر کے کماندار تم (التوتاش) ہو گے۔۔۔ تو بھر تیار کرو۔ جتنی جلدی ممکن ہو علی بن حسین سے ٹکرانے کے لیے روانہ ہو جاؤ۔“

تمام سالاروں نے اتفاق کیا۔ سلطان مسعود اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ دربار پر رخصت ہو گیا۔

لشکر میں خبر پہنچادی گئی تھی۔ زور و شور سے تیاریاں جاری تھیں۔ تمام ہماری سامان اور سامان رسد لشکر کی روانگی سے قبل ہی روانہ کر دیا گیا۔

التوتاش نے دیے گئے اسوے کو عبور کر کے پہلے تو بخارا پر حملہ کر کے اسے فتح کیا اور پھر سرقد کی طرف روانہ ہوا۔

علی بن حسین کو جب غزنی لشکر کے آنے کی خبر ملی تو وہ بھی حرکت میں آیا اور سرقد سے نکل کر کھلم میدان میں آگیا۔

اس کے طلائے گردوں نے اسے پہلے ہی اطلاع دے دی تھی کہ غزنی فوج کب تک یہاں پہنچ جائے گی اور ان کی تعداد کتنی ہے۔ جس میدان میں اس نے پڑاؤ کیا تھا، اس میدان کے ایک طرف تو ایک بہت بڑی نہر بہہ رہی تھی اور دوسری طرف ایک بہت بڑا پہاڑ تھا۔ علی بن حسین نے بڑی

بھراٹھ کر پھیلے لگا۔ لاشوری طور پر اس کی نظر باہر سڑک کی طرف اٹھ گئی۔ اس نے دیکھا، وہی کبیل ہوش اس کے محل کے پیچھے رہا ہے۔ اس کا جی چاہا کہ چھچھ کر اسے محل میں آنے کو کہے لیکن یہ روکا جی ہوتی۔ ایک غلام پاس کھڑا تھا۔ اسے دوڑایا کہ پیچھے کبیل اوڑھے ایک آدمی کبیل رہا ہے اسے نہایت احترام کے ساتھ محل میں لے کر آئے۔ غلام نیچے چلا گیا۔ مسعود اب بھی اس کبیل ہوش پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ اس نے دیکھا کہ غلام پیچھے گیا اور اس کبیل ہوش سے کچھ بات کرنے لگا۔ اس شخص نے کبیل کے اندر ہاتھ ڈالا اور ایک کاغذ نکال کے اس کے ہاتھوں میں دے دیا، غلام محل کی چھت پر آیا۔

”میں نے تم سے کہا تھا کہ اس شخص کو لے کر اندر آؤ۔“ مسعود نے براہی سے کہا۔

”سلطان محترم! میں نے آپ کا پیغام اس کے گوش گزار کر دیا تھا۔ اپنی طرف سے بھی بہت ضد کی تھی لیکن اس نے یہ کاغذ مجھے دے دیا اور خود ایک طرف کوچل دیا۔“ مسعود نے وہ کاغذ کھول کر پڑھا۔ اس پر لکھا تھا۔

”علی بن حسین + سرقد“

یہ دونوں نام اس کے لیے اجنبی نہیں تھے لیکن اس بہم تحریر کا مطلب واضح نہیں تھا۔ اس کے دربار میں عالموں اور دانشوروں کی کمی نہیں تھی۔ اس نے یہ عمارت (اگر اسے عمارت کہا جائے) سب کو دکھائی لیکن کوئی بھی اس سے کھل نہ کر سکا۔

مسعود اس امید پر خاموش ہو گیا کہ شاید وہ فقیر پھر آئے اور اس سے میں اس عمارت کا مفہوم سمجھ لوں۔

دن پردن گزرتے گئے۔ یہاں میں امن قائم ہو چکا تھا۔ جو لشکر بھدان کی طرف گیا تھا، سپہ سالار التوتاش کی سربراہی میں گیا تھا اور اس کی سربراہی میں واپس ہو چکا تھا۔ اس وقت وہ مسعود کے پاس بیٹھا تھا۔ چند اور سالار بھی تھے۔ امیر مسعود کے دو بیٹے مسود اور محمد بھی موجود تھے۔ التوتاش بھدان کے واقعات و انتظامات سے آگاہ کر رہا تھا کہ بہتوں پہلے پہنچے ہوئے طلائے گرد اور غزنی مسعود کی اجازت سے دربار میں داخل ہوئے۔

”التوتاش! ہم نے انہیں علاقے کی صورت حال جاننے کے لیے روانہ کیا تھا۔ اچھا ہوا کہ لوگ اس وقت واپس آئے ہیں جب تم بھی موجود ہو۔“ مسعود نے کہا اور پھر ان لوگوں کی طرف متوجہ ہوا۔ ”اگر کوئی خاص خبر لائے ہو تو ہمارے حضور پیش کرو۔“

”کیا ہم بزدلوں کی طرح لڑائی کی طرف سے منہ موڑ کر کھڑے ہو جائیں؟“ ”بک تقدی نے کوک کر کہا۔“ ”صلح کرنا مصلحت ہے، بزدلی نہیں۔“ ”تو آپ چاہتے ہیں کہ اس موقع پر صلح کر لی جائے؟“ ”اس کے سوا چارہ نہیں ہے۔ اگر التوتاش لڑائی میں شریک نہ ہوئے تو لشکر اس دل جی سے نہیں لڑ سکے گا لہذا ہارنے سے بہتر صلح کر لی جائے۔“ ”کیا علی عین صلح کے لیے تیار ہو جائے گا؟“ ”یہ کہاں قبل از وقت ہے۔ اگر وہ نہ مانا تو مجبوری ہوگی، آریا پار۔“ ”کیا اس صلح کی اجازت سلطان سے لینا ضروری نہیں؟“ ”شاہ نہیں یا شاہ سلطان بھی یہ فیصلہ ہم پر چھوڑ دے۔“ ای لیے التوتاش نے بھی کہا تھا کہ اب لوگ اپنے حالات کو دیکھتے ہوئے لڑائی کے بارے میں جو چاہو کرو۔“ ”اگر دوسرے لوگ بھی اس صلح کے لیے تیار ہیں تو مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔“ ”بک تقدی نے کہا۔ دوسرے سرداروں نے بھی حسین میاں کی اس تجویز سے اتفاق کیا کہ اس وقت صلح کر لینا ہی مناسب ہوگا۔ جب اسی تجویز پر سب کا اتفاق ہو گیا تو ان فوجی سرداروں نے علی عین کے پاس ایک قاصد روانہ کیا اور اسے صلح کی درخواست کی۔ صلح کے لیے یہ شرط رکھی گئی تھی کہ بخارا کو غزنوی سلطنت میں شامل کیا جائے اور سرحد اور اس کے آس پاس کا علاقہ علی عین کے قبضے میں رہے۔“ ”علی عین کو اس شرط میں مقبولیت نظر آئی۔ اس نے سوچا بخارا کو غزنوی لشکر نے زور بازو سے حاصل کیا ہے لہذا وہ اس کے پاس رہتا ہی چاہیے لیکن اگر سرحد بھی ان کے پاس چلا گیا تو اس کے پاس کیا رہ جائے گا۔ اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ التوتاش زخمی ہو چکا ہے ورنہ شاید وہ اس صلح پر آمادہ نہ ہوتا۔ التوتاش کی ہیبت نے اسے صلح پر مجبور کر دیا البتہ وہ یہ سوچ ضرور رہا تھا کہ آخر ایسی کیا مجبوری ہے کہ التوتاش کی طرف سے صلح کا پیغام بھیجا گیا ہے۔“ ”علی عین صلح کر کے سرحد کی طرف روانہ ہو گیا۔ غزنوی لشکر بھی واپس روانہ ہوا۔ التوتاش اسی زخمی حالت میں سرداروں کے حصار میں تھا۔ اس کی حالت مسلسل تشویشناک تھی۔ ستر کے دوران ہی التوتاش نے دائمی اجل کو لبیک کہا۔ اس کی موت کی خبر کوراتے میں لشکریوں سے چھپائے رکھا۔“

خوارزم بچ کر التوتاش کی موت کا اعلان کر دیا مگر سلطان مسعود خراسان میں تھا کہ اسے التوتاش مرنے کی اطلاع ملی۔ اس نے التوتاش کی خدمات اعلیٰ میں اس کے بیٹے ہارون کو خوارزم کا حاکم مقرر کر دیا۔ اس کے باپ سلطان محمود نے ہندوستان پر سترہویں کے تھے۔ کوئی راجا ایسا نہیں تھا جو اس کا زخم خوردہ نہ ہو گیا محمود کی وفات کے بعد تین چار سال کا دقت درمیان میں آ گیا تھا۔ مسعود اندرونی شورشوں کو نشتانے میں مشغول رہا ہندوستانی راجاؤں نے یہ سمجھ لیا کہ اب غزنی سے کوئی یہاں آنے والا نہیں۔ انہوں نے طرح طرح سے مسلمانوں کو شہر شروع کر دیا تھا۔ ان ہی میں تھک سرتی کا راجا تھا۔ یہ قلعہ ”دو سکیر“ میں واقع تھا۔ اس راجا نے مسلمانوں کا جیٹا حرا کر دیا تھا۔ قلعہ سرتی کے ارد گرد خاصا بڑا علاقہ اس کے زیر سر پر تھی تھا۔ ان علاقوں میں مسلمان بھی خاصی تعداد میں ہوا کرتے تھے لیکن راجا کے مظالم نے انہیں گھر بار چھوڑنا پر مجبور کر دیا تھا۔ آنے جانے والے تجارتی قافلے بھی اس کے چھین جھپٹ سے محفوظ نہیں تھے۔ وہ نہ صرف ان کا مال متاع لوٹ لیتا تھا بلکہ انہیں قید کر کے محض تعصب کی بنا پر ان کو قید کر دیتا تھا۔ چھوڑ دیا بھی تھا تو اس وقت جب وہ کوڑی کوڑی کے تاج ہو چکے ہوتے تھے۔ جیہوں سے پیسے اور جسون سے جان نکل چکی ہوتی تھی۔“ ہندوستان کی طرف سے آنے والے خبروں کی زبانی اس تک یہ خبریں پہنچتی رہتی تھیں، بالآخر اس کے غزنوی خون نے جوش مارا اور اس نے لشکر کشی کا پختہ ارادہ کر لیا۔“ وہ ہر معاملے میں اپنے وزیر احمد بن حسین ہمدانی سے مشورہ کرتا تھا۔ اس نے جب ہندوستان پر لشکر کشی کا ارادہ کیا تو وہ اس وقت خراسان میں تھا۔ احمد حسین ہمدانی سے مشورے کے لیے ضروری تھا کہ وہ اسے یہاں بلائے یا خود غزنی پہنچے۔ اس نے یہی بہتر سمجھا کہ خود غزنی چلا جائے اور وہیں سے تیاری کر کے ہندوستان روانہ ہو جائے۔“ وہ ابھی واپسی کا ارادہ کر رہی رہا تھا کہ اس کے آدمیوں نے مجبوراً کابل پوش کی موجودگی کا سراغ لیا۔ مسعود جہاں بھی جاتا تھا اپنے آدمیوں کو حکم دیتا تھا کہ وہ اس مجبوراً کا ٹھکانا تلاش کریں۔ خراسان میں بھی اس کے آدمی کسی ایسے شخص کو تلاش کرتے پھر رہے تھے جو سرے پاؤں تک کابل میں پلٹا ہوا ہو اور اب وہ یہ خبر لے آئے تھے کہ خراسان سے باہر جو نہی بہہ رہی ہے، اس کے کنارے ایک جموہیڑی ہے۔ انہوں نے اس شخص کو اس جموہیڑی میں

شکین در شکین

لہا ہے اور ان کے بقول اس سے ہاتھ بھی کر کے آئے۔“ ”ہاں، فوراً سوار ہوا اور ان کے ساتھ وہاں پہنچ گیا۔“ ”اور وہ تک کسی جموہیڑی کا نشان تک نہیں تھا۔ غزنی کے انار سے ایک تابوت رکھا تھا۔ مسعود نے اپنے ساتھ آئے۔“ ”آدمیوں سے تابوت کھولنے کے لیے کہا۔ تابوت کھولا گیا تو وہ خالی تھا۔ یہ تابوت یہاں کیوں رکھا گیا ہے؟“ ”جموہیڑی کہاں تھی؟“ ”مہذب کو حرا چلا گیا؟“ ”کچھ مجھ میں نہ آتا تھا۔ اس نے اپنے آدمیوں سے کہا کہ تابوت اپنے ساتھ لے لیں۔“

وہ یہ تابوت لے کر اپنی قیام گاہ پر آ گیا۔ جب وہ غزنی روانہ ہوا تو یہ تابوت اس کے ساتھ تھا۔ وہ ابھی چند منزلیں ہی گیا ہوا کہ مخالف سمت سے ایک سوار آتا نظر آیا۔ یہ سوار غزنی سے آیا تھا۔ یقیناً کوئی خاص فریضی۔“ ”وزیر سلطنت خواجه احمد بن حسین ہمدانی نے قضاے الہی سے وفات پائی۔“ ”یہ خبر سننے ہی مسعود کو غدی کنارے رکے تابوت کا خیال آیا جواب اس کے ساتھ تھا۔ معاملہ ہو گیا۔ مہذب نے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ کسی اہم شخصیت کا انتقال ہوا ہے۔ یہ تابوت اپنے ساتھ لیتے جاؤ۔“ ”احمد بن حسین ہمدانی کی وفات کی خبر سننے ہی مسعود کو اس کی پریشانی کے دن یاد آ گئے۔ سلطان محمود غزنوی نے سے اپنا وزیر مقرر کیا تھا۔ اس عہدے پر وہ اٹھارہ سال تک کام کرتا رہا لیکن اس کی دیانت داری کی بدولت اس کی کشتی سمندر میں آ گئی۔ بڑے بڑے امیر اس کے خلاف ہو گئے اور اس کے خلاف محمود کے کان بھرنے شروع کر دیے۔ ان درباریوں کی باتوں نے محمود کے دل پر اثر کیا اور اس نے احمد بن حسین کو وزارت سے علیحدہ کر دیا ورنہ اسے قید کر دیا۔ وہ تیرہ سال تک ”کالنگر“ کے قلعے میں سیری کی زندگی گزارا رہا۔ یہاں تک کہ مسعود تخت نشین ہوا اور اس نے اس خریب گورہائی دلا کر اپنا وزیر سلطنت قرار کیا۔“ ”معیشت کے دن گزرے ہی تھے کہ وہ ہر قید سے آزاد ہو گیا۔“ ”غزنی پہنچا تو لوگوں کو تعجب کے سوا کیا ہو سکتا تھا کہ وہ احمد بن حسین ہمدانی کی تدفین کے لیے تابوت بھی ساتھ لایا ہے۔“ ”احمد بن حسین کی تدفین کے بعد نئے وزیر کی تقرری کا مسئلہ درپیش تھا۔ اسے جلد سے جلد حل کرنا اس لیے بھی ضروری تھا کہ اسے ہندوستان کی مہم پر روانہ ہونا تھا۔ اس کی

ایک ہفتہ گزر گیا تھا، نہ راجا کو قلعے سے باہر آنے کی ہمت ہو رہی تھی نہ غزنوی لشکر کو خندق عبور کرنے کی کوئی صورت نظر آ رہی تھی۔ خندق عبور بھی کر لی جاتی تو دیو بندیکہ فاصلے سے تھی۔“ ”قلعے کے اندر بھی پریشانی ہی پریشانی تھی۔ اس وقت بھی راجا فاصلے کے ایک برج سے غزنوی لشکر کا جائزہ لے کر آیا تھا اور پہلے سے زیادہ پریشان نظر آ رہا تھا۔ اس کی

سلطان مسعود ارادہ کرنا تھا کہ ان معقول شرائط پر وہ صلح کر لے گا اور غزنی واپس چلا جائے گا۔ اگر اس نے صلح نہ کی تو غزنی بھی کر لیا تو بھی وہ انہی شرائط پر غزنی واپس جائے گا تو کیوں نہ ابھی چلا جائے۔ ابھی یہ ٹکس برخواست نہیں ہوئی تھی کہ چند سپاہی ایک شخص کو پکڑ کر اس کے حضور لائے۔ اس کے کپڑے دھو اور مٹی میں اٹے ہوئے تھے۔ کئی جگہ سے پھٹ بھی گئے تھے۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔

”کون ہے یہ؟“ سلطان مسعود نے پوچھا۔
”سلطان! یہ کہتا ہے مسلمان ہے اور آپ سے کچھ بات کرنا چاہتا ہے۔“

”اس کے لباس سے تو یہی ظاہر ہو رہا ہے کہ یہ مسلمان ہے۔ بہر حال تم لوگ جاؤ۔ اسے یہیں چھوڑ دو، ہم خود اس سے بات کرتے ہیں۔“

وہ شخص اتنا ہکا بکا ہوا تھا کہ اجازت لیے بغیر ہی زمین پر بیٹھ گیا۔ مسعود نے محسوس ضرور کیا لیکن اس کی حالت دیکھ کر اس سے کوئی باز پرس نہیں کی۔

”اب کیوں کیا کہنا چاہتے ہو؟“ مسعود نے پوچھا۔
”حضور! ہم چند مسلمان تاجر اپنے وطن سے نکلے اور بدھستی سے ان کافروں کے ہاتھوں گرفتار ہو گئے ہیں۔ ان ہندوؤں نے ہم پر طرح طرح سے تشدد کیا۔ ہماری تمام دولت چھین لی اور قلعے میں ہم سے غلاموں کی طرح کام لیا جاتا ہے۔ اگر آپ نے صلح کر لی تو آپ کے جانے کے بعد یہ ہندو ہم پر معصیت ڈھائیں گے اور زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ اگر ہمیں چھوڑ بھی دیا تو کسی اور قافلے کو قیدی بنالیں گے۔ یہ سلسلہ یوں ہی چلتا رہے گا۔ اگر آپ نے صلح نہ کی اور اپنی عمل داری قائم کر لی تو مسلمان محفوظ ہو جائیں گے۔ آپ راجا کو باندھ بھی کر سکتے ہیں کہ وہ مسلمانوں پر ظلم نہ ڈھائے۔“

”وہ تو سب ٹھیک ہے لیکن تم قلعے میں تھے تو تمہیں قلعے سے باہر کس نے آنے دیا؟“

”مجھے معلوم ہوا تھا کہ قاصد صلح کا پیغام لے کر باہر جا رہا ہے۔ میں نے کچھ اشرافیاں چمپا کر اپنے پاس رکھ لی تھیں۔ وہ اشرافیاں اس وقت کام آئیں۔ میں نے قلعے کے دروازے پر کھڑے دو پہرے داروں میں وہ اشرافیاں بانٹ دیں۔ انہوں نے ایک گھوڑے کا انتظام کر دیا۔ قاصد جو بھی باہر نکلا، میں بھی اپنے گھوڑے پر سوار ہوا۔ اس سے پہلے کہ تھوڑے پہلے اپنی جگہ واپس آتا، میں بھی خندق پار کر گیا۔ قاصد نے مجھے دیکھ لیا تھا اس لیے میں دوسری طرف مڑ گیا اور گھنے کے کیتوں میں داخل ہو گیا۔ یہ

بہت پر قدم رکھ دیا۔ اس کے پیچھے ایک اور سوار آیا۔ دروازے پر کھڑے پہرے داروں نے یہی سوچا ہوا کہ راجا نے ایک نہیں، دو قاصد روانہ کیے ہیں۔ جب گھوڑے خندق کی دوسری طرف چلے گئے تو اس نے ہل ہٹا لیا۔

قاصد کو احساس ہوا کہ اس کے پیچھے ایک سوار اور آ رہا ہے تو اس نے پلٹ کر دیکھا لیکن جتنی دیر میں وہ رک کر اس کا انتظار کرتا، پیچھے آنے والا سوار ایک طرف مڑا اور گھنے کے کیتوں کی طرف چلا گیا۔ وہ گھوڑے سمیت ان کیتوں میں داخل نہیں ہو سکا تھا۔ اس نے گھوڑا دوپہن چھوڑا اور پیدل چلا ہوا گھنے کے کیت میں داخل ہو گیا۔

قاصد کچھ دیر اس عجیب و غریب آدمی کو دیکھتا رہا پھر آگے بڑھ گیا کہ ہو گا کوئی..... مجھے کیا۔

جب وہ قاصد لشکر کے بالکل قریب پہنچ گیا تو اس نے سفید جھنڈا بلند کر لیا تاکہ لشکر سے اس کی جانب کوئی تیر نہ چلا جائے۔ لشکر میں پہنچے ہی اس نے زور سے آواز دی۔

”مجھے تمہارے بادشاہ ملتا ہے۔“

چند سپاہی آگے بڑھے اور اسے اپنے گھیرے میں لے لیا۔

”تم کون ہو اور بادشاہ سے کیوں ملتا ہے؟“

”ہم راجا کی جانب سے صلح کا پیغام لے کر آئے ہیں۔“ سپاہیوں نے اسے سلطان مسعود کی خدمت میں پہنچا دیا۔ اس وقت اس کے دوسرا درجہ کا قیدی اور حسین میاں بھی بیٹھے تھے۔ باتیں یہی ہو رہی تھیں کہ محاصرہ اٹھا کر غزنی چلا جائے یا قلعے کی تعمیر کی کوئی ترکیب نکالی جائے۔

سلطان مسعود نے یہی مناسب سمجھا کہ ان لوگوں کی موجودگی ہی میں قاصد کا پیغام پڑھا جائے۔

جب قاصد پیغام پڑھ کر سنا چکا اور جواب کا طالب ہوا تو مسعود نے سالاروں کی طرف دیکھا۔

”اس سے کہیے جواب کے لیے کل بھر حاضر ہو۔“ قاصد کے چلے جانے کے بعد حسین میاں سلطان مسعود سے مخاطب ہوا۔

”سلطان! یہ تو بہت اچھا ہوا کہ صلح کے لیے ہمیں ہاتھ نہیں بڑھانا پڑا۔ شرائط بھی نہایت معقول ہیں اگر ہم صلح کر لیں تو یہ تو بھی مفتوح راجا کے سامنے یہی شرائط رکھتے۔“

”جب آپ اتنے ہی مطمئن تھے تو بہت جواب اسی وقت کیوں نہیں دے دیا؟“

یہاں سے اٹھ کر وہ اپنی رانی کے پاس گیا۔ رانی بھی اس محاصرے سے پریشان تھی۔ راجا کی کمزوری اس پر ظاہر ہو چکی تھی۔ وہ خود یہ سوچ رہی تھی کہ راجا سے بات کرے گی۔

راجا نے خود یہ موقع دے دیا اور ٹوڈل سے ہونے والی تمام گفتگو اسے بتا دی اور خود اس سے بھی مشورہ مانگا۔

”میں تو خود آپ سے بات کرنے والی تھی۔ ہماری سات بیٹیاں ہیں اور ساتویں جوان ہیں۔ میں نے سنا ہے مسلمان بڑے عاشر ہوتے ہیں۔ جنگ میں جوڑکیاں ان کے ہاتھ آتی ہیں انہیں داسیاں بنا کر رکھتے ہیں۔ آپ اس معصیت کو جلد سے جلد یہاں سے ہٹائیں ورنہ میں خود ان کے پاس پہنچ جاؤں گی۔ ان سے کہوں گی کہ مجھے اور میری بیٹیوں کو راستہ دے دو پھر تم جانو اور راجا جانے۔“

”تم کیسی بزدلی ہو کہ اس مشکل گھڑی میں میرا ساتھ نہیں دے رہی ہو۔“

”میں آپ سے پہلے یہی کہتی تھی کہ مسلمان رعایا کو زیادہ جگہ مت کرو۔ انہی میں سے کسی نے شکایت کی ہوگی جو یہ مسلمان بادشاہ ہم پر چڑھائی کرنے آ گیا۔ اسے دفع کر دو ورنہ میں اپنی جان دے دوں گی۔“

”ٹوڈل کہتا ہے صلح کر لوں گی۔“

”خود سوچو، جب لڑنے والا خود صلح کا کہہ رہا ہے تو تم کیا کیلے لڑو گے؟“

”ٹھیک ہے بھائیو! جب تیری بھی یہی رائے ہے تو مجھے کیا۔“

راجا کا دل نہیں چاہ رہا تھا لیکن مرتا کیا نہ کرتا۔ حالات ایسے ہو گئے کہ اسے صلح پر تیار ہونا پڑا۔ اس نے ٹوڈل اور دوسرے سالاروں سے مشورے کے بعد صلح نامے کی مہارت تیار کر لی۔

”ہم اس شرط پر صلح کرنے کے لیے تیار ہیں کہ بادشاہ ہمیں قتل نہ کرے۔ اس کے صلے میں ہم اسی وقت ایک بہت بڑی رقم بطور نذرانہ پیش کریں گے اور آئندہ بھی اسی طرح ہر سال ایک معقول رقم خراج کے طور پر ادا کرتے رہیں گے۔“

راجا نے یہ درخواست ایک قاصد کے حوالے کی کہ وہ اسے سلطان مسعود تک پہنچا دے اور اس کا جواب لے کر فوراً قلعے میں آجائے۔

راجا کے غم سے متحرک ہلنے لپٹنا کام شروع کر دیا۔ قلعے کا دروازہ کھلا۔ متحرک ہلنے جہش کی اور خندق کا ایک بڑا حصہ خندق کی چھت بن گیا۔ قاصد کے گھوڑے نے اس

فوج کا سینا پانی بھی اس کے ساتھ تھا۔
”ٹوڈل! تم نے پڑاؤ کی حالت دیکھی؟“
”دیکھی مہاراج۔“

”کیا کہتے ہو ان مسلمانوں کے بارے میں؟“
”کہنا کیا ہے مہاراج! کب تک پڑے رہیں گے۔ اٹھ کر خود ہی چلے جائیں گے۔“

”یہ تم نے کیسے کہہ دیا؟“
”مہاراج! خندق پار کرنا ان کے بس کی بات نہیں۔ اگر خندق پار کر بھی کی تو تفصیل کی دیوار توڑنا ان کے لیے نامکن ہوگا۔ خندق پار کی تو ہمارے تیر انداز انہیں چھٹی کر کے رکھ دیں گے۔“

”مجھے معلوم ہے کہ یہ سب تم مجھے خوش کرنے کے لیے کہہ رہے ہو۔ حقیقت کچھ اور ہے جو تم جانتے ہو۔“

”جو انداز میرا تھا، وہ میں نے مہاراج کو بتا دیا۔“
”تم یہ بات ابھی طرح جانتے ہو کہ قلعے میں موجود خوراک کے ذخیرے میں کمی آتی جا رہی ہے۔“

”جی مہاراج۔“
”ہمیں بروقت معلوم نہ ہو سکا تھا کہ مسود غزنوی یہاں پہنچنے والا ہے ورنہ ہم قلعے میں زیادہ خوراک جمع کر لیتے۔“

”جی مہاراج۔“
”کیا جی مہاراج کی رٹ لگائی ہوئی ہے۔ بولنے کیوں نہیں کہ اب کیا کیا جائے؟ گھنے کی فصل بیک چکی ہے۔ ان مسلمانوں کے پاس اگر خوراک ختم بھی ہو گئی تو گھنے کی فصل کاٹ کر مہینوں زندہ رہ سکتے ہیں۔“

”مہاراج! مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ قلعے میں خوراک کا ذخیرہ ختم ہونے کو ہے۔ اب تو ہمیں باہر نکل کر لڑنا ہی پڑے گا۔“

”کیا تم خود غزنوی کو بھول گئے ہو؟ وہ جب آتا تھا اپنے ساتھ موت کا عذاب لے کر آتا تھا۔ مسود غزنوی اس کا بیٹا ہے۔ یہ لشکر وہی خونخوار لشکر ہے۔ اگر یہ ہم پر غالب آ گیا تو ہم میں سے کسی کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔“

”پھر تو ایک ہی راستہ رہ جاتا ہے۔ ہم مسود غزنوی سے صلح کر لیں۔“

”کن شرائط پر؟“
”صلح ہم کر رہے ہیں اس لیے شرائط ایسی ہوں جو مسود کے لیے پرکشش ہوں۔“

”بس اب تم جاؤ۔ میں سوچتا ہوں کہ شرائط کیا ہوں۔“

راستہ اتنا طویل ہو جائے گا، یہ مجھے معلوم نہیں تھا۔ میں بڑی مشکل سے آپ تک پہنچا ہوں۔ ہاں، میں ایک بات اور بتا دوں۔ قلعے میں خوراک کا ذخیرہ بہت کم رہ گیا ہے۔ اس لیے راجا صلح پر مجبور ہوا ہے۔ میں پھر یہ کہوں گا کہ اگر آپ نے صلح کر لی تو آپ کے جانے کے بعد راجا ہمارا جیتا دو بھر کر دے گا۔“

اس تقریر کو سن کر مسعود کے دل میں جذبہ اسلامی نے جوش مارا اور اس نے صلح کا ارادہ ترک کر دیا۔ دوسرے دن جب وہی قاصد صلح کے پیغام کا جواب لینے آیا تو مسعود نے صاف کہہ دیا۔

”میں ان شرائط پر صلح منظور نہیں۔ اپنے راجا سے کہو جنگ کی تیاری کرے۔ یا تو خود باہر نکل آئے یا ہم کسی نہ کسی طرح قلعے میں داخل ہو جائیں گے۔“

مسعود نے شاید پہلے ہی سوچ لیا تھا کہ کیا کرنا ہے۔ اس نے لشکر کو حکم دیا کہ غریب کے کھیتوں سے گئے کاٹ کاٹ کر خندق میں ڈال دیتے ہیں۔ اس علاقے میں گنا بہ افراط پیدا ہوتا تھا لہذا کوئی کمی نہیں ہوئی اور خندق کی سطح اتنی بلند ہوئی کہ یہ آسانی قلعے تک پہنچا جاسکتا تھا۔ اوپر سے تیر اندازی ہوتی رہی۔ بہت سے مسلمان شہید بھی ہوئے لیکن لشکر فضیل کے نیچے پہنچ گیا۔ قلعے میں موجود راجا کا لشکر اتنا پریشان ہو چکا تھا کہ اس نے خود قلعے کا دروازہ کھول دیا اور لڑے بغیر ہتھیار ڈال دیے۔

مسلمانوں نے ہندوؤں کو قتل کیا۔ ان کے بیوی بچوں کو قید کیا اور ان کا مال و اسباب اپنے قبضے میں کر لیا۔ مسلمان تاجروں کو ان کی دولت و انہیں کر دی اور انہیں رہا کر لیا۔ راجا کو گرفتار کر کے سلطان کے سامنے پیش کیا گیا۔

”میں یہ شکایت پہنچی ہے کہ تم مسلمان تاجروں پر مظالم ڈھاتے رہے ہو۔ کیا تم نے اپنی طاقت کا غلط استعمال نہیں کیا؟ کیا تم نے مجھے جسے تم مسلمانوں کا کوئی ولی وارث نہیں؟ تم نے دیکھ لیا کہ مسلمانوں کی حمایت کرنے والے کیسے طاقتور ہیں۔“

”مجھ سے واقعی پاپ ہو گیا۔ اگر اب مجھے موقع ملا تو میں مسلمانوں کا برابری سے خیال رکھوں گا۔“

”اگر میں صلح کر لیتا تو تم اسے میری کمزوری سمجھتے۔ اب تم نے دیکھ لیا کہ غزنی سے ہندوستان دور نہیں۔ میں کسی بھی وقت تمہاری سرزنش کے لیے آسکتا ہوں۔“

”میں آپ کا اطاعت گزار رہوں گا۔“

”اس کی کیا ضمانت ہے؟“

”آپ مجھ پر بھروسہ کریں۔“

”میں نے اپنے ایک آدمی احمد نیا لگین کو ہندوستان کا سپہ سالار بنا کر لاہور بھیجا تھا۔ وہی میرا نمائندہ ہوگا جو تم پر نظر رکھے گا اور تم اس کے سامنے جوابدہ ہو گے۔ پابندی سے خراج ادا کرتے رہو گے۔“

”مجھے منظور ہے۔“

مسعود نے سوچا تھا کہ وہ کچھ دن ہندوستان ہی میں رہے گا۔ اس سلسلے میں احمد نیا لگین سے خط کتابت بھی ہوگئی تھی کہ وہ کچھ دن بعد یہاں سے رخصت ہوگا اور لاہور میں قیام کرے گا لیکن اسے چند خبروں نے غزنی کی طرف لوٹ جانے پر مجبور کر دیا۔ یہ خبریں طبرستان کی طرف سے آ رہی تھیں جہاں کے حاکم ابالغاجا نے لوٹ مار کا بازار گرم کر دیا تھا۔ سلطان کی مملکت کے ایک علاقے پر بھی قبضہ کر لیا تھا اور دوسرے علاقوں کی طرف لپکتی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ مسعود کی مسلسل غیر حاضری نے اسے اور بھی تیار بنادیا تھا۔ مسعود کے وزیر مملکت نے کئی مرتبہ اس کی طرف لشکر روانہ کیے لیکن ترکمانوں کی طرح وہ بھی ناقابل تغیر معلوم ہو رہا تھا۔ اب تو یہ ڈر لگنے لگا تھا کہ کہیں وہ غزنی پر ہی دھاوا نہ بول دے۔ ابولنصر وزیر مملکت نے اس کی طرف قاصد دوڑائے تو اس نے ”سستی“ کو خیر باد کہا اور کچھ دن لاہور میں قیام کرتا ہوا غزنی کی طرف روانہ ہو گیا۔ غزنی میں اس کا بے چینی سے انتظار ہو رہا تھا۔ اس کے پہنچنے ہی ایک مرتبہ پھر غزنی کے بازاروں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ جنگ کے بادل پھر مٹلانے لگے۔

مسعود کا لشکر ہندوستان کے سفر سے تھکا ہوا لوٹا تھا۔ اس نے لشکر کو آرام کرنے کی غرض سے ایک ہفتے تک غزنی ہی میں روکے رکھا۔ ابولنصر نے مشورہ ضرور دیا تھا کہ مسعود غزنی ہی میں رہے اور اس کا کوئی لائق سالار یا فرزندوں میں سے کوئی اس فہم پر روانہ ہو لیکن اس نے خود جاننا ضروری سمجھا۔

”یہ ہم اتنی آسان ثابت نہیں ہوگی۔ قدم قدم پر میرے مشوروں کی ضرورت ہوگی۔ اس لیے میرا جانا ضروری ہے۔“

خلطان مسعود جس مہم کو بہت مشکل سمجھ رہا تھا، امیر طبرستان کی بزدلی نے اسے اتنی ہی آسان بنا دیا۔ مسعود کے لشکر نے طبرستان پہنچنے ہی وہاں کے دو شہروں ”آمل“ اور ”ساری“ کو فتح کرنے کا ارادہ کیا۔ ابھی تک طبرستان کی فوج وہاں نہیں پہنچی تھی۔ وہاں کے باشندوں نے شوق ہو کر

مسعودی لشکر کا مقابلہ کیا۔ یہ شہر نہایت جنگجو قبائل پر مشتمل تھے۔ مقابلہ بھی خوب کیا لیکن باقاعدہ تربیت یافتہ فوج سے ان کا مقابلہ۔ چند گھنٹے بھی نہیں گزرے تھے کہ دونوں شہر مسعودی دونوں ہتھیاروں پر آ گئے۔

یہ دونوں شہر ایک جھینٹے میں مسعود کے قبضے میں چلے گئے تھے۔ مسعود اپنے لشکر کو لے کر ”گورگان“ چلا گیا۔ دراصل وہ اپنے لشکر کو سستانے کا موقع فراہم کرنے کے بعد نئی ہم کی ابتدا کرنا چاہتا تھا۔

امیر طبرستان کو جب ان شہروں کے ہاتھ سے چلے جانے کا علم ہوا تو اسے اپنے مرکزی شہر کی فکر ہوئی۔ نہ جانے کب سلطان متحرک ہو جائے اور یلغار کر دے۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ وہ کتنا ہی بڑا لشکر تیار کر لے، سلطان کا مقابلہ نہیں کر سکتا چنانچہ اس نے اپنے سالاروں سے مشورہ کرنے کے بعد اپنا ایک وفد گورگان بھیجا اور امان طلب کی۔

”سلطان محترم! ہم ابا کا لہجہ کا پیغام لے کر آئے ہیں۔ اس نے یہ پیغام دے کر ہمیں بھیجا ہے کہ آئے والے دور میں وہ آپ کا مطیع اور فرماں بردار بن کر رہے گا۔ اس کے علاقے میں نہ صرف آپ کے نام کا خطبہ پڑھا جائے گا بلکہ آپ کے نام کا سکہ بھی جاری ہوگا۔“

”ہمیں خوشی ہوئی کہ اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا لیکن اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ وہ آئندہ سرکشی پر نہیں اترے گا اور ہمارے علاقے کو نقصان نہیں پہنچائے گا؟“

”ہم نے بھی اپنے آقا سے اس موضوع پر بات کی تھی۔ وہ ضمانت کے طور پر اپنے بیٹے اور بیٹے کو آپ کے پاس بھیجے کو تیار ہے۔“

”جب وہ اس ضمانت کی تکمیل کر دے گا تو ہم بھی غزنی واپس چلے جائیں گے۔“

ابا کا لہجہ نے اپنے بیٹے بہمن اور اپنے بیٹے شہر و بہو ضمانت کے طور پر سلطان کے پاس گورگان روانہ کر دیا۔ سلطان چند روز قیام کے بعد روانہ ہو گیا۔

وہ نیشاپور میں تھا کہ وہاں کے باشندوں نے اس کے پاس آ کر ترکمان سلجوقی کے مظالم کی شکایت کی۔ وہ اس سے پہلے بھی ترکمانوں کے خلاف ہم چلا چکا تھا۔ اس کا سالار امیر الریس بن محمد امیر یز ترکمانوں کی فتح کئی کے لیے کئی لڑائیاں لڑ چکا تھا لیکن اسے کوئی کامیابی نہ مل سکی تھی۔ یہ لوگ آوارہ گرد لڑا کرتے۔ کچھ دیر مقابلہ کرتے تھے پھر روپوش ہو جاتے تھے۔ پھر کہیں سے برآمد ہو جاتے تھے۔ لوٹ مار کا بازار گرم کرتے تھے۔ پھر روپوش ہو جاتے

تھے۔ یہ لوگ چونکہ ایک بڑے علاقے میں پھیلے ہوئے تھے اس لیے ان کا سد باب مشکل ہو رہا تھا۔ اس مرتبہ مسعود نے بک تغزی اور حسین بن علی میکال کو ایک زبردست فوج کے ساتھ ترکمانیوں کی سرزنش کے لیے روانہ کیا۔

ترکمانی چیتنیوں کی طرح پہاڑوں پر پھیلے ہوئے تھے اور غزنی فوج کا مشاہدہ کر رہے تھے۔ جب یہ فوج ایک مقام ”حقید التاق“ پر پہنچی تو ان چیتنیوں نے ریگنا شروع کیا۔ چند لوگ پہاڑ سے نیچے اترے اور سالار بک تغزی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

”ترکمانی یہ درخواست کرتے ہیں کہ ہماری ساری قوم غزنویوں کی تابع اور فرماں بردار ہے۔ ہم اگر لوٹ مار کرتے ہیں تو یہ ہماری معاشی مجبوری ہے لہذا اگر امیر مسعود ہماری معاش کے لیے زمین کی حد بندی کر دے تو ہم اقرار کرتے ہیں کہ آئندہ ہم کسی کو نقصان نہیں پہنچائیں گے۔“

بک تغزی دور دراز کا سفر کرتا چلا آ رہا تھا۔ ترکمانوں کی پچھلی کرتی بھی یاد تھی۔ اس نے نہ صرف یہ کہ ان لوگوں کی بے غزنی کی بلکہ نہایت سخت جواب دے کر انہیں لوٹا دیا۔

”ترکمانیوں سے جا کر کہہ دو کہ اطاعت کا اقرار کریں اور آئندہ کسی بد اعمالی کے مرتکب نہ ہوں۔ اپنے ایک قابل اعتبار آدمی بھیج کر میرے نام ایک شاہی فرمان منگوائیں تاکہ میں ترکمانوں سے کسی قسم کا تعرض نہ کروں۔ اگر یہ شرط منظور نہیں تو ہمارے اور ان کے درمیان کو تارے سے کاٹ دیں۔“

ترکمانی ایسی بے غزنی کہاں برداشت کرنے والے تھے۔ سب کے سب پہاڑوں سے اتر آئے۔ غضب کارن پڑا۔ ان کی سر فروشی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی لیکن غزنی لشکر ایسی جانبازی سے لڑا کہ ترکمانوں کے قدم اکھڑنے لگے۔ وہ ایسے مواقع پر فرار کا راستہ اختیار کرتے تھے۔ کچھ دنوں کے لیے روپوش ہو جاتے تھے اور پھر وہی لوٹ مار کا راستہ اختیار کرتے تھے۔ انہیں جب پوری طرح یقین ہو گیا کہ بک تغزی کے سامنے ان کا زور نہیں چل سکے گا تو وہ جنگ سے بھاگ گئے۔

بک تغزی نے دور تک ان کا تعاقب کیا۔ ان کے مال و دولت پر قبضہ کر لیا اور ان کے اہل و عیال کو گرفتار کر لیا۔ غزنی لشکر بھی لوٹ مار کے لیے ادھر ادھر منتشر ہو گیا۔ غزنی لشکر بھی کچھ رہا تھا کہ اب جنگ ختم ہوئی۔ بہت سوں نے تو اپنے ہتھیار بھی اتار کر رکھ دیے تھے۔

شکں حد شکں

دلی پھیلی ہوئی ہے۔ اگر ان لوگوں کو زبردستی لے جایا گیا تو ہمیں ایک اور بغاوت کا سامنا ہوگا جو ممکن ہے لاہور میں نہیں غزنی میں ہو۔“

”کیا میں لشکر والوں کی حق تلفی کرتا ہوں؟ کیا وہ میرے ملازم نہیں؟ کیا انہیں مالی خیریت میں حصہ نہیں ملتا؟ پھر وہ انکار کیوں کریں گے؟“

”میں یہ نہیں کہتا کہ انکار کریں گے۔ میں تو صرف اتنا عرض کروں گا کہ نتائج بہتر نہیں آئیں گے اور یہ بھی ممکن ہے کہ انکار کر دیں۔“

”تم کیا کہنا چاہتے ہو..... میں لاہور کی بغاوت کو نظر انداز کروں؟ لاہور کو ہاتھ سے جانے دوں؟ احمد کو اس کے حال پر چھوڑ دوں؟ اس کے خلاف کسی مہم کا آغاز نہ کروں؟“

”میرا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا۔ میں تو صرف یہ گزارش لے کر آیا تھا کہ اس مہم پر کسی اور کو بھیجا جاسکتا ہے۔ یہ اتنی بڑی مہم نہیں ہے۔ جس سردار کو حکم دیں گے، وہ اپنا ذاتی لشکر لے جا کر اس بغاوت کو کچل دے گا۔ شاہی لشکر کو کسی بڑے معرکے کے لیے محفوظ رکھیے۔“

سلطان مسعود نے بک تغزی کے مشورے پر عمل کیا اور تاحہ نام کے ایک ہندو سردار کو احمد نیا تلگن کی سرکوبی کے لیے لاہور روانہ کر دیا۔

تاحہ نے احمد کی طاقت کا غلط اندازہ لگا یا اور ایک معمولی سا لشکر لے کر لاہور کے دروازے پر دستک دے بیٹھا۔

احمد اپنی طاقت میں اتنا اضافہ کر چکا تھا کہ وہ اس معمولی سے لشکر کو خاطر میں نہ لایا۔ پوری طرح تیار ہو کر باہر نکلا اور تاحہ کے مقابلہ آ گیا۔ دونوں میں زبردست جنگ ہوئی۔ اس جنگ میں تاحہ ہارا گیا اور اس کا لشکر بھاگ کھڑا ہوا۔ اس کی اطلاع مسعود کو پہنچی تو اس نے تنگ کو طلب کیا۔

فہم ہندوؤں کا بہت بڑا امیر تھا۔ اس کے پاس بہت بڑا لشکر تھا۔ مسعود نے اسے لاہور کی طرف روانہ کیا۔ تنگ نے نیا تلگن سے جنگ کر کے اسے شکست دی۔ نیا تلگن شکست کھا کر سندھ کی طرف بھاگا۔ تنگ برابر اس کے تعاقب میں لگا ہوا تھا۔ نیا تلگن بار بار پلٹ کر دیکھتا تھا اور تنگ کو موجود پا کر آگے بڑھ جاتا تھا۔ وہ منصورہ گیا، پھر پٹنچا۔ دریائے سندھ کے کنارے پہنچ کر کچھ رہا تھا کہ تنگ واپس چلا گیا ہوگا لیکن کھوڑوں کی ٹانگوں نے اسے دہلا دیا۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا کہ وہ دریائے پارا کر کے دوسری طرف

نہاں لایا۔ ایک اچھا موقع ہاتھ آ گیا۔ انہوں نے دڑوہ کوہ کے بل پر غزنی پر حملہ کر دیا۔ غزنی لشکر منتشر ہو چکا تھا۔ اس لیے باوجود نہایت بہادری سے لڑا۔ بہت سے آدمی مارے گئے۔ انہوں نے اپنی صفیں بھی درست کر لیں۔ طرفین میں دو دروازے تک زبردستی لڑائی ہوئی رہی۔ غزنی ہاروں کی تعداد کم تھی، اس لیے میدان جنگ سے ان کے ہاتھ اٹھنے لگے۔ بک تغزی کو صحت اسی میں نظر آئی کہ ان جنگ سے فرار ہو جائے۔ اس نے اپنا کھوڑا اودھایا اور حسین بن علی میکال کے کھوڑے کی قریب پہنچ گیا۔

”میکال! اب لانے کا کوئی قاعدہ نہیں۔ لشکر بہت ہار گیا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ ہم میدان جنگ سے بھاگ کر اپنی جائیں بچائیں۔“

”یہ کہاں کی بہادری ہے کہ ہم لشکر کو چھوڑ کر خود بھاگ جائیں۔“

”ترکمانیوں کو لشکر کی نہیں، اس وقت ہماری تلاش ہے۔ لشکر ہمارے دفاع کے لائق نہیں رہا ہے۔ اپنی جان بچاؤ۔“

”اپنی جان بچانے کے لیے میری کوار بہت ہے۔“

”تم کس کس سے لڑو گے؟ میری بات اب بھی مان لو۔“

”مجھے مرنا منظور ہے لیکن بھاگ نہیں سکتا۔“

”میرے دوست مجھے معاف کر دینا۔ میں یہاں سے نکلتا ہوں۔ زندہ بچ گیا تو امیر مسعود تک ضرور پہنچوں گا۔“ بک تغزی نے کہا اور صفیں چیرتا ہوا نکل بھاگا۔

میکال استقلال سے لڑتا رہا لیکن ترکمانوں کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا۔ بک تغزی نیشاپور پہنچ گیا اور امیر مسعود کے قدموں میں کوار رکھ دی۔

مسعود نے شکست کا حال سنا تو اسے سخت صدمہ ہوا۔ ناکام و نامراد وہیں غزنی روانہ ہوا۔

وہ ابھی ترکمانیوں سے دوسرے ٹکڑا کا منصوبہ بنائی رہا تھا کہ لاہور کے ناظم احمد نیا تلگن کی بغاوت کی خبریں اس تک پہنچیں۔ اس کی فوج بھی ہوئی تھی۔ مسعود کا شوق و یواگی اس کے سپاہیوں کو آرام کا موقع ہی نہیں دے رہا تھا۔ لوگ برسوں سے اپنے گھر نہیں گئے تھے۔ روز روز کی محاذ آرائیوں سے تنگ آ گئے تھے۔ اب لاہور کا مرحلہ درپیش ہو گیا تھا۔ لشکر میں اچھل بچی ہوئی تھی۔ سالار بک تغزی اس صورت حال کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے خود سے طاقت کی اور اس کی توجہ اس طرف دلائی۔

”آپ کے حکم سے سفر تو نہیں لیکن سپاہیوں میں بے

اثر جائے۔ وہ ابھی دریا کے وسط میں پہنچا تھا کہ دفعتاً دریا میں سیلاب آگیا۔ نیاٹھلین نے بہت ہاتھ پاؤں مارے لیکن ڈوب گیا۔

ٹھک اور اس کے ساتھی کنارے پر کھڑے اس کے ڈوبنے کا منظر دیکھ رہے تھے۔ یہ عبرت کا وقت تھا۔ احمد نیاٹھلین کل تک لاہور کا حکمران بنا ہوا تھا۔ سیاہ سفید کا مالک تھا۔ کفرانِ نعمت نے اس حال کو پہنچایا کہ بھاگنے کو زمین تک ہوگئی۔ دریا میں کودا۔ اس نے بھی آگے بڑھنے نہ دیا۔ عبرت کی یہ زنجیر ابھی مکمل نہیں ہوئی تھی۔ ایک کڑی بات تھی۔ ٹھک یہ منظر دیکھ کر آگے بڑھنے ہی والا تھا کہ دریا کے بہاؤ نے نیاٹھلین کی لاش کنارے پر پھینک دی۔ ٹھک کے آدمیوں نے اس کا سر کاٹ کر ٹھک کے سامنے پیش کر دیا۔ ٹھک نے وہ سر سلطان مسعود کے پاس فزنی بھیج دیا۔ سلطان مسعود نے فزنی میں ایک نیا مکمل تعمیر کروایا تھا۔ اس میں ایک بڑا خوبصورت جڑا تخت بچھایا گیا اور اس تخت پر ایک عالی شان تاج سونے کی زنجیر سے باندھ کر لٹکایا گیا۔

مسعود نے اس محل میں پہلا دربار منعقد کیا۔ جڑا تخت پر قدم بچھو فرمایا اور تاج اپنے سر پر رکھا۔ یہی وقت تھا جب احمد نیاٹھلین کا ”سر“ فزنی لایا گیا اور ایک طشت میں رکھ کر مسعود کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ تمام درباریوں نے مبارک باد کے نعیرے بلند کیے اور اسے نیک لکھون سمجھا گیا۔ ابھی یہ خوشی کم نہیں ہوئی تھی کہ انہی کا قصدوں نے ایک بری خبر بھی مسعود کے گوش گزار کی۔

”ہاں کے راجا نے سلطان کی اطاعت سے منہ موڑ لیا ہے اور وہ سرکشی پر آمادہ ہے۔ اس نے مسلمان رعایا پر مظالم کی حد کر دی ہے۔ مسلمانوں کو زبردستی ہندو بنایا جا رہا ہے۔“

یہ اطلاع ایسی نہیں تھی جسے نظر انداز کیا جاسکتا۔ معاملہ صرف ایک شہر کا نہیں تھا۔ اس کی دیکھا دیکھی دوسرے راجاؤں کو بھی بغاوت پر آمادہ ہوتے دیکھیں گئی۔ سلطان محمود غزنوی کے محلوں نے جن راجاؤں کے سر جھکا دیے تھے، اب وہ سر اٹھانے لگے تھے۔ ان کی فتح کتنی ضروری تھی ورنہ لاہور ان راجاؤں سے دور نہیں تھا۔ جن علاقوں کے پیچھے سیکٹھلین اور محمود غزنوی کی محنت تھی، ان پر آج آنے کا خطرہ بڑھ گیا تھا۔

مسعود نے عام دربار بلوئی کر دیا اور صرف سالاروں کا اجلاس طلب کیا۔

”ہمیں ایک مرتبہ پھر ہندوستان کی طرف جا ہوگا۔“

”ترکمانوں کا خطرہ ابھی غائب نہیں ہے۔ آپ کے روانہ ہوتے ہی وہ پھر سر اٹھا سکیں گے۔“

”اس سیلاب کو روکنے کا عمل بھی ہم نے تلاش کر لیا ہے۔ میں لشکر کا ایک حصہ الگ کر کے عبدالرحیم بن عبدالعزیز کی سربراہی میں چھوڑ جاؤں گا جو میرے آنے تک میرے علاقوں تک انہیں روکے رکھے گا۔“

”کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ پہلے ہم ترکمانوں سے نمٹ لیں جو مسلسل ہمارے لیے عذاب بنے ہوئے ہیں اور اگر کے بعد ہندوستان کا رخ کریں؟“

”میرے بھائی! ترکمانوں سے جنگ کوئی ایک دن کی بات نہیں ہے۔ وہ سامنے آ کر لڑنے کے عادی نہیں ہیں۔ ان کا تقاب کرتے کرتے ہمارے لشکر ہی اتنا ٹھک چکے ہوں گے کہ ہندوستان جانے کے لائق نہیں رہیں گے۔ اس کے علاوہ اس وقت میرا ہندوستان جانا اس لیے بھی سود مند ہوگا کہ وہاں کے راجاؤں سے مالی قیمت لے کر لوٹوں گا جو ترکمانوں سے جنگ کرنے میں کام آئے گا اور ہندوستان کے جو علاقے ہمارے باج گزار ہیں، ان پر ہماری دھاک بھی بیٹھے گی۔“

اس کے دلائل میں وزن تھا اور کسی میں اختلاف کی جرات بھی نہیں تھی لہذا تمام سالاروں نے اس سے اتفاق کیا اور اجلاس ختم ہو گیا۔

وہ تو ہم پرست نہیں تھا لیکن آج بڑی شدت سے اسے وہ مجذوب یاد آ رہا تھا جو کئی مرتبہ اس کی مدد کر چکا تھا۔ اس کے آدی تلاش کرتے کرتے ٹھک چکے تھے لیکن وہ کہیں نظر نہیں آیا تھا۔ اسے بہت دن بعد وہ تابوت یاد آیا جو خراسان میں ندی کے کنارے رکھا ہوا تھا۔ اس وقت وہ اسے احمد بن حسین ہمسندی کی موت کی طرف اشارہ سمجھ رہا تھا لیکن اب وہ سوچ رہا تھا کہ کہیں اس مجذوب نے اس تابوت کے ذریعے اپنی موت کی اطلاع تو نہیں دی تھی کیونکہ اس دن کے بعد سے وہ کسی کو نظر نہیں آیا تھا۔ کہیں اس کا انتقال تو نہیں ہو گیا، اس کی طرف سے ہونے والی بشارتوں کا سلسلہ بھی بند ہو چکا تھا۔ اس نے اس معنی کو خدا پر چھوڑا اور ہندوستان جانے کی تیاری کرنے لگا۔ جب لشکر کی تیاری مکمل ہوگئی تو مسعود اپنے سالاروں کے ساتھ ہندوستان کی طرف کوچ کر گیا۔

ہاں کے راجا کو جب خبر ملی کہ سلطان مسعود غزنی سے

شکن حد شکن

روانہ ہوا ہے تو اسے یہ سوچنے کی ضرورت نہیں تھی کہ وہ کسی سرکوبی کے لیے آ رہا ہے۔ خود غزنی کے دربار میں اپنے لوگ موجود تھے جو اسے مل جل کر خبریں پہنچا رہے تھے۔ اسے اپنی طاقت پر اتنا کمزور تھا کہ اس نے محصور ہونے کے بجائے کھلے میدان میں جنگ کرنے کو ترجیح دی۔ اس نے شہر سے نکل کر دو میل کے فاصلے پر پڑاؤ کر لیا دوسرے لشکروں میں وہ سلطان مسعود کے استقبال کے لیے تیار کھڑا تھا۔

سلطان مسعود کا لشکر جو بھی مناسب فاصلے پر پہنچا، ہاں کے راجا نے جنگ کے فتنارے بجوانے شروع کر دیے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ غزنوی لشکر کو آرام کا موقع ملے۔

اچھی غزنوی لشکر نے آرام کے لیے خیمے بھی بلند نہیں کیے تھے کہ جنگ کا آغاز ہو گیا۔ یہ جنگ اتنی ہولناک تھی کہ چند منٹوں ہی میں فیصلی کی طرف برقی نظر آگئی۔ راجا کی جلد بازی نے اسے شدید نقصان پہنچایا۔ اس نے اپنا آدھا لشکر کٹوا دیا اور پھر اس کے قدم لڑکھانے لگے۔ وہ پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو گیا لیکن اسے فائدہ یہ تھا کہ پشت پر اس کا شہر تھا۔ وہ اپنے پیچھے لشکر کو لے کر شہر میں داخل ہوا اور محصور ہو گیا۔

طبقات نامری کے مولف کا بیان ہے کہ اس زمانے میں ہاں کے سواک کا دارالسلطنت تھا۔ ہاں کا قلعہ بہت ہی مضبوط تھا۔ اس کی بابت ہندو عقیدہ رکھتے تھے کہ اسے کبھی کوئی مسلمان فرماں روا فتح نہیں کر سکتا۔

سلطان مسعود نے ہندوؤں کے اس عقیدے کو باطل کرنے کے لیے اس قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ قلعے کا محاصرہ کیے پانچ روز گزار گئے تھے۔ اتنے مضبوط قلعے کو فتح کرنے کے لیے پانچ روز کچھ بھی نہیں ہوتے بلکہ اس کی مضبوطی کو دیکھ کر لگتا تھا، پچاس روز بھی گزر جائیں تو کم ہیں۔ اس دشت میں یہ چھٹی رات تھی جب مسعود کو خواب میں وہ مجذوب مکمل پوش نظر آیا۔ مسعود نے دیکھا کہ مجذوب فیصلی کے قریب گیا ہے اور کسی سیزم کی مدد کے بغیر فیصلی پر چڑھ گیا اور اندر اتر کر شہر چٹا کر دروازہ کھول دیا۔ غزنوی لشکر اندر چلا گیا۔ مسعود کی آنکھ مل گئی تو وہ براہید تھا کہ پانچ دن کی مسلسل محنت آج اچانک دیکھائے گی۔ آج شہر ضرور فتح ہو جائے گا۔ اس نے پہلا کام یہ کیا کہ اپنے لشکر کو چار حصوں میں تقسیم کر کے فیصلی کے چاروں طرف پھیلا دیا۔ پہلے ایک حصے نے شہر پر تیر برسائے۔ اندر موجود راجا کے لشکر یہ سوچ کر اس طرف بھاگے ہوں گے کہ حملہ ہو گیا۔ اسی وقت دوسرے حصے نے حملہ کر دیا پھر تیسرے حصے نے۔ راجا کے لشکریوں کو مشغول کرنے کے بعد لشکر کے چوتھے حصے نے سیزم کی مدد

سے اوپر چڑھنا شروع کر دیا۔ فیصلی پر موجود سپاہیوں نے واروں کے خوف سے بھاگنا شروع کر دیا۔ مسعود کے پاس دوسری طرف اتر گئے اور دروازہ کھول دیا۔ ایک مرتبہ پھر گھمسان کارن پڑا۔ راجا کا بچا کچھ لشکر بھی ختم ہو گیا۔ اس آبادی میں راجا کا کچھ پتا نہ چلا۔ شاید وہ اپنی جان بچا کر بھاگ گیا تھا یا پھر مارا گیا اور لاش نہیں ملی۔

اس جنگ کے دوران مسعود کو معلوم ہوا تھا کہ سون پت کے راجا دیپال ہری اور ایک دوسرے ہمسایہ راجا رام دیو نے اس جنگ میں ہاں کے راجا کی لشکر اور مال و زر سے مدد کی ہے لہذا اب اس نے ان دونوں کو سبق سکھانے کا ارادہ کیا۔ اس نے ہاں کا قلعہ اور تمام مالی قیمت اپنے قابل اعتماد سرداروں کے حوالے کیا اور خود سون پت کا قلعہ فتح کرنے کے لیے آگے بڑھا۔

اس کی دہشت اس کے قدموں سے آگے آگے جاری تھی۔ راجا دیپال ہری ایسا بدحواس ہوا کہ راج پات چھوڑ کر جنگ کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ غزنوی لشکر نے سون پت پہنچ کر قلعے کو تسخیر کر لیا اور اس کے تمام بچوں کو پاش پاش کر کے تمام مال و دولت پر قبضہ کر لیا۔ جب کسی نے بتایا کہ راجا کو قلا مندر کی بیڑیاں چڑھتے ہوئے دیکھا گیا تھا تو لشکر میں سے چند سپاہی اس مندر میں گئے۔ وہاں تک دھوکا ایک پھڑت بیٹھا ہوا تھا۔ اس سے راجا کے بارے میں پوچھا لیکن وہ کچھ بتانے سے قاصر تھا کیونکہ وہ گونگا تھا۔ کم از کم اشارے سے اس نے یہی بتایا تھا کہ وہ گونگا ہے۔ ایک مسلمان کو شک ہوا اور اس نے گوارا اس کے سر پر لہرائی۔

”ہمارے دھرم میں گوشت کھانا کھانے کا کوئی حق نہیں۔ میں ابھی تیری گردن اڑاؤں۔“ موت کے خوف نے گوشت کھانے کو بان دے دی۔

”بھگوان کے لیے مجھ پر دیا (رحم) کرو۔ میں گونگا نہیں ہوں۔“

اسے اس طرح بولتے ہوئے دیکھ کر مسلمان کو ہنسی آگئی۔

”اگر تو گونگا نہیں ہے تو بتا تیرا راجا دیپال کہاں چھا ہوا ہے؟“

”وہ یہاں آیا ضرور تھا لیکن وہ یہاں ہے نہیں۔“

”مجھے ضرور معلوم ہوگا۔ بتاؤ کہاں ہے؟“ مسلمان نے پھر گوارا کا رخ اس کی طرف کیا۔

”بتاتا ہوں۔ بتاتا ہوں۔“ پھڑت نے کہا۔ ”وہ یہاں چھپنے کے لیے آیا تھا لیکن جب اس نے مجھے بتایا کہ

آنے والے مسلمان ہیں تو میں نے اسے یہاں چھپنے سے منع کر دیا۔ میں نے اسے بتایا تھا کہ مسلمان، مندروں کے دشمن ہیں۔ وہ شہر میں آئے تو مندر میں ضرور آئیں گے اور تو پکڑا جائے گا۔

”میں نے تجھ سے یہ پوچھا ہے کہ اس وقت وہ کہاں ہے؟“
”مہاراج! مجھے نہیں معلوم۔ ہاں، اس نے یہ ضرور کہا تھا کہ وہ جنگل کی طرف جا رہا ہے۔“
”سباہوں کو اب اتنی فرصت نہیں تھی کہ اسے قتل کرتے یا اس سے کچھ اور پوچھتے۔ دوڑتے ہوئے مندر کی سیڑھیاں اترے اور سیدھے اس طرف پہنچے جہاں مسود کے لیے خیمہ لگایا گیا تھا۔“

”سلطان معظم! ہمیں معلوم ہوا ہے کہ دیپال قریبی جنگل کی طرف چلا گیا ہے۔“
”تورا جاؤ۔ ایک ایک درخت چھان مارو اور اسے پکڑ کر میرے پاس لاؤ۔“

سباہوں کی ایک بڑی تعداد جنگل کی طرف روانہ ہوئی۔ یہ ایسا گنجان جنگل تھا کہ دن میں اندھیرا طاری تھا۔ یہاں کسی کو تلاش کرنا آسان نہیں تھا۔ یہ خطرہ بھی تھا کہ اگر راجا نے یا اس کے آدمیوں نے اندھیرے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے حملہ کر دیا تو بہت نقصان ہو سکتا ہے۔ یہ سپاہی پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ ایک جگہ ایک سپاہی کے پاؤں سے کوئی چیز ٹکرائی۔ دیکھا تو ایک بڑا صندوق تھا۔ اس کا مطلب تھا راجا یہیں کہیں ہے۔ یہ صندوق اسی کا ہو سکتا تھا۔ اسے کھولا گیا تو راجا کا خزانہ اس میں بند تھا۔ میرے جواہرات کی بڑی مقدار تھی جن سے صندوق بھرا ہوا تھا اور آگے بڑھے تو ایک جوتی ملی جس میں جیتی موتی جڑے ہوئے تھے۔

”اگر راجا یہاں ہوتا تو دوسری جوتی بھی یہاں ہوتی۔“ ایک سپاہی نے کہا۔

”اسے ہماری آمد کا علم ہو گیا ہوگا۔ وہ گھبراہٹ میں ایسا ہنگامہ کہ پاؤں کی ایک جوتی بھی نہیں رہ گئی۔ اب وہ یہاں نہیں ہے یا جنگل میں بہت آگے تک نکل گیا ہے۔ اب اسے ڈھونڈنا فضول ہے۔ کیا خبر یہ جنگل کہاں تک جاتا ہے۔ واپسی میں ایسا نہ ہو کہ ہم راستہ ہی بھول جائیں۔“

سباہوں نے وہ صندوق کندھوں پر اٹھایا اور جنگل سے باہر نکل آئے۔

مسود نے بھی دیپال ہری کو اس کے حال پر چھوڑا اور اپنے دوسرے دشمن رام دیو کی طرف بڑھا۔ راجا رام

دیو اپنی آنکھوں سے دیپال ہری کا شوق دیکھ چکا تھا۔ اسے جب مسود کی آمد کی خبر ہوئی تو اس نے داخل مندی سے کام لیا۔ بہت سالانہ دولت مسود کی خدمت میں روانہ کیا اور یہ درخواست کی۔

”میں بہت ضعیف اور کمزور ہوں لہذا مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ بذات خود خدمت اقدس میں حاضر ہو سکوں۔ میرے حال پر رحم کیا جائے اور جو کچھ ارسال خدمت ہے، اسے قبول کیا جائے اور مجھے اپنے اطاعت گزاروں میں شمار کیا جائے۔“

مسود نے اس کی یہ درخواست قبول کر لی۔ اس نے رام دیو پر حملہ آور ہونے سے گریز کیا اور واپس سون پت چلا گیا۔

اس نے سون پت کی حفاظت اور انتظام کے لیے ایک متحد امیر کو وہاں چھوڑا اور خود سون پت کے آس پاس کے علاقوں کی سرحدیں معرہ ہو گئیں۔

ان علاقوں کو اس نے بہت جلد فتح کر لیا۔ ان پر قبضہ کرنے کے بعد وہ غزنی کی طرف روانہ ہوا۔ لاہور پہنچا تو کچھ دن وہاں قیام کیا۔ اس نے اپنے دوسرے بیٹے ابو انجہر دو کو وہاں کا حاکم بنایا اور اسے ملے دلم عطا کیا اور محمود غزنوی کے مشہور غلام ایاز کو اس کا اتالیق مقرر کر کے غزنی روانہ ہو گیا۔

ابھی وہ غزنی پہنچا بھی نہیں تھا کہ راستے کی دھول اس کے سر کو چھونے لگی۔ اسے ترکمانیوں کی طرف سے بڑھنے والی شورشوں کی خبروں نے چراغ پا کر دیا۔ ایک تو ہندوستان کی سمہات کی جھکن، اوپر سے یہ خبریں۔ میری تقدیر مجھے غزنی کیوں نہیں جانے دیتی؟ ایک چکر ہے جو میرے پاؤں سے لپٹا ہوا ہے۔

دراصل جب وہ ہندوستان پر لشکر کشی کے لیے نکلا تھا تو بک تھڈی اور حسین میاں کے سپرد ترکمانیوں کی بہم کی تھی جس میں انہیں شکست ہو گئی تھی۔ مسود ہندوستان چلا گیا تھا۔ اس کی غیر موجودگی میں راجا ترکمانیوں نے وہ طوقان اٹھایا کہ غزنی کا جدوجہد خطرے میں پڑ گیا۔ خبریں ایسی تھیں کہ وہ سوچنے لگا تھا کہ اسے غزنی دیکھنا نصیب بھی ہوگا یا نہیں۔ اس نے غزنی جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اپنے لشکر کے ساتھ بڑی تیزی سے پنج شہر کا رخ کیا۔

اس کا لشکر اس خوشی میں شاداں چلا جا رہا تھا کہ اس کی منزل غزنی ہے۔ اچانک علم ہوا کہ ترکمانیوں سے ملنا ہے، لہذا ”پلو“ لشکر کی خوشی بے دلی میں بدل گئی۔ اس کا

شکن حد شکن

لشکر اعلیٰ و غارت گری کا مکمل کھیلنے کھیلنے تک چکا تھا۔ ترکمانیوں کو جب خبر ہوئی کہ سلطان مسود ان کی سرکوبی پر آمادہ ہے اور اس کا رخ ”پلو“ کی طرف ہے تو وہ پلو چھوڑ کر ادھر ادھر کے علاقوں میں منتشر ہو گئے۔

وہ وہاں پہنچا تو ترکمانیوں کی کہانیاں تھیں، وہ خود وہاں موجود نہیں تھے البتہ خبروں کی صورت ایک اور آفت منہ کھولے کھڑی تھی۔

مسود نے اطمینان کا سانس لیا تھا کہ یہاں آتے ہی اسے ترکمانیوں کا سامنا کرنا نہیں پڑا لیکن یہ اطمینان وقتی ثابت ہوا۔ اس کے پہنچنے کے ایک دن بعد ہی پنج کے باشندوں کا ایک وفد خدمت میں حاضر ہوا اور اس سے فریادی۔

”دو یا سومو (مادر انجہر) کے اس پار کے علاقوں کے حکمران فطزل بیگ نے دو یا پار کے کئی بار مسلمانوں کے علاقوں میں لوٹ مار کی ہے اور مسلمانوں کا قتل عام کیا ہے۔ اب تو یہ حال ہے کہ مسلمان عورتیں بچوں کو سلاتے وقت کہتی ہیں سو جاؤ نہ فطزل بیگ آجائے گا۔“ ذرا ہوشیار۔ بچے یہ کہہ رہے ہیں کہ کولا جواب کرتے ہیں، آئے دو فطزل بیگ کو کس سلطان مسود کو بلا لوں گا اور عورتیں مایوسی سے کہتی ہیں، سلطان کو ہماری پروا کہاں۔ اسے تو ہندوستان سے فرصت نہیں۔“

سلطان مسود ان کی فریاد سے اتنا متاثر ہوا کہ اس نے ترکمانیوں کے خلاف ہم کو اتنا اس ڈالا اور فطزل بیگ سے دو دو ہاتھ کرنے کا تہیہ کر لیا حالانکہ اسے ایک جذباتی فیصلہ ہی کہا جاسکتا تھا کیونکہ یہ سردیوں کا موسم تھا۔ فطزل بیگ کا علاقہ برف کی چادر اوڑھ چکا تھا۔ اس وقت کوئی دیوانہ ہی ان علاقوں میں قدم رکھ سکتا تھا۔ اس کے امراء اور فوجی افسروں وغیرہ کو اس کے ارادے کی خبر ہوئی تو انہوں نے مخالفت کی اور ترکمانیوں سے منہ کی تلخیں کی۔

”دو سال سے ترکمانی خراسان میں لوٹ مار چائے ہوئے ہیں اور ابلی خراسان ان کی اس روش سے اس حد تک عاجز آ چکے ہیں کہ خراسانیوں کا ایک بڑا حصہ ان کی حکومت تسلیم کرنے کے لیے تیار ہو گیا ہے۔ اس وقت یہی مناسب ہے کہ پہلے ترکمانیوں کا قلعہ فتح کیا جائے اور پھر اس کے بعد کسی اور طرف توجہ کی جائے۔“

مسود نہ تو موسم کی شدت کا قائل ہو سکا، نہ امراء کے دلائل اس پر اثر انداز ہوئے۔ وہ اپنے ارادے پر قائم رہا۔ اس نے دریائے جیحوں پر مل بندھوایا۔ ایک مرتبہ پھر اراکین سلطنت نے اسے روکنے کی کوشش کی۔

سلطان مسود جب پنج میں داخل ہوا تو اسے معلوم ہوا کہ گورگان کی طرف گیا ہے۔ سلطان مسود نے اس کے تعاقب میں گورگان کا رخ کیا۔ داؤد سلجوقی گورگان کو چھوٹا ہوا اپنی محفوظ پناہ گاہوں کی طرف چلا گیا تھا۔ مسود کو ناکامی ہوئی۔ وہ اپنے لشکر کے ساتھ گورگان ہی میں ٹھہر گیا۔

وہ خود بھی گورگان میں تھا، اس کا بیٹا ابو موسیٰ اس کے ساتھ تھا اور مسود کا لشکر بھی یہیں اپنی جھکن اتار رہا تھا۔

اس سے اچھا موقع اور کیا ہو سکتا تھا۔ شہر کے معزز لوگوں نے ایک وفد تیار کیا اور اس سے ملاقات کے لیے پہنچ گئے۔ مسعود جس شہر میں ہوتا تھا، وہاں کے لوگوں سے ملنے میں اسے عار نہیں ہوتی تھی۔ لوگ اجازت لے کر حاضر ہوتے تھے اور مسائل سے آگاہ کرتے تھے۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا، میرے اصل معزز تو کسی شہر کے باشندے ہیں۔ معزز جو باتیں کسی مصلحت کے تحت چھپا لیتے ہیں یہ ظاہر کر دیتے ہیں۔ مسعود نے اس وفد کا نہایت خوش دلی سے استقبال کیا۔

”معزز! دوستو! تمہارے سامنے فرنی کا سلطان نہیں مسلمانوں کا ہمدرد بیٹھا ہے۔ جو کہنا چاہے ہو کسی خطر کے بغیر کہو۔ اگر تمہیں ہم سے بھی کوئی شکایت ہے تو ہم سننے کو تیار ہیں۔“

”سلطان معظم! ہمیں آپ سے تو کوئی شکایت نہیں البتہ آپ کی بے خبری سے شکایت ہے۔“

”بات تو ایک ہی ہوتی، بہر حال پھر بھی کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟ وہ کون سی خبر ہے جس کی ہمیں خبر نہیں؟“

”مختصر! اس علاقے میں علی تقدری نام کا ایک ڈاکو ہے جس نے تہلکہ مچا رکھا ہے۔ بستیوں کی بستیوں اجاڑ دیتا ہے۔ عورتیں اٹھا کر لے جاتا ہے جنہیں لوٹ کر بیچ دیتا ہے۔ مال و اسباب کسی کے پاس نہیں رہتے دیتا۔“

”تم میں سے کسی کو اس کے ٹھکانے کا علم ہے؟“

مسعود کے اس سوال پر ایک شخص اپنی جگہ سے کھڑا ہوا۔ یہ وہ شخص تھا جسے علی تقدری کے آدمی اغوا کر کے لے گئے تھے اور وہ کسی نہ کسی طرح وہاں سے بھاگ نکلا تھا۔

”میں اس قلعے سے واقف ہوں جسے وہ اپنی پناہ گاہ کے طور پر استعمال کرتا ہے۔“

سلطان مسعود نے وفد کو رخصت کر دیا اور اس شخص کو روک لیا جو علی تقدری کے ٹھکانے سے واقف تھا۔ وفد کے چلے جانے کے بعد سلطان نے علی تقدری کے پاس بھیجے گئے لیے چار دیوئی وفد تشکیل دیا۔ اس وفد میں وہ شخص بھی تھا جو اس کے ٹھکانے سے واقف تھا۔

یہ وفد اس قلعے میں پہنچا اور علی تقدری سے ملا۔

”سلطان مسعود تک تمہاری شکایتیں پہنچی ہیں۔ سلطان نے تمہیں گورگان طلب کیا ہے تاکہ تم سے اطاعت اور فرماں برداری کا عہد لے۔“

”میں سلطان کا غلام نہیں ہوں کہ اس کی ایک آواز پر گورگان پہنچ جاؤں۔“

”غلام نہیں، اس کی رعایا تو ہو۔“

”میں اپنی دنیا کا خود غلام ہوں، کسی کی رعایا نہیں۔“

”تم اس کی رعایا نہیں لیکن اس کی رعایا کے لیے اذیت کا باعث بنے ہوئے ہو۔ وہ اپنی رعایا کی حفاظت چاہتا ہے۔“

”تو کولے حفاظت۔ اسے کس نے روکا ہے۔ میری روزی پر کیوں لات مارنا چاہتا ہے۔“

”دیکھو، تم گورگان چلے جاؤ تو قاصدے میں رہو گے۔ ممکن ہے بادشاہ تمہیں معاف کر دے ورنہ۔۔۔۔۔۔“

”ورنہ کیا؟“

”وہ تمہاری سرکونی کے لیے لشکر بھیجے گا۔“

”شوق سے بھیجے۔ میرا لشکر اس کا مقابلہ کرے گا۔ اپنے بادشاہ سے کہو علی تقدری جنگ کے لیے تیار ہے۔“

اس نے نہایت بدتمیزی کا مظاہرہ کرتے ہوئے شاہی وفد کو قلعے سے باہر نکال دیا اور خود قلعہ بند ہو کر بیٹھ گیا۔

شاہی وفد نامراد لوٹا اور وہاں ہونے والی مشکو سے مسعود کو آگاہ کیا تو اس کے غصے کی انتہا نہ رہی۔ اس نے ایک چھوٹا لشکر اس کی سرکونی کے لیے روانہ کر دیا۔

”اگر ایک معمولی ڈاکو کا مقابلہ کرنا میری توہین نہ ہوتی تو میں خود لشکر کے ساتھ جاتا لیکن مجھے یقین ہے کہ میری غیر موجودگی کے باوجود تم اسے زنجیروں میں جکڑ کر میرے سامنے لاؤ گے۔“

لشکر روانہ ہوا۔ علی تقدری کو اپنے بیگمردوں پر بڑا ناز تھا۔ اس نے قلعے کی تفصیل سے شاہی لشکر کو دیکھا تو اور بھی نازاں ہوا۔ ”سلطان نے میری طاقت کا غلط اندازہ لگا یا۔ معمولی سا لشکر بھیج کر سمجھتا ہے کہ وہ مجھے شکست دے دے گا۔ یہ لشکر تو میرے ایک لوالے کا بھی نہیں۔ میں اگر اسے کھلے میدان میں شکست دوں گا تو اس کی شاہی دھڑی رہ جائے گی۔ اس کے غرور نے اسے باہر نکلنے پر مجبور کر دیا۔ اس کا لشکر بادشاہی لشکر سے دو گنا تھا۔ مسعود نے واقعی غلط اندازہ لگا یا تھا لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ علی تقدری نے آتے ہی ہلا بول دیا۔ شاہی لشکر نے بھی بہرہ ور جواب دیا۔ جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ علی تقدری کا لشکر تعداد میں زیادہ نہیں زیادہ ضرور ہے لیکن اسے جنگ کا تجربہ نہیں۔ نئے نئے لوگوں سے لڑنا اور بات ہے اور تجربہ کار فوج سے لڑنا دوسری بات ہے۔ اس کے لشکر کی کٹ کٹ کر کرنے لگے۔ جب اس نے دیکھا کہ اس کے سپاہی آدھے بھی نہیں رہ گئے تو وہ قلعے کی طرف بھاگا۔ چاہتا تھا کہ قلعے میں داخل ہو کر دروازے بند کر لے لیکن اسے دیکھ کر اس کے سپاہی بھی دروازے کی طرف بھاگے۔ دروازہ بند کرنے میں اتنی دیر لگ گئی کہ فرنی لشکر

لاتا بڑتا قلعے میں داخل ہو گیا اور ڈاکو گرفتار کر لیا گیا۔ اس کے سچے بچے سامنے بھی گرفتار کر لیے گئے۔ اس کی نشاندہی پر لوگوں کا لوتا ہوا مال بھی قلعے کی کھڑکیوں سے نکل آیا۔ کچھ نئی عورتیں اور مرد بھی بازیاں کر لے گئے۔

سلطان مسعود کا لشکر ان سب کو لے کر گورگان کے نواح میں پہنچا جہاں سلطان مسعود ان کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے اپنے سالار کو مہارک بادوی کہہ کر علی تقدری کو زندہ گرفتار کر کے لے آیا تھا اور پھر علی تقدری سے مخاطب ہوا۔

”تمہاری بد بختی سے میرا ہم کلام ہونا میری توہین ہے لیکن میں تیرا انجام تجھے یاد دلانے کے لیے تجھ سے مخاطب ہوں۔ تیری کم سے کم سزا یہ ہے کہ تیری گردن اڑا دی جائے۔“

”اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ میرے ساتھیوں میں سے بہت سے ابھی زندہ ہیں جو تجھ سے بدلہ لیں گے۔ تمہ سے بدلہ لے سکے تو تیری رعایا کا جتنا حرام کروں گے۔“

”تو کتنا بد بخت ہے کہ مرے وقت بھی تجھ پر توبہ کا دروازہ بند ہے۔“

جب علی تقدری کو یقین ہو گیا کہ سلطان اسے سزا دیے بغیر نہیں مانے گا تو معافی طلبی پر اتر آیا۔

”اگر اس مرتبہ مجھے معاف کر دیا جائے تو میں آئندہ کے لیے برے کاموں سے توبہ کر لوں گا۔“

”توبہ کا وقت گزر گیا۔ میرے بلانے پر اگر تو گورگان آ جاتا اور میری اطاعت کا دم بھرتا تو میں تجھے معاف کر سکتا تھا لیکن تو نے وہ وقت نکال دیا۔ اب اگر توبہ کر رہا ہے تو یہ تیری چالاکی ہے۔“

سلطان نے اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا۔ وہ اسے گھسیٹتے ہوئے ایک طرف لے گئے اور اس کی گردن اڑا دی۔ غلٹی خدا نے اطمینان کا سانس لیا۔

اب مسعود کو فرنی کا رخ کرنا تھا لیکن اسی دوران پہ خبریں گشت کرنے لگیں کہ ادھر ادھر بکھرے ہوئے ترکمانی شہزادے ”مرز“ میں جمع ہو رہے ہیں۔ سلطان مسعود کو اپنا عہد یاد آیا۔ وہ ترکمانوں کے خلاف ہم پر جانا چاہتا تھا لیکن مغزل بیگ کا قہقہہ سامنے آ گیا تھا اور اس نے ترکمانوں کے خلاف ہم ترک کر دی تھی۔ اب جو اس نے ترکمانوں کے جمع ہونے کی خبریں سنیں تو وہ شہر مد کی طرف روانہ ہوا۔

ترکمانوں نے جب سنا کہ سلطان مسعود ”مرز“ کی طرف کوچ کر رہا ہے تو وہ گھبرا گئے۔ انہوں نے ایک قاصد مسعود کی طرف روانہ کیا اور کہا بھجوا۔

”ہماری قوم پوری طرح بادشاہ کی اطاعت گزار اور فرماں بردار ہے۔ ہم نے اب تک جو جہنم اٹھائی ہے وہ صرف اس لیے کہ ہمارا کوئی زبردست معاش نہیں۔ اگر بادشاہ ہماری معاش کے لیے مدد فرمائے اور اتنی جاگیر و نف کر دے کہ ہمارے جانوروں اور اہل و عیال کی کفالت ہو سکے تو آئندہ کے لیے ایسی حرکتوں سے توبہ کر دیں گے۔“

مسعود نے ان کی اس درخواست کو قبول کیا اور ان کے سردار ”بیخو“ کے پاس اپنا ایک قاصد بھیجنا کہ وہ اپنے وعدے کی ضمانت دے اور نیک چلتی کا یقین دلائے۔

سردار بیخو نے اس قاصد کے ذریعے سلطان مسعود کو یقین دلایا کہ وہ اپنی قوم کو راجہ راست پر رکھے گا اور ہمیشہ سلطان کا وفادار رہے گا۔ اس کے علاقوں کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھے گا اور اس سے ٹکرانے سے ہمیشہ گریز کرے گا۔

سلطان اس جواب سے بہت خوش ہوا۔ وہ خود اس آوارہ گرد بیگمرد قوم سے ٹکرانے کے حق میں نہیں تھا۔ وہ تو ہمیشہ سے یہ چاہتا رہا تھا کہ اس کے علاقوں میں امن رہے تاکہ وہ ہندوستان کے راجاؤں سے آسان جنگیں لڑتا رہے۔ معمولی سی جاگیر دے کر امن خریدنا اسے برا نہیں لگا۔

اب اسے ”مرز“ جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس نے اپنا رخ ہرات کی طرف موڑ دیا۔

”مرز“ سے ہرات جاتے ہوئے مسعود ابھی راستے ہی میں تھا کہ ترکمانوں کا ایک لشکر اچانک کوہستانی سلسلے سے نمودار ہوا اور سلطان مسعود کو فرنی کے لشکر کے پچھلے حصے پر حملہ آور ہوا۔ چند سپاہیوں کو گل کیا اور خوراک سے لدے ہوئے بار برداری کے جانور اپنے ہمراہ لے گئے۔ کوہستانی سلسلہ انہیں چھپانے کے لیے دو رنگ پھیلا ہوا تھا۔

سلطان مسعود کو معلوم ہوا تو ترکمانوں کی اس حرکت پر سخت غضب ناک ہوا۔ اس نے لشکر دہیں روک دیا اور لشکر کا ایک دستہ ان کے پیچھے روانہ کیا۔ توڑی دور جا کر اس لشکر نے ترکمانوں کو جالیا۔ ترکمانی بھی سسل تھے۔ دونوں لشکروں میں شدید بے گراؤ ہوا۔ ترکمانوں نے بہت جا بجا کہ وہ شاہی لشکر پر غالب آ جائیں لیکن ان کی ایک نہ چلی، بہادر تھے اس لیے بھاگنے پر مرنے کو ترجیح دی۔ کچھ ٹھہرے ہوئے، باقی گرفتار کر لیے گئے۔ لاشوں اور قیدیوں کو مسعود کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ اس نے ان مردہ اور زندہ ترکمانوں کو گدھوں پر سوار کر کے ان کے سردار ”بیخو“ کے پاس بھجوا دیا اور کہا بھجوا۔

”پہ دیکھو اور آئندہ کے لیے ہوشیار ہو جاؤ۔ جو کوئی وعدہ خلافی کرتا ہے اور اپنے عہد کو توڑتا ہے اس کا بھی حال

ہوتا ہے۔“

یہ گرفتار ہونے والے ترکمانی جب بیٹو کے پاس پہنچے تو اس نے سلطان کو پیغام بھجوایا۔ ”میں خود بھی ان لوگوں سے بے زار تھا اور میں خود ان کو مزادینا چاہتا تھا جو انہیں خود بخود لگتی۔“

بیٹو نے اس واقعے سے اپنی لامٹی عاہر کی اور معذرت کی۔

مسعود اب مطمئن تھا۔ وہ ہر اس سے بیٹھا پورا یا اور وہاں سے طوس کی طرف روانہ ہوا۔ طوس کے قرب و جوار میں بھی ترکمانوں کے ایک چھوٹے سے لشکر نے سلطان سے چھیڑ چھاڑ کی۔ سلطان نے ان کی اکثریت کو موت کے گھاٹ اتارا اور طوس شہر میں داخل ہو گیا۔ یہاں آ کر اسے معلوم ہوا کہ باد آورده کے باشندوں نے قلعہ ترکمانوں کے حوالے کر دیا ہے۔ اس نے طوس کے قلعے کو فتح کر کے اہالیان قلعہ کو قتل کیا اور پھر بیٹھا پار کی طرف واپس ہوا۔

☆☆☆

سلطان مسعود اب فخرل بیگ اور ترکمانوں کے درمیان گھرا ہوا تھا۔ یہی فخرل بیگ اس کے مقابلے پر آتا کچھ دیر لڑتا اور بھاگ جاتا، یہی ترکمانی اس کے ساتھ ساتھ چلتے، موقع دیکھ کر حملہ آور ہوتے اور لوٹ مار کر کے پھاڑوں میں کم ہو جاتے۔ اسے عیار دشمنوں سے واسطہ پڑا تھا اور وہ حتی الامکان ان سے نمٹ رہا تھا۔ سلطان کا لشکر اس آگہ بھلی سے تھک چکا تھا۔ بڑے بڑے سردار اس سے تالاں ہونے لگے تھے کہ وہ انہیں آرام کا موقع ہی نہیں دیتا۔ انہیں مسلسل جنگوں میں مصروف رکھے ہوئے ہے۔ مسعود کو ان عناصر کے تہود پینے چاہیے تھے لیکن وہ اس بدلتی ہوئی صورت حال کو خاطر میں نہیں لارہا تھا۔

ترکمانی اسے کہیں جہن سے نہیں بیٹھے دے رہے تھے۔ مسعود نے بھی انہیں تاگوں پہنے چھوڑ دیے تھے۔ وہ ہر جگہ ان کا پیچھا کرتا پھر رہا تھا۔ نگ آ کر ترکمانوں نے اس معاہدوں کو خاتمہ میں رکھا اور آپس میں اتفاق کر لیا۔

”گھڑیوں میں بیٹ کر مسعود کے خلاف کارروائیاں کرنے کا کوئی قاعدہ نہیں۔ ہمیں چاہیے کہ ہم سب مل کر چاروں طرف سے اسے گھیر لیں اور اس کا خاتمہ کر دیں۔“

اس منصوبے پر عمل کرنے کا انہیں بہت جلد موقع مل گیا۔ سلطان مسعود ایک ہم کے لیے ”مرخس“ کیا ہوا تھا۔ جب وہ ”مرخس“ سے نکل کر کھلے میدان میں آیا تو ترکمانوں نے جمع ہو کر چاروں طرف سے اسے گھیر لیا۔

مسعود نے بھی فوج کو مرتب کیا اور فریقین کے درمیان جنگ شروع ہو گئی۔

مسعود کے بہت سے سردار جو اس سے نگ آچکے تھے، کچھ دیر تو لڑے اور پھر دشمن سے مل گئے۔ اس تنگ حرای پر مسعود کے فھے کا ٹھکانا نہیں رہا تھا۔ اس نے ان خداریوں کی پردا نہیں کی اور خود میدان میں اتر آیا لیکن برے دن اس کا پیچھا کر رہے تھے۔ ترکمانوں کو بھاری پڑتے ہوئے دیکھ کر اس کے لشکر کا دافرحصہ اپنے سرداروں سمیت میدان جنگ سے فرار ہو گیا۔ اب وہ چیدہ چیدہ سالاروں اور بہت تھوڑے لشکر کے ساتھ تیار ہو گیا۔ جب اس نے دیکھا کہ بہت کم لوگ اس کے ساتھ رہ گئے ہیں تو ان چند ساتھیوں کے ساتھ دشمن کی صفوں کو چرتا ہوا میدان سے بھاگ نکلا۔ دشمن نے اسے بھاجتے ہوئے دیکھا لیکن کسی کو یہ جرأت نہ ہوئی کہ کوئی اس کا تعاقب کرتا۔ اسے یہ شک ضرور تھا کہ دشمن اس کا تعاقب کرے گا اس لیے برقی رفتار سے دوڑ رہا تھا۔ اسی طرح دوڑتے دوڑتے وہ ”مرد“ پہنچا۔ اس کے مفرد لشکر کا کچھ حصہ اس سے پہلے ہی وہاں پہنچ چکا تھا۔ مسعود کے وہاں پہنچنے ہی یہ لشکر اور چند مفرد سردار اس سے آئے۔

اب یایس اور دل شکستہ مسعود غزنی اپنی ہزیمت کسی میت کی طرح اپنے کاندھے پر اٹھائے غزنی کی طرف رواں دواں تھا۔ مفرد سردار اور لشکر بھی اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ راستے بھر اس نے ان سے کوئی بات نہیں کی لیکن غزنی پہنچنے ہی اس نے انہیں ان کی خداری کی سزا دی۔ پہلے انہیں گرفتار کیا گیا پھر ذلیل و رسوا کیا اور آخر کار ہندوستان بھجوا کر وہاں کے مختلف قلعوں میں قید کرادیا۔ ان قیدیوں میں اس کے مشہور زمانہ سالار بک تھدی اور حاجب شیبانی بھی تھے۔

ان قیدیوں میں سے اکثر نے قید کی حالت میں وفات پائی۔

اس شکست اور ساتھیوں کی خداری نے سلطان کو پڑمردہ کر دیا۔ اس کے پاس معمولی سا لشکر رہ گیا تھا۔ اس کے قدیمی اور عزیز ترین سالار ہندوستان کے قلعوں میں قید تھے۔ اس نے اہم ترین معرکوں میں کامیابی حاصل کی تھی اور اپنی دھاک بٹھائی تھی۔ اس ایک شکست نے ان سب پر پانی پھیر دیا تھا۔ اب وہ دوبار بھی کم متعقد کر رہا تھا۔ ایک قسم کی گوشہ نشینی کی زندگی گزار رہا تھا۔ اس کے ہر دوسا سہمی اس کی طرف سے سخت غمر تھتے۔۔۔ بالآخر

شکست در شکست

اس نے اس تنہائی سے نگ آ کر خود کو ملٹی مصروفیات میں ”تھک کر لیا۔ وہ ابتداء سے ہی مل اور مل پر در تھا۔ سرکر آرائیوں نے اسے اس طرف سے غافل کر دیا تھا۔ نہ اس کی تربیت کسی طالب علم کی طرح کی گئی تھی۔ خوش بیان ادیب، عربی زبان کا ماہر اور علوم ہکلیہ کا دلدادہ تھا۔ علم ویت کا شائق اور ساسی علوم۔ دانش وروں، شاعروں اور ادیبوں کو اخانات سے نوازا کرتا تھا۔

سلطان مسعود چونکہ عالموں کا قدردان تھا اس لیے وہ بیرونی کی بھی قدر کرتا تھا۔ بیرونی بھی اس کا دل سے مباح تھا۔ سلطان مسعود بیرونی کے ساتھ اکثر ساسی اور ملٹی موضوعات پر تبادلہ خیال کیا کرتا تھا، ایک دفعہ اس نے بیرونی سے دریافت کیا کہ رات اور دن کیوں گنتے پڑتے ہیں۔ یہی رات کیسے ہوتی ہے اور کبھی دن لہبا ہو جاتا ہے۔ سورج قطبین پر غروب کیوں نہیں ہوتا؟ اس بارے میں وہ مشاہدے کے ذریعے واضح دلائل بتا سکتا تھا۔ بیرونی نے سلطان کے لیے آسان زبان میں کتاب التلیل والتہار لکھی۔ چونکہ سلطان عربی زبان میں مہارت رکھتا تھا اس لیے یہ کتاب پڑھ کر بہت خوش ہوا۔

سلطان مسعود چونکہ علم ویت اور حقائق علیہ میں شغف رکھتا تھا لہذا اس بات کے پیش نظر بیرونی نے علم ویت اور نجوم پر ایک نہایت عمدہ کتاب لکھی جس کا طرز بیان بہت سادہ اور آسان تھا۔ اس نے نجوم کے مسائل پر بہت کم بحث کی، ساسی اصطلاحات بھی بہت کم استعمال کیں۔ تمام مسائل کو اس طریق سے بیان کیا کہ جو کسی اس فن سے معمولی شغف رکھتا ہو، وہ اس کے مفہوم کو سمجھ سکتا تھا۔ اس نے علم ویت کے وہ مسائل جن تک مسلمان رسائی حاصل کر سکتے تھے، تمام کے تمام بیان کر دیے۔ بیرونی نے اس مرکز کو کتاب کا نام سلطان مسعود کے نام پر ”قانون مسعودی“ رکھا۔ جب کتاب سلطان کو پیش کی گئی تو اس کا دل باغ باغ ہو گیا۔ اس نے بیرونی کو غلط سے نوازا اور چاندی کے سکوں سے لدا بھی بیرونی کو انعام کے طور پر پیش کیا۔

سلطان مسعود ہی کے حکم سے بیرونی نے ایک اور کتاب بھی تحریر کی جس میں موضوع سے متاسبت رکھنے والی قرآن حکیم کی آیات جگہ جگہ دلیل کے طور پر پیش کیں۔ علم نجوم پر یہ کتاب اسنے اعلیٰ پائے کی کمی کہ سلطان نے بے حد پسند کی اور انعام واکرام سے نوازا۔

ایک البیرونی پر ہی تھمر نہیں، اس زمانے کے مشہور عالم قاضی ابو محمد نے اپنی تعظیم الشان کتاب جو تفسیر فی عالم اس نے اس تنہائی سے نگ آ کر خود کو ملٹی مصروفیات میں ”تھک کر لیا۔ وہ ابتداء سے ہی مل اور مل پر در تھا۔ سرکر آرائیوں نے اسے اس طرف سے غافل کر دیا تھا۔ نہ اس کی تربیت کسی طالب علم کی طرح کی گئی تھی۔ خوش بیان ادیب، عربی زبان کا ماہر اور علوم ہکلیہ کا دلدادہ تھا۔ علم ویت کا شائق اور ساسی علوم۔ دانش وروں، شاعروں اور ادیبوں کو اخانات سے نوازا کرتا تھا۔

سلطان مسعود چونکہ عالموں کا قدردان تھا اس لیے وہ بیرونی کی بھی قدر کرتا تھا۔ بیرونی بھی اس کا دل سے مباح تھا۔ سلطان مسعود بیرونی کے ساتھ اکثر ساسی اور ملٹی موضوعات پر تبادلہ خیال کیا کرتا تھا، ایک دفعہ اس نے بیرونی سے دریافت کیا کہ رات اور دن کیوں گنتے پڑتے ہیں۔ یہی رات کیسے ہوتی ہے اور کبھی دن لہبا ہو جاتا ہے۔ سورج قطبین پر غروب کیوں نہیں ہوتا؟ اس بارے میں وہ مشاہدے کے ذریعے واضح دلائل بتا سکتا تھا۔ بیرونی نے سلطان کے لیے آسان زبان میں کتاب التلیل والتہار لکھی۔ چونکہ سلطان عربی زبان میں مہارت رکھتا تھا اس لیے یہ کتاب پڑھ کر بہت خوش ہوا۔

مرنے سے پہلے

ڈاکٹر مذہبی خیالات رکھتا تھا۔ جس مریض کو دوا دیتا اسے کوئی روحانی ہدایت بھی کر دیتا۔ ایک نوجوان کے لیے نسخہ لکھنے کے بعد اس نے کہا۔
نوجوان! مجھے بتاؤ کسی کو جنت میں جانے کے لیے کیا کرنا چاہیے؟
”نوجوان چاہیے۔“ نوجوان نے جواب دیا۔
ڈاکٹر کچھ پریشان ہوا اور پھر بولا۔
”لیکن مرنے سے پہلے کیا کرنا چاہیے؟“
”آپ کو بلالینا چاہیے۔“ نوجوان نے جواب دیا۔

مرسلہ: وزیر محمد خان، محل ہزارہ

اور غزنی شہر سے دور رہنے کے بعد بہت سے لشکری اس سے ملا ہیں۔ وہ تو انشاؤں میں ہوں گے کہ سلطان مسعود سے جان بھری۔ انہیں اپنے گھروں کو جانے کا موقع ملا۔ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ سلطان کے زیادہ تر لشکری اس کا ساتھ چھوڑ کر جا چکے ہیں۔ جو ہیں وہ بھی بس زبردستی اس کے ساتھ ہیں۔“
”اس کے باوجود ہم یہ کام اکیسے نہیں کر سکتے جب تک کچھ بڑے سالار ہمارے ساتھ شامل نہ ہو جائیں۔“
رات نے ایک قدم اور بڑھا دیا تھا۔ اس سوال کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا کہ اسے اپنے ساتھ ملایا جائے۔
آخری فیصلہ پھر یولاجس نے یہ تجویز دی تھی۔
”میری نظر میں دو آدمی ہیں جو بے آسانی سلطان کے خلاف ہو سکتے ہیں۔“

”دو کون.....؟“ کئی آوازیں ایک ساتھ ابھریں۔
”سلیمان بن یوسف اور علی خورشید کا بیٹا۔“
”تم نے یہ کیسے جان لیا کہ یہ دونوں ہمارا ساتھ دیں گے؟“
”کیا تمہیں یاد نہیں کہ علی خورشید کو سلطان نے قتل کر دیا تھا اور یوسف کو قید میں ڈال دیا تھا اور وہ اسی عالم اسیری میں جیل بسا تھا۔ ان دونوں کو یہ واقعات یاد ہوں گے۔ اپنے باپ کے قاتل کے خلاف وہ ضرور اٹھ کھڑے ہوں گے۔ ہم انہیں بدلہ لینے کا آسان موقع فراہم کر رہے ہوں گے۔“

بات سب کی سمجھ میں آگئی۔ اب وقت خالص کرنے کا موقع نہیں تھا۔ ان میں سے چند لوگ اٹھے اور علی خورشید کے خیمے میں پہنچ گئے۔ وہیں سلیمان بن یوسف کو بھی بلوایا گیا۔
یہ پہلے ہی طے کر لیا گیا تھا کہ انہیں خزانے کے بارے میں کچھ نہیں بتایا جائے گا ورنہ ان کا حصہ بھی انہیں دینا پڑے گا۔

جب سلیمان بن یوسف بھی آگیا تو سرکشوں نے دکان کھالی۔ ان دونوں کو یاد دلایا گیا کہ سلطان ان کے باپ کا قاتل ہے۔
”یہ ہمیں بھی معلوم ہے۔ بدلے کی آگ ہمارے دل میں بھی جل رہی ہے، لیکن ہم سلطان سے ٹکرانے کی ہمت نہیں رکھتے۔ ہم تم لوگ یہ بتاؤ کہ تم کس مقصد کے لیے آئے ہو؟“ سلیمان بن یوسف نے کہا۔

”آپ کو معلوم ہے سلطان مسعود کا بھائی امیر محمد یہاں پہنچ چکا ہے۔“
”ہمیں یہ بھی معلوم ہے۔“
”تو پھر ہمارا منصوبہ یہ ہے کہ سلطان مسعود کو گرفتار

کر رہا ہے؟

وہ اس خواب کے مختلف پہلو سوچتا رہا لیکن کوئی واضح تعبیر سمجھ میں نہ آئی۔ اگر کوئی بات سمجھ میں آئی تو یہ کہ شاید کوئی بڑی افواہ پیش آنے والی ہے۔ مجھے اب باقی سبزی احتیاط سے طے کرنا ہے۔

صبح ہوئی اور یہ قافلہ ایک مرتبہ پھر روانہ ہوا۔

جب مسعود رباط مارا (مخ لفظ ”مارگھ“ ہے۔ یہ مقام راولپنڈی اور انک کے درمیان واقع ہے) یاد رہا تو جہلم کے قریب پہنچا تو ان غلاموں نے جو خزانے کی حفاظت پر مامور تھے، اس خزانے کا کچھ حصہ لوٹ کر اپنے خیموں میں چھپا دیا۔

انہوں نے یہ فیصلہ بد انجام تو دے لیا لیکن یہ سوچ کر ان پر لرزہ طاری ہو گیا کہ اگر خزانے کے لوٹے جانے کی خبر سلطان مسعود کو ہوگئی تو ہم میں سے کوئی زندہ نہیں بچے گا۔ کسی کا سراں کی گردن پر نہیں رہے گا۔

سلطان نے پڑاؤ کر لیا تھا۔ خزانے کے پہرے دار تبدیل ہو گئے تھے۔ جن لوگوں نے خزانے پر ہاتھ صاف کیا تھا وہ سب ایک خیمے میں جمع ہو گئے تھے اور اپنے بچاؤ کی ترکیبیں سوچ رہے تھے۔

”اب پہرے دار تبدیل ہو گئے ہیں۔ چوری کا الزام ان پر آئے گا۔“ ایک نے کہا۔

”کیسی آوازیں کی باتیں کرتے ہو۔ دولت ہمارے خیموں سے برا نہ ہوگی۔“

”یہ راز بھی کھلنے والا نہیں۔“

”یہ راز جب بھی کھلے گا، سلطان ہمیں چھوڑے گا نہیں۔“

”ہم یہ دولت لے کر کہیں فرار ہو جائیں گے۔“

”اس طرح ہم اپنے پاؤں پر کھڑی خود ماریں گے۔ ہم پاتال میں بھی چھپ گئے تو سلطان ہمیں ڈھونڈ لے گا۔“

”پھر کیا ہو سکتا ہے۔ جلدی سوچو رات گزرنے والی ہے۔“

ان کا ایک ساتھی جو بڑی دیر سے خاموش بیٹھا تھا، کچھ سوچ کر بولا۔

”اس کا ایک ہی حل ہے اور وہ یہ کہ سلطان کو گرفتار کر کے معزول کر دیا جائے۔ اس کا بھائی امیر محمد یہاں پہنچ چکا ہے، اس کی بادشاہت کا اعلان کر دیا جائے۔“

”سلطان کا لشکر ایسا ہونے دے گا؟“

”بالکل ہونے دے گا۔ سلطان کی آنے دن کی مہموں

کر کے ایک قلعے میں قید رکھا ہوا تھا۔ برسوں سے اس کا خیال تک نہیں آیا تھا لیکن اس وقت وہ اسے بے تحاشا یاد آ رہا تھا۔ اس نے لشکر کو پڑاؤ کرنے کا حکم دیا۔ جتنے سالار تھے، سب حیران تھے کہ اتنی جلدی کون سی ممکن غالب آگئی کہ بادشاہ پڑاؤ کر رہا ہے۔

خزانے سے لے ہوئے اثاثہ و قمار غلاموں کے پہرے میں لشکر سے الگ کھڑے تھے۔

پڑاؤ کرتے ہی مسعود اپنے خیمے میں بند ہو گیا۔ کسی کو اندر آنے کی اجازت نہیں تھی۔ وہ سوچ رہا تھا، امیر محمد کے بارے میں کیا ہونا چاہیے۔ وہ ناپتا ہو چکا ہے۔ اب اس کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں۔ اگر اسے اپنے پاس بلا لیں اور لاہور پہنچ کر اسے اپنے ساتھ رکھوں تو کیا حرج ہے۔ اسے تمام پہچلی باتیں یاد آ رہی تھیں۔ اسی وقت وہ اقتدار پر قابض ہو گیا تھا۔ اسے سزا دینی ضروری تھی لیکن اب سلطنت میرے پاس ہے۔ لشکر میرا ہے، طاقت میری ہے۔ وہ میرے لیے خطرہ نہیں بن سکتا۔ اگر میں نے اسے رہائی دلا دی تو وہ میرے میرا احسان مندر ہے گا۔

وہ گھنٹوں اپنے آپ سے جنگ کرتا رہا۔ کبھی ایک رائے قائم کر لیتا، کبھی دوسری رائے اختیار کر لیتا۔۔۔ بالآخر اپنے ایک آدمی کو اس کام کے لیے بھیجا کہ وہ اس کے بھائی امیر محمد کو قلعے سے نکال کر اس کے سامنے لائے۔

اسے اسی مقام پر رات بسر کرنی تھی اور صبح ہوتے ہی روانہ ہونا تھا۔ وہ سونے کے لیے لیٹا تو نیند کبھی دور جا کر کھڑی ہوگئی تھی۔ وہ کروٹیں بدلتا رہا اور سوچتا رہا۔ رات کے کسی پہر میں اسے نیند آگئی۔ اس نے ایک بھیانک خواب دیکھا۔ اس نے دیکھا کہ ایک بہت بڑا میدان ہے جہاں لاکھوں آدمیوں کی بھیڑ ہے۔ اتنے لوگ جمع ہیں کہ راستہ بنا کر ٹکنا محال ہے۔ اچانک وہ بھیڑ چھٹ گئی۔ گزرنے کے لیے راستہ بن گیا۔ پھر ایک فیصلہ دور سے آتا دکھائی دیا۔ قریب آیا تو مسعود کو پہچاننے میں وقت نہیں ہوئی۔ سرخ ریشم میں لپٹا ہوا وہی مجذوب فقیر تھا لیکن اس حالت میں کہ اس کی گردن پر سر نہیں تھا۔ اس نے اپنا کٹا ہوا سراپتی پھیل پر رکھا ہوا تھا اور وہ جل رہا تھا۔ جب وہ اس بھیڑ میں راستہ بناتا ہوا آگے بڑھا تو لوگوں نے گریہ و زاری شروع کر دی۔

مسعود کی آنکھ کھلی تو اس کے رخسار بھی آنسوؤں سے تر تھے۔ وہ ایک مرتبہ پھر اس خواب کو دہرانے لگا۔ وہ مجذوب خود جل ہو گیا ہے یا کسی مکہ قتل کی طرف اشارہ

دیکھا گیا۔ کچھ لوگ تھے جو ایک جگہ سے دوسری جگہ جا رہے تھے۔ کئی سالہ بھی آپس میں لے۔

شام ہوتے ہوتے کچھ دتے غزنی اور بلخ کی طرف جانے والی شاہراہوں پر متین ہو گئے۔ احتیاط کے طور پر لاہور جانے والی سڑک کو بھی بند کر دیا گیا۔

لنگر میں عام طور پر سلطان مسعود کی طرف سے شکایت پائی جاتی تھی۔ سلیمان بن یوسف اور علی خورشید کے بیٹے کے طرفدار بڑی تعداد میں موجود تھے۔ ترکمانوں سے شکست کھانے کے بعد جن سالاروں مثلاً بک تغزی وغیرہ کو اس نے ہندوستان کے قلعوں میں قید کر دیا تھا، ان کے حامی بڑی تعداد میں موجود تھے۔ بعض وہ تھے جنہیں برسوں ہو گئے تھے اور گھر جانا نصیب نہیں ہوا تھا۔ ان وجوہات کی بنا پر تقریباً سارا لشکر مسعود کا مخالف ہو گیا۔ مسعود مجبوراً مارگہ میں قلعہ بند ہو گیا۔ اس کے سواہ کچھ اور کبھی نہیں سکتا تھا۔ بھاگنے کی تین شاہراہیں بند ہو گئی تھیں۔ لنگر خلاف تھا۔ امراء نے انھیں پھیر لی تھیں۔ ابھی دو پہر تک یہ حال تھا کہ دوستوں نے اسے گھیرا ہوا تھا۔ ایک شاعر اسی دن لاہور سے یہاں پہنچا تھا اور اس کی شان میں قصیدہ پیش کر کے انعام وصول کر کے رخصت ہوا تھا۔ کسی کو گمان بھی نہیں تھا کہ ابھی چند گھنٹوں کی مہلت میں کیا ہو جائے گا۔ جب لنگر نے حملہ کیا تو وہی امراء دشمن کی صفوں میں کھڑے نظر آئے بلکہ ایک صاحب کی مہربانی سے لنگر کو رباط میں داخل ہونے کا موقع ملا۔ سلیمان بن یوسف، علی خورشید کا بیٹا اور بک تغزی کا ایک عزیز جو مسعود کے درباریوں میں شامل تھا، لنگر یوں کی ایک بڑی تعداد کے ساتھ مسعود کے پاس گئے اور اس کے پیروں میں بڑیاں ڈلوادیں۔

”سلطان معظم یہ نہیں پوچھیں گے کہ لاہور اب کتنی منزل دور رہ گیا ہے؟“ اس کے باقی امراء نے خطر اس سے پوچھا۔

”میں اندھوں سے راستہ نہیں پوچھا کرتا۔“

”ہم اندھے ہیں مگر ہم نے آپ کو خوب پہچانا۔“

”پہچان لینے تو اس ذلت کا کام نہ کرتے جواب کر رہے ہو۔“

”ہم نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔ ہم نے تو وہی کیا جو اس سے پہلے آپ کرتے رہے ہیں۔ آپ نے اپنے بھائی امیر محمد سے اس کی بیٹائی جھین لی تھی۔ اب ہم حضور کو انہی کے پاس لیے چلتے ہیں۔ دیکھیے وہ آپ کے بارے میں کیا فیصلہ صادر کرتے ہیں۔“

”وہ ہمارا قیدی فیصلہ صادر کرنے والا کون ہوتا ہے۔“

”وہ آپ کا قیدی نہیں، غزنی کا حکمران ہے۔ اس نے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا ہے۔“

سلطان مسعود کے لیے یہ اطلاع بالکل نئی تھی۔ اب اس کی سمجھ میں آیا کہ امیر محمد اب تک اس سے ملاقات کے لیے کیوں نہیں آیا تھا۔ اسے یہ بھی تعجب ہو رہا تھا کہ امیر محمد اب تک لنگر گاہ کے اس خیمے میں رہ رہا تھا۔

سلطان مسعود کو امیر محمد کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ اس کے پیروں میں بڑیاں اب بھی پڑی ہوئی تھیں۔ امیر محمد تو دیکھ نہیں سکتا تھا لیکن سلطان مسعود دیکھنے کی طاقت رکھنے کے باوجود اسے نہیں دیکھ رہا تھا۔ یہ اس کی غرت تھی جو اسے امیر محمد کی طرف دیکھنے نہیں دے رہی تھی۔

”یہ تو میں نہیں دیکھ سکتا کہ تمہاری آنکھوں میں میرے لیے کتنی غرت ہے لیکن سوچ سکتا ہوں کہ میں بااختیار ہوں۔ میں تمہیں قتل تو نہیں کراؤں گا البتہ نظر بند ضرور کروں گا۔ تم جو جگہ اپنے اور اپنے بال بچوں کے لیے منتخب کر دو ہیں تمہیں قید کروں گا تا کہ تم اپنی زندگی کے باقی دن اطمینان سے بسر کر سکو اور اپنی آنکھوں سے میرا دور حکومت دیکھو۔“

مسعود نے قلعہ گیری (یہ قلعہ دو پائے سندھ کے قریب واقع تھا) میں رہنا پسند کیا اور دو ٹوکی کی تیاری کرنے لگا۔ جب مسعود دو ٹوکی کی تیاری کرنے لگا تو اس کے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی لہذا اس نے امیر محمد کے پاس ایک آدمی بھیجا تا کہ وہ اخراجات کے لیے رقم لائے۔ امیر محمد نے پانچ سو درہم بھجوائے۔ جب یہ رقم اس کے سامنے آئی تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

”سبحان اللہ! کل اسی وقت میرے قبضے میں زردو ہار سے لے دے ہوئے تین ہزار اونٹ تھے اور آج یہ عالم ہے کہ میرا بھائی مجھے پانچ سو درہم بھجوا رہا ہے۔ میرا ایک اونٹ ہی مجھے واپس کر دیتا۔“

مسعود نے اسی وقت اپنے چند ساتھیوں سے ایک ہزار دو تینار بطور قرض لیے اور وہ پانچ سو درہم جو امیر محمد نے بھجوائے تھے، اسی شخص کو بطور انعام دیے جو لے کر آیا تھا۔

سلطان مسعود کے قلعہ گیری روانہ ہونے کے بعد امیر محمد رباط مارگہ میں داخل ہو گیا۔ سلطان مسعود کا خزانہ اور لشکر سب بچہ اس کے ہاتھ آ گیا۔

امیر محمد نہ کہ اندھا تھا اس لیے اس نے سلطنت کا تمام کاروبار اپنے محبوبہ الحواس بیٹے احمد کے سپرد کر دیا۔ احمد کا دماغ تو ازل ہی بہت درست نہیں تھا۔ اسے پاگل نہیں کہا جا

تا تھا لیکن محبوبہ الحواس ضرور تھا۔ بعض اوقات ایسے کام کر جاتا تھا کہ بعد میں خود پچھتا جاتا تھا۔

جب سلطان مسعود قلعہ گیری میں قفل ہو گیا تو ایک روز امیر محمد کے دو چھوٹے بیٹے عبدالرحمن اور عبدالرحیم اپنے بپائی مسعود سے ملنے قلعہ گیری گئے۔

عبدالرحمن نے مسعود کو دیکھتے ہی بڑی بدتمیزی سے کہا۔ ”اب یہ سرتاج شای کے قائل نہیں رہا۔“ اور پھر اس نے سرے نوٹی اتار کر زمین پر پیچک دی۔ یہ ایسی بدتمیزی تھی کہ عبدالرحیم براشت نہ کر سکا۔ اس نے اس ناشائستہ حرکت پر عبدالرحمن کو ڈانٹا اور نوٹی اٹھا کر مسعود کے سر پر رکھ دی۔

”عبدالرحمن!“ عبدالرحیم نے اپنے بھائی سے کہا۔ ”بادشاہوں کے دن بدلتے رہتے ہیں۔ کل تک ہمارا باپ قید میں تھا آج تخت پر ہے۔ اگر کل بچا جان کے دن بھرے تو انہیں تمہاری یہ حرکت یاد ہے گی۔“

”اب ان کے دن بھرے والے نہیں۔“ عبدالرحمن نے ایک مرتبہ پھر نہایت بدتمیزی سے کہا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

☆☆☆

سلطان مسعود کے سابق سالار اور اس تمام فساد کے بانی تو شکین بنی، سلیمان بن یوسف اور خورشید کا بیٹا ایک ہی خیمے میں جمع تھے اور آئندہ کا لائحہ عمل طے کر رہے تھے۔

”مجھے ابھی ابھی یہ خبر ملی ہے کہ امیر محمد کا بیٹا عبدالرحیم مسعود کے ساتھ نہایت عزت سے پیش آیا ہے جبکہ عبدالرحمن نے اس کی بے عزتی کی۔“ تو شکین نے کہا۔

”اس واقعے میں کون سی نئی یا لوگھی بات ہے؟“

سلیمان بن یوسف نے کہا۔

”نئی بات یہ ہے کہ دونوں کے رویے سامنے آ گئے۔ اگر کسی وقت حالات بدلتے ہیں تو عبدالرحیم، مسعود کا ساتھ دے گا۔“

”یہ تو تم نے بہت دور کی سوچی۔“ تو شکین نے اس کا مستحکمہ اڑایا۔

”آپ اسے مذاق نہ سمجھیں۔ میں سنجیدہ ہوں۔ نئے سلطان احمد سے لوگ خوش نہیں ہیں۔ اسے نیم پاگل قرار دیتے ہیں۔ اگر اسے کسی وقت معزول کر کے امیر محمد نے اپنے ان دو بیٹوں یعنی عبدالرحمن اور عبدالرحیم کے ہاتھوں میں انتظام دے دیا تو یہ سوچو یہ کش مکش کیا رنگ دکھا سکتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی سوچو کہ مسعود کے بیٹے ابھی زندہ ہیں۔ اگر وہ ”مارگہ“ کی طرف بڑھے اور امیر احمد کو شکست

شکین حدیث لکھن

دے کر سلطنت پر قابض ہو گئے اور مسعود کو ہار لایا تو سوچ ہمارا حشر کیا ہوگا۔ ذرا سوچو، امیر محمد کو قید کر کے اندھا کر دیا گیا تھا۔ کوئی کہہ سکتا تھا کہ سلطنت ایک مرتبہ پھر اس کے ہاتھوں میں آئے گی۔ دیکھو آگئی۔“

”اس طویل تقریر کا مقصد تو یہ ہوا کہ مسعود کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔“ تو شکین نے کہا۔

”بالکل..... میرا مقصد یہی ہے۔ جب مسعود نہیں رہے گا تو پھر میں اپنے انجام کی فکر نہیں ہوں۔ یوں سمجھو کہ ہم مسعود کو قتل کر کے ایک اہم گواہ کو راستے سے ہٹائیں گے۔“

”تجوڑ ابھی ہے لیکن یہ کام سلطان محمد کے بیٹے احمد کی رضامندی کے بغیر نہیں ہو سکتا کیونکہ سلطنت کے تمام انتظامات تو اس کے ہاتھ میں ہیں۔“

”یہ تمام خدشات جو تم نے پیش کیے، احمد کے سامنے رکھتے ہیں بلکہ اس سے تو یہ کہتے ہیں کہ جب تک مسعود زندہ ہے تمہارے باپ کی حکومت اور تمہاری جان کو خطرہ ہے لہذا اسے قتل کرادو۔“

یہ بات خطہ الحواس احمد کی سمجھ میں آگئی۔ اس نے سلطان محمد کی جانب سے ایک فرمان لکھا جس میں کہا گیا تھا۔ ”مسعود کو قتل کر کے اس کا سر کاٹ کر میرے پاس بھیج دو۔“

یہ فرمان قلعہ گیری کے کوتوال کے پاس بھجوا دیا گیا۔ اسی رات مسعود کو قتل کر دیا گیا اور اس کا سر اس کی لاش کے ساتھ رکھ کر احمد کی خدمت میں پہنچا دیا گیا۔ احمد نے سرد کیا، لاش دیکھی اور مطمئن ہونے کے بعد اسے دوبارہ قلعہ گیری بھیج دیا کہ اسے قلعے کے اندر ہی دفن کر دیا جائے۔

سلطان محمد تک یہ خبر پہنچی تو آنسو بہانے کے سوا اس کے پاس کچھ نہیں بچا تھا۔ وہ بہت دیر تک بھائی کو یاد کر کے روتا رہا۔

جب ہوش آیا تو اسے یاد آیا کہ جب کوئی مر جاتا ہے تو اس کے اعزہ سے تعزیت بھی کی جاتی ہے۔ اس نے کاتب کو بلا دیا اور مسعود کے لڑکے مسعود کے نام اس مضمون کا خط بھیجا کہ فلاں فلاں افراد نے اپنے باپ کے قصاص کے لیے تمہارے باپ کو قتل کر دیا۔ ان کے علاوہ کوئی اور اس اقدام میں شریک نہیں ہے۔

سلطان مسعود قفل ہو گیا تھا۔ اس کا کتا ہوا سر اس کی لاش کے ساتھ چل کر آیا تھا۔ سلطان اپنے خواب کی تعبیر دیکھنے کے لیے اب اس دنیا میں نہیں رہا تھا۔ وہ جب ہندوستان جانے کے لیے لنگر کے ساتھ نکلا تھا اور ایک جگہ قیام کیا تھا تو خواب میں اس نے دیکھا تھا کہ کبیل پش

” لگتا ہے کہ میری ماں پاگل ہو گئی ہے۔ “ یہ لہتے ہوئے جارج نے گری میں بیٹھے ہوئے بے چینی سے پہلو بدلا۔ اس وقت وہ میرے لیوگ روم میں بیٹھا ہوا تھا۔ میں چائنا ٹاؤن کے اس اپارٹمنٹ میں گزشتہ تیس سال سے رہائش پذیر تھی جب اپنے شوہر کے ہمراہ نیو یارک نئی آئی لیکن وہ پندرہ برس قبل داغ مفارقت دے گیا اور میں اس کے بغیر زندگی گزارنے پر مجبور ہو گئی۔ میں اس کے لیے تیار نہیں تھی لیکن حالات نے مجھے بہت کچھ سکھایا۔ اس کے بغیر بھی میں نے پانچ بچوں کی پرورش کی اور ان کی زندگی

تاریک دہشوں میں امیر کی کرن بھائی ایک دلچسپ تحریر

بہت اچھا لگتا ہے جب کوئی مجرمانہ ذہن راست گوئی کی جانب متوجہ ہو جائے مگر... ایسا فلموں میں ہوتا ہے یا فرضی کہانیوں میں۔ حقیقی طور پر اگر نادانستگی میں ایسا واقعہ رونما ہو بھی جائے تو دنیا دانستوں تلے انگلی داب لیتی ہے۔ یہاں بھی کچھ ایسا ہی ہوا کہ ایک مہربان کی کاوشوں سے نہ صرف غلط فہمی دور ہوئی بلکہ وہ غلط فہم بھی درست فہم کی جانب چل پڑا۔

رقم کس واپسی

تویر ریاض



دن جنگ ہوتی رہی۔ جب رات ہوئی تو دونوں فوجیں اپنے اپنے ٹھکانوں پر واپس آ گئیں۔ دوسرے دن پھر جنگ شروع ہوئی۔ امیر محمد کا ایک سالار سید منصور جو میرا چل کھاتا تھا، امیر مسعود کے حق میں دستبردار ہو گیا۔ اس نے ایک آدمی کے ذریعے مودود کی خدمت میں کھانا بھیجا کہ وہ اس جنگ میں حصہ نہیں لے رہا ہے لہذا اسے جان کی امان دی جائے۔

سید منصور جنگ کے وقت کھانا تھا دیکھتا رہا اور اس نے کسی جانب سے کوئی کوشش نہیں کی۔ میدان کارزار گرم ہوتا رہا۔ لاشیں گرتی رہیں اور۔۔۔ بالآخر امیر مودود کو فتح حاصل ہوئی۔ امیر محمد اپنے لڑکے احمد اور بڑے بڑے سرداروں کے ہمراہ گرفتار ہو گیا۔

ان امیروں کو امیر مودود کے سامنے پیش کیا گیا، ان میں وہ بھی تھے جنہوں نے مسعود کے قتل کی سازش تیار کی تھی اور احمد کو قتل پر اکسایا تھا۔

امیر مودود نے جواب سلطان مودود بن چکا تھا ان امیروں کے قتل کے احکام صادر کر دیے۔ صرف امیر محمد کے بیٹے عبدالرحیم کو زندہ رہنے دیا کیونکہ اسے بتا دیا گیا تھا کہ قلعہ گیری میں ملاقات کے وقت عبدالرحیم سلطان مسعود سے عزت کے ساتھ پیش آیا تھا اور اس کی ٹوپی زمین سے اٹھا کر اس کے سر پر رکھی تھی۔

جب مودود اپنے باپ کے قاتلوں کو موت کے گھاٹ اتار چکا تو اس مقام پر جہاں یہ جنگ ہوئی تھی، ایک شہر آباد کرنے کا حکم دیا اور اس شہر کا نام ”فتح آباد“ رکھا۔ باپ کی لاش کی بابت حکم دیا کہ گیری سے غزنی لائی جائے اور خود بھی غزنی پہنچ گیا۔

وہ دن غزنی میں ماتم کا دن تھا جب سلطان مسعود کی لاش قلعہ گیری سے غزنی لائی گئی۔ غزنی کے ہر شہری نے سیاہ لباس پہنا ہوا تھا۔ ہر آنکھ گھبارھی۔

سلطان کی میت ایک بڑے میدان میں پہنچادی گئی جہاں اس کی نماز جنازہ ادا ہوئی تھی۔ جب صفیں بندھ گئیں تو اس گرمی کے موسم میں بہت سے لوگوں نے اگلی صف میں کھڑے اسے جب صف میں کود دیکھا جو ایک بھاری کیل میں لپٹا ہوا تھا۔ اس وقت بھی کسی کو معلوم نہ ہوسکا کہ یہ کون تھا اور نماز کے بعد کدھر چا گیا۔

مہذب اپنا کتا ہوا سراپہ ماتم میں لے کر چل رہا ہے۔ یہ خواب اشارہ تھا کسی ناگہانی آفت کا۔ سلطان نے سوچا بھی تھا کہ وہ احتیاط کرے گا لیکن احتیاط نہ کر سکا۔ اپنے بھائی امیر محمد کو اپنے پاس بلالیا اور اس کے بیٹے کے ہاتھوں سر کٹوا بیٹھا۔

امیر مودود کو جب سلطان محمد کا خط ملا تو اس نے جواب میں لکھا۔

”خدا آپ کی عمر دراز کرے اور آپ کے لڑکے احمد منہ بڑا لکھو اس کو اتنی عقل دے کہ وہ دنیا کے نشیب و فراز کو سمجھ سکے۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ آپ کے دیوانے بیٹے نے ایک بہت بڑا جرم کیا ہے اور ایسے بادشاہ کو قتل کیا ہے جسے امیر المومنین نے ”سید الملوک والصلائن“ کا لقب دیا تھا۔ میں آپ پر واضح کر دیتا ہوں کہ ایک نہ ایک دن یہ خون رنگ لائے گا اور آپ کے بیٹے کو اس کے اعمال کی سزا ضرور ملے گی۔“

اس خط کا جواب لکھنے کے بعد وہ چاہتا تھا کہ مارگہ پہنچے اور اپنے باپ کے خون کا بدلہ لے لیکن وزیر ابوالہر نے اسے اس ارادے سے باز رکھا اور اسے سمجھا بھجا کر اپنے ساتھ غزنی لے گیا۔

مودود کے آنے کی خبر سن کر غزنی کے تمام بڑے بڑے سردار اور امراء اس کے استقبال کے لیے شہر سے باہر آئے۔ اس کا بھائی ایزد یار بھی اس کے حق میں دستبردار ہو گیا اور مودود کو نیا سلطان تسلیم کر کے اس کے سر پر تاج شاهی رکھ دیا۔

مودود نے تخت پر قدم رکھتے ہی باپ کے قتل کا بدلہ لینے کا عندیہ دیا۔ ایزد یار کا لشکر بھی اس کے ساتھ ہو گیا۔ دونوں فوجوں نے مل کر ایک عظیم الشان لشکر تیار کیا اور غزنی سے کوچ کر گیا۔

اس کے کوچ کی خبریں جب مارگہ پہنچیں تو امیر محمد بھی مارگہ سے نکلا۔

امیر مودود اپنے چچا سے انتقام لینے کے لیے جب ایک مقام ”دینور“ یا ”دینور“ تک پہنچا تو امیر محمد کی فوج سامنے آ گئی۔

فوجیں آراستہ ہوئیں اور جنگ شروع ہو گئی۔ امیر محمد کا چچا اور مسعود کا قاتل اس لشکر کی سربراہی کر رہا تھا۔ تمام

تاریخ فرشتہ، محمد قاسم، طبقات اکبری، خواجہ نظام الدین، طبقات ناصر، ترجمہ احمد علی شوق، ابو ریحان البیرونی، محمد زکریا ورت

ماخذات

پسند کرتا تھا۔ وہ بہت ذہین اور باصلاحیت تھا لیکن بد قسمتی سے غلط راستے پر پڑ گیا تھا اور صرف اپنے والدین ہی کی نہیں بلکہ میری نصیحتوں کو بھی نظر انداز کر دیا کرتا تھا۔

بہر حال اپنے بچوں کی طرف سے مجھے ایسی کوئی پریشانی نہیں تھی۔ وہ سب اچھی جگہوں پر کام کر رہے تھے گوکہ میرے چار بیٹے دوسرے مقبول میں چلے گئے تھے لیکن انہیں اپنی ذمہ داریوں کا احساس تھا۔ وہ اہم مواقع پر مجھ سے ملنے ضرور آتے، چاہے وہ کوئی سالگرہ ہو، ماؤں کا دن یا یوم آزادی..... البتہ چھوٹی بیٹی جولیا میرے ساتھ ہی رہا کرتی تھی۔ جارج اسکول میں میرے دوسرے بیٹے کا ہم جماعت تھا اور وہ بھی دوسرے قصبے میں چلا گیا تھا۔ میری بیٹی کا دعویٰ تھا کہ وہ صرف اس لیے میرے ساتھ رہ رہی ہے کہ مجھے روزمرہ زندگی میں اس کی مدد کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ میں نے بھی اس کی بات کی تردید نہیں کی لیکن سچ تو یہ ہے کہ تیس سال سے اس اپارٹمنٹ کی سیزیاں چڑھ رہی ہوں، مجھے پہلے دن کی طرح اب بھی انہیں چڑھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی۔ جب مکان کی مالکہ اولڈی نے یہ اپارٹمنٹ دکھایا تھا تو اس نے جو کرایہ بتایا، وہ مجھے بہت زیادہ لگا.....

بہر حال ٹھوڑی سی بحث کے بعد ہم ایک قابل قبول معاہدے پر پہنچ گئے۔

مجھے خوشی ہے کہ بیٹی میرے ساتھ رہتی ہے کیونکہ اسے اب بھی میری توجہ کی ضرورت ہے۔ بعض اوقات دیر تک کام کرنے کی وجہ سے وہ کھانا نہیں کھاتی یا ویزا وغیرہ سے گزارہ کر لیتی ہے جو میری نظر میں کھانا نہ کھانے کے برابر ہے۔ میں اس کے لیے قوت بخش سوپ بناتی ہوں جس سے اس کی توانائی بحال رہ سکے۔ اس کا کام کافی تھا کہ دینے والا ہے۔ وہ پرائیویٹ سرائے رساں ہے جس کا سارا وقت حقائق معلوم کرنے کے لیے لوگوں کا پچھا کرنے میں گزر جاتا ہے۔ پہلے میں بھی یہی سمجھ کر جارج اس سے ملنے آیا ہے لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ میرا خیال غلط تھا۔

”تم میرے باپ کو تو جانتی ہی ہو“ جارج نے کہا۔

اس کا اصل نام یونگ لوٹا تھا لیکن وہ اپنے آپ کو جارج کہلاواتا پسند کرتا تھا۔ وہ اپنی گفتگو کو پچاڑ بنانے کے لیے چینی زبان استعمال کر رہا تھا لیکن اسے اس پر عبور حاصل نہیں تھا جبکہ میرے بچے بہت اچھی زبان بولتے تھے۔ انہوں نے زیادہ طالب علمی میں ہر ہفتے چینی زبان کی کلاس میں شرکت کی تھی۔ اسی طرح ان کے کزن بھرنے بھی چینی زبان پر عبور حاصل کیا تھا۔

جارج نے چائے کی پیالی ہونٹوں سے لگائی، گوکہ میں جانتی تھی کہ اسے میری چائے کی کوئی پروا نہیں ہے لیکن وہ صرف مجھے خوش کرنے کے لیے لی رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے میرے لیے ٹائی، ٹائی کے الفاظ بھی استعمال کیے۔ اس رویے کے پیش نظر میں نے بھی ماں کے بارے میں استعمال کیے جانے والے الفاظ کو نظر انداز کرنے کا فیصلہ کیا جو اس نے ابتدائی کلمات میں ادا کیے تھے۔

”تمہارے باپ کے بارے میں صرف اتنا ہی جانتی ہوں کہ اس نے اپنی مرضی سے زندگی ختم کرنے کے لیے وقت کا انتخاب کیا۔“ میں نے چائے کا گھونٹ لینے ہوئے کہا۔

”نیکن ٹائی، ٹائی! اس نے رقم نہیں چرائی تھی۔“

میں نے سر ہلا دیا لیکن زبان سے کچھ نہیں کہا۔ میں نے یوں ظاہر کیا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتی اور نہ ہی میں نے وہ افواہیں سن رکھی ہیں جو چائنا ٹاؤن میں گردش کرتی رہی تھیں۔ ان افواہوں کے مطابق جارج کے باپ لو چان نے لگی مارنگ جیولرز کے سیف میں سے بھاری مقدار میں امریکی کرنسی چرائی تھی جہاں وہ ملازمت کیا کرتا تھا۔ اس رقم کی اہلیت تقریباً ایک لاکھ ڈالر تھی۔ لو چان سے بھی پوچھ چوچھ کی گئی لیکن افواہوں کے علاوہ کوئی ثبوت نہیں ملا۔ اس کے گھر کی بھی تلاشی لی گئی لیکن کچھ برآمد نہ ہوا۔ چونکہ اس کے خلاف کوئی محسوس ثبوت نہیں تھا اس لیے پولیس نے اسے گرفتار نہیں کیا لیکن اس واردات کے چند دنوں بعد ہی اس نے خودکشی کر لی۔ افواہ سازوں کا کہنا تھا کہ اس نے ضمیر کی ملامت سے تنگ آ کر اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیا۔

میں نے مناقبت سے کام لینا ضروری نہ سمجھا کیونکہ جارج نے جو موضوع چھیڑا تھا، اس پر مزید گفتگو کرنا کوئی وضاحت طلب کرتا میرے نزدیک وقت کا زیاں تھا کیونکہ میں اس بارے میں سب کچھ جانتی تھی اور میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو وقت ضائع کرنا پسند کرتے ہیں۔

”میرا باپ بیمار تھا۔“ جارج نے کہا۔ ”وہ زیادہ عرصہ زندہ نہیں رہ سکا تھا۔ وہ جس تکلیف میں مبتلا تھا، اس کے بارے میں ڈاکٹروں کی رائے تھی کہ وہ بڑھتی چلی جائے گی۔ میرا خیال ہے کہ یہ بھی ایک وجہ تھی۔ پھر اس پر چوری کا الزام بھی لگ گیا۔ وہ یہ سب برداشت نہ کر سکا اور اس نے اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیا۔“

میں نے ایک بار پھر سر ہلا دیا حالانکہ میں اس کے

باپ کی بیماری کی تنقید نوعیت کے بارے میں بھی جانتی تھی۔ میں نے جارج سے پوچھا۔ ”کیا تم جانتے ہو کہ وہ رقم اس نے چرائی تھی؟“

”یہ میں کیسے جان سکتا ہوں اور میں یہاں اس رقم کی بات کرنے نہیں آیا۔ میں پورے احترام کے ساتھ یہ کہوں گا کہ اس رقم کو تلاش کرنا تمہارے بس سے باہر ہے اور نہ ہی میں تم سے یہ کہہ رہا ہوں کہ اس رقم کا پتہ لگا دیا میرے باپ کی سادھ کو بچاؤ۔ اب بہت دیر ہو چکی ہے۔ میں تو تمہارے پاس اپنی ماں کے سطلے میں آیا ہوں۔“

”اچھا، اب میں سمجھی۔“ میں نے طنزاً کہا۔ اس کی باتوں سے میں نے بھی اندازہ لگا یا کہ وہ میرے بارے میں بہت کم جانتا ہے۔ اس لیے میں نے فوری درمحل ظاہر کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ بعض اوقات سراخ رسانی میں عقل مندی کی تقاضا بھی ہے کہ دوسرے لوگ آپ کے بارے میں غلط اندازہ نہ لگیں۔

”تمہاری ماں نے ایسا کیا کر دیا جس سے تمہیں پریشانی ہو رہی ہے؟“ میں نے پوچھا۔

وہ مجھ پر ٹٹا ہنسا ہنسا ہوا۔ ”اس کا سوٹ کیس۔“

میں نے ایک بار پھر سر ہلا دیا۔ اس کی ماں کا اصل نام تو ”لوئے“ تھا لیکن وہ اپنے آپ کو گھوڑیا کہلاتا پسند کرتی تھی۔ وہ ایسٹ براؤڈے میں رہتی تھی جو میرے گھر سے زیادہ دور نہیں تھا۔ میں نے آخری بار اسے اس وقت دیکھا تھا جب اس کے شوہر کی آخری رسومات میں شرکت کے لیے گئی تھی۔ اس کے اگلے روز سے ہی گھوڑیا کو جاننا ٹاؤن کی سڑکوں پر ایک سوٹ کیس کھینچتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔

”میں نے بھی جب پہلی بار اسے سوٹ کیس کے ساتھ دیکھا تو پوچھ پچھا کر لیا کہ وہ کیسے سڑ پر جا رہی ہے؟“ میں نے جارج کو بتایا۔ ”یادہ کچھ وقت کے لیے تمہارے یا تمہاری بہن کے پاس رہنا چاہ رہی تھی لیکن اس نے میری بات کی تردید کر دی۔“

اس نے خاصی تجدیزی کا ثبوت دیا تھا لیکن میں نے یہ بات جارج کو نہیں بتائی۔ کہیں وہ اپنی ماں کا دفاع نہ کرنے لگے۔ اس طرح مزید وقت ضائع ہوتا۔

”اس کا کہنا ہے کہ اس سوٹ کیس میں اس کی تمام قیمتی اشیاء ہیں۔ اب میرا باپ اس دنیا میں نہیں رہا اس لیے وہ ڈوبی ہے کہ کہیں کوئی اس کے اپارٹمنٹ میں نقب نہ لگا کر وہ ساری اشیاء چوری نہ کر لے اس لیے وہ انہیں اپنے ساتھ لیے

بھرتی ہے۔“

”وہ قیمتی چیزیں کیا ہیں؟“

”کچھ نہیں۔ اس کے پاس کوئی قیمتی چیز نہیں ہے۔“ وہ ہاتھ بجاتے ہوئے بولا۔ ”اپارٹمنٹ کا کرایہ نامہ، اس کے کچھ نئے، ہمارے پیدائش کے سرٹیفکیٹ اور ایک بریٹلیف..... یہ سب چیزیں ایک پرس میں بھی آ سکتی ہیں۔“

”پھر اس سوٹ کیس میں کیا ہے؟“

وہ ناک سکیڑتے ہوئے بولا۔ ”پرانے اخبارات، ملے پکڑے..... اس کے علاوہ مجھے معلوم نہیں۔ میں نہیں بتا چکا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ وہ پاگل ہو چکی ہے۔“ وہ آگے کی طرف جھکتے ہوئے بولا۔ ”میں نے کوشش کی کہ وہ ہمارے ساتھ کنز میں رہے۔ یہ میں اس وقت سے کہہ رہا ہوں جب میرا باپ پہلی بار بیمار ہوا تھا۔ میں ان دونوں کی دیکھ بھال کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور اب مجھے اس کی فکر ہے۔ وہ اس طرح اکیلی نہیں رہ سکتی لیکن وہ میری بات ماننے کے لیے تیار نہیں۔“

”میرے بچے بھی جی چاہتے ہیں کہ میں اپنے بیٹے کے گھر چلی جاؤں جو کہ کنز میں رہتا ہے۔“ میں نے چائے کا گھونٹ لینے ہوئے کہا۔ ”میں بھی وہاں نہیں جانا چاہتی۔ چائنا ٹاؤن میرا گھر ہے۔ شاید تمہاری ماں بھی ایسا ہی محسوس کرتی ہو۔ مجھے اس میں پاگل پن کی کوئی بات نظر نہیں آتی۔“

”وہ تو فحش ہے لیکن تم اپنے شوہر کے مرنے کے فوراً بعد نام نہاد قیمتی چیزوں سے بھرا ہوا سوٹ کیس لے کر سڑکوں پر نہیں پھرتیں جبکہ مرنے والے پر ایک بڑی رقم چرانے کا الزام بھی ہو۔“

میں نے ایک بار پھر سر ہلا دیا کیونکہ اس نے ایک اچھا نکتہ اٹھایا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

”تم میرے پاس کیوں آئے ہو جارج؟“

اس نے چائے کا گھونٹ لینے ہوئے کہا۔ ”بالآخر اسے ہمارے پاس رہنے کے لیے آنا ہی ہو گا کیونکہ اب ڈیڑی اس دنیا میں نہیں رہے جو اپارٹمنٹ کا کرایہ دے سکیں۔ اس حقیقت کا ادراک ہونے میں اسے کچھ وقت لگے گا۔ تب تک اسے سوٹ کیس سمیت سڑکوں پر پھرنے سے احتراز کرنا چاہیے۔ یہ خطرناک ہے۔ وہ دراصل کوشش کر رہی ہے کہ کوئی اس پر حملہ کرے۔ ہر کوئی سمجھتا ہے کہ اس سوٹ کیس میں رقم ہے۔“

”وہ ایسا کیوں سمجھیں گے؟“ میں حیران ہوتے ہوئے بولی۔ ”اگر گھوڑیا کے پاس چرائی ہوئی رقم ہے تو کوں

سوچے گا کہ وہ اسے سوٹ کیس میں لیے پھر رہی ہے؟“
 ”وہ لڑکے جو گینگ کے لیے کام کرتے ہیں۔ میں نے دیکھ جی لی کو اس کی بلڈنگ کے آس پاس چکر لگاتے دیکھا ہے۔“

”دیکھ جی لی اس گروہ سے الگ ہو چکا ہے اور جیل سے آنے کے بعد وہ بالکل بدل گیا ہے۔ اس کی ماں نے مجھے بتایا ہے کہ وہ اپنی سادہ حرکتوں سے تاب ہو چکا ہے اور اچھی زندگی گزارنے کا خواہش مند ہے۔“
 ”تم نے اس کی ماں کی بات پر یقین کر لیا..... وہ کیسے یہ کہہ سکتی ہے؟“

”ایک ماں اپنے بیٹے کو اچھی طرح جانتی ہے۔“
 جارج نے ایک بار بھرناک سیڑھی۔ یہ کوئی پُرکشش انداز نہیں تھا۔ ”کاش میری ماں بھی یہ سمجھ سکے کہ میں یہ کہنے میں کتنا تنہا ہوں۔ اسے ہمارے ساتھ رہنے کی ضرورت ہے۔ تب تک اسے اس سوٹ کیس سے چھٹکارا حاصل کرنا ہوگا جو بد معاشوں کے لیے ایک مقناطیس ہے۔“

”میں سمجھ گئی۔“ میں نے کہا۔ ”تم چاہتے ہو کہ تمہاری ماں کو اس سوٹ کیس سے الگ کر دوں۔“
 ”یہ پہلا کام ہوگا۔ دوسرا کام اسے ہمارے ساتھ کونز میں رہنے پر آمادہ کرنا ہے۔“

”میں ایک دقت میں ایک ہی کام کر سکتی ہوں۔“
 اس کے جانے کے بعد میں نے سوچنے میں کچھ وقت گزارا۔ گوکہ میری بیٹی سراغ رساں ہے لیکن یہ میرا پہلا کیس نہیں تھا۔ ماضی میں بھی چند مواقع ایسے آئے جب میں نے اس بات کو ترجیح دی کہ میری بیٹی کو ان کیسوں میں مددگار نہیں ہونا چاہیے۔ اس طرح میں خود ہی ان کا مل لٹالنے میں کامیاب ہو گئی۔ بہر حال یہ پہلا کیس تھا جو کوئی مکمل براہ راست لے کر میرے پاس آیا تھا۔

میں نے جانے ختم کی کیونکہ صورت حال کا بغور جائزہ لینے کے لیے اس کی ضرورت ہوتی ہے اور یکن کی دیوار پر لگے ہوئے ٹیلی فون کی طرف بڑھی۔ گوکہ میری بیٹی نے مجھے موبائل فون بھی دے رکھا ہے لیکن اسے میں ضرورت کے وقت ہی استعمال کرتی ہوں۔ میں نے فون کر کے گھور یا کو اپنے یہاں چائے پر مدعو کیا۔

اپنے مہمان کا انتظار کرنے کے دوران میں نے اپنے شوہر کے کزن کے بیٹے یونگ میمر کے بارے میں دوبارہ سوچنا شروع کر دیا۔ مجھ میں اتنی اہلیت ہے کہ بیک وقت دو مسائل کے بارے میں سوچ سکوں۔ اس سوچ بچار کے

دوران میں نے یکن میں رکھے ہوئے برتن بھی دھو ڈالے پھر میں نے کچھ مزید فون کالز کیں پھر اسٹول پر چڑھ کر بادام سے بچے ہوئے بسکٹوں کا ڈبا اتارا۔ اس کے بعد میں نے چائے کے لیے پانی رکھ دیا۔

گھور پانے دروازے کی کھنٹی بجائی اور میں نے مطلوبہ پش و پا کر دروازہ کھول دیا۔ میں نے میز جیوں پر اس کے ہماری قدموں کی آواز سنی اور جان گئی کہ وہ سوٹ کیس کھینٹ رہی ہے۔ اگر وہ اسے گھر چھوڑ آتی تو میرا کام یہیں ختم ہو جاتا اور میں اسے چائے پلا کر رخصت کر دیتی مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔ وہ سوٹ کیس اپنے ساتھ لے کر آئی تھی۔

ڈیوڈی میں داخل ہو کر اس نے اپنی گیلی برساتی اتاری اور مجھے وہ چھوٹا سا صندوق دیا جو میرے لیے خرید کر لائی تھی۔ وہ مٹھائی کا ڈبا تھا جسے میں نے کھول کر پلیٹ میں بچا دیا، جب وہ اپنے جوتے اتار رہی تھی۔ وہ بھی میری قریبی دوست نہیں رہی لیکن اس سے اکثر ملاقات ہوتی تھی جب ہمارے بچے ایک ہی اسکول میں پڑھا کرتے تھے۔

ہمارے تعلقات ہمیشہ خوشگوار رہے۔ شاید اس نے میری دعوت کا اچھا اثر لیا ہو۔ اپنے شوہر کی خودکشی کے بعد وہ تنہا ہو گئی تھی کیونکہ سب لوگ میری طرح نہیں سوچتے پھر سوٹ کیس کا بھی معاملہ تھا۔ اگر اس کے بیٹے کی رائے کو نظر انداز کر دیا جائے تب بھی سوٹ کیس کو ساتھ لیے پھرنا ایک عجیب سی بات نظر آتی ہے، خاص طور پر ایسی صورت میں جب آپ نہیں نہ جا رہے ہوں۔

”تمہارے بیٹے کا خیال ہے کہ تم اپنے حواس کو ہٹا بیٹھی ہو۔“ میں نے پیالی میں چائے ڈالتے ہوئے کہا۔
 اس نے تسننہ کیڑے اور بولی۔ ”وہ چاہتا ہے کہ میں کونز چلی جاؤں اور اس کی گیلی کے ساتھ رہوں۔ میں نے انکار کر دیا۔ اس لیے وہ مجھے پاگل سمجھتا ہے۔“

”تم یہ سوٹ کیس اپنے ساتھ سڑکوں پر لیے پھرتی ہو۔ ممکن ہے کہ وہ اس وجہ سے بھی تمہیں پاگل کہتا ہو۔“
 اس نے ایک بسکٹ نکالتے ہوئے کہا۔ ”اس سوٹ کیس میں میری تمام قیمتی اشیاء ہیں اس لیے اسے ساتھ رکھنا ضروری ہے۔ اب میرا شوہر اس دنیا میں نہیں رہا۔ کوئی بھی شخص میرے اپارٹمنٹ میں داخل ہو کر یہ چیزیں چوری کر سکتا ہے۔“

”تمہارا شوہر کام کیا کرتا تھا۔ اس نے گھر پر رہ کر تمہاری قیمتی اشیاء کی حفاظت نہیں کی لیکن اس کی زندگی میں تو تم بھی یہ چیزیں اپنے ساتھ لے کر نہیں پھرتی تھیں۔“

”ہاں۔ میں خوش قسمت تھی کہ اتنے برسوں میں یہ چیزیں چوری نہیں ہوئیں لیکن اپنے شوہر کی موت کے بعد میں زیادہ خطرہ محسوس کرنے لگی ہوں۔“

”گھور پانے۔“ میں نے سختی سے کہا۔ ”کیا اس سوٹ کیس میں وہ ایک لاکھ ڈالرز بھی ہیں جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ تمہارے شوہر نے یکن کے سیف سے چوری کر لیے تھے؟“

”بالکل نہیں۔“ وہ اپنی گھبراہٹ پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔ ”تمہیں میرے شوہر کے بارے میں اس جھوٹ پر یقین نہیں کرنا چاہیے۔“

”ٹھیک ہے۔ میں یقین نہیں کرتی لیکن تمہیں یہ بات سمجھنی چاہیے کہ اگر میں یہ سوال کر سکتی ہوں تو دوسرے لوگوں کے ذہن میں بھی یہ بات ہوگی۔ تمہارا بیٹا بھی اسی لیے پریشان ہے کہ تم اپارٹمنٹ میں تنہا رہتی ہو اور اس سے زیادہ خطرناک بات یہ ہے کہ تم یہ سوٹ کیس اپنے ساتھ لیے پھرتی ہو۔“

اس نے جلدی جلدی چائے کا کھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ”مجھے اس کی پریشانی سے کوئی سروکار نہیں۔ میں جانتی ہوں کہ کیا کر رہی ہوں۔“

”مجھے بتایا گیا ہے کہ جنگ جی لی تمہاری گھرانی کر رہا ہے۔“
 ”یہ بات تمہیں کس نے بتائی..... میرے بے وقوف بیٹے نے؟ میں دیکھ جی لی سے بالکل بے خوف نہیں ہوں۔“

”ممکن ہے کہ ایسا ہی ہو جیسا کہ مجھے بتایا گیا ہے کہ وہ سدھر گیا ہے لیکن اس کے علاوہ اور بھی توجواں لڑکے ہیں۔“ میں نے میمر کے بارے میں سوچتے ہوئے کہا۔ ”جو تمہارے لیے خطرناک ہو سکتے ہیں۔“

میری اس بات کا گھور پانے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے چائے کے کچھ اور کھونٹ لیے، میرے بچوں کے بارے میں پوچھا۔ میں ناراض ہونے والوں میں سے نہیں ہوں چنانچہ میں نے اسے مختصراً ان کی مصروفیات کے بارے میں بتا دیا۔ اس نے چائے پی اور میرے بہت سارے بسکٹوں پر ہاتھ صاف کیا اور جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے میرا شکریہ ادا کیا لیکن مجھے اس کے الفاظ میں گرم جوشی محسوس نہیں ہوئی۔ وہ اپنا سوٹ کیس کھینچتی ہوئی میرے گھر سے چلی گئی۔

اس کے جانے کے تیس منٹ بعد میرا دوسرا مہمان بھی آ گیا۔ اب دیکھ جی لی میری ڈیوڈی میں اپنے کیلے جوتے اتار رہا تھا۔ جب میں نے آخری بار اسے دیکھا تھا، اس کے

مقابلے میں وہ بہت مختلف دکھائی دے رہا تھا۔ یہ اس نے نیل جانے سے پہلے کی بات ہے۔ وہ رکرڈ آئی لینڈ میں آٹھ مہینے کی سزا بھگت کر آیا تھا۔ اس کی ماں دھوئی کرتی تھی کہ اب وہ سدھر گیا ہے۔ دیکھنے میں بھی وہ ایسا ہی لگ رہا تھا۔ اس نے بالوں میں سلیقے سے کٹھن کی ہوئی تھی۔ کپڑے استری شدہ تھے۔ یہاں تک کہ جوتے بھی خوب چمک رہے تھے۔

میں نے اورنگ کا پیالہ اس کی کرسی کے برابر دیالی میز پر رکھا اور بولی۔ ”دیکھ جی لی! تم بہت اچھے لگ رہے ہو۔ کیا تم اب بھی لوگوں کو لونٹے ہو؟“

وہ بسکٹ منہ میں رکھنے والا تھا کہ اس کا ہاتھ درمیان میں ہی رک گیا۔ ”نہیں۔ یہ کہنا ہے کہ میں نے کبھی ایسا نہیں کیا۔“

”میں سمجھتی ہوں۔“ میں نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ ”تاہم تمہاری ماں کا کہنا ہے کہ تم سدھر چکے ہو۔ اس نے مجھے بتایا کہ کہیں جیل میں وقت گزارنا بہت تکلیف دہ محسوس ہوا لہذا تم نے فیصلہ کیا کہ اپنی طرف سے پوری کوشش کرو کہ دوبارہ وہاں جانے کا امکان باقی نہ رہے۔ اس کا کہنا ہے کہ تم اپنی اصلاح کی کوشش کر رہے ہو۔ کیا یہ سچ ہے؟“

اس نے مجھ سے آنکھیں.... ملائے بغیر کہا۔ ”میں نے جیل میں رہ کر یہی سیکھا ہے کہ اصلاح کر کے ہی میں اپنے اعمال بہتر بنا سکتا ہوں۔“

”اپنی اصلاح کرنا بہت اچھی بات ہے۔ یہ زندگی گزارنے کے لیے بھی اچھا ہے۔ کیا تمہارے پاس اس کا کوئی راستہ ہے؟“

وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”کوئی بھی مجھے ملازمت نہیں دے گا۔“ اس نے سر جھٹکاتے ہوئے کہا۔
 ”لیکن میں زیادہ دیر قاصرغ نہیں رہوں گا۔ مجھے امید ہے..... اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں نے تمہیں اس لیے بلایا ہے تاکہ خود کچھ سکون کرتم واقعی بدل گئے ہو جیسا کہ تمہاری ماں کہتی ہے۔ اب مجھے اس کی بات پر یقین آ گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ کم بھروسہ کر سکتے ہیں۔ امید ہے کہ مستقبل میں تمہارا پر عمل ایک ایمان دار اور کارآمد زندگی کے مفصل میں معاون ثابت ہوگا..... اور بسکٹ لو۔“

اس نے بسکٹ نہیں لیا تو میں نے ایک بار پھر چائے بنائی تاکہ ہماری گفتگو جاری رہے۔
 میرا تیسرا مہمان دیکھ جی لی کے جانے کے آدھ گھنٹا

بعد آیا۔ یہ میرے شوہر کے کزن کا بیٹا بھر چن تھا۔ وہ میرے لیے کوئی قصہ لے کر نہیں آیا اور نہ ہی اس نے اپنے سنے جتنی جوتے اتارے جب تک کہ میں نے اسے ایسا کرنے کے لیے نہیں کہا۔ کرسی پر بیٹھے ہی اس نے دو بٹک ایک ساتھ اٹھائے لیکن چائے کو ہاتھ نہیں لگایا۔

”بھر !!!!!“ میں نے اسے غائب کرتے ہوئے کہا۔

”مجھے وہ راستہ پسند نہیں جس پر تم آگے بڑھ رہے ہو۔“

اس نے بٹک کا ٹکڑا منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔

”مجھے یاد نہیں کہ میں نے تم سے اس بارے میں پوچھا ہو۔“

”مجھ سے بدتمیزی سے بات مت کرو۔“ میں نے غصے سے کہا۔ ”اگر میرا شوہر زندہ ہوتا تو وہی اس خاندان کا بڑا کہلاتا۔ اس کی بیوی ہونے کی حیثیت سے مجھے یہ حق حاصل ہے کہ اپنی خواہشات کا اظہار کر سکوں۔“

”کبھی رہو۔“ بھر بولا۔ ”تمہیں کوئی نہیں روک رہا۔“

اس نے ایک اور درج اٹھایا جو تک جی لی لے کر آتا تھا۔

”شاید نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”لیکن کسی نہ کسی کو تو تمہیں روکنا چاہیے۔ تم نے ایک غلط راستے کا انتخاب کیا ہے جو تمہیں ایک بری زندگی کی طرف لے جائے گا۔“

”اس غمزدگی کے لیے تمہارا شکر ہے۔ کیا تم نے مجھے اسی لیے بلایا تھا کہ میری بری زندگی کے بارے میں خبردار کر سکو۔ کیا اب میں جا سکتا ہوں؟“

”لگتا ہے کہ تم میری تنبیہ کو سنجیدگی سے نہیں لے رہے۔ میں دیکھ رہی ہوں کہ تم اب بھی کسی قابلِ نفرت کارروائی کے بارے میں سوچ رہے ہو۔“

”میری بات کا غلط مطلب مت سمجھو آئی لیکن تمہیں کوئی اندازہ نہیں کہ میں کیا سوچ رہا ہوں۔“

”میں کچھ چیزیں دیکھ سکتی ہوں۔“ میں نے کہا۔

”میں نے کچھ باتیں سنی ہیں جو نیک شگون نہیں ہے۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ تم اس بد قسمت بیوہ گورو پا کا پیچھا کر رہے ہو اور تمہاری نظریں اس کے سوت کیس پر ہیں۔“

”میں نہیں جانتا کہ کس نے تمہیں یہ بات بتائی لیکن یہ بالکل غلط ہے۔ میں نے کبھی اس پاگل بڑھیا پر توجہ نہیں دی۔“

”اگر تم اس غریب عورت پر حملہ کر کے اس کا سوت کیس چھیننے کے بارے میں سوچ رہے ہو جس کے بارے میں تمہیں یقین ہے کہ اس میں وہ ایک لاکھ ڈالرز موجود ہیں جن کی چوری کا الزام اس کے شوہر پر لگایا گیا تھا تو میں تمہیں ایسا نہ کرنے کا مشورہ دوں گی۔“

”اوہ میرے خدا! کیا تم واقعی ایسا کر دو گی؟“ اس نے

ذائقہ اڑانے والے انداز میں کہا۔ ”مگر کیوں؟“

”پہلی بات یہ کہ تم ابھی طرح جانتے ہو یہ غلط ہے۔ دوسرے یہ کہ تم نیل چلے جاؤ گے۔ میری ابھی دنگ جی لی سے بات ہوئی ہے جو حال ہی میں نیل سے رہا ہوا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ نیل کوئی ابھی جگہ نہیں ہے۔ وہ اپنی اصلاح کی کوشش کر رہا ہے تاکہ اسے دوبارہ نیل جانا پڑے۔“

”تم کسی کی باتوں میں آگئیں۔ مجھے حیرت ہے آئی۔ میں تو تمہیں ایک ہوشیار خاتون سمجھتا تھا۔ وہ لڑکا اب بھی پہلے جیسا ہی ہے۔“

”میں تمہاری رائے سے اتفاق نہیں کرتی۔ ہم دونوں میں جو بھی درست ہے، اس کے باوجود نیل کے بارے میں حقائق تبدیل نہیں ہو سکتے۔ وہ بہت ہی بری جگہ ہے۔ اس کے علاوہ بھی گورو پا کا سوت کیس چرانا ایک غلطی ہو گی کیونکہ رقم اس میں نہیں ہے۔“

”یہ تم کیسے جانتی ہو؟“

”اس نے مجھے یہی بتایا ہے۔“

وہ تہہ لگاتے ہوئے بولا۔ ”آئی! تمہاری ساری باتیں غلط ہیں۔“

”گورو پا نے مجھے بتایا ہے کہ وہ رقم اس کے سوت کیس اور نہ ہی اس کے گھر میں ہے۔ اس طرح یہ معاملہ تو ختم ہو گیا۔ تاہم یہ جانا بہت مشکل ہے کہ تمہیں سیدھے راستے پر کس طرح لایا جائے۔ میں نے اپنا فرض سمجھ کر یہ کوشش کی تھی کیونکہ تم سارے بٹک کھا چکے ہو اس لیے تمہیں چلے جانا چاہیے۔“

”اچھا خیال ہے۔“ وہ کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔

میں نے اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے کہا۔ ”اپنے والدین کو میرا سلام کہنا۔“

”بالکل !!!!! وہ جوتے پہننے ہوئے بولا۔ ”بٹکوں کے لیے شکر ہے۔ خدا حافظ آئی۔“

اس کے جانے کے بعد میں ایک بار پھر نیل فون کی طرف بڑھی۔ اس بار میں نے لگی مارنگ جیولرز کا نمبر ملایا۔ ان کی دکان چند بلاک کے قاصطے پر سینٹرل اسٹریٹ پر واقع تھی۔ صبح کے وقت سڑکوں پر بہت رش ہوتا ہے اور باہر کا موسم بھی ٹھیک نہیں تھا اور میرا وہاں جانا ضروری نہیں تھا اس لیے میں نے فون پر ہی بات کرنا مناسب سمجھا۔

”ولیم کونسا۔“ میں نے دکان کے مالک سے رابطہ ہونے پر کہا۔ ”میں جن یوگین بول رہی ہوں۔ یہ بتاؤ کہ اگر کوئی شخص کسی دوسرے کے لیے کوئی بڑا کام کرے تو

وصول کنندہ کو جواب میں اس کے ساتھ ایک چھوٹی سی مہربانی کرنے میں خوش محسوس ہوئی۔ کیا میں ٹھیک کہہ رہی ہوں؟“ وہ ہنسیکا ہوتے ہوئے بولا۔ ”کیا میں تمہیں جانتا ہوں؟“ ”نہیں۔“ میں نے کہا۔ ”براہ مہربانی میرے سوال کا جواب دو۔“

”میں سمجھتا ہوں کہ ایسا ہونا چاہیے۔ معاملہ کیا ہے؟“ ”اگر تمہیں چوری شدہ رقم واپس مل جائے تو یہ ایک بڑا کام ہوگا۔ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟“

وہ حیران ہوتے ہوئے بولا۔ ”تم اس رقم کے بارے میں کیا جانتی ہو؟“ ”میں کچھ نہیں جانتی۔ صرف تم سے ایک سوال پوچھ رہی ہوں۔ اس کا جواب دو۔“

”ہاں اگر کوئی شخص یہ رقم واپس کرتا ہے تو میں اس کا احسان مند ہوں گا بشرطیکہ وہ کوئی چور نہ ہو۔“

”ٹھیک ہے، شکریہ۔“ یہ کہہ کر میں نے فون رکھ دیا۔ اس کے بعد ٹیلی فون کافی دیر خاموش رہا۔ مجھے جس کال کا انتظار تھا، وہ شام ۷ بجے موصول ہوئی۔ اس سے پہلے صرف میرے سب سے بڑے بیٹے کا فون آیا تھا۔ اپنے بچوں کا فون سن کر مجھے یک گونہ خوشی ہوئی تھی جبکہ وہ ٹیلی فون استعمال کرنے کے بارے میں زیادہ مستعد نہیں تھے۔

میری بیٹی اسی وقت گھر آئی تھی جب وہ متوقع کال آئی۔ اس نے اپنے پیڑروم سے ہی پوچھا کہ کیا میں فون پر بات کرنا پسند کروں گی۔ شاید وہ سمجھ رہی تھی کہ میں سو سنی ہوں لیکن میں جاگ رہی تھی۔ میری توقع کے مطابق فون کرنے والا وہی جی لی تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ سب لوگ خیریت سے تو ہیں۔

”ہاں۔“ اس نے کہا۔ ”میرا مطلب ہے کہ سوائے۔“ ”میں اس وقت کوئی طویل کہانی سننے کی ضرورت محسوس نہیں کرتی۔“ میں نے اسے بتایا۔ ”کافی دیر ہو چکی ہے۔ اگر سب لوگ خیریت سے ہیں اور پریشانی کی کوئی بات نہیں تو تم صبح مجھ سے ملنے آ سکتے ہو۔“

اس نے میری بات سے اتفاق کیا۔ میرا دن بھی کافی مصروف... گزرا تھا لہذا میں بھی بستر پر دراز ہو گئی۔ اگلے روز صبح سویرے میری بیٹی کا کام پر چلنے لگنے اور میں دیک جی لی کی آمد کا انتظار کرنے لگی لیکن اس کے آنے سے پہلے ہی جارج کا فون آ گیا۔

”گزشتہ رات میری ماں پر حملہ ہو گیا۔“ ”مجھے امید ہے کہ وہ زخمی نہیں ہوئی ہوگی۔“

”نہیں۔ انہوں نے صرف سوٹ کیس چھین لیا جس کے بارے میں، میں اسے پہلے ہی خبردار کر چکا تھا۔“ یہ کہہ کر وہ ہلکے لہجہ کے لیے رکا پھر بولا۔ ”تمہیں خبریانی نہیں ہوئی۔ چنانچہ ان دنوں میں سب مظلوم ہو چکا ہے۔“ ”میں جیلے ہی اس بارے میں سن چکی ہوں۔“ میں نے اس کی بات تسلیم کرتے ہوئے کہا۔ ”کیا اسے اپنی ایشیا مل گئیں؟“

”ہاں۔ میرا خیال درست نکلا۔ انہیں وہ سوٹ کیس کولمبس پارک میں پڑا ہوا ملا۔ وہاں اخبارات، ڈیڑھی کی پرانی ٹیمیں اور ردی کا غنڈ بکھرے ہوئے تھے۔ یہ مجھیں اس کی جتنی ایشیا۔“

”جارج۔۔۔۔۔۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے خوشی ہے کہ تمہاری ماں کو کوئی نقصان نہیں پہنچا اور تمہیں بھی اس پر خوش ہونا چاہیے۔ اس کا یہ طریقہ عمل انوکھا ضرور ہے کہ وہ فضول چیزوں سے بھرا ہوا سوٹ کیس لیے پھر رہی ہے۔ یہ صدمے کا اثر بھی ہو سکتا ہے۔ میں تو یہی کہوں گی کہ جب تک وہ یہ حماقت کر رہی ہے، تم اسے برداشت کرتے رہو، گوکہ مجھے یقین نہیں کہ یہ زیادہ عرصہ چلے۔“

”یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟“ ”معاف کرنا جارج۔۔۔۔۔۔ مجھے آج بہت سے کام کرنا ہیں۔“ میں نے دروازے پر کھنکھنی کی آواز سن کر کہا۔ ”میں تم سے بعد میں بات کروں گی۔“

میں نے اس کی برساتی لے کر ہاتھ روم میں لٹکائی اور دیک جی لی کو لویگ روم میں بٹھادیا۔ اس مرتبہ وہ میرے لیے چھوٹے عسکروں کا اٹھایا لے کر آیا تھا۔ میں نے وہ چھوٹی میز پر رکھا اور اس کے لیے چائے نکالتے ہوئے بولی۔ ”مجھے صبح جارج نے فون کر کے بتادیا ہے۔“

”ہاں۔ میں شرطیہ کہہ سکتا ہوں کہ اس کی ماں کو بہت صدمہ ہوا ہوگا۔ حالانکہ۔۔۔۔۔۔“ میں نے کچھ انتظار کرنے کے بعد کہا۔ ”براہ کرم اپنا جملہ مکمل کرو۔“

”معافی چاہتا ہوں۔ بات صرف اتنی ہے کہ میں نے تمہارے کہنے کے مطابق میجر کا تعاقب کیا۔ اس نے گھور یا کہ قریب جانے کے لیے اندھا میرا ہونے کا انتظار کیا۔ اس نے سوٹ کیس چھینا اور اس کو کوشش میں کرتے کرتے بچا کیونکہ گھور یا نے کوئی مزاحمت نہیں کی بلکہ وہ مسکرا رہی تھی۔ مجھے بہت عجب لگا۔ وہ اس سے لڑنے کے بجائے وہاں سے چلی گئی۔“

”میں نے سہرا لٹے ہوئے کہا۔ ”تم نے کیا کیا؟“ ”صرف وہی جو تم نے کہا تھا۔“ ”ماں تم نے اسے زخمی نہیں کیا؟“

”دیک جی لی کی آنکھیں پھیل گئیں۔“ میں نے بالکل ادا کیا، ہم نے کہا تھا۔ ”وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ”میں نے سب ضرور لگا لیکن زخمی نہیں کیا۔ یہ چوٹ ایسی نہیں لگتی کہ وہ ہلے لیکن اس دوران وہ کافی تکلیف میں رہے۔“ میں نے اس کا وہ حال کیا ہے کہ کافی عرصہ وہ سیدھا ہو کر اس محل کے گاؤں اور اس کی جال میں لنگڑا ہٹ رہے گی۔“

”تم نے اس سے کیا کیا؟“

”میں نے اسے بتادیا کہ وہ ایک کمزور سالاکا ہے جو اپنے آپ کو مضبوط ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اگر میں نے اسے آئندہ اس علاقے میں گزربڑ کرتے دیکھا تو اسے جان سے مار دوں گا۔ بہر حال اب وہ گرفتار ہو چکا ہے اور اسے اسی حالت میں ایک رات جیل میں گزارنا ہوگی۔ بس میں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ جو کچھ میں نے اس کے ساتھ کیا، وہ اسے خوفزدہ کرنے کے لیے کافی ہے۔“

”بہت عمدہ۔۔۔۔۔۔ اور بسکٹ لو۔ وہ تم ہی تھے جس نے سوٹ کیس کا سامان باہر نکالا؟“

”ہاں۔ میں نے سوچا کہ اس مار پیٹ کے بعد یہ اور بھی برا ہوگا کہ کوئی اور رقم لے کر بھاگ جائے۔“

”لیکن رقم اس میں نہیں تھی۔“ ”نہیں۔“ دیک جی لی نے چائے کا مگھٹ لیتے ہوئے کہا۔ ”جیسا کہ تم نے کہا تھا جن تائی تائی، واقعی اس میں کچھ نہیں تھا۔“

”تم مجھے آگئی کہہ سکتے ہو۔“ میں نے کہا۔ ”کیا تم نے یہ خبر چنانچہ ان دنوں میں پھیلا دی ہے۔۔۔۔۔۔ اس سوٹ کیس میں رہی چیزوں کے بارے میں؟“

اس نے سہرا لٹے ہوئے کہا۔ ”ہر کوئی جان گیا ہے۔ میں نے ایسی اداکاری کی جیسے واقعی پاگل ہو گیا ہوں۔“

”تم نے بہت اچھے طریقے سے اپنا کام کیا ہے۔“ ”میں نے کہا۔ ”اور جانے دو گے؟“

دیک جی لی نے جانے کے بعد میں نے مزید کچھ ٹیلی فون کالز کیں۔ ان میں سے ایک جارج اور دوسری اس کی ماں گھور یا کے لیے تھی۔ میں نے رات والے واقعے پر ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے اسے ایک بار پھر چائے پر مدعو کیا۔

ایک بار پھر وہ سوٹ کیس سمیت میرے گھر کی بیڑمیاں چڑھ رہی تھی۔ جب وہ دروازے پر پہنچی تو میں

نے اس کی چھتری لے کر ہاتھ روم میں رکھ دی۔ وہ میرے لیے سیاہ پھلیوں والے بن لے کر آئی تھی جو میں نے چائے دان کے ساتھ ایک پلیٹ میں رکھ دیے۔

”تم بالکل ٹھیک لگ رہی ہو۔“ میں نے کہا۔ ”کوئی چوٹ تو نہیں آئی؟“

”نہیں۔ میں بھاگ گئی تھی۔ انہیں صرف میرا سوٹ کیس چاہیے تھا۔ میں نے پہلے ہی پولیس کو اس لڑکے کے بارے میں بتادیا ہے جو اپنے آپ کو بکھر رہا ہے۔ وہ اسے تلاش کر لیں گے۔“

”اس طرح انہیں یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ تمہاری قیمتی اشیاء اس کے پاس نہیں ہیں۔“

”نہیں۔ خوش قسمتی سے وہ انہیں تلاش نہیں کر سکا۔“ وہ آگے کی طرف جھکی اور اپنی آواز نیچی کرتے ہوئے بولی۔ ”میں نے انہیں ایک دوسرے سوٹ کیس میں منتقل کر دیا تھا۔“ اس نے ایک سے سوٹ کیس کی طرف دیکھتے ہوئے سر ہلایا جس نے میرے گھر کا داخلی دروازہ روک رکھا تھا۔

”گھور یا۔“ میں نے چائے کی پیالی میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ ”جس سوٹ کیس کو تم ساتھ لیے ہوئے پھر رہی تھیں، اس میں تمہاری کوئی قیمتی چیز نہیں تھی۔ تم چاہتی تھیں کہ کوئی یہ سوچ کر حملہ کرے کہ اس سوٹ کیس میں وہ رقم ہے جس کی چوری کا الزام تمہارے شوہر پر لگا تھا لیکن جب کہ وہ اسے لڑکوں نے سوٹ کیس کھولا تو اس میں صرف پرانے کپڑے اور ردی کا غنڈ تھے۔ فوراً ہی یہ خبر پورے چانچا

ٹاؤن میں پھیل گئی۔ اب لوگ یہی سمجھیں گے کہ شوہر کی موت کے صدمے سے تمہارا ذہنی توازن خراب ہو گیا ہے۔ آئندہ کوئی تم پر حملہ نہیں کرے گا اور نہ ہی کوئی اس رقم کی تلاش میں تمہارے اپارٹمنٹ کا رخ کرے گا جس کی چوری کا الزام تمہارے شوہر پر لگا یا گیا تھا۔ یہ تھا تمہارا منصوبہ۔ اب تم اطمینان سے وہ ایک لاکھ ڈالر خرچ کر سکو گی۔“

گھور یا کا منہ کھلا رہ گیا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ”میں نہیں جانتی۔“ میں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”جب پولیس نے تمہارے اپارٹمنٹ کی تلاشی لی تو وہ رقم کہاں چھپائی گئی تھی۔ اگر تمہارے شوہر نے کوئی سیٹیفیڈ بیازٹ بائس کرائے پر لیا ہو تو پولیس اس کا بھی پتا لگا لیتی لیکن اگر کسی نے پہلے سے بتا دی کہ تمہاری بڑی رقم کو چھپانے کے لیے اور کسی کئی جگہیں ہیں۔ ابھی میں نے کہا کہ یہ تمہارا منصوبہ تھا لیکن اصل اسکیم تمہارے شوہر نے

درخواست ہے۔ پیرا سے ایک غور دیکھ لیں۔
 ”کون ہے وہ؟“
 ”ایک اکیلی عورت۔ میرے پڑوس میں رہتی ہے۔
 بوڑھی ہو چکی ہے۔ اس کا کوئی بھی پڑسان حال نہیں ہے۔ اس
 کے شوہر کا انتقال ہو چکا ہے اور کوئی اولاد بھی نہیں ہے۔“

میری اسسٹنٹ میری میز کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔
 اس وقت اس کی مداخلت مجھے محل گئی تھی۔ میں نے
 کہا۔ ”کیا بات ہے۔ تم جانتی ہو کہ میں سیمینار کے لیے نوٹس
 مار رہا ہوں۔ ایک گھنٹے کے بعد مجھے اپنا کچھر ڈیلیور کرنا ہے۔“
 ”سوری سر!“ وہ بوکھلا گئی تھی۔ ”لیکن آپ سے ایک

میں رہنا چاہے اور گھر یا تم یا گھوں کی طرح سوٹ کیس لے
 کر پھرنا چھوڑ دو گی۔ اس کے علاوہ جنہیں پولیس کو یہ بھی بتا:
 ہوگا کہ تم سے حملہ آور کو پکچانے میں غلطی ہوئی۔ پھر ایک
 رات تیل میں گر کر چکا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس کے لیے
 اتنا ہی کافی ہے۔“

وہ دونوں میری بات سمجھ گئے اور انہوں نے میری
 انکیم سے اتفاق کیا۔ جب وہ جانے لگے تو میں نے جارج کو
 یاد دلایا کہ میں نے اس کے لیے جو سراغ رسائی کی ہے،
 اس کا تیل بھیج رہی ہوں۔

ان کے جانے کے بعد میں نے کئی مارنگ جیولرز کو
 فون کیا۔ ”چن یونگ بن بول رہی ہوں۔“ میں نے مالک
 سے اپنا تعارف کر دیا۔ ”میں نے ابھی ابھی
 افواہ سنی ہے کہ تمہاری رقم واپس مل جائے گی۔“
 ”کیا؟“ وہ چونکتے ہوئے بولا۔ ”تم نے کس سے
 سنا؟ وہ رقم کہاں ہے؟“

”تم یہ سوال نہ کرو تو بہتر ہے کہ یہ رقم کہاں تھی۔ سارا
 مسئلہ ایک غلط فہمی کی وجہ سے ہوا جو دور ہو گئی ہے۔ البتہ مجھے
 تم سے ایک بات اور کہنی ہے۔“
 ”وہ کیا؟“

”گزشتہ گفتگو کے دوران میں نے تم سے ایک چھوٹی
 سی مہربانی کی بات کی تھی۔ اگر تم وہ کرو تو سب کچھ ٹھیک
 ہو جائے گا۔“

”کیا یہ کوئی جبر ہے؟“
 ”نہیں سفارش..... میں نے کہا۔“

”میرے جاننے والوں میں ایک نوجوان شخص کو
 ملازمت کی ضرورت ہے، گوکہ اس کا ماضی داغ دار ہے لیکن
 وہ دل کا بہت اچھا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ تمہارے لیے
 کارآمد ثابت ہوگا۔“

اس مہم کو سرانجام دینے کے لیے مجھے چار مختلف کو ریز
 کسپینوں کی خدمات حاصل کرنا پڑیں تاکہ رقم کی منتقلی کا مکمل
 مکمل طور پر خیر رہے۔ پہلی کھپتی نے گھوڑیا کے ٹلیٹ سے مال
 اٹھایا۔ اس طرح دوسری، تیسری اور پھر چوتھی کھپتی کے ذریعے
 آخری ڈیلیوری ہوئی۔ اس سارے عمل کے دوران میں بری
 طرح تھک گئی لیکن یہ اطمینان ضرور تھا کہ میں نے چرائی ہوئی
 رقم اس کے مالکوں تک واپس پہنچادی تھی بلکہ اس کے عوض
 ایک بھیکے ہوئے پائوس نوجوان کو بھی سیدھے راستے پر لگا دیا۔
 اب مجھے بھر کے لیے بھی ایسا ہی بندوبست کرنا تھا۔

بتائی تھی۔ تم دونوں کو ڈر تھا کہ اس کی موت کے بعد تمہارا بیٹا
 مکان کا کرکرا دینے سے انکار کر دے گا اور تمہیں اپنے ساتھ
 رہنے پر مجبور کرے گا۔ اس لیے اس عمتائی سے بچنے کے
 لیے یہ طریقہ اختیار کیا گیا۔“
 اب بھی گھور یا خاموش رہی۔

”میرے اپنے بچے بھی ایسی ہی خواہشات کا
 اظہار کرتے رہتے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”کہ مجھے اپنے
 بڑے بیٹے کے پاس کو کنز چلے جانا چاہیے۔ میں ایسا نہیں
 چاہتی گوکہ ان کے ساتھ اچھا وقت گزارتی ہوں۔ یہ بہت
 اہم ہے کہ بچے اپنی دادی کے بارے میں جانیں۔ اسی
 طرح میں انہیں دادا کے بارے میں بھی یاد دلانی رہتی
 ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ تم بھی ایسا ہی کر دو گی گوکہ اس کا
 سہرا تمہارے شوہر کو جاتا ہے کہ اس نے مرنے سے پہلے
 تمہاری خوشی کا انتظام کر دیا۔ ویسے بھی یہ بہت شاطرانہ
 انکیم تھی لیکن تم اپنے پوتے پوتیوں کو کیا بتاؤ گی کہ ان کا
 دادا ایک چور تھا۔“

اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتی، دروازے کی گھنٹی بجی
 اور دوسرے ہی لمحے جارج داخلی دروازے میں کھڑا
 جوتے اتار رہا تھا۔ میں نے اسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا
 اور بولی۔ ”اپنی ماں سے سخت رویہ اختیار نہ کرنا۔ یہ
 ناخلفی ہوگی۔ تمہارے لیے بہتر ہوگا کہ اس بات پر توجہ دو
 کہ وہ اپنے گھر میں رہنے کے لیے کتنی تنہید ہے۔ وہ کب
 تک یہاں رہ سکتی ہے اور تمہارا باپ بھی چاہتا ہوگا کہ اس
 کی خواہش کا احترام کیا جائے۔ تم نے گزشتہ روز کہا تھا کہ
 کاش تمہاری ماں سمجھ سکتے کہ تم اسے اپنے ساتھ رکھنے میں
 کتنے تنہید ہو۔ میرا خیال ہے کہ اب وہ یہ بات سمجھ جائے
 گی۔ جنہیں وہ رقم مل گئی؟“

جارج نے اپنی ماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
 ”میں اپارٹمنٹ سے ہی آ رہا ہوں۔ وہ رقم الماری کے نچلے
 خانے کی ہے۔ میں پچھانی گئی تھی۔ اب مجھے یقین آ گیا کہ
 ڈیڈی نے ہی وہ رقم چرائی تھی۔“

گھوڑیا کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ ماں اور بیٹا ایک دوسرے
 کی شکل دیکھنے لگے۔

میں نے جلدی سے کہا۔ ”اب میں بتاتی ہوں کہ یہ
 مسئلہ کیسے حل ہوگا۔ اس کمرے سے باہر کسی شخص کو بھی اس
 بارے میں علم نہیں ہونا چاہیے۔ میں گماں بن کر رقم کی
 واپسی کا بندوبست کروں گی۔ جارج! تم اپنی ماں کے
 اپارٹمنٹ کا کرایہ دیتے رہو گے جب تک وہ چائنا ٹاؤن

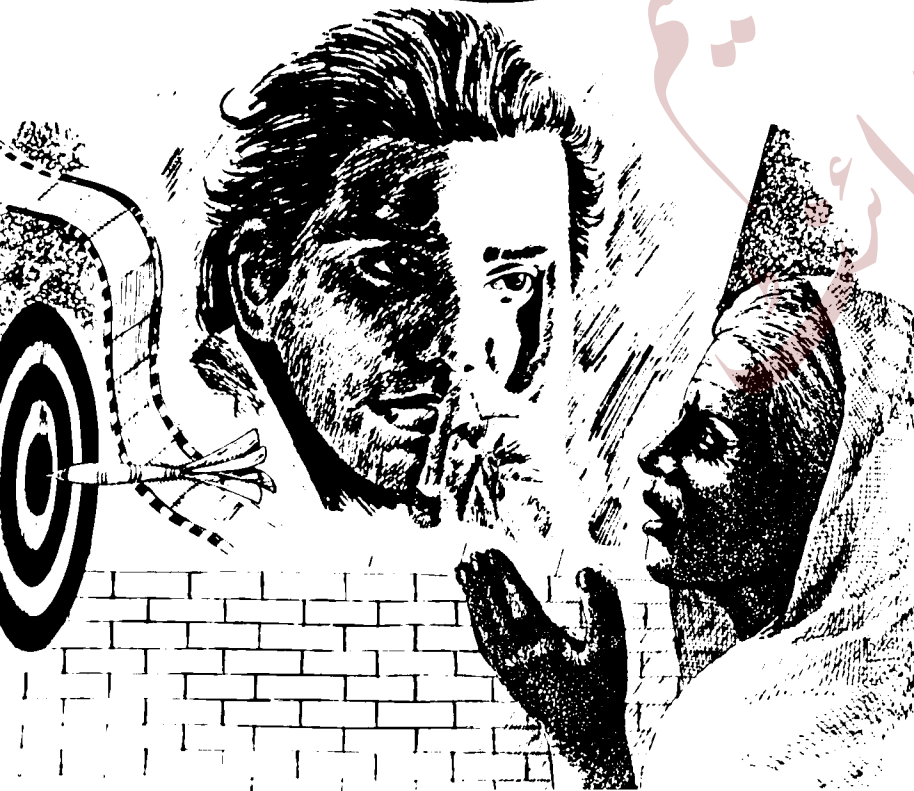
ایک لمحہ

منظر امام

یہ حقیقت ہے کہ بس کوئی ایک لمحہ ہی ہوتا ہے جب زندگی بن بھی
 جاتی ہے اور بکھر بھی جاتی ہے... اور اگر کسی دوسرے کے اختیار میں
 یہ بنانے اور بکھیرنے کا عمل آجائے تو یہ اس کا ظرف کہ وہ کیا فیصلہ
 کرتا ہے... وہ بھی بس اسی ایک لمحہ کا قیدی تھا جس میں اس کی
 قسمت کا فیصلہ کسی انتہائی کمزور انسان کے ہاتھ میں تھا اور اس
 نے اس کا حق ادا کر دیا مگر... ایک روز اسے اس حق کا فرض
 بھی ادا کرنا تھا۔

محبت اور امانت کا ادھار اہل کرنے والے ایک

خوش قسمت انسان کا ماجرا



”کیا مصیبت ہے؟“ میں جھلا گیا تھا۔ ”میں تم سے اس کی لائف ہسٹری نہیں معلوم کر رہا۔ کیا پراہم سے اس کے ساتھ؟“ شہلانے اپنے ہاتھ میں تھامی ہوئی رپورٹ میری طرف بڑھادی۔ رپورٹ دیکھ کر میں اور بھی جھلا گیا۔ ”شہلا کیا ہوا ہے تمہیں۔ یہ کیس میرا نہیں ہے۔ اس کی Knee cap اپنی جگہ سے کھسک گئی ہے۔ یہ سرجری کا کیس ہے۔ وہ بھی بڈیوں کے سر جن کا۔“

”میں جانتی ہوں سر۔“ شہلا روہاٹی۔ ہوئی تھی۔

”لیکن ایک نظر اس بے چاری کو دیکھ تو لیں۔“

”میں اسے کمرے میں نہیں بلاؤں گا۔“ میں نے کہا۔

”کہاں بیٹھی ہے وہ؟“

شہلا خاموش ہو گئی تھی۔ اس نے فوراً میری ٹیبل کے پاس والا شیشا ایک طرف کر دیا۔ اس شیشے سے وہ دم نظر آ جاتا تھا جہاں مریض بیٹھا کرتے تھے۔ میں نے یہ خاص انتظام اسی لیے کیا تھا کہ جن مریضوں کو دیکھنا ہوتا تھا اسی طرح دیکھ کر بلایا کرتا تھا۔

”وہ دیکھیں سر۔ وہ سفید ساڑی میں۔“ شہلانے اشارہ کیا۔

میں نے اس بوڑھی کمزور عورت کو دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا۔ نہ جانے یادوں کی کتنی ٹھنکیاں ایک ساتھ کھل گئی تھیں۔ وہ کمزور اور بوڑھی ہو گئی تھی لیکن ان کے نقوش وہی تھے۔ وہی مہربان نقوش۔ پیار کرنے والے۔ خیال رکھنے والے۔

میں چند لمحوں تک اس کی طرف دیکھتا رہا پھر میں نے شہلا کی طرف دیکھا۔ جس کی امید بھری نگاہیں میری جانب لگی ہوئی تھیں۔ ”جاؤ، اسے بلاؤ۔“

شہلا جلدی سے باہر چل گئی۔ جیسے اسے یہ غصہ ہو کہ میں کہیں اپنا ارادہ نہ بدل دوں لیکن اسے کیا معلوم کہ اب تو میرے سارے ارادے اس بوڑھی عورت کے قدموں میں ڈھیر ہو چکے تھے۔ میں اس کو دیکھ کر اپنے اس زمانے میں چلا گیا تھا جب میں اسکول میں پڑھا کرتا تھا اور تعلیم میرے لیے وبال جان بنی ہوئی تھی۔ میری سمجھ میں کئی سبکیٹ نہیں آتے تھے۔ مجھے اپنے ابو کا خیال رہتا تھا۔ وہ بے چارے میری تعلیم کی وجہ سے کتنے پریشان رہتے تھے۔ دن بھر مزدوری کرتے اور شام کے وقت میری پڑھائی کا پوچھا کرتے۔ جبکہ ان کو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ انگریز کس کو کہتے ہیں اور جیو میٹری کیا چیز ہوتی ہے۔ میں ان کو اپنی کانیاں دکھایا کرتا اور وہ ابھی ہونے لگے کہ خوش ہو جاتے۔

دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ شہلا اس عورت کو لے آئی تھی۔ اس غریب سے چلا بھی نہیں جا رہا تھا۔ شہلانے اسے

سانے والی کرسی پر بٹھا دیا۔

وہ مجھے دیکھ کر مسکرائی۔ وہی مسکراہٹ۔ وہ نہیں بڑا تھی۔ اس مسکراہٹ میں وہی تازگی تھی وہی پیار تھا۔ اپنا ہاتھ جو پہلے کسی ہوا کرتی تھی۔

”بیٹا، میری رپورٹ تو دیکھ لی؟“ اس عورت نے مجھے مخاطب کیا۔

”ہاں اماں دیکھ لی ہیں لیکن۔۔۔۔۔“ میں کچھ کہتے کہ رک گیا۔

”کیا ہوا بیٹا؟ بتاؤ۔۔۔۔۔“

”اماں! آپ کا یہ کیس عام دواؤں کا نہیں ہے۔ کھنٹے آ سرجری ہوگی۔ آپ کو ڈاکٹر اشتہام کے ہاسپتال جانا ہوگا۔ وہاں اسی کا علاج ہوتا ہے۔“

”جانتی ہوں بیٹا۔“ اس نے ایک گہری سانس لی۔ ”میرے ایک جاننے والے وہاں بھی لے گئے تھے لیکن سرجری کے اخراجات میں برداشت کرنے کے قابل نہیں ہوں۔ مجھے تو بس کوئی چن کر دوں گا کہ تھی طور پر اس درد سے نجات مل جائے۔“

”لیکن آپ کو تو سرجری کرانی ہی ہوگی۔“ میں نے کہا۔

”چن کر سے کام نہیں چلے گا۔“

”سرجری کہاں سے کرواؤں۔ میرے پاس تو پیسہ نہیں ہیں۔“

”بہت پہلے، بہت پہلے بالکل سبکی بات میں نے اپنی ٹیٹ سے کہی تھی۔“ اس نے تنہا تنہا کہا۔ ”اس میں تو پیسے ہی نہیں ہیں۔“

”کوئی بات نہیں۔“ ”مجھے میرے گال پر جھکی دی۔ اگر پیسے نہیں ہیں تو کیا ہوا۔ میں دوں گی پیسے۔ تم ایسا کرو، شا کے وقت میرے گھر آ جایا کرو۔ میں تمہاری کتابیں بھی لوں گی۔“

”مجھ کا گھر میرے محلے کے قریب ہی تھا۔ میں نے ایک بار ان کا گھر دیکھا تھا۔ ان کے والدین بھی ان کے ساتھ تھے۔ میرے لیے یہ بہت خوشی کی بات تھی کہ مجھے پھر پھر یاد ہو کر مجھے خود ہی پڑھا میں گی۔“

میں نے گھر جا کر جب ابو کو بتایا تو وہ بھی خوش ہو گئے تھے۔ ”بیٹا! ایک کام کرو۔ تم مجھے اپنی ٹیٹ کے پاس لے چلو میں ان کا گھر لے آ کر دوں گا۔“

پہلے دن ابو میرے ساتھ گئے تھے۔ وہ اپنے ساتھ مٹھائی کا ایک ڈبا بھی لے گئے تھے۔ ”مجھے ان سے کہا۔ ”ارے آپ نے اس کی زحمت کیوں کی۔ کیا ضرورت تھی؟“

”میرے غریب لوگ ہیں ٹیٹ! ابو نے کہا تھا۔“ آپ میرے

لے لیے بہت کچھ کر رہی ہیں۔ میں اور کیا کر سکتا ہوں؟“

”مجھ دنوں کی بات ہے۔“ ”مجھ مسکرائیں۔“ ”مجھ آپ نے غریب نہیں رہیں گے۔ کیونکہ مجھے اندازہ ہو گیا ہے کہ آپ کی ٹیٹ ایک بڑا آدمی بننے والا ہے۔“

ان کی حوصلہ افزائی ہی تھی۔ جس نے مجھے شہر کا ایک ڈاکٹر اور بڑا ڈاکٹر بنادیا تھا اور میں نے ان کی وجہ سے اور ان کے بڑے عزت و دولت اور شہرت کمائی اور اس وقت وہی میرے ہاتھ میں تھی کہ وہی جس کے پاس اپنے آپ پریشن کے نام سے نہیں ہیں۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ میں نے اپنا چہرہ دوسری طرف کر لیا۔

”بیٹا۔“ ”مجھ کی آواز آئی۔“ ”تم مجھے کوئی چن کر ہی دو تو بہتر ہوگا۔“

”دیکھیں میری بات سمجھنے کی کوشش کریں۔“ میں نے کہا۔ ”میں نے کمرے میں کچھ نہیں ہوگا اور جہاں تک اخراجات کا تعلق ہے تو آپ اس کی پروا نہ کریں۔ میرے پاس ایک انجی او ہے۔ وہ آپ کے سارے اخراجات برداشت کرے گی۔ آپ کو کوئی ٹیٹ نہیں ہوگی۔“

”سب تو میں نہیں چاہتی۔“ اس نے کہا۔

”وہ کیوں؟“

”اس لیے کہ میں یہ اچھی طرح جانتی ہوں کہ وہ این جی او کیوں سی ہوگی۔ میرے سارے اخراجات تم برداشت کر رہے ہو۔“ ”میں نے کہا۔ ”لیکن میری ٹیٹ میرے ہی ہے کہ میں نے کسی سے کچھ نہیں مانگا۔ کسی سے کچھ نہیں لیا۔ یہ بات تم ہی جانتے ہو۔“

”میں؟“

”ہاں بیٹا۔ میں نے بچپان لیا ہے تم کو۔“ ”مجھ نے کہا۔ ”میں انجی او ہونا۔ پہلے صرف ڈیشان ہوا کرتے تھے۔ اب ماشاء اللہ ڈاکٹر ڈیشان ہو گئے ہو۔ شہر کے سب سے بڑے ڈاکٹر۔ میں نے کہا تھا کہ تم بہت بڑے آدمی بننے والے ہو۔ خدا نے ان کی بات رکھ لی۔ میں نے اس کمرے میں آتے ہی تم کو بلایا تھا بیٹا۔“

میں اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کے قدموں میں جا کر بیٹھ گیا۔ میں رو رہا تھا۔ وہ بھی رو رہی تھیں۔

”ابو! میں نے اپنا کانٹا ہوا ہاتھ میرے سر پر رکھ دیا۔“ ”جب میں بیٹھا تھی اور شہر دے سے بھٹی آئی تھی تو کیا ایک ڈاکٹر نہیں ہے کہ وہ اپنی ماں کی خدمت کر سکے۔ بتائیں؟“

”ابو! میں نے تو یہ سمجھا تھا کہ کسی خدا کا حق نہیں ماننا چاہیے۔ اس لیے کہ اب آج جب ایک بیٹا اپنی ماں سے اپنا حق مانگ

معافی

وہ ایک عام سادہ تھا۔ لاہور کی مال روڈ میری گزرگاہ تھی۔ جسے چند لوگوں نے ٹرڈور درمیان میں رکھ کر روک رکھا تھا اور وہاں دے رہے تھے۔ پتا نہیں یہ معاشرہ کس سمت نکل پڑا ہے؟ ہم زندوں کا احترام تو کب کا کھو گئے، اب مردوں کا بھی کھونے لگے ہیں۔ مردوں کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کرنا کہاں کا احتیاج ہے؟

ٹرڈور سے معافی کے لیے آگے بڑھا، لیکن اس دن مجھے معلوم ہوا کہ معافی بھی مقدروالوں کو ملتی ہے۔ چار پائی کے قریب ہوا تو۔۔۔۔۔ آواز آئی۔ صاحبہ! یہ عورت ہے۔ میں نے فوراً پاؤں کے پاس جاتے ہوئے ہاتھ ہٹا لیے اور آگے سے کہا۔ کیا انسان مرنے کے بعد بھی عورت یا مرد رہتا ہے؟ چار پائی پر ہاتھ رکھ کر معافی مانگی اور کہا۔ درحقیقت آپ زندہ ہو۔۔۔۔۔ ہم مر گئے ہیں۔

(صابر چودھری کی کتاب اپنا ریل کی ڈاڑی سے اقتباس)

مرسلہ: جاوید اختر، رانا، پاک چن شریف

رہا ہے تو آپ کیوں دیر کر رہی ہیں؟“

وہ خاموش رہیں۔ البتہ سسکیاں لے رہی تھیں۔ اسی دوران شہلا بھی کمرے میں داخل ہو گئی۔ وہ یہ سب دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔ وہ پریشان ہو کر جانے لگی تھی۔ میں نے اسے آواز دی ”شہلا!“

”میں سر!“ وہ رک گئی تھی۔

”شہلا فوراً ڈاکٹر اشتہام سے اپائنٹ لے لو۔ میرے حوالے سے۔ ان سے کہنا ڈاکٹر ڈیشان کو اپنی ماں کی سرجری کروانی ہے۔ سمجھیں؟“

ایک بار مجھ پر کچھ کا ہاتھ میرے سر پر آ گیا۔ میں نہیں جانتا کہ میں نے اپنا حق ادا کیا تھا یا نہیں لیکن اتنا ضرور ہے کہ بہت دنوں کے بعد مجھے ایک عجیب سا سکون ملا تھا۔ ایسا سکون جو اس وقت ملا کرتا تھا جب میری ماں زندہ تھی۔ اور میں ایک ڈاکٹر ہونے کے ناتے سب سے یہ کہہ رہا ہوں کہ جب بھی زندگی میں ایسا کوئی موقع آئے تو اسے قبولی انا اور شان کے چکر میں بڑا نہ کریں۔ فائدہ اٹھالیں۔



شیش محل

قسط نمبر: 22

اسماء تادری

جہاں پر انسان کی بے بسی کی انتہا ہو... وہیں سے ربّ جلیل کی رحمتوں کی ابتدا ہوتی ہے۔ یہ بات کبھی اس نے بچپن میں سنی تھی مگر حادثات و واقعات اور طبقاتی کشمکش میں گہری مختصر سی فانی زندگی کے پیچ و خم میں الجھ کر اسے کچھ یاد نہ رہا... اسے نہیں معلوم تھا کہ یکسانیت سے بے زار اور تنوع کے متلاشی لوگ معزز اور بلند مقام کے حصول کی خاطر خود کو کتنی پستی میں گرا لیتے ہیں۔ وہ ذہین و فطین نوجوان بھی آنکھوں میں خوش امیدی کے خواب لیے راہ میں پلکیں بچھانے اس کا منتظر رہتا تھا لیکن ناکام آرزوئوں اور ناآسودہ تمنائوں کے انجام نے اس کے منہمک زخموں کو لہو لہو کر دیا... راکھ میں دبی چنگاری نے اس کے تمام ارادوں کو خاکستر کر ڈالا۔ دل کی بے ترتیب دھڑکنوں کے ساز کے درمیان جو خوش امیدی کبھی اس کی زندگی کا حصہ تھی اب نہ تو وہ خوش دکھائی دیتا تھا اور نہ ہی کسی کی آنکھ میں اس کے لیے کوئی امید باقی تھی۔ جانے یہ زندگی کا کونسا موڑ تھا... وہ تو شیش محل کے پر منظر میں محبوب کی مسکراتی آنکھوں کے جلنے دیپ میں اپنے عکس کو دیکھنے کا عادی تھا... کھلتے گلابوں اور محبتوں کی برستی پھوار میں خود کو بھیگا محسوس کرتا تھا کہ اچانک اس شیش محل میں ہر جانب لپکتے شعلوں کی جھلک دکھائی دی تو احساس ہوا کہ وہ لوگوں کے ہجوم میں کس قدر تنہا ہے... جسے وہ اپنا ہمسفر اور رفیق سمجھتا رہا اس سے بڑا قیب کوئی نہ نکلا۔

اسرا و مجرّمے پرڈوں میں شرف سرسبز رنگ برنگی دارنات تلی کی ماس دلچسپ داستان

[illegible]

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

جولیت سوکر بھی تو طبیعت میں مجیب ہی کسلندی اور ادا سی محسوس کر رہی تھی۔ رات میں بھی اسے ابھی اور پرسکون نیند نہیں آ سکی تھی۔ بار بار عارف کا معذو رہے ممکن کراپا ذہن میں آ جاتا تھا۔ بے شک وہ مشکل حالات میں سارے قول و قرار بھول کر اسے چھوڑ دیتا تھا اور وہ بھی اس کی اس حرکت کے بعد اسے اپنے دل سے بے دخل کر چکی تھی پھر بھی اس کی تکلیف سے از حد متاثر ہوئی تھی۔ انہوں نے زندگی کے کئی برس ایک ہی تعلیمی ادارے اور پھر دفتر میں ساتھ کام کرتے ہوئے گزارے تھے اور تعلقی خاص سے بہت کر دیر یہ شناسائی کے باعث بھی وہ عارف کے لیے خود کو کبھی محسوس کر رہی تھی وہ جسمانی ہی نہیں، روحانی اذیت میں بھی جلتا تھا اور ڈھری تکلیف نے اسے بالکل ختم کر دیا تھا۔ کوئی انسان جسے آپ نے زندگی سے بھرپور صحت مند اور توانا دیکھا ہو، میں عالم جوانی میں ایسی اجترحات میں نظر آئے تو صدمہ تو محسوس ہوتا ہی ہے۔ چنانچہ جولیت بھی صدمے میں جلتا رہی تھی اور رات بھر سوچتی رہی تھی کہ عارف کے لیے کیا کر سکتی ہے۔ بہت سوچ بچار کے بعد اس نے فیصلہ کیا تھا کہ عارف

”ہم نے بی بی موسیٰ بھی کیا تھا میڈم لیکن یہ نہیں مانا۔ یہ تو صبح ہم سے بھی پہلے کچن میں موجود ہے۔ آج کا ناشتا انہوں نے ہی بنایا ہے۔ ہم نے تو صرف چائے اور ٹوسٹ ہی ریڈی کیا ہے۔“ خاناماں نے اپنی صفائی پیش کرنے والے انداز میں جولیٹ کو بتایا۔

”تم خاناماں سے بھی پہلے کچن میں پہنچی ہوئی ہو۔ صبح کتنے بیچے جاگ گئے تھے؟“ جولیٹ کی حیرت میں اضافہ ہوا۔

”ہم تجھ کے دقت ہی جاگ جاتے ہیں۔ فجر کے بعد دوبارہ سوئے کی عادت بھی نہیں ہے اس لیے سوچا کہ فارغ بیٹھے رہنے کے بجائے توڑ دیا سا کام ہی کر لیا جائے۔ ہمیں کھانا پکانے کا شوق ہے لیکن بہت زیادہ مشق نہیں ہے اس لیے معلوم نہیں آپ لوگوں کو ہمارا تیار کردہ ناشتا پسند بھی آئے گا یا نہیں۔“ اس نے نہایت سادگی سے جولیٹ کو جواب دیا۔

لینے کے باعث یہ کیفیت ہے چنانچہ خود کو تازہ دم کرنے کے لیے دل خانے میں ٹھس مٹی۔ خاصا طویل شاور لینے کے بعد وہ تیار ہو کر اپنے کمرے سے باہر نکلے اور باورچی خانے کا رخ لیا۔ اسد اللہ نے ہر کام کے لیے ملازمین کا انتظام کر لیا تھا جو طے کردہ معمول کے مطابق ہر کام انجام دے لیتے تھے۔ باورچی خانے کی ذمہ داری بھی ایک تجربہ

”اپنا شوق پورا کرنے کے لیے ہمیں کلنگ کی اجازت دے رہی ہوں لیکن تم اسے اپنی ذمہ داری نہیں سمجھتا۔ گھر کے ہر کام کے لیے ملازمین موجود ہیں۔ تم اپنی خوشی سے چاہو تو دادی جان کو تعویذ سی کہہ کر دے سکتی ہو کیونکہ ہمیں پتا ہے کہ میں دن بھر گھر میں موجود نہیں ہوتی اور بہت کم وقت ان کے ساتھ گزار پاتی ہوں۔ ان کی دیکھ

عارف نے اسے منع کر دیا، وہ لہ لہا اپنے پاس رکھ لی کہ ماجدہ خود یہ کام کر لے گی۔ " مردوں میں سے ایک صاحب نے اس کے سوال کا جواب دیا، وہ تو خالی نظروں سے سب کو دیکھ کر رہ گئی۔ اصل کیفیت یہ تھی کہ عارف اس دنیا میں نہیں رہا تھا اور اس کے جانے کی وجوہات پر بات کرنا ایک فردی ہی بات تھی۔

☆☆☆

سٹیوں اور دوڑتے قدموں کی آوازیں تیزی سے قریب آتی جا رہی تھیں۔ راہور جس کا چہرہ پہلے ہاتھ پر چاقو سے لگنے والے زخم کی تکلیف اور خوف کے باعث زرد ہو رہا تھا، زندگی بچ جانے کی امید ہوئی ہی مکمل اٹھا تھا۔

"میری ماں تو تم لوگ ہتھیار ڈال دو ورنہ کچھ ہی لمحوں میں کتے کی موت مارے جاؤ گے۔" اس نے خود کو گھبر کر کھڑے ستار بھائی کے آدمیوں سے کہا جنہوں نے کوئی رد عمل ظاہر نہیں کیا۔ وہ کم کے غلام تھے اور اس وقت ان کی تکمیل فاروق کے ہاتھوں میں تھی۔ وہ انہیں جو حکم دیتا، وہ اس پر عمل کرتے۔

"تم لوگ آگے جا کر آنے والوں کو روکنے کی کوشش کرو۔ اس سے حساب کتاب میں خود کروں گا۔" صورت حال سنگین ہونے کے باوجود فاروق کے چہرے سے اطمینان رخصت نہیں ہوا اور اس نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا۔ وہ فوراً ہی حرکت میں آ گئے۔

"تم بہت بڑی سلیک کر رہے ہو۔ تمہارے چند ساتھی پولیس فورس سے مقابلہ نہیں کر سکتے۔ آری بھی شہر میں ہی موجود ہے۔ ہنگامہ زیادہ بڑھا تو وہ لوگ بھی پولیس فورس کا ساتھ دینے آ جائیں گے۔" راہور نے فاروق پر دباؤ ڈالنے کی کوشش کی لیکن اس نے کوئی اثر نہیں لیا اور مسکراتا ہوا راہور کی طرف بڑھا۔ اس کی پیش قدمی پر راہور گھبرا گیا۔ اس کا پورا لور اس کے ہاتھ سے نکل چکا تھا اور مہتا ہونے کی وجہ سے وہ فاروق جتنا ہر اعتماد نہیں تھا۔ بدحواسی میں اسے سمجھا اور بھائی نہیں دیا تو کتنی کے نیچے ایسی تک گپے ہوئے فاروق کے چاقو کا دست پکڑ کر اسے ہی کھینچ کر باہر نکال لیا۔ اس عمل سے اس کی اذیت میں اضافہ ہوا اور خون نہایت تیزی سے بہنے لگا۔ عام حالات میں یہ ایک نہایت گہرا کھاد تھا لیکن جب جان پر پتی ہو تو آدمی اس طرح کی باتوں کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ راہور نے بھی یہی کیا اور ہاتھ میں پکڑا چاقو پوری قوت سے فاروق کو دے مارا۔ راہور کی طرف دھیرے دھیرے

دھمکی بھری کھڑکیوں پر ہاتھوں سے کھینچنے کو۔ موت کی لاش کو میری جان لینے کے لیے کیوں نہیں بھیجتا تو؟" وہ جواب دینے سے زیادہ آسان کی طرف ہاتھ اٹھا لیا کہ بالک کائنات سے جھلری تھی۔

"عارف مر گیا۔۔۔۔۔" جولیٹ کے وجود پر کوڑا سا لگا۔ "کیسے مر گیا وہ؟ کل تو میں اسے بالکل ٹھیک چھوڑ لی تھی۔" اس نے دوبارہ ماجدہ کو جھنجھوڑتے ہوئے اس پر ہاتھ رکھا۔ عارف کمزور اور معذور ضرور ہو گیا تھا لیکن اس کی حالت اتنی بری بھی نہیں تھی کہ وہ ایک رات میں ہی جان لی بازی ہار جاتا۔ وہ تو اس کے لیے کیا کچھ سوچ کر یہاں آئی تھی اور وہ ہی باقی نہیں رہا تھا۔

"رات کسی وقت اس نے چوہے مار دوا کھا کر نوکشی کر لی۔ صبح یہ جسم تلی آئی تو بھائی کی لاش دیکھی۔۔۔۔۔" ایک کے سوال کا جواب ماجدہ کے بچائے ایک اوجیز عمر مورت نے دیا۔ اس کے انداز میں ماجدہ کے لیے غلامت تھی۔ یقیناً اسے بھی ماجدہ کے کرتوتوں کا علم تھا اور کچھ دیر ہی کہ عارف کی خودکشی کے پیچھے ماجدہ کی بھیگی ہوئی روش ہی تھی۔ جولیٹ بھی جانتی تھی کہ ماجدہ کی وجہ سے عارف ذہنی تناؤ اور جذباتی ابتری کا شکار تھا لیکن وہ محسوس کر رہی تھی کہ اس انتہائی قدم کے پیچھے خود اس سے ہونے والی ملاقات بھی کا فر نامی۔ عارف نے اسے اس لیے چھوڑ دیا تھا کہ اس کے حساب سے اب وہ ایک پاک دامن عورت نہیں رہی تھی اور وہ اسے اپنے خاندان کا حصہ نہیں بنا سکتا تھا لیکن قسمت نے اس کے منہ پر، جولیٹ کی مظلومیت پر بے رحمی کا مظاہرہ کرنے کے نیچے میں اس سے بھی شدید طمانچہ مار دیا تھا۔ اس کی ایک بہن کو بلوائی اٹھا کر لے گئے تھے اور دوسری روپوں کے لیے جسم کا دھندا کرنے لگی تھی۔ وہ جو پہلے ہی اندر سے بری طرح ٹوٹ چکا تھا، جولیٹ کے سامنے ہونے والی شرمندگی کو نہ سہہ سا اور خود اپنے ہاتھوں سے اپنی جان لے لی لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ اس کے پاس چوہے مار دوا آئی کہاں سے؟ اس نے یہ سوال بلند آواز سے کر بھی ڈالا۔

"اس نے صفائی والے لڑکے کو پیسے دے کر دوا منگوائی تھی۔ اس نے شکایت کی تھی کہ اس کے خیمے میں بہت چوہے ہو رہے ہیں جو کھانے پینے کے سامان میں بھی گھس جاتے ہیں اور وہ اپنی معذوری کی وجہ سے انہیں ہکا نہیں پاتا۔ لڑکے نے دوا لار دینے کے بعد عارف کو پیشکش کی تھی کہ وہ خیمے کے مختلف حصوں میں دوا ڈال دیتا ہے لیکن

وہ بھی ناشتے کا ٹائم ہو گیا ہے، پاپا اور بڑے ابا بھی ناشتے کے لیے آنے والے ہوں گے۔" "ہم یہیں ناشتا کر لیتے ہیں؟" چاند بانو نے جھجکاؤ مظاہرہ کیا۔

"بالکل نہیں۔ تمہارے ہاتھ کا بنایا ہوا ناشتا تمہاری موجودگی میں ہی اصل لطف دے گا۔" جولیٹ نے اس کے انکار کو قطعی رد کر دیا اور ندرت جہاں سے مخاطب ہو کر بولی۔ "اجمادادی جان! اب اجازت دیجیے۔ دوبارہ شام میں آپ سے ملاقات ہوگی۔"

ندرت جہاں نے نگاہوں کی زبان سے اسے الوداع کہا۔ یہ حالات کی بہت بڑی تبدیلی تھی کہ وہ جولیٹ جس کی شکل دیکھنا بھی انہیں گوارا نہیں تھا، اب انہیں عزیز ہو گئی تھی لیکن وہ زبان سے اظہار کرنے سے قاصر تھیں۔

ناشتے کی میز پر جولیٹ نے خاص طور پر اسد اللہ اور صفی اللہ کو بتایا کہ آج کا ناشتا چاند بانو نے تیار کیا ہے۔ صفی اللہ نے اختصار سے اور اسد اللہ نے بہت مکمل کر چاند بانو کے بنائے ناشتے کی تعریف کی۔ وہ اپنی جگہ بیٹھی جیسے ہی خود اس نے بہت کم کھایا۔ ڈھیر ساری تعریفیں کرنے کے باوجود جولیٹ نے خود بھی بہت کم کھایا تھا۔ صبح سے طبیعت پر جو اضطراب چھایا ہوا تھا، وہ اسے چھپانے کی کوشش تو کر رہی تھی لیکن خود اپنی ذات کو اس کے اثرات سے بچا نہیں رہی تھی۔ ناشتے سے فراغت کے بعد اس نے سب کو گڈ بائے کہا اور کیمپ کے لیے روانہ ہو گئی۔ وہاں پہنچے ہی اس نے سب سے پہلے عارف کے خیمے کا رخ کیا لیکن وہاں جمع ہجوم کو دیکھ کر دور ہی سے خشک گئی۔ لوگوں کی چمکیوں کے درمیان کسی عورت کے بلند آواز میں کیے جانے والے بین سب سے نمایاں تھے۔ وہ تیز تر قدموں سے چلتی ہوئی آگے بڑھی۔ قریب پہنچے پر اسے ہجوم کے درمیان سینہ کوٹ کوٹ کر روٹی ماجدہ دکھائی دی۔ اس کا دل دھکم سے وہ گیا۔ وہ لوگوں کے درمیان سے راستہ بناتی ہوئی ماجدہ تک پہنچی۔ اس کے ارد گرد کئی عورتیں موجود تھیں جو اسے سنہالنے کی کوشش کر رہی تھیں لیکن وہ پچھاڑیں کھاتی کسی کے قابو میں نہیں آ رہی تھی۔

"کیا ہوا ہے ماجدہ؟ تم اس طرح کیوں رو رہی ہو؟" اس نے ماجدہ کا شانہ زور سے ہلاتے ہوئے دھشت زدہ لہجے میں پوچھا۔

"میں لٹ گئی۔ میں برباد ہو گئی۔ میرا کچھ نہیں بچا، مجھے چھوڑ کر چلا گیا میرا بھائی۔ پورا خاندان مر گیا، میں کیوں

بھال کے لیے نرس موجود ہے لیکن میرا خیال ہے تمہاری کہنی سے ان کی صحت پر اچھا اثر پڑے گا۔"

"مجھے شک ہے۔ ہمیں خود بھی ان کی صحبت میں وقت گزار کر خوشی ہوگی۔ اب اگر آپ اجازت دیں تو ہم وادی جان کے لیے یہ دیا لے جائیں۔ ٹھنڈا ہو کر لطف نہیں دے گا۔"

"بالکل لے جاؤ پھر ناشتے کی میز پر آ جانا۔ تمہارا بنایا ہوا ناشتا تمہارے بغیر کھانے میں بھلا کیا لطف آئے گا۔" جولیٹ اس کے انداز پر مسکرا دی اور اسے باہر جانے کا راستہ دیا۔ وہ چلی گئی تو اس کے تیار کردہ ناشتے کا جائزہ لینے لگی۔ پوریاں، آلو جھولوں کی ترکاری، سوچی کا خوش رنگ و خوشبودار طوا۔ ابلے ہوئے انڈے بالکل تیار ٹرائی میں سجے ہوئے تھے اور اب ملازم کھن، جیم اور ٹوسٹ جیسے لوازمات ٹرائی میں منتقل کر رہا تھا۔ وہ اس طرف سے مطمئن خود بھی ندرت جہاں کے کمرے میں پہنچ گئی۔ چاند بانو نے ان کے اوپر دی دھڑکنیوں کا سہارا دے کر قدرے اوپر اٹھا رکھا تھا اور گلے میں نیپکین باندھ کر انہیں پیچھے کی مدد سے دلیا کھلا رہی تھی۔ ندرت جہاں کی حالت ایسی تھی کہ وہ معمول کی غذا انہیں لے سکتی تھیں اور انہیں غم غم خاص یا مانع غذا ہی دی جاتی تھی۔ وہ غذا بھی وہ بہت کم مقدار میں لیتی تھیں لیکن جولیٹ نے محسوس کیا کہ آج وہ چاند بانو کا تیار کردہ دلیا کافی رغبت سے کھا رہی ہیں۔ انہیں کھلاتے ہوئے چاند بانو ان سے چھوٹی چھوٹی باتیں بھی کرتی جا رہی تھی۔ وہ کسی کی باتوں کا جواب نہیں دیتی تھیں لیکن ان کی آنکھوں کی چمک اور چہرے کے تاثرات سے ظاہر تھا کہ انہیں چاند بانو کا خود سے بات کرنا اچھا لگ رہا ہے۔ جولیٹ کے دیکھنے ہی دیکھتے چاند بانو نے پیالے میں موجود سارا دلیا انہیں کھلا دیا اور پھر بڑی محبت سے ان کا منہ صاف کرنے لگی۔ وہ اپنے کام سے فارغ ہو کر پیچھے ہٹی تو جولیٹ نے آگے بڑھ کر ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر چھوڑا اور شوق لہجے میں بولی۔

"دیکھیے وادی جان! میں آپ کے لیے اتنی اچھی لڑکی ڈھونڈ کر لائی ہوں۔ یہ تو بالکل سٹیوں کی طرح آپ کا خیال رکھ رہی ہے اور مجھے لگتا ہے کہ آپ کو اس کے ہاتھ سے بنا دیا بھی بہت اچھا لگے۔"

"آج روائٹ میڈم اور ٹیلی آج ہیگم صاحب نے پہلی بار ٹھیک سے ڈائنٹ لیا ہے۔"

نرس نے بھی اس کی تائید کی۔

"اب تو مجھے بھی تمہارے ہاتھ کا ڈائنٹ چکھنے کی بے چینی ہو رہی ہے چاند بانو! چلو ڈائنٹک روم میں چلے ہیں۔"

بڑھتا فاروق اس کی ایک ایک جنبش پر نظر رکھے ہوئے تھا۔
 راہنور نے اس کی طرف چاقو پھینکا تو اس نے نہایت تیزی
 سے اپنے جسم کو دائیں جانب ہٹا کر ہونے خود کو نہ صرف
 اس کے وار سے محفوظ رکھا بلکہ فضا میں ہی چاقو کو اچک لیا۔
 چاقو ہاتھ میں آتے ہی اس کے کانوں سے فائرنگ کی کان
 بھاڑ آوازیں سنیں۔ یعنی طور پرستار بھائی کے آدی پولیس
 فورس کو اس طرف آنے سے روکنے کے لیے برسرِ پیکار
 ہو گئے تھے۔ وہ کتنی مہلت حاصل کر پاتے، اسے اندازہ
 نہیں تھا، بس یہ احساس تھا کہ راہنور کے معاملے کو بہت
 تیزی سے نمٹانا ہوگا۔ اس نے ہاتھ میں آ جانے والے چاقو
 کو ہوا میں لہرایا اور راہنور سے بولا۔

”یہ چاقو مجھے رہن دادا نے تحفے میں دیا تھا اور یہ
 میرا فرامیندار ہے۔ تم جیسے چڑی مار اس چاقو سے میرا شکار
 نہیں کر سکتے۔“ ردمل میں راہنور نے عجیب حرکت کی۔ وہ
 بچے جھکا اور مٹی میں مٹی بھر کر فاروق کی طرف اچھال دی
 اور خود پلٹ کر تیزی سے بھاگنے لگا۔ جس طرف گولیاں
 برس رہی تھیں، وہ اس کی مخالف سمت میں بھاگ رہا تھا
 کیونکہ اسے معلوم تھا کہ بے شک اس طرف اس کے ساتھی
 اور ہمدرد موجود ہیں لیکن اندھی گولیاں دوست اور دشمن کسی
 کو نہیں پہچانتی ہیں۔ وہ کسی اندھی گولی کا شکار نہیں بننا چاہتا
 تھا۔ دوسری طرف فاروق وقتی طور پر راہنور کی چال سے
 تھوڑا سا متاثر ہو گیا تھا۔ راہنور کی پیمائش ہوئی مٹی کے کچھ
 ذرات اس کی آنکھوں میں چلے گئے تھے جن کی جھپٹن سے
 اس کی آنکھوں میں پانی آ گیا تھا اور بصارت دھندلا سی گئی
 تھی۔ اس کے باوجود اس نے بہت نہیں ہاری اور دوڑتے
 قدموں کی آواز پر ہی راہنور کے پیچھے بھاگ کھڑا ہوا۔
 بھاگتے ہوئے اس کی آنکھوں سے مسلسل پانی بہہ رہا تھا
 لیکن اس کا ایک فائدہ یہ ہوا تھا کہ آنکھوں میں جانے
 والے مٹی کے ذرات بھی اس پانی کے ساتھ بہہ کر نکلتے
 جا رہے تھے اور جھپٹن کا احساس کم ہوتا جا رہا تھا۔ فاروق
 نے آنکھوں کو ہاتھوں سے مسلنے کی غلطی نہیں کی تھی کیونکہ
 اسے معلوم تھا کہ ایسا کرنے سے آنکھوں میں موجود
 ذرات کی رگڑ آنکھوں میں انفیکشن پیدا کر سکتی ہے۔ وہ
 تکلیف کو نظر انداز کر کے نہایت پھرتی سے راہنور کے پیچھے
 بھاگ رہا تھا۔

راہنور بھاتی وچ بند آدی تھا اور اس وقت تو اس کی
 جان پر پنی ہوئی تھی، اس لیے وہ بہت تیزی سے بھاگ رہا
 تھا۔ خود فاروق کے لیے بھی یہ زندگی اور موت کی ہی جنگ

تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اگر اس وقت راہنور اس کے ہاتھوں
 سے بچ نکلتے میں کامیاب ہو گیا تو اسے دوسرا موقع ملنا بہت
 مشکل ہوگا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ خود ہی گرفتار ہو جاتا۔ ستار
 بھائی کے آدی بے شک مسلح تھے اور پوری پامردی سے اس
 کے حکم پر عمل کر رہے تھے لیکن اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا
 جاسکتا تھا کہ ریاستی طاقت کے آگے چند افراد کا زیادہ دیر
 ڈنار ہوتا بہت مشکل تھا۔ وہ اپنے مددگاروں کے زیر ہوجانے
 سے پہلے راہنور کو اس کے انجام تک پہنچا دیتا، یہی اس کے
 لیے مناسب تھا۔

اس کا جذبہ انتقام اسے بہت تیزی سے راہنور کے
 پیچھے بھاگ کر لے جا رہا تھا۔ فاصلہ چند قدم رہ گیا تو اس نے
 کھسی پیچھے کی سی پھرتی سے جست لگائی اور راہنور پر جا پڑا۔
 وہ دونوں بھاگتے بھاگتے سڑکوں کچھوڑ کر گلیوں میں پہنچ
 گئے تھے جہاں روشنی بہت کم تھی اور وہ بس سایوں کی طرح
 ہی دکھائی دے رہے تھے۔ یہ سائے ایک دوسرے سے
 دست و گریباں بری طرح زمین پر لٹ رہے تھے۔ راہنور
 زخمی ہونے کے باوجود بھرپور مزاحمت کر رہا تھا۔ انسان
 زندگی کے لیے ایسا ہی دیوانہ ہوتا ہے۔ وہ بھی دیوانہ دار
 زندگی کی جنگ لڑ رہا تھا۔ دوسری طرف فاروق کے لیے بھی
 ایک طرح سے یہ زندگی اور موت کا ہی معاملہ تھا۔ رہن کے
 قتل میں شامل اس اہم کردار کو انجام تک پہنچانے بغیر وہ
 سکون کی سانس نہیں لے سکتا تھا۔ رہن کے قاتل زندہ رہتے
 تو خود اس کا جینا دوبھر ہو جاتا۔ اسے یہ بھی اندازہ تھا کہ اگر
 آج وہ ناکام ہو گیا تو اسے دوبارہ موقع ملنا بہت مشکل ہوگا۔
 اپنے اس احساس کے تحت وہ راہنور کو بری طرح رگید رہا تھا
 اور موقع ملنے پر اسے ایک آدھ گھونسا بھی جڑ دیتا تھا۔

اس کا چاقو اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا لیکن اس نے
 ابھی تک راہنور پر چاقو سے کوئی وار نہیں کیا تھا۔ رہن کی دی
 اخلاقی تربیت نے ان نازک حالات میں بھی اسے ایسا
 کرنے سے روک رکھا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ راہنور اپنے
 رہنور سے محروم ہوجانے کے بعد اب بالکل ہتہا ہے اور
 نئے دشمن پر ہتھیار کا استعمال اس کی تربیت کے برخلاف
 تھا۔ وہ چاقو والے ہاتھ کو استعمال کیے بغیر بس ایک ہاتھ سے
 لڑ رہا تھا۔ خود راہنور کا بھی ایک ہاتھ زخمی تھا اور دیکھا جائے تو
 عملاً وہ دونوں ایک جیسی پوزیشن میں تھے۔ راہنور عام
 پولیس والوں کی طرح ست اور ڈھیلا بندہ نہیں تھا۔ وہ پوری
 قوت سے فاروق کا مقابلہ کر رہا تھا اور فاروق کو بھی اس کا
 کوئی نہ کوئی وار سہتا پڑ رہا تھا پھر بھی بہر حال وہ راہنور پر

بھاری تھا اور کچھ دیر نہیں جاتی تھی کہ اسے مکمل طور پر زیر کرنے والا تھا لیکن چاکا بھی راضی نہ تھا کہ اسے اپنے سے اس کے سر پر ایک طوفانی ٹھہر ماری تو وہ مل کر رہ گیا۔ دردی ایک ایسی خوفناک لہر تھی کہ اسے اپنے حواس کم ہوتے محسوس ہوئے اور آنکھوں کے آگے تارے سے ناچنے لگے۔ اگرچہ وہ ماضی میں سر پر لگنے والی مہلک چوٹ سے ایک طویل علاج کے بعد صحت یاب ہو چکا تھا لیکن ڈاکٹروں نے اسے احتیاط کی تاکید کر رکھی تھی۔ لڑائی میں احتیاط کی گنجائش کہاں ہوتی ہے۔ دشمن کا دارجل مل گیا اور اس کی حالت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے اس کے ہاتھ سے چاقو بھی چھین لیا۔ چاقو ہاتھ سے نکل جانے کا احساس ہوتے ہی فاروق نے سر کو زور سے جھکا دیتے ہوئے آنکھوں کے سامنے ناچنے والوں سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کی اور غیر ارادی طور پر اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے اندازے سے ہی راضی ہو کر پلاٹ چلا دی۔ یہ کوئی چچا چلا دار نہیں تھا جو کچھ بھال کر کیا ہو لیکن اس کا نتیجہ حیرت انگیز نکلا۔ راضی اس سے زیادہ فاسلے پر نہیں تھا اور اس کی چلائی لات مین اس وقت راضی کی کتبی پر لگی تھی جب وہ چاقو تولے اس پر حملہ کرنے ہی والا تھا۔

فاروق کی ٹانگ کی ضرب نے اس کے ہاتھ کو مجب سے زاویے سے موڑ دیا اور چاقو کا رخ خود اس کی جانب ہو گیا۔ اگلے ہی لمحے اس کے منہ سے ایک بمیائیک چیخ نکلی اور وہ نیچے گر کر بری طرح تڑپنے لگا۔ فاروق نے آنکھیں ملنے ہوئے اس کی طرف دیکھا تو دنگ رہ گیا۔ چاقو اس کے زخروں میں بہت جلد ہو گیا تھا اور وہ بے بسی کے عالم میں زمین پر پڑا کسی ذوق کیے جانے والے جانور کی طرح تڑپ رہا تھا۔ راضی کے تڑپنے کا منظر دیکھتے ہوئے اس نے دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں بھی سیں۔ فائرنگ کا سلسلہ کچھ دیر ہوئی موقوف ہو چکا تھا جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا تھا کہ ستار بھائی کے آدمی بھر پور محنت کے بعد زیر ہو گئے ہیں اور اب پولیس فورس علاقے میں پھیل رہی ہے۔ پیچھے مڑنے پر فاروق کو دور جھلانی روشتیاں دکھائی دے گئیں۔ اس تاریک گلی میں فی الحال وہ ان روشنیوں کی زد سے محفوظ تھا لیکن اسے اندازہ تھا کچھ اور قریب آنے پر وہ لوگ راضی کے بلبلانے کی آوازیں سن کر اس طرف آ جائیں گے۔

اس نے آگے بڑھ کر راضی کے سینے پر اپنا دایاں ہتھ بھریا اور اس کی گردن میں بہت جلد اپنا چاقو بھج لیا۔

چاقو کھینچنے پر راضی کی گردن سے خون کا ایک فوارہ سا پھوٹا جس نے فاروق کے چہرے اور لباس کو داغ دار کر دیا لیکن اس نے پروا نہیں کی اور پوری بے رحمی سے اس کا دایاں ہاتھ تمام کر ایک ہی جھٹکے میں اس کی ساری انگلیاں کاٹ ڈالیں۔ یہی وہ ہاتھ تھا جس سے اس نے رہن پر گولی چلائی تھی۔ پامردی سے درجن بھر افراد سے لڑتے رہن کو درحقیقت سینے پر لگنے والی گولی نے ہی زیر کیا تھا۔ وہ پہاڑ سا حوصلہ رکھتا تھا لیکن تھا تو بہر حال گوشت پوست سے بنا انسان جیسے سینے میں اترنے والے سیسے نے ڈھا دیا تھا اور آج وہ نقص خاک و خون میں لوٹا اپنی زندگی کی آخری سانسیں لے رہا تھا جس نے رہن سے اس کی زندگی چھین کر بہت سوں کو ان کی روح سے محروم کر دیا تھا۔ وہ اپنے چاہنے والوں کے لیے ان کی روح جیسا ہی تو تھا اور اس کے بغیر وہ ایسا ہی محسوس کرتے تھے کہ جیسے بے روح جسم لیے پھرتے ہوں۔

جاں کنی کے عالم میں جتلا راضی کا جسم انگلیاں کاٹے جانے کی اذیت سے بری طرح پڑکا لیکن فاروق نے اس کے لیے اپنے دل میں کوئی بھدردی محسوس نہیں کی۔ رحم اور بھدردی کے جذبات انسانوں اور محسوسوں کے لیے ہوتے ہیں، خون پر دندوں سے کسی کو بھدردی نہیں ہوتی۔ راضی تھا رہن کے گل کا بھرم تو نہیں تھا۔ وہ حافظہ کے لباس میں مظلوم مسلمانوں کے مال و متاع اور زندگیوں کی پھینٹا پھریا تھا۔ کچھ دیر قبل انہوں نے اسے ایک مسلمان ستار کی دکان کا تالاڑتے ہوئے ہی پکڑا تھا۔ وہ جسے حفاظت کرنی چاہیے تھی، خود ہی لٹیر اور قاتل بنا ہوا تھا تو پھر وہ ایسے ہی انجام کا حق دار تھا۔ فاروق نے اس کی لاش پر محارت سے تھوکا اور اپنے قدم آگے بڑھا دیے۔ بے شک اس نے رہن کے آخری قاتل کو بھی انجام تک پہنچا کر اپنی زندگی کا سب سے اہم مشن پورا کر لیا تھا لیکن ابھی اسے کچھ اور کام بھی کرنے تھے جن میں سرفہرست جولیت کے جرم کو انجام تک پہنچانے کا کام تھا۔ اسے اس کام کے لیے زندگی سے کچھ اور مہلت درکار تھی اسی لیے وہ قریب آتی آوازوں اور روشنیوں سے بچ کر بھاگتا چلا جا رہا تھا۔ زندگی ایسی ہی شے کا نام ہے جو کسی نہ کسی بھانے انسان کو جینے پر اکساتی رہتی ہے۔ وہ بھی زندگی کی چاہ میں بھاگ رہا تھا۔ اچھی بات یہ تھی کہ رہائشی علاقہ ہونے کے باوجود کوئی بھی گھروں سے باہر نہیں آیا تھا۔ شہر میں کرینے نافذ تھا اور لوگ خوف زدہ تھے چنانچہ کسی نے بھی اس پرانی آگ میں کوہنے کی محنت نہیں کی تھی۔

شیش محل

فاروق اور راضی کے درمیان ہونے والی خونی لڑائی نگلی کے کیڑوں کو نیند سے نہ جگا یا ہو، ایسا تو ممکن ہی نہیں تھا۔ وہ جاگ گئے ہوں گے لیکن بنا بیتیاں روشن کیے بس دروازے اور کھڑکیوں کی درزوں سے جھانکنے پر ہی اکتفا لیا ہوگا۔ تاریکی میں انہوں نے دو ساپوں کے علاوہ دیکھا ہی کیا ہوگا لیکن بہر حال اپنی بات تو سمجھ آگئی ہوگی کہ ایک ماہ دوسرے کو ہلاک کر کے خود مسموم واردات سے فرار ہو چکا ہے۔ فرار فاروق کی ضرورت تھی اور وہ ہاپتا ہوا بھانسا چلا جا رہا تھا۔ یہ بھی نہیں تھا جس کی گلیاں اس کے لیے ہر وقت اپنی ہاتھیں کھلی رکھتی تھیں اور جس کے راستے اسے ہاتھ کی لکیروں کی طرح اذیت دے تھے۔ یہاں وہ خود کو بچانے کی جلی خواہش کے تحت اندھا دھند بھاگتا چلا جا رہا تھا۔ راضی کی ماری ٹکر کی وجہ سے اب بھی اس کے سر میں وقفے وقفے سے ہلانے سے چھٹ رہے تھے لیکن وہ پھر بھی کسی نہ کسی طرح بھاگتا چلا جا رہا تھا۔ راستوں کا تعین کیے بغیر یوں ہی بے ست بھاگتے ہوئے آخر کار اس کی ہت جواب دے گئی اور آخر وہ ایک مکان کی دیوڑھی پر سانس لینے کے لیے رکا تو وہیں ڈھسے گیا۔ خودی میں جاتے ہوئے بھی اسے احساس تھا کہ موت کے ہر کارے اس کے پیچھے ہیں چنانچہ قہار کی لاشوری خواہش کے تحت اس نے جب میں پڑے چاقو کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ راضی کی انگلیاں کاٹنے کے بعد اس نے چاقو کو کسی کے لباس سے صاف کر کے دوبارہ جیب میں رکھ لیا تھا اور اب اس کا ہاتھ جیب کے اندر ہی چاقو کو مضبوطی سے تھامے ہوئے تھا اور کان آہٹوں پر لگے ہوئے تھے۔ اس کی تربیت، ہوش میں نہ ہونے کے باوجود اس سے ہوش مندوں جیسی حرکات خود کا طریقے سے کر داری تھی۔ آخر کار اس کے حواس کالوں نے اپنے بہت قریب ایک آہٹ سن لی اور فطری طور پر اس نے آہٹ کے ماخذ کی طرف دیکھنا چاہا لیکن اپنی اس خواہش میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ غشی جیسی کیفیت نے اسے اپنی جگہ سے ٹھیک طرح ہلنے بھی نہیں دیا۔ اس وقت اس کے ذہن میں جو واحد خیال آیا، وہ یہ تھا کہ کیا میں اپنے جیسے کام انجام دیے بغیر ہی اس دنیا سے جانے والا ہوں؟

☆☆☆

عارف کی موت جولیت کے لیے کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ ماضی میں اس کا عارف سے بہت قریبی تعلق رہا تھا اور وہ دونوں ایک ساتھ زندگی گزارنے کی منصوبہ بندی کرتے رہے تھے۔ حالات نے عارف کے خیالات میں

تبدیلی پیدا کر دی اور وہ اپنی راہ بدل گیا تو جولیت نے بھی اسے اپنے دل سے نکال دیا لیکن اب جن حالات میں اس نے اپنی جان دی تھی، ان سے جولیت از حد متاثر ہوئی تھی۔ اسے رہ رہ کر عارف کا معذور اور بے بس وجود یاد آتا تھا اور خود بخود ہی آنکھیں بھیگ جاتی تھیں۔ عارف کی آخری رسومات پر آنے والے تمام اخراجات اس نے خود اٹھائے تھے۔ اسماء اللہ نے چیک میں اس کے نام سے علیحدہ اکاؤنٹ کھلوایا تھا اس میں ایک معقول رقم جمع کرادی تھی اور اسے اختیار دے دیا تھا کہ وہ جس طرح چاہے، اس رقم کو خرچ کرے۔ اس لیے رقم کے معاملے میں اسے کوئی تنگی یا پریشانی نہیں تھی۔ بھائی کی موت کے غم سے نڈھال ماجدہ کے لیے بھی وہ اپنے ذہن میں ایک منصوبہ تشکیل دے رہی تھی تاکہ اس کے معاشی مسائل حل ہو سکیں۔ فی الحال اس نے ماجدہ سے اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کی تھی۔ وہ ماجدہ کو غم سے بچانے کا مسموع دینا چاہتی تھی۔ وہ روزانہ کپکپ میں اس سے ملاقات کرتی تھی اور اپنے طور پر اسے تسلی دہانی دینے کی کوشش کرتی تھی لیکن وہ محسوس کر رہی تھی کہ ماجدہ کی آنکھوں کی دیرانی دن بدن بڑھتی جا رہی ہے۔ وہ اس کی باتوں کے جواب میں کچھ بولتی بھی نہیں تھی۔ اس صبح وہ ماجدہ سے ملنے اس کے خیمے میں پہنچی تو دیکھا کہ وہ وہاں موجود نہیں ہے۔ اسے خیال گزرا کہ وہ آس پڑوس کے کسی خیمے میں گئی ہوگی چنانچہ سب سے قریبی خیمے میں مقیم خاندان کی خاتون سے اس کے بارے میں دریافت کیا۔

”وہ یہاں نہیں ہے۔ میں اس..... کو یہاں قدم رکھنے کی بھی اجازت نہیں دے سکتی۔“ خاتون نے اس کے استفسار کے جواب میں ماجدہ کے لیے ایک موٹی سی گالی کا استعمال کرتے ہوئے گھروں سے لکچہ میں جواب دیا۔ جولیت کو خاتون کا انداز ناگوار نظر آیا لیکن وہ انہیں ٹوک نہیں سکی۔ اسے اندازہ تھا کہ یہاں سب کو ماجدہ کی روش کا علم ہے اور خاتون نے اسی مناسبت سے اس کے لیے گالی استعمال کی ہے۔ اس خیمے سے ہٹ کر اس نے آس پاس کے مزید خیموں سے ماجدہ کے بارے میں معلوم کرنے کی کوشش کی لیکن ہر جگہ لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے ماجدہ کے لیے تحقیر آمیز الفاظ استعمال کیے گئے۔ وہ تھک ہار کر دوبارہ ماجدہ والے خیمے میں آئی تھی۔ اس خیمے میں ایک چارپائی پر عارف نے اپنی زندگی کی آخری سانسیں لی تھیں۔ چارپائی کے سر ہانے دی گئی تھی اب بھی وہ دوایں موجود تھیں جو عارف کو صحت مند کرنے کے لیے

ماجدہ اپنا جسم بیچ کر خرید کے لائی تھی۔ وہ ساری دوا لیں بے مقصد یہاں پڑی رہ گئی تھیں اور عارف چلا گیا تھا۔ خیمے میں اس کے استعمال کی چیزیں بھی ادھر ادھر گر زندگی کی بے ثباتی کا احساس دلا رہی تھیں۔ زندگی کے ان لوازمات کے لیے آدی کیا کچھ جدوجہد نہیں کرتا اور جب دنیا سے جاتا ہے تو سب کچھ بھٹی دھرا جاتا ہے۔ جولیت چند منٹ سے زیادہ وہاں نہیں بیٹھ سکی اور گھبرا کر باہر آ گئی۔ باہر آتے ہی اس کی نظر صفائی والے اس لڑکے پر پڑی جس نے عارف کو اس کے کہنے پر چوہے مار دیا اور لڑکائی مچ گئی۔ جولیت کو کچھ کر وہ ذرا سا خشک پھر بھٹکا ہوا اس کے قریب آ گیا۔ عارف کی خودکشی پر کیپ انتقامیہ نے اس بے چارے کو خاموشی ڈانٹ پھینکا کہ کتنا نہ بنایا تھا کہ اس نے وہ ہملک زہر عارف کو کیوں فراہم کیا۔ اس موقع پر جولیت نے ہی اس غریب لڑکے کی ڈھال بن کر اسے اس مصیبت سے نجات دلائی تھی۔

”کیسے ہو نظام؟“ وہ قریب آیا تو جولیت نے اس کا نام لے کر اس سے دریافت کیا۔
 ”ٹھیک ہوں میڈم!“ اس نے جواب دے کر خاموشی اختیار کر لی لیکن اس کے انداز سے لگتا تھا کہ وہ کچھ کہنا چاہتا ہے۔ اچانک ہی جولیت کو خیال آیا کہ اس سے ماجدہ کے بارے میں پوچھو۔ وہ صبح سویرے سے ہی صفائی کے سلسلے میں۔ کیپ میں ادھر ادھر گھومتا رہتا تھا اور بہت محنت تھا کہ اس نے ماجدہ کو کہیں آتا جانا دیکھا ہو۔
 ”وہ رات ہی کو یہاں سے چلی گئی تھی۔ میں آپ کو یہی بات بتانا چاہ رہا تھا۔“ اس کے استفسار کے جواب میں نظام نے اسے اطلاع دی۔
 ”چلی گئی..... لیکن کیسے؟“ جولیت کو اس انکشاف پر حیرت ہوئی۔

”اسے قادر شاہ اپنے ساتھ لے گیا۔“ اس نے آواز کو پست کر کے جولیت پر ایک اور انکشاف کیا۔
 ”قادر شاہ.....“ جولیت کو ایک اور دھچکا لگا۔ ”کیا وہ زبردستی ماجدہ کو یہاں سے لے کر گیا ہے؟“
 ”میرے خیال میں نہیں۔“ نظام نے نفی میں سر ہلایا پھر مزید بولا۔ ”وہ اپنی مرضی سے ہی قادر شاہ کے ساتھ گئی ہوگی۔ قادر شاہ اس کا بیٹھ تھا۔ بھائی کے مرنے کے بعد سے وہ دھندے پر نہیں جاری تھی لیکن یہاں بھی بدینیت لوگوں کی کی نہیں ہے۔ قادر شاہ نے اسے سمجھایا ہوگا کہ مفت کی کھانے والوں سے جان چھڑا کر وہاں چلے جہاں اسے دام مل سکے۔ اس لیے وہ یہاں سے چلی گئی۔“

نظام نے گویا اس پر کئی حقائق آشکار کر دیے۔ اس کے دل کو ایک اور گہرا صدمہ پہنچا۔ پناہ گزینوں کے اس کیپ میں ایسی لوٹ مار پر اس کا دل بوجھل ہو گیا۔ اس روز وہ زیادہ دیر تک کیپ میں نہ رکا سکی اور گھر واپس آ گئی۔ اس وقت اسد اللہ گھر پر موجود نہیں ہوتے تھے اور صفی اللہ اپنے کمرے تک محدود رہنے کے عادی تھے۔ اس نے بونٹی عذرت جہاں کے کمرے میں جھانکا تو اسے وہاں چاند بانو دکھائی دی۔ وہ عذرت جہاں کے بستر کے قریب رکھی کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ حسب معمول اس نے نماز کے انداز میں چادر اوڑھ رکھی تھی اور دونوں ہاتھوں میں قرآن اٹھائے اس کی تلاوت میں مصروف تھی۔ اس کی آواز میں بڑی تلاوت اور کشش تھی۔ جولیت اس کی آواز کے سحر میں گرفتار چپٹی چلی گئی اور کمرے کے ایک گوشے میں پڑی کرسی پر بیٹھ کر محویت سے چاند بانو کی تلاوت سنتی رہی۔ عذرت جہاں کی خدمت پر مامور عیسائی نرس بھی خاموشی اور دلچسپی سے قرأت سن رہی تھی۔ بستر پر دراز عذرت جہاں کی آنکھیں بند تھیں لیکن بند آنکھوں کے گوشے سے بہتے آنسوؤں کے قطرے گویا دے رہے تھے کہ وہ بھی قرآن کی آیات کو پوری توجہ سے سن رہی تھیں۔

جولیت اسلام کا مطالعہ شروع کر چکی تھی لیکن قرآن کو عربی میں پڑھنے اور سمجھنے سے قاصر تھی۔ ہاں، چاند بانو دوران قرأت بار بار ”فہماکی الاہر بکما نکذین“ کی تکرار اسے اچھی لگ رہی تھی۔ دوسری طرف عذرت جہاں جو اس آیت کا ترجمہ جانتی تھی، زیادہ بے قرار اور مضطرب تھیں۔ ”میں تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹاؤ گے“ کے الفاظ ذہن میں گونجنے لگے تھے تو اپنے ماضی کے مناظر ایک ایک کر کے آنکھوں کے سامنے چلے آتے تھے۔ پورے غرور اور مظننے سے زندگی گزارتے ہوئے انہیں بھی احساس ہی نہیں ہوا تھا کہ جس شان و شوکت پر وہ مغرور اور نازاں ہیں وہ تو ان کے رب کی نعمتیں ہیں جن پر بندے کو غرور کا حق نہیں بلکہ شکر واجب ہے اور دولت و ثروت کی موجودگی میں انکساری کا اظہار بھی شکر گزاری کی ہی ایک قسم ہے۔ دولت کے مل پر دوسرے انسانوں کو اپنے سے کمتر اور حقیر جانا اصل میں اللہ کے غضب کو دعوت دیتا ہے۔ وہ بھی ساری زندگی نوح و غرور میں گزار کر اپنے رب کو غضبناک کرنے کے جرم کی مرکب ہوئی تھیں۔ انہوں نے بھی اپنے رب کی عطا کردہ نعمتوں پر سجدہ شکر ادا نہیں کیا تھا، لہذا رب کے بندوں کے ساتھ عذرت سے

فرما کر ان کی تذلیل کرتی رہی تھیں۔ وہ نعمتوں کو جھٹلانے والی تھیں اس لیے اپنے رب کے غضب کا شکار ہوئی تھیں لیکن پھر بھی دیکھا جائے تو ان کا رب اب بھی ان پر مہربان تھا۔ وہ جانتا تو اس معذوری و دلا چاری کے ساتھ انہیں بے ہارا بھی کر دیتا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا تھا۔ ان کے پاس آج بھی بہت سی نعمتیں تھیں۔ خدمت، توجہ، دوا اور علاج سب کچھ میسر تھا اور ایسا بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔ یہی اولاد بستر علالت پر بے بس پڑے ہاں باپ سے بچاؤ آ جاتی ہے لیکن یہاں بھی بچپن نے انہیں کسی طرح کی نئی اور کمی محسوس نہیں ہونے دی تھی تو یہ بھی اللہ کی ان پر نعت تھی۔ وہ آنسو بہاتی دل کی گہرائیوں سے اپنے رب سے معافی طلب کرنے کے ساتھ ساتھ ”فہماکی الاہر بکما نکذین“ کے ساتھ اپنے رب کی نعمتوں کا اعتراف اور شکر کرتی جا رہی تھیں۔

کچھ ایسی ہی حالت چاند بانو کی بھی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اس کا رب اس پر کتنا مہربان ہے۔ وہ جو عزت کی زندگی کی چاہ میں مبتلا ہر آن ڈرتی رہتی تھی کہ ایسی زندگی اسے کیسے اور کہاں نصیب ہوگی، آج ایک محفوظ جہت تلے بیٹھی ہوئی تھی اور اللہ نے ایک غیر لڑکی کے دل میں اس کے لیے اتنی ہمدردی اور محبت پیدا کر دی تھی کہ وہ اسے قادر شاہ جیسے بھڑیلوں کے چنگل میں جانے سے بچا کر اپنے ساتھ یہاں لے آئی تھی۔ اپنے رب کی اس مہربانی پر شکر گزار وہ بھی بے آواز آنسو بہا رہی تھی لیکن ان آنسوؤں نے اس کی قرأت کی روانی پر کوئی اثر نہیں ڈالا تھا۔ وہ بہت واضح اور صاف آواز میں ایک کے بعد ایک آیت پڑھتی جا رہی تھی۔ آخر کار سورۃ ختم ہو گئی اور اس نے قرآن پاک بند کر کے چادر کے پلو سے اپنے آنسو پھر دھوئے عذرت جہاں کی طرف متوجہ ہوئی اور قرآن پاک کو سناؤ نہیں پر رکھ کر نشو و نما سے ان کے آنسوؤں کو صاف کرتے ہوئے ان کے ماتھے پر ایک بوسہ دیا۔ اس کا یہ بوسہ عذرت جہاں پر عجیب طرح اثر انداز ہوا اور وہ بری طرح بلک بلک کر رونے لگیں۔ ان کی یہ کیفیت دیکھ کر چاند بانو گھبرا گئی۔ جولیت اور ڈیوٹی نرس بھی فوراً متوجہ ہوئیں۔ نرس پر وضوئیل انداز میں ان کا پی پی اور نبض کی رفتار وغیرہ چیک کرنے لگی جبکہ جولیت نرم آواز میں انہیں تسلی اور دلا سے دیتی رہی۔
 ”مم..... معافی.....“ ان کے حرمے سے خاموشی اختیار کے لیے ان نے بڑی مشکل سے جیش کی اور وہ جولیت کی طرف دیکھتے ہوئے صرف ایک لفظ ادا کر سکیں۔

شیش محل

”کسی معافی کی ضرورت نہیں ہے دادی جان! آپ میری بزرگ ہیں اور میں نے ماضی کی ہر بات بھلا کر آپ کی حیثیت تسلیم کر لی ہے۔“ جولیت نے ان کے ہاتھوں کو محبت سے تھامتے ہوئے انہیں تسلی دلائی اور پھر بڑی دیر تک ان کے بالوں میں اٹھایاں پھیرتی ان سے تسلی آمیز گفتگو کرتی رہی۔ اس دوران نرس نے ایک اچھلکھن تیار کر کے ان کے بازو میں لگا دیا تھا۔ ان کے ساتھ بلند فشار بخون کا مسئلہ تھا اور ڈر رہتا تھا کہ کسی بھی قسم کے جذباتی دباؤ کی صورت میں ان کی طبیعت زیادہ بگڑ نہ جائے۔ انہیں اس جذباتی دباؤ سے

قارئین متوجہ ہوں



کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچہ نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ ہر چاند ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

☆ ہک اسٹال کا نام جہاں پر چاند دستیاب نہ ہو۔
 ☆ شہر اور علاقے کا نام۔
 ☆ ممکن ہو تو ہک اسٹال کا PTCL یا موبائل نمبر۔

رابطے اور مزید معلومات کے لیے

ثمر عباس 0301-2454188

جاسوسی ڈائجسٹ پبلیکیشنز

سپینس جاسوسی پیکیز، سرگزشت

63-فلاکسٹیشن ڈسٹری بیوٹر ایف بی ٹی ریسٹورنٹ

مندرجہ ذیل نیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں

35802552-35386783-35804200

ای میل: **jdpgroup@hotmail.com**

بچانے کے لیے ہی نرس نے انہیں سکون آور انجکشن لگا دیا تھا۔ دوا کے اثر سے وہ جلد ہی سو گئیں تو جو لیت نے چاند بانو کو اپنے ساتھ باہر آنے کا اشارہ کرتے ہوئے خود بھی باہر کا رخ کیا چاند بانو کھسکی ہوئی سی اس کے پیچھے باہر آ گئی۔

”ہم روزانہ ظہر کی نماز کے بعد انہیں قرآن پاک پڑھ کر سناٹے ہیں اور ہم نے ہمیشہ محسوس کیا ہے کہ انہیں ہمارا ایسا کرنا اچھا لگتا ہے لیکن آج جانے کیا ہوا کہ وہ اس طرح تڑپ تڑپ کر رو رہی لگیں۔“ جو لیت کے کمرے میں پہنچ کر چاند بانو نے اسے صفائی دینے کی کوشش کی۔

”تم داوی جان کو کیا پڑھ کر سناری تمہیں چاند بانو؟“ اس کے معذرتی جملوں پر توجہ دے بغیر جو لیت نے کھوئے کھوئے سے لہجے میں اس سے پوچھا۔

”ہم سورۃ الرحمن کی تلاوت کر رہے تھے۔ اس سورۃ کو قرآن کی زینت کہا جاتا ہے۔ ہمیں اس سورۃ کی قرأت کر کے بہت سکون ملتا ہے اس لیے ہم آج داوی جان کو خاص طور پر یہ سورۃ سنارہے تھے لیکن انہیں نہ جانے کیا ہوا کہ وہ اس طرح رو نہ لگیں۔“ چاند بانو اب بھی کنفیوژ سی تھی۔

”وہ جو تم ایک لائن بار بار ریپیٹ کر رہی تھیں، اس کا کیا مطلب تھا؟“

جو لیت نے اس بار بھی اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے اس سے دریافت کیا۔ ”اس آیت کا ترجمہ ہے، پس تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔“

چاند بانو نے اسے آگاہ کیا۔ زمر دہائی کے کولھے پر جہاں لڑکیوں کو گانے بجانے اور دھن کی تعلیم دی جاتی تھی، وہیں قرآن پڑھانے کے لیے بھی ایک مولوی صاحب ملازم تھے۔ عید، شبِ برات، روزوں اور قربانی کا اہتمام بھی خوب ہوتا تھا اس لیے طوائف زادی ہوتے ہوئے بھی چاند بانو دینی معلومات سے بے بہرہ نہیں تھی۔ عشق نے طبیعت میں سوز پیدا کیا تو خود بخود ہی مذہب کی طرف رجحان بڑھتا چلا گیا اور اپنی پچھلی زندگی سے مکمل تاب ہونے کے بعد وہ بالکل ہی دین کی ہوری تھی اس لیے معلومات میں بھی خاص اضافہ ہوا تھا۔

”اللہ پاک نے قرآن کی تلاوت میں بہت سکون رکھا ہے۔ ہم نے بچپن میں ہی کلامِ پاک پڑھنا سیکھ لیا تھا لیکن باقاعدہ تلاوت کی عادت نہیں تھی، بس رمضان اور شبِ برات وغیرہ پر ہی گناہ بخشنا کے لیے اسے کھولنے کا رواج تھا۔ جب ہم کوٹھا چھوڑ رہے تھے تو پتا نہیں کس

جذبے کے تحت قرآن پاک کا ایک چھوٹا نسخہ اپنے ساتھ لے لیا تھا۔ ہمیں ایسا لگتا تھا کہ قرآن کا وہ نسخہ ہماری حفاظت کرتا ہے۔ اپنی طبیعت کے مضطرب پر قابو پانے کے لیے ہم نے قرآن پاک کی تلاوت کا سلسلہ شروع کر دیا اور اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے ہمیں اس عمل میں اتنا سکون ملا کہ اب یہ ہمارے معمولات میں شامل ہے۔ مخصوص اوقات کے علاوہ بھی جب ہمیں فرصت میسر ہو یا دل کو بے چین یا کمزور تو فوراً قرآن پاک کی تلاوت کرنے بیٹھ جاتے ہیں۔ اس سے ہمارے دل کو بہت ڈھارس ملتی ہے۔“ جو لیت کی کیفیت سے بے خبر چاند بانو جذب کی سی کیفیت میں اسے بتاتی جاری تھی۔

”کیا واقعی عبادت کرنے سے انسان کے دل کو سکون مل جاتا ہے؟“ اس کی باتیں سن کر جو لیت نے بچوں کی سی مصیبت سے پوچھا۔ ایک عرصہ ہو گیا تھا اسے بے سکونی کے عالم میں رہتے ہوئے دلدار آغا نے جو کچھ اس کے ساتھ کیا تھا، اس کے بعد سے اسے کبھی چین نہیں ملا تھا۔ عارف کی بے وفائی، جوزف اور جوزفین کی دائمی جدائی، جوزفین کی ناکام داستانِ محبت اور اس کے علاوہ بھی دھوکوں اور استخاؤں کا ایک سلسلہ تھا جو وہ مسلسل اپنی جان پر سہا رہی تھی۔ عارف کی موت کے حادثے نے ذہنوں کو نئے سرے سے اوپر ڈالا تھا اور وہ پہلے سے بھی زیادہ خود کو سکون کی تلاش ہی پار ہی تھی، اس لیے چاند بانو سے یہ سوال کیا تھا۔

”اپنے تجربے کی روشنی میں تو ہم پورے یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ عبادت سے دل کو سکون اور قرار ملتا ہے۔ ہم آپ کو ایک سچ بتا سکیں، ہم جو محبت میں بے طلب ہونے کا دعویٰ کرتے تھے، اتنے بھی بے طلب نہیں تھے۔ کبھی کبھی بہت آزرہ ہو جاتے تھے کہ جو نس نس میں رہتا ہے، ہم کبھی اس کے گھر میں نہیں بس سکتے۔ وہ کبھی ہمارے نہیں بن سکتے۔ دنیا میں کبھی ایک لڑکی ہے جو ان کے دل پر قابض ہے اور اس نے ہمارے لیے ان کے دل تک جانے کے سارے راستے بند کر دیے ہیں لیکن جب ہم اپنے خالق سے قریب ہوتے تو اس کی کیفیت سے بھی باہر نکل آتے۔ اب ہماری محبت پہلے سے کہیں زیادہ شفاف ہے۔ ہم نے اپنی ہر طلب کو بھلا کر اپنے معبود سے صرف ایک طلب رکھی ہوئی ہے کہ وہ انہیں ان کے دل کی خوشی کے ساتھ طویل زندگی عطا فرمائے۔ ہمارا دل تو ان کی خوشی کو محسوس کر کے بھی خوش ہو جائے گا اور یقین جانیے، اپنے

شیش محل

یہ سب مانگ کر ہمارے دل میں اتنا سکون اتر گیا کہ ہمیں پورا یقین ہے کہ ایک نہ ایک دن وہ اپنے دل کی باتیں ضرور یائیں گے۔ ہم تو اس آن دھنی اور ان جان کی سی محبت کرنے لگے ہیں جو آج ان کی محبت کو اس جہان تک لے آئے والے وقت میں اسے اس محبت کی سبوتا کو تسلیم کرنا پڑے گا۔“

چاند بانو اس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے اپنی دلی رائے بولتی چلی گئی۔ ”تم بہت پیاری بہت اچھی لڑکی ہو چاند بانو! میں تمہاری حوصلہ مندی سے متاثر بھی ہوتی ہوں اور مجھے تمہارے سکون پر رشک بھی آتا ہے۔ تمہیں دیکھ کر میرا دل تمہاری طرح بن جانے کو چاہتا ہے لیکن میں کہیں تمہاری طرح بن سکتی ہوں۔ میں تو جیغہ مچا رہی ہوں۔“ عبادت میں بھی سکون پاؤں تو کیسے کہ ابھی تو یہ بھی ملے نہیں کر سکی ہوں کہ مجھے اپنی ماں کے مذہب پر قائم رہنا چاہیے یا اپنے باپ کے دین کو اپنالینا چاہیے۔“ جو لیت کے ذہنی تناؤ نے اسے ایک اہم مسئلہ کو چاند بانو کے سامنے بیان کرنے پر مجبور کر دیا۔

”آپ ماں یا باپ کے دین میں سے کسی کے انتخاب کی تکلیف میں کیوں پڑتی ہیں۔ آپ خود کو اس الجھن سے آزاد کر لیں گے فلاں دین میری ماں کا تھا اور فلاں پر میرا باپ کا رہندہ ہے۔ آپ اپنے لیے صرف اس دین کا انتخاب کریں جو خود آپ کو اچھا لگے۔ جس میں آپ سچائی اور حق کو پا سکیں، جو آپ کو فطرت سے قریب محسوس ہو۔“ چاند بانو نے اسے مشورے سے نوازا۔

”تم ٹھیک کہتی ہو۔ مجھے ایسا ہی کرنا ہوگا۔“ جو لیت کو اس کا شورہ اچھا لگا پھر اسے بتانے لگی۔ ”پاکستان آنے سے پہلے میں اسلام کا مطالعہ کر رہی تھی۔ اسلامی تعلیمات نے مجھے کافی حد تک متاثر بھی کیا لیکن میں کسی واضح فیصلے پر اس لیے نہیں پہنچ سکی کہ میری وجہ سے کہیں نام اور ڈیڈی کی روحوں کو تکلیف نہ پہنچے۔“

”ہم آپ سے ایک بار پھر یہی کہیں گے کہ دین کا انتخاب کرنے کے لیے آپ کو انسانی رشتوں اور محبتوں سے خود کو آزاد رکھنا ہوگا۔ روزِ حشر انسان سے صرف اس کے اپنے اعمال کا حساب لیا جائے گا اور کسی تاویل کو سننے بغیر رب تعالیٰ یہی کہے گا کہ جب میں نے تجھے عقل دی تھی تو پھر تو نے اس سے کام کیوں نہیں لیا۔ آپ تو ابھی خاصی تعلیم یافتہ اور سمجھدار خاتون ہیں۔ آپ کو ہمارا فیصلہ عقل کی کسوٹی پر پرکھ کر کرنا چاہیے۔“ چاند بانو اس سے عمر میں چھوٹی تھی

طریقہ تبلیغ اسلام

حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔

لوگوں کو اسلام کی دعوت الفاظ استعمال کیے بغیر دیا کرو۔

پوچھا کیا کیسے؟

فرمایا۔ اپنے کردار اور اخلاق کے ذریعے۔

مرسلہ: محمد جاوید خان تحصیل علی پور

لیکن کسی بڑی بین کی سی محبت سے اسے سمجھا رہی تھی۔ سمجھداری سے ہی کام لیتے ہوئے اس نے اس موضوع کو زیادہ طول نہیں دیا اور بات بدلتے ہوئے پوچھنے لگی۔

”یہ بتا سکیں کہ ہوا کیا ہے؟ چند دن سے ہم آپ کو بہت مضطرب دیکھ رہے ہیں اور آج تو آپ خلاف معمول وقت سے بہت پہلے گھر واپس آ گئی ہیں۔ کیا کوئی بات ہوئی ہے؟“

”ہاں۔“ جو لیت نے اعتراف کیا اور پھر اسے عارف کی موت کے سانحے سے آگاہ کرنے کے ساتھ ساتھ خود بخود ہی اپنی ذات پر بیتے ہر سانحے سے آگاہ کرتی چلی گئی۔ اتنے عرصے میں یہ پہلی بار تھا کہ وہ کسی سے اپنا دکھ بانٹ رہی تھی۔ آصف خان نے حویلی میں قیام کے عرصے میں کتنی بار اسے کریدا تھا، اس کے دل کا حال جاننے کی کوشش کی تھی اور یقین دہانی کروائی تھی کہ وہ ہر صورت میں اس کا ساتھ دے گا لیکن پھر بھی وہ اس کے سامنے کچھ عیاں نہیں کر سکی تھی اور اس چھوٹی سی لڑکی کو سب بتا دیا تھا جس سے اس کا کوئی رشتہ نہیں تھا اور وہ خود ایک پناہ گزین کی حیثیت سے اس گھر میں مقیم تھی۔

”آپ ہر جو کچھ گزرا، وہ واقعی بہت الم ناک اور قابلِ افسوس ہے لیکن ہم پھر بھی یہ کہیں گے کہ آپ اتنے عظیم نقصانات اٹھانے کے باوجود خود پر اپنے رب کی نعمتوں کو نہیں بھٹا سکتیں۔ اس رب نے اس وقت جب اپنے تئیں آپ بالکل تنہا ہو گئی تھیں، سبکے باپ تک آپ کو رسائی دی۔ ان کے دل میں آپ کے لیے بے تحاشا محبت ڈالی اور ان ساری دلدلی نعمتوں سے نوازا جس کے لیے بہت سے لوگ ساری زندگی خواب ہی دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ مادی نعمتوں اور سہولیات کو بھلے ہم دوسرے تیرے درجے پر رکھیں لیکن ان کی اہمیت سے انکار نہیں کر سکتے۔ معافی آسودگی انسان کے ذہن کو کیسوی عطا کرنے اور راہیں

متحین کرنے میں خاصی مدد دیتی ہے۔ آپ اپنی اور ماجدہ کی مثال کو ہی سامنے رکھیے۔ آپ کو ساری مادی آسائشات مہیا ہیں اس لیے آپ سکون دل کے حصول کے لیے آسانی سے خدمتِ خلق کی راہ پر چل پڑی ہیں دوسری طرف ماجدہ کو ایسا آسودگی کی وجہ سے کتنی کی راہ اختیار کرنی پڑی ہے۔ ہم ماجدہ کو اس کے عمل میں حق بجانب قرار نہیں دے رہے لیکن آپ کو ایک صحیح حقیقت سے آگاہ کر رہے ہیں۔ مالی طور پر آسودہ یا پھر گھر کی چار دیواری میں محفوظ رہنے والی عورت کے لیے جو مالی ساری زندگی کا روگ بن جاتی ہے، اسی مالی دہکتی کو ایک تلاش اور بے آسرا عورت اپنے نصیب کا ٹکسا کھینچ کر قبول کر لیتی ہے۔ انہی عورتوں کو کچھ کر آپ اور ہم جیسے لوگوں کو تو رہے گا بے حد شکر گزار ہونا چاہیے کہ اس نے ہمیں ایسی آزمائش میں مبتلا نہیں ہونے دیا اور عزت سے جینے کے مواقع میسر کیے۔“ چاند بانو نے بہت محبت سے جو لٹ کے الٹک اپنی چادر سے صاف کیے اور دھیسے لچھے میں اسے سمجھائی چلی گئی۔

”تمہاری باتیں دل کو اچھی لگتی ہیں چاند بانو! تم دعا کرنا کہ میرا دل بھی تمہاری طرح سکون پالے۔“

”ہم آپ کے کہے بغیر بھی آپ کے لیے بہت دعا میں کرتے ہیں، اب اور کئی زیادہ کریں گے۔“ اس کی درخواست پر چاند بانو نے مسکرا کر جواب دیا۔ اپنے گھر کی چھت تلے پناہ دے کر جو لٹ نے اس پر بہت بڑا احسان کیا تھا اور وہ اس احسان کا بدلہ دعاؤں کی صورت میں ہی دے سکتی تھی۔ سو بہت فراخ دلی سے یہ کام کیا کرتی تھی اور کیا جو لٹ اسد اللہ، اللہ کی اس نعمت کو جھٹلا سکتی تھی کہ اس نے اسے ان لوگوں سے نوازا تھا جو اس کے لیے دعا گورہتے تھے اور دعاؤں کے حصار میں رہنے والوں سے بڑھ کر بھلا کون خوش نصیب ہوتا ہے۔

☆☆☆

قاروق کی آنکھ کھلی تو وہ ایک چھوٹے لیکن صاف سحرے کمرے میں موجود تھا۔ کمرے میں ہلکی روشنی والا ایک بلب جل رہا تھا جس نے ارد گرد کے مناظر کو واضح کیا ہوا تھا لیکن اس کی روشنی آنکھوں کو چھتی نہیں تھی۔ کچھ دیر تک وہ یونہی نامحسوس عالم میں اپنی جگہ پڑا اس ماحول اور منظر میں اپنی موجودگی کے بارے میں غور کرتا رہا لیکن پھر سر میں اٹھنے والی درد کی لہر نے اس کی توجہ بانٹ لی۔ چند سیکنڈ میں درد کی لہر گزر گئی تو اسے یاد آیا کہ وہ راہوگر کے اس کے انجام تک پہنچنے کے بعد اپنی جان بچا کر بھاگا تھا تو

ایک مکان کی دیوڑھی میں گر کر نیم بے ہوش ہو گیا تھا۔ اسے دھندلا دھندلا سا خیال تھا کہ کسی نے اس کے بے جان ہوتے وجود کو ہلایا تھا اور اسے آواز میں دیتے ہوئے اس کے بارے میں جاننے کی کوشش کی تھی لیکن سر میں ہونے والی شدید تکلیف نے اسے کوئی جواب نہیں دینے دیا تھا۔ راہوگر کی فکر نے اسے خاصا نقصان پہنچایا تھا پھر اس کے بعد اس کے ساتھ ہونے والی تکلیف اور جان بچانے کے لیے کی جانے والی بھاگ دوڑ نے مزید کام خراب کر دیا تھا۔ وہ جو شملہ سے واپس آنے کے بعد سے خود کو بالکل فٹ اور صحت مند تصور کر رہا تھا، ایک اور جھٹکے کی زد میں آ گیا تھا اور اب جانے کس کے گھر میں آرام دہ بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ اپنے ذہن میں اٹھنے اس سوال کے جواب کے لیے اسے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا اور وہ کمرے کا دروازہ کھول کر اندر آنے والے شخص کو کچھ گھبراہٹ کر رہ گیا۔

”ڈاکٹر پرکاش۔“

”اب کیسا لیل کر رہے ہو یک مین؟“ انہوں نے اس کی حیرت کو نظر انداز کرتے ہوئے نرمی سے پوچھا۔

”میں ٹھیک ہوں لیکن آپ یہاں کیسے؟“ قاروق کی حیرت ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

”میرے بھروسے یہاں رہتے ہیں اور میں ان سے ملاقات کے لیے چھٹی پر یہاں آیا ہوں۔“ انہوں نے اس کی حیرت دور کر دی پھر نہایت تنجید کی سے بولے۔

”باہر پولیس نے سارے علاقے کو گھیرا ہوا ہے۔ وہ اس شخص کو اریٹ کرنا چاہتے ہیں جس نے ان کے ایک آفیسر کو قتل کر ڈالا ہے۔ ان کی طرف سے اناؤنسمنٹ کی گئی ہے کہ جس کسی نے بھی قاتل کو پناہ دے رکھی ہے، وہ اسے خود پولیس کے حوالے کر دے ورنہ پولیس خانہ تھانہ لے کر خود اسے بازیاب کر والے گی۔ اس اناؤنسمنٹ کے بعد میرے قاروق خوف زدہ ہیں اور چاہتے ہیں کہ تمہیں پولیس کے حوالے کر دیا جائے لیکن میں پہلے تم سے ساری بات جانتا چاہتا ہوں۔“

ڈاکٹر پرکاش وہ شخص تھے جنہوں نے اس کے علاج پر خصوصی توجہ دی تھی اور اس علاج کے دوران رہیں سے ہونے والی دوستی کو یوں نبھایا تھا کہ رہیں کے آخری وقت میں اسے شناخت کر لینے کے باوجود پولیس پر ظاہر نہیں کیا تھا۔ مردہ خانے سے رہیں کی لاش نکال کر قاروق کے حوالے کرنے میں بھی کیتھرائن کو ڈاکٹر پرکاش کا تعاون حاصل رہا تھا اور اب بھی وہ اسے فوری طور پر پولیس کے حوالے کرنے

شیش محل

لے جائے اپنے گھر میں پناہ دیے ہوئے تھے۔ ایک بار پھر اس پر زور دیا تو وہ رہیں کے قتل میں راہوگر کے کردار سے لے کر اپنی انتقامی کارروائی تک بہت کچھ بتاتا چلا گیا۔ اپنی انتقامی کارروائیوں کے بہت سے قصے اس نے حذب کر دیے تھے لیکن یہ ضرور بتا دیا تھا کہ کیتھرائن کو اس سے راہوگر کی پاداش میں کن صورتوں سے گزرنا پڑا تھا اور وہ اسے حالات سے فرار کروانے کے جرم کا مرتکب ہونے کے ساتھ ساتھ ملک سے فرار کروانے میں بھی کامیاب ہو چکا تھا۔ ڈاکٹر پرکاش دھل دیے بغیر تنجید کی اس کی ساری بات سننے رہے۔ وہ چپ ہو اتو بولے۔

”تم خطروں سے بچل رہے ہو قاروق! تم جو کچھ کر چکے ہو اس کے بعد سرکار سے تمہارے لیے کسی نرمی کی امید نہیں کی جاسکتی۔ میں پریشان ہوں کہ اتنا سب ہونے کے بعد تم کہاں تک خود کو بچا پاؤ گے۔“

”یہ تو خود مجھے بھی نہیں معلوم۔ میں تو بس یہ جانتا ہوں کہ مجھے جو کچھ کرنا چاہیے تھا، میں نے وہی کیا ہے۔ میں دادا کے قاتلوں کو کسی صورت معاف نہیں کر سکتا تھا۔“ قاروق کے چہرے پر تناد سا آ گیا۔

”میں تمہارے اموشو کو سمجھ سکتا ہوں۔ رہیں دادا واقعی بہت پیارا آدمی تھا۔ اس کی پرستانی نے مجھے بھی بہت انسپاز کیا تھا، تمہیں تو پھر وہ بالکل بیٹوں کی طرح چاہتا تھا۔ تمہارا اس کے وحشیانہ قتل پر اس طرح ری ایکٹ کرنا بڑا تھا، پر اب سوچنا ہے کہ تم یہاں سے فح کر کے نکلو گے؟ پولیس نے خاصے بڑے ایرے کو پوری طرح گھیر رکھا ہے۔“ وہ اس کے لیے پریشان تھے۔

”آپ چاہیں تو خود کو مشکل سے بچانے کے لیے پولیس والوں کو انعام کر سکتے ہیں۔“ قاروق نے گویا ان کی مشکل آسان کرنے کی کوشش کی۔

”واٹ ریش؟ میں ایسا کیسے کر سکتا ہوں؟ مجھے یہی کرنا ہوتا تو تمہیں گھر کے اندر لا کر تمہاری اتنی دیکھ بھال کیوں کرتا؟“ وہ ناراض ہوئے۔

”آپ اجازت دیں تو میں اپنے طور پر یہاں سے نکلنے کی کوشش کرتا ہوں۔“ انہوں نے خانہ تلاشی شروع کر دی اور مجھے آپ کے گھر سے بازیاب کر لیا تو آپ کی ٹیک ٹامی پر حرف آئے گا۔“ وہ اپنی وجہ سے انہیں کسی پریشانی میں مبتلا نہیں کرنا چاہتا تھا۔

”نہیں۔ تم ایسا کچھ نہیں کرو گے۔ وہ چپے چپے پر پھیلے ہوئے ہیں اور تمہارا ان کو مل دے کر کلکتا یا بمبیل نہیں ہوگا۔ تمہاری کٹھن میں بھی زیادہ اچھی نہیں ہے۔ مجھے لگتا ہے

لے جائے اپنے گھر میں پناہ دیے ہوئے تھے۔ وہ ہوش میں آتے ہی بے بات ٹوٹ کر چکا تھا کہ اس کا لباس تبدیل کیا جا چکا ہے اور ہاتھ، پیر اور چہرہ بھی صاف ہے۔ اسے یاد تھا کہ راہوگر کی گردن سے چھوٹنے والے خون نے اسے اس کے چہرے اور لباس کو آلودہ کر دیا تھا اور اس کے ہاتھ بھی خون میں رنگے ہوئے تھے۔ وہ اتنی بری حالت میں یہاں پہنچا تھا کہ ڈاکٹر پرکاش کی جگہ کوئی اور ہوتا تو فوراً اسے پولیس کے حوالے کر دیتا۔ انہوں نے ایسا نہیں کیا تھا تو یہ ان کی مہربانی تھی۔

”میں اپنے ساتھ آپ کے سلوک کے لیے آپ کا فکر گزار ہوں ڈاکٹر صاحب اور چاہتا ہوں کہ آپ میری وجہ سے کسی دشواری میں گرفتار نہ ہوں۔ آپ چاہیں تو اپنے والد کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے مجھے پولیس والوں کے حوالے کر سکتے ہیں۔“ اس نے ڈاکٹر پرکاش کو جواب دیا۔

”میں نے تم سے کہا ہے تاکہ میں حقیقت جاننے کے بعد کوئی فیصلہ کر دوں گا۔ تم میرے ان مریضوں میں سے ہو جن سے میں بے حد قریبی تعلق محسوس کرتا ہوں۔ یہ ٹھیک ہے کہ تمہارے علاج کے لیے مجھے انگریز ڈاکٹر کی مدد لینا پڑی تھی لیکن تمہارے کسی کو میں نے خود بھی پوری توجہ دی تھی اور تم صحت مند ہونے لگے تھے تو مجھے بہت خوشی ہوئی تھی لیکن تم جس حالت میں یہاں پہنچے تھے، اسے دیکھ کر میں شاکزدہ ہو گیا تھا۔ کیا تمہیں یاد ہے کہ تمہارے سر میں اتنا شدید درد ہو رہا تھا کہ تم دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر بری طرح کراہ رہے تھے؟“ انہوں نے کچھ ناراض سے لچھے میں اس سے دریافت کیا تو وہ جواباً اپنی سر ہلا کر رہ گیا۔ اسے داہنی یا دائیں ہاتھ کی اس کی ایسی کیفیت تھی۔ وہ تو خود کو خنودگی اور غشی کی کیفیت میں محسوس کرتا رہا تھا۔

”تم بہت تکلیف میں تھے قاروق لیکن اچھی بات یہ تھی کہ تم جھک جھک جھنجھکے اور میں نے تمہارے بدلے ہوئے طریقے کے باوجود تمہیں جھپکا کر نمک نہ فریٹ دے دیا لیکن میرا خیال ہے کہ تمہیں پرامچہ چیک اپ اور علاج کی ضرورت ہے۔“ وہ اسے اس کی حالت سے آگاہ کر رہے تھے۔ یہ سن کر قاروق کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ آگئی اور وہ بولا۔

”یہاں جان بچا کر نکلنے کے امکانات کم ہیں اور آپ پرامچہ چیک اپ اور علاج کی بات کر رہے ہیں۔“

”تم بتاؤ تو کسی کہ ہوا کیا تھا؟“ ڈاکٹر پرکاش نے

خانہ یا دوسری خفیہ جگہ تو ہے نہیں کہ قاروق کو وہاں چھپادیں۔ پولیس والوں کی نظریں ویسے بھی ہر خفیہ جگہ کو ڈھونڈ لیتی ہیں۔ ہاں، ایک ترکیب ہو سکتی ہے اسے چھپانے کی۔ ہم اسے عرض بتا لیتے ہیں۔

”میں کچھ ٹھیک سے سمجھ نہیں بیٹے!“

”آپ بس اتنی بات یاد رکھیں پتا ہی کہ اس کا نام جیندر ہے، ہریانہ سے آیا ہے اور اس کی آنکھوں کا آپریشن ہوا ہے۔ میری یہاں موجود کی وجہ سے آپ اسے اسپتال میں اکیلا چھوڑنے کے بجائے گھر لے آئے ہیں تاکہ میں اس کی اچھی دیکھ بھال کر سکوں۔ پولیس والے اگر پوچھیں تو آپ بول دینا کہ اُسر اس کی ماما کی طبیعت بھی بہت خراب ہے اس لیے اس کے پتا آپریشن کے فوراً بعد آپ کے گھر سے پر واپس لوٹ گئے تھے۔ بہن بھائی اس کا کوئی ہے نہیں۔“ ڈاکٹر پرکاش جلدی جلدی اپنے والد کو سمجھانے لگے اور وہ اثبات میں سر کو جنبش دیتے اس کی بات کو کچھ جانے کا تاثر دیتے رہے۔

”میں اپنا کام شروع کرتا ہوں۔ آپ ماما سے کہیں کہ قاروق کے کپڑے اور دوسری چیزیں جلا کر ان کی راکھ بھادیں تاکہ پولیس کو کوئی نشانی نہ مل سکے۔“ ڈاکٹر پرکاش نے اپنے والد کو ہدایات دیں تو قاروق چونک گیا۔ اس کی بیس کی جیب میں اس کا چاقو موجود تھا اور لباس کے نیچے پھنی صدری میں خاصی رقم بھی تھی۔ یہ دونوں چیزیں اسے دکھائی نہیں دے رہی تھیں۔ ڈاکٹر پرکاش سے سوال کرنا بھی اسے عجیب لگا لیکن انہوں نے خود اس کی کیفیت کو بھانپ لیا اور بتانے لگے۔

”تمہارے پاس موجود رقم میں نے حفاظت سے رکھ دی ہے اور چاقو میرے میڈیکل باکس میں ہے۔ اگر تلاشی ہوئی بھی تو میڈیکل باکس پر کوئی دھیان نہیں دے گا۔ ویسے بھی وہ لوگ اصل میں تمہاری تلاش میں ہوں گے اس لیے دوسری چیزیں کا بار یک بینی سے جائزہ لینا مشکل ہے۔“

”جو اکیمل کر دیکھ لیتے ہیں۔ قسمت نے زور مارا تو ایک بار بھریچ لکھوں گا۔“ قاروق اداسی مسکراہٹ کے ساتھ بولا تو ڈاکٹر پرکاش نے کوئی بھی جواب دینے بغیر اپنا کام شروع کر دیا۔ ان کے والد جیلے ہی باہر نکل چکے تھے۔ ڈاکٹر پرکاش نے اس کی دونوں آنکھوں پر روئی کے گولے کی پٹی سی۔ بجا کر اوپر سے پٹی باندھنے کے علاوہ دائیں رخسار پر بھی میڈیکل ٹیپ کی مدد سے پٹی چسپاوی۔ ان اقدامات کی وجہ سے قاروق کے چہرے کا بیشتر حصہ چھپ

چکا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ مرنے والا شخص ایس بی راٹھور تھا۔ اس آدمی کے بارے میں بہت کچھ سننے میں آ رہا تھا۔ بتانے والے بتاتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کے لیے بالکل اقصائی تھا اور دی میں ہونے والے خون خرابے میں اس کا بڑا ہاتھ تھا۔ بھریچ جیسے کسی بھی ہندو کو ہندوستان کی اڑیٹن اچھی نہیں لگی۔ کوئی بھی آدمی اپنے گھر کے کلوے ہٹے دیکھ کر خوش نہیں ہوتا لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ ہم مسلمانوں کو مارنا اور لوٹنا شروع کر دیں۔ کچھ باتوں میں وہ ٹھیک بھی ہیں۔ ہمارے لیڈرز اگر ان کی نکایت پر کان دھرتے اور انہیں مٹانے کی کوشش کرتے تو شاید بنوارے کو روکا جاسکتا تھا پر اب تو جو ہونا تھا ہو گیا اور ہمیں کوئی ادھکار نہیں ہے کہ مسلمانوں کو ان کے فیصلے کی سزا دیں۔ راٹھور اور اس جیسے لوگ جو کچھ کر رہے ہیں، وہ بہت غلط ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ ایسے لوگ اپنی اصل سے ہی ٹھیک نہیں ہیں۔ تمہارے ساتھ اس نے جو کچھ کیا، اس پر تمہارا ایکشن ٹھیک ہی ہے۔ انیسویں کر راٹھور نے قانون کا رکھوالا ہوتے ہوئے ایک قاتل اور ڈین جوں کو غلط راہ پر چلنے کے لیے مجبور کر دیا۔ پرکاش کی سفارش، تمہاری کیفیت اور راٹھور کے کردار کو دیکھتے ہوئے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں تمہیں اپنے گھر میں پناہ دوں گا۔ میں ہندو ہندو میں ہوں اور انسان پہلے..... اس لیے انسانیت کے ناتے ہی تمہارے کام آتا چاہتا ہوں۔“ اپنی تنگدلی اور سوچ سے انہوں نے ثابت کر دیا کہ ڈاکٹر پرکاش کے عمہ کردار کے پیچھے ان ہی کی تربیت کا فرما ہے۔ وہ واقعی انسان دوست آدمی تھے۔ قاروق نے اتنے اچھے لوگوں کو اپنی وجہ سے مشکل میں ڈالتے ہوئے خود پر بوجھ محسوس کیا اور بولا۔

”آپ لوگوں کی اس کشادہ دلی پر میں آپ کا شکر گزار ہوں لیکن مجھے لگتا ہے کہ مجھے اپنی وجہ سے آپ لوگوں کو کسی مشکل میں نہیں ڈالنا چاہیے۔ میں یہاں سے چلا جاتا ہوں۔ قسمت نے ساتھ دیا تو پولیس والوں کی نظروں سے بچ کر نکل ہی جاؤں گا۔“

”کہاں نکل جاؤ گے؟ پولیس نے پورے علاقے کو گھیرا ہوا ہے اور گھروں کی تلاش لینے کا کام شروع کر چکی ہے۔ اب تو ہمیں تمہیں یہیں کسی طرح چھپانے کی کوشش کرنی ہے۔“ انہوں نے اس کے خیال کو رد کر دیا اور ڈاکٹر پرکاش کی طرف متوجہ ہو کر بولے۔

”تم نے کچھ سوچا پرکاش؟“

”اسی پر سوچ رہا ہوں پتا ہی! اپنے گھر میں کوئی تہ

شروع ہو چکے تھے اور دل بھر کر تعریفیں بھی کرتے جا رہے تھے۔ ان کی ہر تعریف پر ان کی ماں کا چہرہ مزید روشن ہو جاتا تھا۔ وہ دل کلاس گھرانے کی وہی روایتی ماں تھیں جنہوں نے بیٹے کی اچھی تعلیم کے لیے اپنے شوہر کے ساتھ مل کر نہ جانے کتنی قربانیاں دی تھیں۔ بیٹا پڑھ لکھ کر اپنی الگ دنیا بسا چکا تھا اور پیچھے بوڑھے ماں باپ اسی میں خوش تھے کہ ان کا بیٹا ایک اچھی زندگی گزار رہا ہے اور اپنی بے تحاشا مصروفیت میں سے تھوڑا سادقت نکال کر وقتاً فوقتاً ان سے ملنے آ جاتا ہے۔ ڈاکٹر پرکاش کی عمر دیکھتے ہوئے اندازہ لگا یا جاسکتا تھا کہ ان کے بچے جوانی کی سرحد پر پہنچ چکے ہوں گے اور اسی حساب سے ان کے والدین کی عمریں بھی اچھی خاصی تھیں، یعنی وہ لوگ ایک طویل عمر سے تنہائی کی زندگی گزار رہے تھے۔ ہو سکتا ہے وہ روایتی ذہن کے لوگ ہی ہوں جنہیں اپنی پرانی جگہ چھوڑنا اچھا نہ لگتا ہو لیکن موماں بے بوڑھے والدین کی خدا پتا بھرم قائم رکھنے کی ہی ایک کوشش ہوتی ہے۔ کامیاب بچوں کے بوڑھے والدین ان کے شاعرانہ گھروں میں اس توجہ اور اپنائیت سے محروم ہوتے ہیں جو ان کے بیٹوں کے گھر میں ان کی حیثیت کو مستحکم بنا سکے اس لیے وہ اپنی انا اور خودداری کو بچا کر بیٹوں کے بڑے گھروں کو چھوڑ کر اپنے چھوٹے اور عام سے گھروں میں رہنا پسند کرتے ہیں اور اپنی بات پر ہی خوش ہو لیتے ہیں کہ بیٹا دور رہ کر بھی ان کے آرام کے لیے شکر رہتا ہے۔

ڈاکٹر پرکاش نے اپنا ہاتھ پھرتی سے ختم کیا اور قاروق کو اچھی طرح کھانے کی ہدایت کر کے کمرے سے باہر نکل گئے۔ قاروق کی طبیعت پوچھ لگتی تھی اور کھانے پینے کو دل نہیں چاہ رہا تھا لیکن وہ ڈاکٹر پرکاش کی ماں کے اصرار پر ان کا دل رکھنے کے لیے کچھ نہ کچھ کھا رہا تھا۔ انہوں نے اس سے اس کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا، اس لیے اسے بھی ان کی موجودگی بھاری محسوس نہیں ہوئی۔ کچھ دیر بعد جب وہ ناشتے سے اٹھ چکا تھا، ڈاکٹر پرکاش ایک بزرگ کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئے۔ ڈاکٹر پرکاش سے ان کی حد درجے مشابہت ظاہر کر رہی تھی کہ وہ ان کے والد ہیں۔ قاروق نے انہیں آداب کیا۔ جواب میں انہوں نے بھی جیسے روہا کہا اور اپنی بیوی کی خالی کی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئے۔ وہ برتن وغیرہ سمیٹ کر ناشتے کی ٹرے واپس لے جا رہی تھیں۔

”پرکاش سے تمہارے بارے میں بہت کچھ پتا

کہ تم عمر سے اپنی کیتھ کے بغیر خود کو جگم میں ڈالے ہوئے ہو اور اسی کی کسر اب نکل رہی ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ تمہارے سر کی تکلیف تمہیں دوبارہ بھی پریشان کر سکتی ہے۔ تم یہاں میری نظروں کے سامنے رہو اور میری تجویز کروہ میڈیسن استعمال کرو، تمہارے لیے یہی ٹھیک ہوگا۔“ انہوں نے سختی سے اس کی دوسری تجویز بھی رد کر دی۔ اسی وقت دروازے پر ہلکی سے دھک ہوئی اور وہ مکمل گیا۔ کچلے دروازے سے ایک عمر رسیدہ خاتون ٹرے ہاتھوں میں اٹھائے اندر داخل ہوئیں۔

”ارے ماما! آپ نے کیوں کٹھ کیا..... مجھے بلا لیتیں۔“ ڈاکٹر پرکاش فوراً اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے۔ ”کٹھ کیا بیٹا! اپنے ہاتھ سے کام کرنا اچھا لگتا ہے۔ نوکرانی تو میں نے بس تمہاری ضد پر رکھی ہوئی ہے۔“ ان کے جبر میں بھرے چہرے پر مسکراہٹ اور ممتا کی روشنی تھی۔

”آپ کو سنا میری ہر ضد مانتی ہیں۔ کتنی بار آپ سے کہا ہے میرے ساتھ بیٹنی چل کر رہیں۔ بچے بھی آپ دونوں کو یاد کرتے رہتے ہیں۔“ ڈاکٹر پرکاش نے انہیں ایک کرسی پر بٹھا دیا تھا اور بہت محبت سے شکوہ کر رہے تھے۔ ”تمہیں خبر ہے میرا اس گھر سے ہٹ کر کہاں سن نہیں لگتا۔ بچوں کو تم چھینوں میں ہم سے ملوانے لے آنا پڑھنے لکھنے والے بچوں کو عام دلوں میں کہاں فرصت ہوتی ہے کہ بوڑھے دادا دادی کے ساتھ سے بتائیں، بس آتے جاتے بیلو ہائے ہی کر پاتے ہیں۔“ انہوں نے پیار سے بیٹے کے گھوے کا جواب دیتے ہوئے حقیقت بیان کی۔ قاروق سر ہانے سے ٹپک لگا سے بیٹھا دیکھ رہا۔ عرصہ گزر گیا تھا اسے ماں کی چھاؤں سے محروم ہونے لیکن ماں بولی نہیں تھی اور وہ چین سے کھسکا تھا کہ اس کی اور ڈاکٹر پرکاش کی ماں میں کوئی فرق نہیں تھا کہ ماں کا حلق کسی بھی طبعی، مذہب یا خلیے سے ہو..... ماں، ماں ہی ہوتی ہے۔ وہ بھی آنکھوں میں محبت لیے ناشتے کے لوازمات ان دونوں کے سامنے رکھتی رہیں اور کچھ سادگی سے بولیں۔

”لوکاڈ بیٹا! نوکرانی آج نہیں آ سکی تو بچے سے کے بعد آج میں نے رسوئی میں بیٹھ کر کھا ہے۔ جانے ڈھنگ کا بتا بھی پائیں۔“

”بہت مزے کا ہے ماما! امیرا اعتریش لکک کا باہر شیف بھی اتنے مزے کا کچھ نہیں پکا پاتا۔“

ڈاکٹر پرکاش قاروق کو کھانے کا اشارہ کر کے خود

اسے کوئی جذباتی قدم اٹھانے سے روکا اور پہلے سے کمرے میں ادھر سے ادھر ٹپکنے لگے۔ فاروق کو نہ چاہتے ہوئے بھی ان کی بات ماننا پڑی۔

”ٹھیک ہے۔ ایک آپاٹے ہے میرے پاس ہے۔“
دومنت کے اندر ہی ڈاکٹر پرکاش نے ٹھکانا بند کر دیا اور اس کی طرف رخ کر کے بولے۔ وہ سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھنے لگا۔

”میں ہاسپٹل سے ایسولینس منگواتا ہوں۔ ایسولینس کو کوئی نہیں روکے گا۔ بھانہ یہ ہوگا کہ تم اپنی آنکھوں میں تکلیف محسوس کر رہے ہو اس لیے تمہیں چیک اپ کے لیے لے جایا جا رہا ہے۔ یہاں کی طرح ہاسپٹل کے باہر پولیس کا گھیراؤ نہیں ہوگا اس لیے تم وہاں سے نکلنے کی کوشش کرو گے تو کامیاب ہو جاؤ گے۔“ ان کی تجویز واقعی اچھی تھی۔ فاروق کے چہرے پر بھی رونق دوڑی اور وہ بولا۔

”وہاں سے تو ستر بھائی بھی مجھے نکالوا سکتے ہیں۔ مجھے ان کا ٹیلیفون نمبر یاد ہے۔ آپ ٹیلیفون پر میری ان سے بات کروادیں۔“

”اوکے۔ پہلے میں ایسولینس کے لیے کال کر کے اپنے دوست کو ساری بات سمجھا دوں پھر تمہاری بات کروا دوں۔“ ڈاکٹر پرکاش کمرے سے باہر نکل گئے۔ نصف گھنٹے کے اندر فاروق کی وہاں سے روانگی کے انتظامات مکمل ہو چکے تھے۔ حسب توقع پولیس والوں نے ایسولینس کی آمد اور مریض کی وہاں سے منتقلی پر کوئی اعتراض نہیں کیا البتہ راستے میں ایک جگہ چیکنگ ضرور ہوئی۔ فاروق کا چاقو ہنوز ڈاکٹر پرکاش کے میڈیکل باکس میں پڑا تھا جس کی تلاش لینے کا کسی کو خیال نہیں آیا۔ ناکابندی والے علاقے سے نکل کر فاروق اور ڈاکٹر پرکاش دونوں نے اطمینان کا سانس لیا لیکن احتیاطاً آپس میں کوئی گفتگو نہیں کی کہ ایسولینس کا ڈرائیور رخصت میں چلا نہ ہو جائے۔ ہاسپٹل پہنچ کر بھی فاروق کو باقاعدہ ایک مریض ہی کی طرح اسٹریچر پر منتقل ڈاکٹر نے فاروق کی آنکھوں پر باندھی پٹی کھولی اور اسے بتایا کہ ستر بھائی کے آدی اسے لینے کے لیے آئے ہوئے ہیں لیکن ڈاکٹر پرکاش نے فوری طور پر فاروق کو روانگی کی اجازت دینے کے بجائے اس سے کہا کہ وہ ہاسپٹل میں موجودگی کا فائدہ اٹھا کر اس کے سر کی تکلیف کی طرف سے اپنا اطمینان کر لیتا چاہتے ہیں۔ فاروق تیار نہیں تھا لیکن ڈاکٹر پرکاش کے اصرار پر اسے ماننا پڑا۔ ڈاکٹر پرکاش کے دوست نے

”اے والے اب اس گھر سے باہر جا رہے ہیں۔ ان کے ماننے کے دو چار منٹ بعد ہی ڈاکٹر پرکاش دوبارہ اس کے سے میں آ گیا اور آہستہ سے اسے آواز دے کر پوچھا۔

”تم جاگ رہے ہو فاروق؟“
”جی ڈاکٹر صاحب۔“ فاروق فوراً اپنی جگہ سے اٹھ اُٹھا اور بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”آپ کی ترکیب کامیاب رہی۔ پولیس والے دھوکا کھا کر واپس چلے گئے۔“
”شاید۔۔۔ لیکن مجھے لگتا ہے کہ وہ تھوڑا سا ٹھنک گئے ہیں۔ اصل میں تھوڑی سی مس پینڈنگ ہو گئی۔“
”وہ کیا؟“ فاروق چونکا۔

”تمہارے خون آلود کپڑوں وغیرہ کو جلانے کے بعد ماتی راکھ ٹھیک طرح سے بہا نہیں سکیں۔ ایک سپاہی نے ہاتھ روم میں پڑی راکھ دیکھ لی تھی اور اس کے بارے میں پوچھا بھی تھا۔ میں نے بھانہ بنادیا کہ ماتی نے سفید لیٹے اور ٹنک سے میری نظر اتارنے کے بعد دونوں چیزیں ہاتھ روم میں لے جا کر جلادی تھیں۔ یہ اسی کی راکھ ہے لیکن پتا نہیں پولیس والوں نے مانا بھی پائیں۔ انہوں نے مجھ سے ہاسپٹل اور ڈاکٹر کا نام بھی پوچھا تھا کہ تمہارا آدریش کہاں اور کس نے کیا۔ پتا جی سے بھی پوچھ رہا تھا کہ ان کے دوست بریانی میں کس جگہ رہتے ہیں۔“ ڈاکٹر پرکاش تذبذب کا شکار تھے۔ فاروق کو بھی ان کی تشویش میں جان محسوس ہوئی۔

”خیر تم فکر نہ کرو۔ میری یہاں بھی ڈاکٹر زے اچھی پہچان ہے۔ میں نے اپنے جاننے والے ایک آئی اسپیشلسٹ کا ریفرنس دے دیا ہے۔ اسے فون کر کے سمجھا دوں گا کہ اگر کوئی انکو آزاری کرے تو اسے کیا جواب دینا ہے۔“ انہوں نے اپنی تشویش سے آگاہ کرنے کے ساتھ ہی اسے تسلی بھی دی۔

”مجھے نہیں لگتا ڈاکٹر صاحب کہ وہ مطمئن ہو گئے ہوں گے۔ پولیس والوں کو ایک بار خشک پڑ جائے تو وہ بال کی خال نکالنے بیٹھ جاتے ہیں۔ اچھی جو آتا تھا، وہ آپ کے ہاتھ کا شکر دھاس لیے ان کے احترام میں خاموشی سے چلا گیا۔ اب دوبارہ اس کی جگہ کوئی دوسرا آئے گا جو کوئی لحاظ نہیں کرے گا۔ مجھے اس سے پہلے ہی یہاں سے لھنا ہوگا۔“
فاروق بے چین ہو گیا اور آنکھوں پر باندھی پٹی کھولنے کی دوش کی۔

”جلد بازی سے کام نہ لو۔ اس طرح سوچے سمجھے بنا کر تم آسانی سے ان کے جال میں پھنس جاؤ گے۔ مجھے ونی آپاٹے سوچنے دو۔“ ڈاکٹر پرکاش نے ایک بار پھر

نہندے سے جاگنے کے باوجود بھاری بھاری دھک اور مردانہ آوازوں نے اسے فوراً سمجھا دیا کہ پولیس اسے تلاش کرتے ہوئے یہاں پہنچ چکی ہے۔ اسے اپنے اعصاب میں واضح تناؤ محسوس ہوا لیکن کسی نہ کسی طرح خود پر ضبط کیے بستر پر پڑا رہا۔ کچھ لمحوں میں ہی اسے اپنے کمرے کا دروازہ کھولے جانے کی آواز سنائی دی۔ ساتھ ہی ایک مردانہ آواز کالوں میں پڑی۔ وہ کہہ رہا تھا۔

”میں سر کا اسٹوڈنٹ رہا ہوں اور مجھے ان کی زبان پر بھروسہ ہے۔ بس اپنی ڈیوٹی پوری کرنے کے لیے آپ کے کیسٹ پر ایک نظر ڈالنا چاہتا ہوں۔“
”شیور اسپیکر اڈیوٹی پوری کرنا بہت اچھی بات ہے، بس آپ کوشش کریں کہ میرا پینشنٹ ڈسٹرب نہ ہو۔ اس کے لیے ریٹ بہت ضروری ہے۔“ ڈاکٹر پرکاش نے پروفیشنل انداز اختیار کرتے ہوئے اسے جواب دیا۔ فاروق کی آنکھوں پر پٹی تھی اس لیے وہ کچھ دیکھ نہیں سکتا تھا، اتنا اندازہ البتہ ہو گیا کہ کوئی اس کے قریب آ کر کھڑا ہوا ہے۔ اس نے پوری کوشش کی کہ اس کا اعصابی تناؤ اس کے چہرے سے ظاہر نہ ہو اور وہ سکون سے سویا ہو ہی محسوس ہو۔ حسب توقع اسپیکر نے ڈاکٹر پرکاش سے اس کے رخسار پر چمکی پٹی کے بارے میں پوچھا اور انہوں نے اسے وہی جواب دیا جو کہ پہلے طے کر چکے تھے۔

”میرے ہمیشہ بڑی سو فٹ سچر رکھتے ہیں۔ اپنے دوست کے بیٹے کے لیے اس عمر میں بھی کٹ اٹھانا انہی کی ہمت ہے۔“ اسپیکر شاید اپنا اطمینان کر چکا تھا اور دوستانہ لہجے میں پرکاش کے سامنے ہنسنے لگا رہا تھا۔

”پتا جی ہیو مینٹی پر بلو کرنے والے آ دی ہیں۔ انہوں نے مجھے ڈاکٹر بھی اسی لیے بتایا تھا کہ میں انسانوں کی سیوا کروں۔ اپنے اسٹوڈنٹس کو بھی وہ یہی سب سمجھاتے تھے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد بھی کئی سالوں تک وہ بچوں کو فزیالوجیشن دیتے رہے ہیں۔ وہ تو جھپٹے دو تین سالوں سے ان کی ہمت نہیں رہی ہے تو گھر سے لھنا چھوڑ دیا ہے لیکن اب بھی کوئی بھولا بھٹکا بڑھانے کی ریکوریٹ لے کر گھر آ جائے تو اسے نہ نہیں کہتے۔“ ڈاکٹر پرکاش اور پولیس اسپیکر کی گفتگو سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اسپیکر ڈاکٹر پرکاش کے والد کا کوئی پرانا شاگرد نکل آیا ہے، اسی لیے اتنے دوستانہ انداز میں پیش آ رہا ہے۔ باتیں کرتے ہوئے وہ دونوں کمرے سے باہر چلے گئے تو فاروق نے سکون کا سانس لیا اور اپنی جگہ پر گہنے لینے ہی محسوس کرتا رہا کہ

”کیا تھا اور شناخت آسان نہیں تھی۔“
”تمہارے جسم پر اور بھی چھوٹی موٹی چیزیں موجود ہیں۔ اگر کسی کی نظر پڑ جائے تو بھانہ بنایا جاسکتا ہے کہ ہاسپٹل میں کسی ضرورت کے تحت تم نے خود بستر سے اٹھنے کی کوشش کی اور دو آؤں کی میز پر گر گئے۔ مگر نے سے شیشیاں وغیرہ نہیں تو ان کے گلے تمہارے جسم کے مختلف حصوں میں چھ کر ختم بن گئے۔“ ڈاکٹر پرکاش ہر طرح کے سوال جواب کے لیے اپنے ساتھ دوسروں کو بھی تیار دیکھنا چاہتے تھے۔

”میں آپ کی ہدایات یاد رکھوں گا۔“ فاروق نے انہیں یقین دہانی کروائی۔

”تمہیں کسی کے سامنے زیادہ بولنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر پولیس والے یہاں آئے تو میں ان سے کہہ دوں گا کہ تمہیں مسکن دوا میں کھلا کر سلا دیا گیا ہے۔ میری کوشش ہوگی کہ تمام بات چیت میں خود ہی کروں۔ تمہیں، پتا جی اور ماتی کو صرف احتیاطاً سب کچھ بتانا جا رہا ہوں۔“
”جیسا آپ مناسب سمجھیں۔“ فاروق نے اپنی لگا میں مکمل طور پر ان کے ہاتھ میں تھام دی تھیں اور ان کی ہر بات پر صاف کر رہا تھا۔

”آنکھوں پر پٹی بندھے ہوئے سے تمہیں الجھن تو ہو رہی ہوگی لیکن جان بچانے کے لیے یہ تھوڑی سی تکلیف سہلہ۔ میں تھوڑی تھوڑی دیر بعد یہاں کا چکر لگا تا رہوں گا۔ اگر تمہیں کوئی ضرورت پڑے تو تم آواز دے کر بلا سکتے ہو۔ فی الحال میں تمہیں جیج ایک سکون کی دوا کھلا رہا ہوں۔ اسے کھا کر تم آرام سے سو جاؤ۔ اس طرح تمہیں زیادہ الجھن بھی نہیں ہوگی اور تمہارے سر کی تکلیف کو بھی آرام ملے گا۔ ویسے اب تم کیسا ٹھیک کر رہے ہو؟“

”جب جاگا تھا تو میں درد کی لہریں محسوس ہو رہی تھیں۔ ناشتے کے بعد کافی بہتر ہوں۔“ فاروق نے جواب دیا تو انہوں نے اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے اسے اپنے ہاتھ سے ایک گولی کھلائی اور آرام کرنے کی ہدایت کرتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئے۔ یہ ان کی کھلائی گئی گولی کا اثر تھا یا وہ خود ہی مسلسل بھاگ دوڑ کی وجہ سے بہت تھک چکا تھا کہ تھوڑی ہی دیر میں نیند کی آغوش میں چلا گیا۔ نیند کا یہ دورانیہ تقریباً ڈھائی تین گھنٹوں پر محیط تھا۔ شاید وہ ابھی کچھ دیر مزید سویا رہتا لیکن غیر معمولی آوازوں نے اسے نیند سے جگا دیا۔ سوتے وقت اس کے ذہن میں تھا کہ پولیس والے خانہ تلاشی کے لیے یہاں آ سکتے ہیں اس لیے گہری

ان کی درخواست پر فوری طور پر اس کے انکسے کے انتقام کروادیا پھر بھی ڈھائی تین گھنٹے کا وقت گزر گیا۔ ستار بھائی کے پیچھے آدی مبر سے انتظار کرتے رہے۔ انکسے دیکھنے کے بعد ڈاکٹر پر کاش خوش ہو گئے اور فاروق کو بتایا۔

”رپورٹ بالکل ٹھیک ہے، وہ رت جھاری تکلیف دیکھ کر میں ڈر رہا تھا کہ کوئی انٹرنل پرابلم نہ ہوگئی ہو۔ شاید بہت زیادہ اسٹریس کا اثر تھا کہ ایک گھر سے ہی جھاری حالت خراب ہوگئی۔ دماغ کے معاملات بڑے نازک ہوتے ہیں۔ انکسے سے میں ہر بات کا پتا چلنا پامیل بھی نہیں ہے اس لیے تم یہ مت سمجھ لینا کہ تم ہنڈ ریڈ پرسنٹ ہو۔ میں کچھ میڈیسن دے رہا ہوں۔ ان کو ریکولر کھاتے رہنا تاکہ فوج میں کوئی پریشانی نہ ہو۔“ ڈاکٹر پر کاش اسے ڈیروں ہدایات سے نوازا رہے تھے۔ وہ ان کے غلوں کا پہلے سے بھی زیادہ قائل ہو چکا تھا اس لیے بغیر کسی جت کے انہیں یقین دلانا رہا کہ وہ ان کی ہر بات پر عمل کرے گا۔ وقت رخصت ڈاکٹر پر کاش نے اسے باقاعدہ گلے لگا کر رخصت کیا اور بہت غلوں سے بولے۔

”میں چاہتا ہوں تم بہت لمبا جیون پاؤ۔ تم میرے کوئی نہیں ہو لیکن میں اپنے سن میں تمہارے لیے بڑا پریم محسوس کرتا ہوں۔ تمہارے اندر بیگوان نے کچھ خاص اثر کشن رکھی ہے جو لوگوں کو تمہیں چاہنے پر مجبور کرتی ہے۔ میں نے رین دادا کی تمہارے لیے دیواری کو دیکھا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ وہ بھی کوئی رشتہ نہ ہوتے ہوئے تم پر اپنی جان چھڑکتا تھا۔ اب تمہارا بھی کام ہے کہ اپنے اتنے چاہنے والوں کی چاہت کا خیال کرو اور خود کو بے کار غلطوں میں ڈالنے کے بجائے لائف کو کوٹھڑا سیٹل کرنے کی کوشش کرو۔ کیسٹھرائن کی طرح تم بھی ہندوستان سے چلے جاؤ فاروق! یہاں کی زمین تم پر تنگ ہو چکی ہے اور ضروری نہیں کہ ہر بار بجائو کا راستہ نکل آئے۔“ وہ کسی بڑے بھائی کی طرح اسے نصیحت کرتے رہے۔ فاروق نے ان کی ہر نصیحت خاموشی سے سنی۔ یہ تو اچھی وہ خود بھی اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ اس کی زندگی کو کن طوقانوں سے دوچار ہونا پانی ہے لیکن اپنے رب کی اس مہربانی پر اس کا دل ضرور گداز ہوا تھا کہ واقعی وہ اس پر اتنا مہربان رہا تھا کہ مشکل ترین حالات میں بھی اس کے لیے راہیں نکال دیتا تھا اور لوگوں کے دل اس کے لیے نرم کر دیتا تھا۔ یہ دنیا جہاں بھائی بھائی کا گلا کاٹ دیتا تھا، اس دنیا میں اگر اسے اختیار سے بھی نہیں ملتی تھی تو یہ رب کی طرف سے خصوصی انعام کے سوا کیا تھا۔

☆☆☆

”چاند باو بہت نیک سیرت لڑکی ہے۔ ہمیں اسے دیکھ کر حیرت اور خوشی دونوں ہوتی ہے۔ اپنی کم عمری میں ایسی عبادت گزار اور پہلی بار ہمارے مشاہدے میں آ رہی ہے۔ اس پر سے وہ خدمت گزار بھی بہت ہے۔ روزانہ ہی اس کے ہاتھوں سے پتا کوئی نہ کوئی بچکان کھانے کو مل جاتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ کبھی جان کا بھی خیال رکھتی ہے۔ ہم نے محسوس کیا ہے کہ اس کی آمد کے بعد سے کبھی جان کی صحت پر اچھا اثر پڑا ہے اور وہ پہلے جتنی مایوس اور آرزو دکھائی نہیں دیتیں۔“ رات کے کھانے کے بعد اسد اللہ مطالعے کے عادی تھے۔ حویلی میں موجود کتابوں کا پیش بھا خزانہ تو نکلے والی آگ میں ہی جل کر راکھ ہو گیا تھا لیکن کتابوں کے دلدادہ اسد اللہ نے سکون میر آئی سی یہاں بھی کتابیں جمع کرنا شروع کر دی تھیں اور ایک چھوٹی سی لائبریری تشکیل دینے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ دوران مطالعہ وہ چاہے ضرور پڑھتے تھے۔ مومالازم ہی انہیں چاہئے پیش کرتا تھا لیکن کبھی کبھار جو لیت بھی ان کے لیے چاہئے لے جاتی تھی۔ آج بھی وہ خود ان کے لیے چاہئے لے کر آئی تھی۔ ساتھ ایک کپ اسے لیے بھی تھی جسے دیکھ کر اسد اللہ سمجھ گئے کہ وہ ان سے گفتگو کی خواہش مند ہے چنانچہ خودی اسے اپنے سامنے رکھ کر سی پڑنے کی دعوت دے ڈالی اور دھڑلہ دھڑلہ گفتگو کرتے ہوئے بات چاند بانو تک آ پہنچی تو انہوں نے محل کر اس کی تعریف کی۔

”آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں بابا! میں نے بھی محسوس کیا ہے کہ اس کے آنے سے ہمارے گھر کے ماحول پر اچھا اثر پڑا ہے اور وہ سارے کام کر رہی ہے جو ایک نئی کی حیثیت سے مجھے کرنے چاہیے تھے۔“ جو لیت نے اعتراف کیا۔

”ہمارے کہنے کا مقصد نہیں تھا بیٹی! ہم چاند بانو کی خدمت کے معترف ہیں لیکن ہمیں آپ کی ذات سے بھی کوئی شکوہ نہیں ہے۔ ہم زندگی کا اچھا خاصا تجربہ رکھتے ہیں اور ہمیں معلوم ہے کہ دنیا میں ہر شخص مختلف صلاحیتوں اور حزان کا حامل ہوتا ہے اور اسی حساب سے اس کا دائرہ کار بھی ہوتا ہے۔ ہم آپ کو گھر میں قید کر کے محل طور پر گھر لے امور میں الجھانے کی گھٹی نہیں کر سکتے۔ ہمیں معلوم ہے کہ ایسا کرنے سے نہ صرف آپ کی صلاحیتوں کا زیاں ہوگا بلکہ آپ ممکن کا شکار بھی ہو جائیں گی۔ ہم آپ کے لیے مختلف انداز سے سوچتے ہیں۔ ہماری ذاتی رائے یہ ہے کہ آپ

شیش محل

اپنے حالیہ تجربات و مشاہدات کو اپنی ڈائری میں نوٹ کرتی مائیں اور پھر ان کی روشنی میں کوئی عمدہ سی کتاب لکھیں۔ ہم نو! اس کتاب کی اشاعت کا انتظام کریں گے۔ آپ نے معاف کی تعلیم حاصل کی ہے۔ آپ لکھنے کی بہترین صلاحیت رکھتی ہیں تو آپ کو اپنی اس صلاحیت کا بھرپور استعمال کرنا چاہیے۔ آج کل آپ اخبارات میں جو چند ایک کالم وغیرہ لکھ رہی ہیں، وہ ہماری نظر سے گزرے ہیں اور اپنے طویل مطالعے کی وجہ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ آپ میں ایک کالم نگار کے علاوہ معضف بننے کی بھی پوری پوری صلاحیت موجود ہے۔ آپ کو اپنی اس صلاحیت کو ضائع کرنے کے بجائے اس کا بھرپور استعمال کرنا چاہیے۔ ابھی آپ کو اس طرح کے کاموں کے لیے فرصت بھی میسر ہے۔ آنے والے وقت میں جب انشاء اللہ آپ کی اپنی گرجا بنی ہوگی تو بہت کچھ میسر ہوتے ہوئے بھی آپ خود کو عدیم الغرضت پائیں گی۔ ہمارے ہاں کی خواتین خواہ مخواہ بھی تعلیم یافتہ اور پیشہ ورانہ صلاحیتوں کی مالک ہوں، مگر کو اپنی ذات سے بالکل منہاجیں کر سکتیں۔ مگر کی کشش ان کے بہت سے خزانم اور ارادوں کی راہ میں حائل ہو جاتی ہے اس لیے بہتر ہے کہ آپ اپنے آج کو بہر طور پر استعمال کر لیں۔“

اسد اللہ نے اس کی بات کے جواب میں بہت تفصیل سے اپنے خیالات و خواہشات سے آگاہ کیا۔ وہ سن کر کچھ دیر کے لیے تو ساکت رہی وہ گئی اس کے دل میں انتقام کی آگ آج بھی نہیں بجھی تھی اور بار بار یہ خیال آتا تھا کہ اسے دلدار آغا سے اپنے ساتھ کیے ظلم کا بدلہ لینا ہے لیکن اپنے انتقامی جذبے کی تسکین کے بعد وہ اپنے باپ کے خوابوں کی تکمیل کیسے کر پائی۔ انتقام کی راہ پر چلنے والے خود بھی شیطوں کی زد میں آ جایا کرتے ہیں۔ اس سے یہ حقیقت نہیں ہوئی نہیں تھی، ایسے میں وہ اپنے باپ کے خواب اور خواہشیں پوری کرنے کی لائق کہاں رہ پائی... لیکن کیا وہ ایک ایسے شخص کو جیوش تشدد آرزو رہا تھا، ایک باہر مایوسی اور دکھوں کے حوالے کر سکتی تھی؟ وہ جنہوں نے زندگی سے کبھی کوئی بڑی خوشی نہیں پائی تھی، کیا عمر کے اس حصے میں اپنی اولاد کے حوالے سے بھی کوئی خوشی پانے کے حق دار نہیں تھے؟ ایک عجیب سی جنگ تھی جو اس کے دل و دماغ میں چھڑکتی تھی اور اسد اللہ اس کی کیفیت سے بے خبر کہے جا رہے تھے۔

”محبت اللہ کے زندہ ہونے کی خبر نے ہمیں بہت امید کر دیا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ ایک نہ ایک دن ہمارا

ان سے رابطہ ہو جائے گا اور وہ واپس آوے گا۔ وہ آجائیں گے۔ وہ دن ہمارے اور جمالی ہمارے ہمارے لیے بے تحاشا خوشی کا دن ہوگا۔ ہماری خواہشیں ہمارے نام آپ کو اپنے پیار سے پیچھے کے ساتھ منسلک کر لیں ہماری طرف سے کوئی جبر یا زبردستی نہیں ہے۔ ہم اپنی خواہش کو آپ کی خوشی پر ترجیح نہیں دیں گے، بس یہ درناست کریں گے کہ اپنی زندگی کے لیے کوئی فیصلہ کرتے ہوئے ہماری خواہش کو بھی مد نظر رکھیے گا۔ محبت اللہ نے بے شک اپنی زندگی کے بہت سے ماہ و سال ایک بالکل مختلف ماحول میں گزارے ہیں لیکن وہ ہمارا خون ہیں اور ہمیں یقین ہے کہ انہوں نے کچھ نہیں وہ کر بھی سکول کی سی زندگی گزار کر ہوگی۔ کچھ کی پیشہ ور بھی مگنی ہوگی تو وہ اپنے ماحول میں واپس آ کر دروہ ہو جائے گی۔“ خواہوں اور خواہشوں کا ایک سلسلہ تھا جس کے بوجھ سے جو لیت دہلی جا رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ اسد اللہ واقعی اللہ جنہوں نے اپنا پورا خاندان گنوا دیا تھا، کیا اتنا حق نہیں رکھتے تھے کہ اپنی نسل کے باقی بچ جانے والے دو افراد کے لیے کوئی خواب دیکھ پاتے؟

”ہم آپ پر محبت اللہ کی دہلی کے لانا ہی انتظار کرنا بوجھ نہیں ڈالیں گے بس کچھ عرصہ ان کا انتظار کر لیتا چاہئے ہیں۔ کیا خبر ہماری دعا میں رنگ لے آئیں اور وہ واپس لوٹ آئیں۔“ ان کے لہجے میں امید ہی امید تھی اور فاروق کا سامنا ہونے سے ہمیشہ خائف رہنے والی جو لیت یہ بھی نہیں سوچ سکتی تھی کہ وہ اپنی امیدوں میں ناکام و نامراد رہ جائیں۔

”اتنی دیر سے ہم اکیلے ہی بات کیے جا رہے ہیں اور آپ بالکل خاموش ہیں۔ کیا ہماری اتنی ساری خواہشوں نے آپ کو پریشان کر دیا ہے؟“ آخر کار اسد اللہ نے اس کی خاموشی کو محسوس کر لیا اور خود اس پریشان ہو کر پوچھنے لگے۔ جواب میں جو لیت نے نفی میں سر ہلایا اور خود کو سنبھال کر دھیرے سے مسکراتے ہوئے بولی۔

”میں سوچ رہی تھی، میرے کیرئیر اور فیوچر پر اتنا سوچنے والے میرے باپ نے کیا میری ذات سے وابستہ ایک! ہم ترین مسئلے پر کچھ نہیں سوچا ہوگا۔“

”ہم سمجھتے ہیں۔“ اس کی بہم بات پر اسد اللہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”کیا آپ نے میرے دلچسپ (مذہب) کے متعلق کبھی کچھ نہیں سوچا؟ آپ کا دل تو چاہتا ہوگا کہ آپ کی بیٹی آپ کے مذہب پر چلے۔“ اس نے اپنی بات واضح کی تو اسد اللہ ایک گہرا سانس لے کر حیرت سے بولے۔

بابت چند سوالات کیے اور پھر دو ایسے پابندی۔ لہا نے لی ہدایت کرتے ہوئے رابطہ منقطع کر دیا۔ وہ ڈاکٹر پرکاش سے بات کر کے فارغ ہوا تو پتا چلا کہ ستار بھائی واپس آ گیا ہے اور اسے ملاقات کے لیے بلارہا ہے۔ اسپتال سے یہاں پہنچنے کے بعد اس کی ستار بھائی سے ملاقات نہیں ہو سکی تھی۔ وہ اڈے پر موجود نہیں تھا اور رات بھر وہاں نہیں آیا تھا۔ اس کے آدمیوں کے مطابق یہ کوئی خاص بات نہیں تھی۔ ستار بھائی اپنی مصروفیات کی بنا پر یا کسی ذاتی وجہ سے بھی اڈے سے غائب ہو جاتا تھا اور کس کی مجال تھی کہ وہ اس کے غائب ہونے کی وجہ پوچھ پاتا اس لیے فاروق کو مشورہ دیا گیا کہ وہ آرام سے سو جائے، ستار بھائی واپس آنے کے بعد خود اس سے ملاقات کر لے گا۔ بے چینی کے باوجود فاروق کے پاس انتظار کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ صبح ناشتے کے بعد بھی ستار بھائی کی آمد کی کوئی اطلاع نہیں تھی۔ اسے خیال آیا کہ ڈاکٹر پرکاش سے ان کی خیریت معلوم کر لے چنانچہ انہیں فون کر کے فارغ ہی ہوا تھا کہ ستار بھائی کی واپسی کی اطلاع کے ساتھ ہی اپنے لیے بلاوا بھیج لیا۔

”جاؤ میرے شیر! تم نے تو دل خوش کر دیا۔“ وہ ستار بھائی کے ملاقاتی کمرے میں پہنچا تو اس نے کھڑے ہو کر خوش دلی سے اس کا استقبال کیا اور جوش میں اسے گلے بھی لگایا۔

”مجھے افسوس ہے ستار بھائی کہ خیر اور آپ کے دوسرے ساتھی اس مہم میں جان سے چلے گئے۔ وہ لوگ اتنی بہادری اور جان بازی سے کام نہ لیتے تو میں بھی اپنا کام انجام نہ دے پاتا۔ ان چند آدمیوں نے پولیس فورس کو بڑی کامیابی سے روک کر مجھے راہور سے حساب چکنا کرنے کا موقع فراہم کیا تھا۔“ اس نے حقیقی دکھ کے ساتھ ستار بھائی کے آدمیوں کے لیے اپنے افسوس کا اظہار کیا۔

”ہوتا ہے فاروق استاد! ہمارے دھندے میں جان جانا کوئی انوکھی بات نہیں ہے۔ تم اپنے دل پر کوئی بوجھ نہ لو۔ مجھے خوشی ہے کہ میرے آدمیوں نے میرا بھرم رکھا اور تمہیں کسی شکایت کا موقع نہیں دیا۔“ ستار بھائی نے اس کی چیمہ چھلتے ہوئے مسرت سے جواب دیا۔

”آپ کے آدمیوں کے ذریعے پولیس آپ تک پہنچنے میں کامیاب نہیں ہو سکی؟“ ستار بھائی کے اشارے پر نشست سنبھالنے ہوئے فاروق نے اس سے دریافت کیا۔

”تم نے ہی تو کہا تھا کہ جانے پہچانے آدمیوں کو تمہارے ساتھ نہ کروں۔ تمہارا یہ مشورہ کام آیا اور پولیس کو

مال نہ وہ اپنے عہدے سے فائدہ اٹھا کر مسلمانوں کے ہاتھ تفتی زیادتی کر رہا ہے۔ خود اس نے راہور کی بدعاشی کا تجربہ کیا ہوا ہے۔ اس نے ایک بڑی مسلمان خاندان کو اپنے گھر میں پناہ دی ہوئی تھی۔ برسوں کے ساتھ کی وجہ سے ہندو مسلم کا فرق اتنا نہیں رہا تھا اور دونوں خاندانوں میں بہت پریم تھا۔ راہور کو کسی طرح اس بات کا پتا چل گیا۔ رادھے اپنی ذیوی پر تھا جب اس نے اس کے گھر پر مادہ لباس میں پولیس والوں کو بھجوا کر زبردستی اس خاندان کو وہاں سے نکال کر انہیں قتل کر دیا۔ رادھے کے گھر پر اس وقت صرف اس کے بیوی بچے تھے جو کچھ نہیں کر سکے لیکن دہشت نے ان پر اتنا اثر ڈالا کہ رادھے کا چھوٹا بیٹا ابھی تک مددے کی کیفیت میں ہے اور راتوں کو ڈر کر نیند میں سے جھج کر اٹھ بیٹھا ہے۔ ایک طرف اپنے مظلوم بچوں کی ہلاکت، دوسری طرف بچے کی حالت نے رادھے کو بہت رنجیدہ کر رکھا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ یہ سب راہور نے کر دیا ہے لیکن اس کے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا۔ ہوتا بھی تو راہور کو جن لوگوں کا آشیر باد حاصل تھا، وہ اس کے خلاف کوئی کیس چلنے ہی نہیں دیتے اس لیے رادھے کو خاموش ہو کر بیٹھنا پڑا لیکن جب راہور مرنا تو بھری اسے اچھا لگا کہ ایک غلام اور بے ایمان آدمی سے پولیس ڈیپارٹمنٹ کو قتل کی گئی اور اسی لیے اس نے سمجھ لینے کے باوجود اپنے ساتھیوں پر تمہارے حوالے سے کسی شک کا اظہار نہیں کیا۔ اس نے پتا چلی سے کہا کہ اگر اس شخص نے آپ کے علاوہ کسی اور کے گھر میں پناہ لی ہوئی تو شاید میں اپنی ذیوی پوری کرتے ہوئے اسے اریٹ کر لیتا لیکن میں نے سوچا کہ آپ نے اسے پناہ دی ہے تو کوئی دارن ہوگا اور میں وہی کارن معلوم کرنے آیا ہوں۔ پتا چلی نے اسے تمہارے بارے میں ساری ذمیلی بتادی۔ وہ سب سن کر بولا کہ اچھا ہاں میں نے اس بندے کو اریٹ نہیں کیا۔ اسے جب یہ پتا چلا کہ تم وہاں سے نکل گئے ہو تو میری خوش ہوا اور پتا چلی کو جن دیا کہ کبھی اس بارے میں کسی کے سامنے زبان نہیں کھولے گا۔ یوں جناب فاروق صاحب تم ایک بار پھر اپنی لگڈنکی کی وجہ سے بچ نکلے۔“

ڈاکٹر پرکاش اسے ساری تفصیل سن کر آخر میں جکے پٹے انداز میں بولے تو فاروق جس دیا لیکن ہتے ہوئے بھی اسے احساس تھا کہ ڈاکٹر پرکاش بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں اور وہ واقعی اپنی خوش قسمتی کی وجہ سے ایک بار پھر بچ گیا ہے۔ گفتگو کے اختتام پر ڈاکٹر پرکاش نے اس کی طبیعت کی

وقت آنے پر اپنے باپ کے مذہب کا انتخاب کر سکوں۔“ جولیٹ نے انہیں اطمینان دلایا۔

”ہاں..... وہ ایسا ہی چاہتی ہوگی۔“ اسد اللہ کے سینے سے ایک سرد آہ نکلی۔ انہیں یاد تھا کہ جولیٹ بھی بھمار اسلام کی طرف اپنے جھکاؤ کا اظہار کیا کرتی تھی۔ اسے موقع ملتا تو شاید وہ اسلام قبول کر لیتی لیکن بعد میں جولیٹ کے ساتھ نے اسے اس بارے میں سوچنے نہیں دیا ہوگا اور بیٹی کی پرورش کرتے ہوئے اس نے شعوری طور پر اسے مسیحیت کی طرف زیادہ راغب کرنے کی کوشش نہیں کی ہوگی۔ وہ جولیٹ تھی..... ان پر مرنے والی جولیٹ جس نے ان سے اپنی محبت کو بساط بھر بھرا تھا اور اب ایک بار پھر انہیں قرض دار کر گئی تھی۔ ان کی بیٹی اتنی آسانی سے ان کا مذہب اپنانے کے لیے راضی ہو گئی تھی تو کیا یہ جولیٹ کا ان پر احسان نہیں تھا؟

☆☆☆

”آپ ٹھیک تو ہیں ڈاکٹر پرکاش! میں نے آپ کی اور آپ کی بیٹی کی خیریت معلوم کرنے کے لیے فون کیا تھا۔“ ستار بھائی کے شکانے پر بیٹھا فاروق ڈاکٹر پرکاش سے فون پر بات کر رہا تھا۔ ان سے جدا ہونے سے پہلے وہ ان کے گھر کا ٹیلیفون نمبر لے کر آیا تھا۔

”سب ٹھیک ہے بھائی! تم اتنے پریشان کیوں ہو؟“ ڈاکٹر پرکاش ہنسے۔

”مجھے خدشہ تھا کہ پولیس والے بعد میں آپ لوگوں کو تنگ کریں گے اس لیے آپ کی طرف سے پریشان تھا۔“ اس نے وجہ بتائی۔

”تمہارا خدشہ غلط نہیں تھا۔ پتا چلی کا وہ اسٹوڈنٹ پولیس والا دوبارہ گھر پر آیا تھا۔“

”بھرم.....؟“ ڈاکٹر پرکاش کی دی اطلاع سن کر فاروق مضطرب ہوا۔

”اس نے پتا چلی کو بتایا کہ اسے تم پر شک ہو گیا تھا کہ تم ہی اس کے مفروضہ مجرم ہو لیکن وہ جان بوجھ کر انجان بن گیا۔“

”وہ کیوں؟“ فاروق کو حیرت ہوئی۔

”ایک تو پتا چلی کا اسٹوڈنٹ ہونے کی وجہ سے دوسرے راہور ہے اپنی ذاتی نفرت کی وجہ سے..... رادھے نام سے اس شخص کا۔ پتا چلی کو بہت زیادہ آئیڈیل لالہ کرتا ہے اس لیے خود بھی بڑا آئسٹ بندہ ہے اور اپنی جانب بڑی ایمانداری سے کرتا ہے۔ اسے راہور کے کردار کا پتا

”ہم اپنی کسی بھی خواہش کو زندگی کے کسی بھی معاملے میں آپ پر جبراً نافذ نہیں کرنا چاہتے۔ ہمیں اعتراف ہے کہ اور بہت سی خواہشوں کی طرح ہمارے دل میں یہ خواہش بھی موجود ہے لیکن ہم آپ پر کوئی زبردستی نہیں کرنا چاہتے۔ ہماری خواہشات اپنی جگہ لیکن مذہب سمیت ہر طرح کے انتخاب کے لیے ہماری طرف سے آپ کو مکمل آزادی حاصل ہوگی۔“

”تھیک ہو سوچ پاپا۔ آپ کی اسی وسیع انگری نے آپ کی ذات کو میرے لیے آئیڈیل بنادیا ہے اور میں اپنے آئیڈیل پاپا کو اپنی ذات سے فوری طور پر ایک خوشی دینا چاہتی ہوں۔“ جولیٹ کی آواز میں ہلکی سی ٹھنک آگئی۔

”کسی خوشی؟“ بہت متین و سنجیدہ ہونے کے باوجود اسد اللہ کی بے چینی زبان پر آگئی۔

”میں اسلام قبول کرنا چاہتی ہوں پاپا! میں مسلمان ہونا چاہتی ہوں۔“ جولیٹ نے واقعی انہیں مطمئن خوشی سے نوازا۔

”کیا واقعی؟“ اسد اللہ اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکے اور اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے۔

”جی پاپا! میں حویلی میں آؤ کے بعد سے اسلام کا مطالعہ کر رہی ہوں۔ مجھے اسلام اچھا لگا ہے اور خصوصاً چاند بانو سے ملنے کے بعد تو میں بہت زیادہ متاثر ہوئی ہوں۔ اتنے دسکوں اور تکالیف کے باوجود اتنی کم عمری میں وہ صرف اس لیے اتنی کمزور ہے کہ وہ مسلمان ہے اور اس نے اپنے مذہب میں اپنے لیے سکون کی راہ ڈھونڈ لی ہے۔ میں بھی اپنے لیے سکون چاہتی ہوں اور یقیناً جانے اس فیصلے نے مجھے بہت سکون عطا کیا ہے۔“ جولیٹ نے انہیں یقین دلایا۔

”ہم آپ کے اس فیصلے سے بہت خوش ہیں بیٹی لیکن اتنا مشورہ ضرور دے کہ اگر جذباتی ہو کر کوئی فیصلہ نہ کریں۔ مذہب کی تبدیلی کوئی معمولی فیصلہ نہیں ہے۔“ اسد اللہ نے اپنی جذباتی کیفیت پر قابو پالیا تھا اور اب رساں سے اسے سمجھا رہے تھے۔

”یہ جذباتی فیصلہ نہیں ہے پاپا! اگر مجھے جذبات میں آ کر فیصلہ کرنا ہوتا تو اتنا نام نہیں لیتا۔ میں نے اسلام کے مطالعے کے بعد ہی یہ فیصلہ کیا ہے۔ ویسے بھی میرے لیے تبدیلی مذہب اس لیے اتنا مشکل فیصلہ نہیں ہے کہ میں کبھی بھی عیسائیت پر بہت زیادہ کاربند نہیں رہی ہوں۔ ماں نے میری تربیت کرتے ہوئے کبھی مذہب پر زیادہ زور نہیں دیا اور شاید ایسا اس لیے تھا کہ وہ خود بھی چاہتی تھیں کہ میں

کوئی کلیہ نہیں ملا۔ تھوڑا اپنے کو بھی دل چتر کر پڑا اور بالکل انجان بن کر بیٹھ گئے۔ پولیس خود ہی ان کے وارنٹوں کو تلاش کر کے لائیں ان کے حوالے کر دے کی۔ پوچھ بچھ بھی شاید ہو لیکن میرا نام تو کوئی نہیں لے گا۔“ ستار بھائی پوری طرح مطمئن تھا لیکن فاروق کو عجیب لگا کہ اپنے حکم پر جان قربان کر دینے والے اپنے آدمیوں کے لیے ستار بھائی کا یہ انداز ہے۔ اس نے محض الفاظ میں اکتھا رہی کر دیا۔ جواب میں ستار بھائی بولا۔

”دیکھ فاروق استاد! مجھے معلوم ہے کہ ربن دادا اپنے ایک ایک آدمی پر کیسے جان چڑھتا تھا اور ہر ایک کے لیے کتنا جذبہ بانی تھا لیکن میں ذرا مختلف حراج کا آدمی ہوں اور اپنے جذبات پر قابو رکھ کر کام کرنے کا طریقہ جانتا ہوں، اسی لیے ربن سے کم صلاحیتیں رکھنے کے باوجود اس سے زیادہ کامیاب ہوں اور میری پہنچ بہت دور تک ہے۔ جو لوگ مر گئے وہ مر گئے، اب انہیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑنے والا کہ میں ان سے اپنے تعلق کو تسلیم کروں یا نہ کروں۔ اب اصل اہمیت اس بات کی ہے کہ میں تمہیں اپنے آدمیوں کو اور خود کو بچاؤں سونے کا کام کر رہا ہوں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں کوئی بہت خود غرض آدمی ہوں اور مجھے اپنے لیے جان دینے والوں کی کوئی قدر ہی نہیں ہے۔ اگر میں ایسا کرنے والا ہوتا تو میرے حکم پر جان کی بازی کون لگتا۔ میرے آدمی مجھے جانتے ہیں کہ میں ان کی قدر کس انداز میں کرتا ہوں۔ اب خیر اور اس کے ساتھیوں کے درمیان کی ذمہ داری میری ہوگی۔ جانے والی جان کو لوٹانا میرے بس میں نہیں ہے لیکن اس کے علاوہ ان کے خاندانوں کا بالکل اسی طرح خیال رکھا جائے گا جیسا وہ خود اپنی زندگی میں رکھتے تھے۔ ان کے بوی بچوں کو کبھی کوئی تنگی نہیں ہوگی اور اس وقت تک ان کی کفالت کی جائے گی جب تک ان کے بچے اپنے بیروں پر کھڑے نہیں ہو جاتے۔ میرے اڈے کے اس دستور سے یہاں کا ہر آدمی واقف ہے اسی لیے یہ سب بے وجہ ہو کر میرے لیے کام کرتے ہیں۔“ ستار بھائی نے تنبیہ کی سے فاروق کے اعتراض کا جواب دیا تو اسے قائل ہونا پڑا کہ چاہے ستار بھائی کے پاس ربن جیسی اخلاقی اقدار نہیں ہیں لیکن وہ زیادہ عملی آدمی ہے اور دنیا میں اسی طرح کے لوگ کامیاب رہتے ہیں۔

”تم ان ساری باتوں کو جانے دو اور یہ بتاؤ کہ خود اپنے لیے اب کیا چاہتے ہو؟ ہمیں کی زمین پہلے ہی تمہارے لیے ٹھک ہو چکی تھی، یہی حال دہلی کا بھی ہے اور شاید

ہندوستان کے کسی اور شہر میں بھی تم سکون سے نہ رہ سکو اس لیے اگر تم چاہو تو تمہاری ساسی لڑکی کی طرح میں تمہارے بھی یہاں سے نکلنے کا انتظام کر سکتا ہوں۔“ اسے خاموش پا کر ستار بھائی نے خود ہی موضوع بدل دیا اور اسے حقائق کی روشنی میں ایک اچھی پیشکش کی۔ فاروق خود بھی جانتا تھا کہ اب اسے ہندوستان چھوڑنا پڑے گا۔ اسے یہ بھی علم تھا کہ ولددار آغا بکراچی میں ہوتا ہے اور اسے اس شخص کو اس کے انجام تک پہنچانے کے لیے کراچی تک کا سفر کرنا ہی ہوگا لیکن ساتھ ہی اسے یہ بھی معلوم تھا کہ ایک بار وہ ہندوستان سے نکل گیا تو وہ بارہ شاید یہاں آتا نصیب ہو اس لیے وہ ہندوستان چھوڑنے سے پہلے ایک بار حیدر آباد کا چکر لگالینا چاہتا تھا۔

حیدر آباد جانے کی خواہش کے پیچھے ایک وجہ تو وہاں جولیت کی موجودگی تھی۔ وہ ایک آخری بار اس کا دیدار کر لینا چاہتا تھا۔ دوسرے خونی رشتوں کی کشش بھی اسے پکارتی تھی۔ اس کے علم میں جب سے وجے کے ذریعے یہ بات آئی تھی کہ اسد اللہ خود اسے تلاش کرتے ہوئے بھی پہنچے تھے، تب سے دل میں ان لوگوں سے ملاقات کی تڑپ سی پیدا ہو گئی تھی لیکن ربن کے قتل کے عظیم مدد سے گزرتے ہوئے وہ اپنے دل کی اس خواہش کو بھی نظر انداز کر گیا تھا اور اب جبکہ ربن کے قاتل اپنے اپنے انجام کو پہنچ چکے تھے تو دل کی اس خواہش نے ایک بار پھر سر اٹھالیا تھا۔ بہت طویل عرصہ گزر گیا تھا اسے حوصلی چھوڑے ہوئے۔ اس مدت میں اس نے زندگی کے بہت سے نشیب و فراز دیکھے تھے۔ وہ جو شیش محل جیسی حویلی کا بانی تھا، یہی کنگ و تارک گھوڑوں میں اپنی زندگی کے شب و روز گزارتا رہا تھا۔ نواب زادہ محب اللہ سے فاروق استاد تک کے سفر نے اس کی زندگی کو یکسر بدل دیا تھا۔

اگرچہ ربن نے اسے بہت ناز و نعم سے رکھا تھا اور حتی الامکان اسے اڈے کے عملی معاملات سے الگ رکھتا تھا لیکن کوسٹلے کان میں رہ کر آدمی کو کالک تو لگتی ہی ہے۔ وہ بھی فاروق استاد کہلانے لگا تھا۔ سب کا چہرہ اور لاڈلا فاروق استاد جیسے وہ لوگ بالکل شہزادوں کی طرح رکھتے تھے لیکن پھر بھی وہ حویلی کی سی شان بان اور جاہ خیمہ کہاں سے آتا۔ وہاں تو جینٹلمن ابرو پر خواہشات پوری ہوتی تھیں اور خدام کی فوج خدمت کے لیے حاضر رہتی تھی۔ سب سے بڑھ کر ایک الگ طرح کا طرز زندگی تھا۔ بات چیت، نشست و برخاست، لباس و پوشاک سے لے کر کھانے پینے

شیش محل

میں ایک خاص قسم کی انفرادیت تھی جو باہر کی دنیا کے آدمیوں کو خرد زدہ کر دیتی تھی۔ اس خاص ماحول سے نکل کر یہی نہیں ایک اڈے پر خود کو ایذا جھٹ کرنے میں اس کا اندرون کتنے مراحل سے گزرا تھا، یہ تو وہ خود ہی جانتا تھا۔ اگر اس کے ساتھ ربن سمیت دیگر افراد کا بے تحاشا غلطی نہ ہوتا تو جانے وہ ان مراحل سے کیسے گزرتا۔ ان لوگوں کی باتوں نے اس کی مشکل کو آسان بنانے میں بہت مدد کی تھی۔ وہ آج بھی ان بھتیوں کا قائل اور قرض دار تھا لیکن بات سے تو کوئی ذی نفس خود کو آزاد نہیں کر پاتا۔ خونی رشتوں کی کشش اور محبت ایک ایسی اہل حقیقت ہے جس سے انکار ممکن ہی نہیں ہے۔ ضد، انا، اصول پسندی انسان کے وجود کو کتنا ہی بگاڑیں، دل انہوں کی محبت سے آزا نہیں ہو پاتا۔ اس نے بھی زندگی کے اتنے برس ان بچھڑ جانے والوں کی محبت دل میں محسوس کی تھی اور اب جبکہ وہ زندگی کے ایک نازک دور سے گزر رہا تھا تو وہ ساری قیمتی شدت سے اس پر حملہ آور ہو گئی تھیں۔ اسے خیال آیا تھا کہ جانے کس گلی میں زندگی کی شام ہو جائے تو بس وہ اس شام سے پہلے ایک بار انہوں سے مل لینا چاہتا تھا۔ ان انہوں سے جن کے درمیان کہیں جولیت بھی موجود تھی۔ اس کی زندگی کا وہ جز جسے وہ کسی صورت خود سے الگ نہیں کر سکتا تھا لیکن جسے اپنا بنانے پر بھی اسے کوئی اختیار نہیں تھا۔ تو ستار بھائی کے ہندوستان سے نکل جانے کے مشورے پر وہ ان سے حیدر آباد جانے کی فرمائش کرنے سے خود روک نہیں سکا۔

”حیدر آباد.....“ ستار بھائی اس کی فرمائش سن کر حیرت زدہ رہ گیا۔

”ہاں۔ وہاں میرا گھر ہے۔ ہندوستان چھوڑنے سے پہلے میں ایک بار اپنے گھر والوں سے مل لینا چاہتا ہوں۔“ اس نے ستار بھائی کو کج بتا دیا۔ اس بار وہ کچھ نہیں لہر سکا۔ خود بھی آدمی تھا اور آدمی کی فطرت کو سمجھتا تھا کہ اب زندگی میں اتنی بڑی تبدیلی پیش آنے جا رہی ہو تو وہ اس طرح کے روٹل کا مظاہرہ کرتا ہے۔ فاروق بھی زندگی نے اس موڑ پر چڑھائی ہو رہا تھا تو یہ کچھ ایسا غلط نہیں تھا۔ وہ اپنے لیے ہندوستان چھوڑنے والا تھا اور اس سے پہلے اپنے گھر والوں سے ملنا چاہتا تھا تو یہ عین انسان کی فطرت ہے۔ طاہرین تھا۔

☆☆☆

جولیت کی زندگی میں وہ ایک بالکل نیا اور مختلف دن مارنے اٹھنے کے بعد وہ اپنے کمرے سے باہر آئی تو سب سے پہلے چاند بالونے اسے بہت محبت اور جوش سے گھیرا گیا۔

”کیا بات ہے بھئی! کیا آج عید کا دن ہے؟“

جولیت نے اس کی گرم جوشی پر تعجب سے پوچھا۔

”عید کا دن ہی مجھے۔ جس دن کا آغاز اتنی بڑی خوش خبری سے ہو رہا ہے، اسے کسی طور عید کے دن سے کم نہیں سمجھا جاسکتا۔“ چاند بالونے کو ہنسنے پر سکرا رہی تھی۔

”کیا تمہارے صاحب بہادر کی کوئی خبر ملی ہے؟“

جولیت نے اسے چھیڑا۔

”وہ بھی انشاء اللہ مل جائے گی۔ ابھی تو ہمیں آپ کے والد صاحب نے ایک خوش خبری سنائی ہے اور ہم اسے سن کر بہت سرور ہیں۔“ چاند بالونے اسے جواب دیا تو وہ سمجھ گئی کہ اسد اللہ نے چاند بالونے کو اس کے قبول اسلام کے فیصلے سے آگاہ کر دیا ہے۔

”شکر یہ چاند بالونو! تم دعا کرنا کہ میرے اس فیصلے کے اچھے نتائج مرتب ہوں۔“

”انشاء اللہ تعالیٰ ایسا ہی ہوگا۔ فیصلہ اتنا اچھا ہے تو اس کے نتائج کیسے اچھے نہیں نکلیں گے۔“ چاند بالونے اسے تسلی دی اور ہاتھ تھام کر کھانے کے کمرے کی طرف لے جاتے ہوئے بولی۔ ”طہیں، چل کر ناشا کریں۔ بڑے اور چھوٹے نواب صاحب وہاں آپ کے منتظر ہیں۔“

جولیت اس کے ہمراہ کھانے کے کمرے میں پہنچی تو دروازے سے ہی اشتہار انگیز خوشبود کی ٹپس آ رہی تھیں۔ اسے دیکھتے ہی معنی اللہ اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے۔ جولیت نے احتراماً ان کے قریب جاکر انہیں سر جھکا کر آداب کہا تو وہ اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے بے تحاشا دعا عین دینے لگے۔ اپنے لیے اتنی دعا عین سن کر جولیت کی آنکھیں جھپک گئیں۔ ”روئے نہیں بنی۔ آج اتنے دنوں بعد تو تم کے بادل چھپے ہیں اور ہم نے کسی خوشی کو محسوس کیا ہے۔ آج ہم آنسوؤں کو اس کوٹھی میں داخلے کی اجازت نہیں دیں گے۔ آج یہاں صرف خوشیاں ہی خوشیاں ہوں گی۔“ معنی اللہ نے اسے ٹوکا تو اس نے فوراً اپنی آنکھوں کو صاف کر ڈالا۔ واقعی آج پہلی بار وہ معنی اللہ کے چہرے پر خوشی کے رنگ دیکھ رہی تھی در نہ وہ تو تم کی چادر اڈھلے گویا بس اپنی زندگی کے دن پورے کر رہے تھے۔

محب اللہ کے لٹ جانے کی ہلکی سی آس نہ ہوتی تو شاید وہ زندہ ہی نہ رہتے۔

”آج جانیے بھئی۔ ناشا آپ لوگوں کا خنجر ہے۔ آج ہماری بیٹی چاند بالونے بہت خصوصی انتظام کیا ہے۔ انہیں

ان کی محنت پر داد دینے کے لیے زیادہ افتخار کروانا مناسب نہیں ہے۔" اسد اللہ کی آواز میں بھی آج کھنک سی تھی۔ ہر ایک کو اتنا خوش پا کر خود جوئیٹ کے دل کے تاروں نے بھی خوشی کا راگ چھیڑ دیا اور وہ اپنے فیصلے پر خود کو پہلے سے زیادہ مطمئن محسوس کرنے لگی۔ ناشتا بہت خوش گووار ماحول میں کیا گیا۔ چاند بانو کو اس کی محنت پر خوب دل کھول کر داد دی گئی۔ وہ بیٹھنی بیٹھنی سی سب کی تعریفیں وصول کرتی رہی۔ ناشتے کے بعد اسد اللہ، جوئیٹ سے مخاطب ہوئے اور بولے۔

"آج کے دن آپ گھر پر ہی تشریف رکھیں۔ حسن اتفاق سے آج جسے کامبارک دن ہے اور ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ جامع مسجد کے خطیب صاحب کے ہاتھ پر آپ کو شرف بہ اسلام کروانے کا اہتمام کر دیا جائے گا۔"

"جیسی آپ کی مرضی۔" جوئیٹ نے ان کی خواہش کے سامنے سر جھکا دیا۔ ناشتے کے بعد اسد اللہ گھر سے روانہ ہو گئے۔ جوئیٹ نے کچھ وقت ندرت جہاں کے کمرے میں گزارا اور انہیں بھی اپنے فیصلے سے آگاہ کیا تو ان کی آنکھیں بھی خوشی سے جھلکنا لگیں۔ جوئیٹ نے باقی وقت چاند بانو کے ساتھ گزارا۔ آج اسے احساس ہو رہا تھا کہ چاند بانو کو اپنے گھر لانے کا فیصلہ خود اس کے اپنے حق میں بہت اچھا تھا۔ چاند بانو نے اس کی تنہائی کو بانٹ لیا تھا اور عمر میں کم ہونے کے باوجود اس کے ساتھ کسی بڑی بہن کی سی محبت اور خلوص کے ساتھ پیش آتی تھی۔ اسی کے مشورے پر جوئیٹ نے نماز جمعہ کا وقت ہونے سے پہلے نہا کر نیا جوڑا پہنا اور اسد اللہ کا افتخار کرنے لگی۔ اسد اللہ گھر آئے تو انہوں نے بھی نماز جمعہ کے لیے بالا اہتمام تیاری کی اور بتایا کہ خطیب صاحب سے ان کی بات ہو گئی ہے۔ وہ قبل از جماعت جوئیٹ کو شرف بہ اسلام کرنے کے خواہش مند ہیں کیونکہ مسجد میں خواتین کے لیے بھی پردے میں باجماعت نماز کا اہتمام ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ جوئیٹ مسلمان ہو کر نماز باجماعت میں شرکت کرے۔

جوئیٹ کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا، وہ تو تیار ہی تھی۔ اسد اللہ نے ثروت بیگ کے گھر میں بھی اطلاع کر دی تھی چنانچہ جب وہ لوگ جامع مسجد کی طرف روانہ ہوئے تو ایک گاڑی میں نواب ثروت بیگ کے علاوہ ان کے اہل خانہ بھی موجود تھے۔ جامع مسجد پہنچنے پر خطیب صاحب نے پردے کے پیچھے سے پہلے تو جوئیٹ سے اس بات کی تصدیق کی کہ وہ بہ رضا و رغبت بغیر کسی جبر کے دائرۃ اسلام میں داخل

ہونے کی خواہش مند ہے پھر اسے اسلام کی چند بنیادی تعلیمات سے آگاہ کیا اور پھر کلہ پڑھایا۔ اس پرے محل سے فارغ ہونے تک نماز کا وقت خاصا قریب آ چکا تھا۔ وہاں موجود خواتین نے جوئیٹ کو گلے لگا کر مبارک بادوں اور پھر سب خلیفہ جمعہ بننے کے لیے خاموشی اور احترام کے ساتھ بیٹھ گئیں۔ جوئیٹ جسے اسد اللہ کی خواہش پر جملہ نام دیا گیا تھا، چاند بانو کے ساتھ ایک طرف بیٹھی ہوئی تھی۔ کچھ خواتین نے اس کے گلے میں پھولوں کے ہار بھی ڈالے تھے جو اس نے اپنے..... گلے سے اتار کر دایمیں جانب احتیاط سے رکھ دیے تھے۔ پھولوں کی خوشبو، ماحول کی پاکیزگی اور خطیب صاحب کے پڑا اثر الفاظ نے دل کو عجیب ہی سا باندھ رکھا تھا۔ جوئیٹ جواب جملہ تھی، ایسا محسوس کر رہی تھی کہ آسمان سے نور کی برسات ہو رہی ہے اور وہ سر تا پا اس برسات میں بھیقتی جا رہی ہے۔ اس نے پورے حضور قلب کے ساتھ نماز میں شرکت کی۔ نماز کے بعد اس کے قبول اسلام کا اعلان کیا گیا اور مٹھائی تقسیم کی جانے لگی۔ وہ بہت بڑی مسجد تھی اور جسے کی نماز میں خصوصاً بہت زیادہ نمازی ہوتے تھے۔ اس لیے مٹھائی کی بہت بڑی مقدار کا انتظام کیا گیا تھا۔ بے تحاشا خوش اسد اللہ، یعنی اللہ کے ہمراہ کھلے ہوئے چہرے کے ساتھ لوگوں کی مبارک بادیں قبول کر رہے تھے۔ یہاں سے فارغ ہو کر وہ لوگ گھر پہنچے تو معلوم ہوا یہاں بھی خصوصی اہتمام ہے۔ صدقے گئے بکرے منگوائے گئے تھے اور آس پڑوس والوں کی دعوت کے علاوہ غریبوں کے لیے لنگر کا بھی انتظام تھا۔ وہ ان بے تحاشا خوشیوں کو دیکھ رہی تھی اور اسے لگ رہا تھا کہ آسمانوں سے اس کے فیصلے کی تائید ہو رہی ہے۔ آج بہت عرصے بعد اس کی زندگی میں وہ دن آیا تھا جب اس کے دل میں نفرت و انتقام کی کوئی لہر نہیں جاگتی تھی اور وہ صرف اپنے دل میں اترے سکون کو محسوس کر رہی تھی۔

☆☆☆

یہ وہ کہاں آ گیا تھا؟ یہ بھلا کونسی جگہ تھی؟ وہ جس حویلی کو چھوڑ کر گیا تھا، وہ تو کسی شیش محل کے مانند تھی جہاں خدمت گاروں کی فوج ظفر موج موجزن رہتی تھی اور اب وہاں بس ایک اجڑا ہوا ویرانہ ہی باقی رہ گیا تھا۔ فن تعمیر کا شاہکار کہلانے والی حویلی کے چلے ہوئے در و دیوار دیکھ کر دل کو ایک وحشت سی محسوس ہو رہی تھی۔ یہ حالت دیکھ کر اس کا دل چاہا کہ خوب بلند آواز میں سب کو آوازیں دے اور پوچھے کہ اسے شیش محل کے رہنے والو..... تم کہاں ہو۔ دیکھو!

دلوں بازو دک گئے اور ٹانگوں میں ایسے زخم آئے کہ ناسور بن گئے۔ ناکارہ آدی کو کون سا تھوڑا سا دوا دیا جائے گی اس کے ساتھ اسے خاک میں ملنے کو۔ جیڑوں کے زخموں میں کیڑے پڑ گئے ہیں۔ خود کو ہلا جلا بھی نہیں پاتا۔ نواسر میں ڈالنے کے لیے ہاتھ سلامت نہیں ہیں۔ کوئی رحم کھا کر کھانے کو کچھ ڈال دے تو جانوروں کی طرح منہ مار کر اس کھانے سے پیٹ کی آگ بجھاتا ہے۔ زخموں سے ایسی بدبو آتی ہے کہ کسی کے اندر اس کے پاس بیٹھ کر اسے کھانا کھلانے کی ہمت نہیں ہے، دوسرے اہل حیدر آباد کو اس کے کردار کی وجہ سے اس سے شدید نفرت بھی ہو گئی ہے اس لیے سوائے کھانا ڈال دینے کے کوئی اس کے ساتھ کسی قسم کی ہمدردی بھی نہیں کرتا۔" جس نے اسے آگاہ کیا تو وہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ جسے قدرت نے اتنی بڑی سزا دے دی ہو، وہ اس کے ساتھ مزید کیا انتقام لے سکتا تھا۔ حیدر آباد میں مزید رکنا بھی بے سود تھا۔ اس نے اسد اللہ کا پاکستان کا پتا حاصل کیا اور ستر بجائی کو اپنی واپسی کی اطلاع دے کر وہاں سے روانہ ہو گیا۔

دہلی کے حالات اب کافی بہتر ہو گئے تھے اور شہر میں کرفیو ختم ہو گیا تھا۔ پہلے کی طرح قدم قدم پر پولیس والوں سے سامنا ہونے کا اندیشہ نہ ہونے کے باوجود وہ بہت احتیاط کے ساتھ سڑا بھائی کے ٹھکانے پر پہنچا تو وہاں ایک حیرت اس کی خاطر تھی۔ رام اور وہ اسے ملنے آئے ہوئے تھے۔ وہ اس کے اپنے تھے، دل پر غم کا بہت سا جوہ لیے وہ ان سے ملتا تو بہت سے آنسو ان کے شانوں پر بہا ڈالے اور اپنے غم کا جوہ ان کے ساتھ بانٹنے ہوئے پہلی بار انہیں اپنے بارے میں سب کچھ بتا ڈالا۔ وہ سنتے رہے۔ ان کے لیے یہ کوئی اتنے عجیب کی بات نہیں تھی کہ وہ جسے ہمیشہ شہزادہ کہتے رہے اور شہزادوں کی طرح اس کے لاڈ اٹھاتے رہے، وہ کچھ عجیب ایک بڑے آن بان والے خاندان سے تعلق رکھنے والا نواب زادہ نکلا تھا۔ رہن کے غم کے بعد ایک اور عظیم غم سے گزرتے فاروق انہوں نے بہت سلیقے اور محبت سے سمیٹا اور صلاح دی کہ اسے اپنے خاندان والوں کے پاس پاکستان چلا جانا چاہیے۔ رام بولا۔

”دیکھ شہزادے! تو ابہن کی دنیا کا آدمی تھا ہی نہیں۔
تو تیش محل کا باسی تھا جو حالات کے ہاتھوں جنگ کرہارے
درمیان پہنچ گیا تھا۔ بجوان کی کرتی تھی کہ اس نے تیرے
من میں ہمارے لیے اور ہمارے من میں تیرے لیے پریم
ڈالا۔ ہم نے ایک دوسرے کے ساتھ ایک لہا سے۔۔۔

مذہبِ بابر بھڑک اٹھے تھے اور اس نے چلتا تھا کہ اپنے
مذہب کی بر بادی کے ذمے داروں کو بھی ایسی ہی کسی آگ
میں اسیل دے جیسی آگ نے ہستی ہستی حویلی کو اجاڑ دیا
اپنے خون کے رشتوں کے پھرنے کے ساتھ ساتھ
جو لٹ کی طرف سے بھی توشیح تھی۔ اس کے بھین
مطابق تو جو لٹ حویلی ہی آئی تھی۔ اسد اللہ کی بھئی آمد
لیٹ ہی کے مکان میں قیام اس کی یہاں آمد کا بین
ت تھا لیکن وہ جس سے جو لٹ کے متعلق کیا اور کیسے
پہنچا۔ اسے تو اعزاز ہی نہیں تھا کہ جو لٹ کس حیثیت سے
دلی میں موجود رہی ہوگی۔ وہ جس کے ساتھ قبرستان کیا اور
کی حیثیت سے گزر ارحس کیفیت سے اسد اللہ گزرے تھے۔
اپنے پیادوں کی قبروں پر فوجہ کناں دل کے ساتھ حاضری
لیے ان ہی قبروں کے درمیان اس ایک کے ہونے اور نہ
نے کی تلاش سے گزرا آسمان نہیں تھا جو دل سے بہت
نہجی اور جس کی حیثیت کی طور خوبی رشتوں سے کم نہیں
تھی۔ اس، بھائی اور بہن کی قبروں پر دعائے مغفرت کرتے
تھے تو قدرتی طور پر اس کی حالت بہت اتر ہوگئی۔ وفادار
مازم جس کا دم غیبت تھا کہ وہ کسی نہ کسی طرح اسے
بہار اوے ہوئے تھا۔

”مجھے اس رکھو کا اتنا چاہتا ہوں جس پایا جس نے ہمارے خاندان کو اجاڑنے میں ملکی کردار ادا کیا ہے۔ میں اس سے جا کر پوچھوں گا کہ اپنے ساتھ ہوئی زیادتی کا بدلہ میرے بے قصور خاندان سے لے کر اتنا بڑا ظلم کیوں کیا؟“ قبرستان سے واپس آتے ہوئے فاروق نے ٹکس سے کہا۔ ٹکس نے رکھو نامی اس شخص کے بارے میں سب کچھ بتادیا تھا جو سبھی نواب سلیم اللہ کے دوست کے بیٹے کے ہاتھوں پر باد ہوا تھا اور انتقامی جذبات نے اسے بلوائیوں کے ساتھ ملتا جڑتا ہوئے پر مجبور کر دیا تھا۔ رکھو کی وجہ سے ہی پہلے نواب سلیم اللہ اپنے دوست کے خاندان کے ساتھ شدید زخمی ہونے کے بعد موت سے دوچار ہوئے تھے اور پھر رکھو ہی نے لالچی بلوائیوں کے ساتھ مل کر حویلی پر حملہ کیا تھا۔

”کیا کریں گے یہاں آپ اس کا انا ہا مطوم کر کے..... وہ عالم تو خود قدرت کے انتقام کا شکار ہو گیا اور آج نشانِ عبرت بن کر باہلِ بنسے کی طرح حیدر آباد کی گلیوں میں لوٹتا رہتا ہے۔“ جس نے اسے جواب دیا۔

”کیوں؟ کیا ہوا ہے؟“ فاروق چونکا۔
 ”اللہ کی لاشی نے کام دکھایا ہے۔ سنا ہے کسی بلوے
 میں حصہ لینے کو کیا تھا، وہیں اچ بری طرح زخمی ہو گیا۔

سے اتنے دل برداشتہ ہوئے کہ اپنی پھٹی جیکم سے پاکستان ہجرت فرما گئے۔ میں بھی ان کے ساتھ اچ جا۔ ٹی خند کرتا لیکن یہاں مالکوں کی قبریں بھی تھیں۔ میں راکھ گیا کہ ان قبروں کی دیکھ بھال کر کے اچ اتنے برسوں۔ کھانا حویلی کا تنگ حلال کرتا رہوں گا۔“ بلوے کی پور داستان سنانے کے بعد اس نے فاروق کو موجودہ صور حال سے آگاہ کیا۔ فاروق کی آنکھوں کے آگے تو زمین آسمان کھوم گئے۔ وہ اپنے جس خاندان سے ملنے کے آقا تھا وہ خاندان ہی باقی نہیں رہا تھا..... یہ خبر کی قیامت سے کم تو نہیں تھی۔

”آپ اپنا بتائے نہیں مہاں کہ آپ کون ہیں؟“
اس کی غیر ہونی حالت دیکھ کر بوڑھے ملازم نے ایک بار بار
اس کی شکل غور سے دیکھی اور ہرودی سے پوچھنے لگا۔ فاروڈ
کے شتاساے نقوش اس کے دل کو بھی بے چین کر رہے تھے
اور وہ اس کے چہرے میں حویلے والوں ہی کی سی جھلک دار
طور پر محسوس کر رہا تھا۔

”میں محب اللہ ہوں جس بابا! آپ کو یاد ہوگا کہ آپ بچپن میں مجھے اپنے کانڈھوں پر اٹھا کر گھومتے تھے۔ فاروق کی آواز بھیگ گئی اور اس نے حویلی کے پرانے ملازم کو شناخت کر کے اس کے نام سے پکارا۔

”محب اللہ..... آپ نواب زادہ محب اللہ ہیں؟“
فریادِ مسرت سے یوڑھے شمس کی آواز کانپ گئی۔

فاروق نے ایک بار پھر تصدیق کی۔ اس تصدیق کے بعد شمس کی حالت ویدنی تھی۔ وہ کلاہٹ میں اسے سجائی نہیں دیتا تھا کہ فاروق کو پکچوں پر بٹائے کہ تعصیلوں پر سمیٹ لے۔ وہ بہت اصرار اور محبت سے اسے اپنے ساتھ اپنے گھر لے کر گیا۔ اس کی خاطر تو نسیج کی کوشش کی اور اسے اس کے اصرار پر ایک ایک بات تفصیل سے بتاتا رہا۔ غم کے بوجھ سے نڈھال فاروق کے لیے کچھ کھانا چنا تو ممکن نہیں تھا لیکن

دوبارہ ایک بین سے سارے حالات کا موصوفہ لکھا رہا جس نے اسے ان لوگوں کے متعلق بتایا جن سے اسد اللہ نے اب بھی کسی نہ کسی طرح رابطہ رکھا ہوا تھا اور جن کے ذریعے شخص کو ان کے حالات کی خبر ملتی رہتی تھی۔ فاروق نے سنا لیکن پہلے شہداء کی قبروں پر حاضری کی خواہش ظاہر کی۔ اتنے بڑے صدمے سے گزرتا ہوا وہ ایک بار پھر اپنے اندر شعلے سے بھڑکے محسوس کر رہا تھا۔ وہی شعلے جو رہن کے قاتلوں کو ان کے انجام سے بہکنا نہ کرنے کے بعد بجھ گئے

جہاں سے پیش کش کا ایک شہزادہ لوٹ کر تم لوگوں سے ملے
کے لیے آیا ہے لیکن حویلی کی ویرانی نے اسے یہ بھی نہیں
کرنے دیا کہ اسے احساس ہو گیا تھا کہ اس ویرانے میں
آواز دے کر کبھی اسے اپنی آواز کی بازگشت کے سوا کچھ
سننے کو نہیں ملے گا۔ ملکی حالات اس کے بھی علم میں تھے، سو کسی
بہت بڑی گزربڑ کے احساس نے اسے نڈھال سا کر دیا اور
وہ وہیں سہم سہم کر بیٹھ گیا۔ بیٹھے بیٹھے جانے تنہی دیر گزری تھی
کہ کسی نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اسے پکارا۔ اس
نے سر اٹھا کر پکارنے والے کی طرف دیکھا۔

”کون ہیں یہاں آپ اور ایسے احرار کاے کو بیٹھے ہیں؟“ عمر رسیدہ شخص نے اس کو توجہ پا کر اس سے سوال کیا۔
”میں یہاں اس حویلی میں آیا تھا۔ یہ..... یہ تو اب سلیم اللہ کی حویلی ہے نا؟“ وہ جیسے خودی تذبذب میں پڑ گیا تھا کہ وہ حج جگہ پہنچا کبھی ہے یا نہیں۔ دل کو اس حویلی کا راستہ تو کہ اتنے برسوں میں کبھی بھولا نہیں تھا لیکن اب یہاں کھڑے ہو کر خواہش جاگ رہی تھی کہ کاش کوئی کہہ دے کہ وہ غلط جگہ آ گیا ہے اور یہ تو اب سلیم اللہ کی حویلی ہے ہی نہیں۔

”آپ بتائے نہیں کہ آپ کون ہیں؟“

مخاطب نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے اس کی خواہش کے برخلاف جواب دیتے ہوئے پوچھا۔

یہ..... یہ سب لپکا ہوا اور یہ حویلی اس حال تک ہے
 اس کے سوال کو نظر انداز کر کے فاروق نے اس
 سے پوچھا۔

”کیا بتا میں ماں! کوئی قیامت سی قیامت تھی جو
س حویلی پر ٹوٹی اور سب کچھ راکھ ہو گیا۔ میں نے برسوں
س حویلی کا ٹھنک کھایا ہوں اور اس کا یہ حال دیکھ کر میرا دل
خون کے آنسو روتا ہے بھر میں روز ادھر کا ایک چکر لگ جاتا
ہوں کہ اپنی وفاداری بھانے کو میرے کسے بس میں اج
یک کام باقی رہ گیا ہے۔“ بتانے والے کی آنکھوں میں
نوموہر آئے۔

”کیا ہوا تھا؟ کیا بلوائیوں کا حملہ.....؟“ فاروق نے
پنے خدشات کی تصدیق چاہی۔

”ہاؤں۔ عالم بلوای سب برباد کر دیے۔ اجاڑ
اے اس بھری پُری حویلی کو۔“ اب اس کی آنکھوں سے
نسو بہنے لگے تھے۔ ان آنسوؤں کے بیچ وہ پوری داستان
ناتوا چلا گیا۔

”بڑے اور چھوٹے نواب زادہ صاحب ان حالات

”اُن کی بات اگ ہے۔ وہ بالکل شیرازوں کی سی آن بان رکھتے ہیں۔“

”مجھے تو یہ بھی تمہاری نظر کا کمال لگتا ہے جس نے ایک انسان کو جانے کیا سے کیا بنا ڈالا ہے۔“ اس نے جاند باز کو چھیڑا۔

”نظر نہیں، یہ محبت کا کمال ہوتا ہے جو ایک انسان کو دوسرے کے لیے بہت خاص، سب سے مفرد اور اعلیٰ بنا دیتی ہے لیکن یقین جانے کہ وہ ہی بہت خاص۔ ان کی خاندانی شرافت اور گرد و کار کی پاکیزگی ان کے سامنے پر لکھی نظر آتی ہے۔ وہ ان لوگوں میں سے ہیں جنہیں اللہ کی طرف سے ایک خاص کشش عطا کی جاتی ہے اور لوگ خود بخود ہی ان کی محبت میں جلا ہو جاتے ہیں۔ ایک صرف ہماری ذات کی ہی بات نہیں ہے، ہم نے ان کے ارد گرد دوسرے افراد کو بھی نہیں بے تحاشا چاہتے ہوئے دیکھا ہے۔“ موضوع گفتگو فاروق قاتو جانہ بانو کی زبان پر خاموش رہ پائی۔ اس نے پوچھا شروع کیا تو یوں چلی گئی۔

”اوکے بابا! کبھی قسمت نے ملایا تو دیکھیں۔ تمہارے صاحب بہادر کی خوبیوں کو، انہی کو مجھے اجازت دو، مجھے کب پہنچتا ہے۔“

وہ اس بڑی اور پھر چاند بانو کو اللہ حافظ کہتی ہوئی کمر سے روانہ ہوئی۔ اسد اللہ اس سے پہلے ہی روانہ ہو چکے تھے۔ صنی اللہ کی دنیا تو صحنی ہی ان کے کمرے سے تک محدود۔ کمانے کے اوقات میں بھی وہ محض اسد اللہ کے خیال سے ہی باہر نکلتے تھے البتہ کچھ روز سے ان کے معمولات میں یہ فرق آیا تھا کہ وہ عبادت کی طرف زیادہ مائل ہو گئے تھے اور صبح و شب نماز کے علاوہ بھی نقلی نمازیں پڑھ کر بچھڑا ہوئے بیٹے کی دواہی کی دعا عیاں نکلتے رہتے تھے۔ جلی کا خیال تھا کہ ان کی اس تہذیبی میں بھی چاند بانو کی کارزار ہے۔ اس سے متاثر ہو کر ہی وہ اس طرف راغب ہوئے ہیں۔ بہر حال جو بھی تھا، اچھا تھا۔ جیسے وہ بھی جیلہ بن کر بھی جلی کھلائی تھی۔ اسد اللہ نے اسے بتایا تھا کہ انہوں نے اس کے لیے جیلہ نام اس لیے منتخب کیا تھا کہ اس کا کتبہ نم تبدیل نہ ہو۔ جیلہ سے جلی پکارنا بھی برا نہیں لگتا تھا۔ کیسے میں بھی اس نے اپنی تہذیبی مذہب سے سب کا گواہ کروایا تھا اور بتا دیا تھا کہ اب اسے جو لیت کے بجائے جیلہ اسد اللہ کہہ کر پکارا جائے۔ زیادہ تر لوگوں نے اس کے فیصلے پر خوشی کا اظہار کیا تھا، کچھ طنزیہ نظروں سے بھی دیکھتے رہے تھے لیکن اسے کسی کی بردائیں نہیں تھیں۔ وہ یہاں کام کرنے آئی تھی

”اب آپ سنا لیں کہ آپ کے پاس کیا خوش خبری ہے؟“
 ”میں نے بھی اسلام قبول کر لیا ہے عاکف اور اب
 امانتیلہ ہے۔“ اس نے بتایا۔

[illegible]

”تم بھی کمال ہو چاند بانو! پتا نہیں کیسے اتنا کچھ لیتی ہو۔ اتنی عبادت، مگر کی اتنی ساری ذمے داریاں اس پر سے یہ کام۔“ سختی نہیں ہو کیا اتنا سب کر کے؟“ اس نے بہت محنت سے چاند بانو کو ٹوکا۔

”تھکن کسی معصوم جانوں کی زندگیوں بچانے کے لیے یہ تھوڑی سی مشقت تو میرے نزدیک عبادت کا درجہ مٹی ہے اور عبادت سے مجھے تھکن نہیں سکون محسوس ہوتا۔“ چاند بانو نے مسکرا کر اسے جواب دیا۔

”تمہارا یہ سکون ہی تمہاری سب سے بڑی دولت
 جس میں دیکھ کر میں سوچتی ہوں کہ وہ شخص کتنا شاندار ہوگا
 جس میں عموماً لڑکی کے دل کا انتخاب ہے۔ میرا دل چاہتا ہے
 اس میں اس شخص سے ملوں اور اسے بتاؤں کہ تم کتنے خوش
 انسان ہو کہ چاند بانو جیسی پیاری لڑکی تمہیں اتنا ہے
 ماننا چاہتی ہے۔“ اس کے لہجے میں چاند بانو کے لیے کئی
 بات تھی۔ چاند بانو اس کی بات سن کر دھیرے سے مسکرائی
 اور انیساری سے بولی۔

”یہ تو آپ کا حسن نظر ہے جو آپ کو ہم میں اتنی

چاند بانو کی طرح اسے نماز کے انداز میں لپیٹ ڈالا۔ اے روپ آئینے میں دیکھا تو خود کو بھی بہت اچھا لگا۔ ابھی وہ آئینے میں دیکھ رہی تھی کہ چاند بانو نے دستک دے کرے میں جھانکا اور اطلاع دی۔

”جیلہ باجی لاہور سے آپ کے لیے ٹیلیفون ہے۔“ اطلاع سن کر وہ فوراً گول کمرے کی طرف دوڑا جہاں ٹیلیفون سیٹ رکھا ہوا تھا۔

”السلام علیکم آبی! کیا حال ہے آپ کا؟“ ریسورٹسٹا
 ہی دوسری طرف سے عائف کی کھنکھتی ہوئی آواز سنائی دی۔

”وَعَلَيْكُمْ السَّلَامُ! بہت لمبی عمر ہے تمہاری۔ تم لوگوں کو یاد کر رہی رہی تھی اور آج میرا خود کا ارادہ تھا کہ کرنے کا۔“ اس نے عاتق کو بتایا اور وہ واقعی آج لوگوں کو فوٹو کرنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ تھوڑے عرصے رفاقت میں بیگم آصف علی کے خاندان سے اس کی گہرائی ہو گئی تھی اس لیے وہ انہیں اپنے مسلمان ہوجانے اطلاع دینا چاہتی تھی۔

”اصل میں خوشی اتنی بڑی تھی کہ میں نے صبح ہو۔
انتظار بھی مشکل ہی سے کیا ہے، آپ کو خوشخبری سنانے
لیے طبیعت بے چین ہو رہی تھی۔“ عاکف کے لہجے کی کڑ
میں اضافہ ہوا۔

”جلدی سے سناؤ الوکہ کیا خوشخبری ہے پھر میں؟“
 جمہیں ایک اچھی خبر سناؤں گی۔“

”تو پہلے آپ ہی سادیں۔“ عاکف نے اس سے کہا
 ”نہیں، پہلے تم اپنی خوش خبری سناؤ۔ تم نے فو
 کرنے میں پہل کی ہے۔“ اس نے زور دیا تو عاکف
 بھی خبرستانے میں دیر نہیں لگا کی اور خوشی سے لبریز لہجے
 بتانے لگا۔

”انجلی نے اسلام قبول کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے آج
اب وہ ہمیشہ یہیں، ہم لوگوں کے ساتھ رہتا چاہتی ہے۔“

”واقعی یہ تو بہت خوشی کی بات ہے۔ تمہیں بہر
 مبارک ہو عارف! تمہاری سچی محبت رنگ لے آئی۔“
 نے دل کی گہرائیوں سے عارف کو مبارک باد دی۔ وہ گو
 سخی اس کی انجلی کے لیے بے قرار ہی نہ کہ عمری کی عجب
 نے عارف کو بہت اضطراب میں مبتلا کر رکھا تھا اور اس
 سوچ کا محور و مرکز بن گئی تھی۔ وہ خوف زدہ رہتا تھا کہ کہیں
 ان کا گھر چھوڑ کر اپنے رشتے داروں کے پاس بھو یا
 جانے کا فیصلہ نہ کر لے۔ اب انجلی کے مسلمان ہو جانے سے
 پہلے سے اس کے سارے مسائل اور اذیتوں میں

اپنے..... دکھ سکھ بانٹنے پر تہمت اچھا گزارا اور تیرے سے الگ ہونا ہمارے سن کو دکھ کی کرے گا لیکن تو اپنی دنیا میں، اپنے اصل کے ساتھ مجھ (عزت) کی چھٹی (زندگی) گزارے گا تو اس سے ہم سب کا سن زیادہ خوش رہے گا۔ یہاں تو دے بھی کسی اب تیرے لیے حالات بہت خراب ہیں۔ ہمارے بیچ رہے گا تو پولیس والوں کی نظروں میں بھی آ جائے گا اور وہ تجھے چھوڑنے والے نہیں۔ تیرے پیچھے بھی انہوں نے اڈے پر بڑی اکھاڑ بچھاڑ ہے۔ کچھ تھی کے تھانے سے فرار کے بعد سالے اڈے پر گرفتاریاں ڈالنے آئے تھے لیکن اپنے پاس سارا ہندوستان تھا۔ غلامو چا چا سمیت محلے کے کئی لوگوں نے بولا کہ اس رات اپن اڈے پر ہی تھا۔ اشوک بچن نے بھی قانونی داؤ بیچ کھیلے تو اپنی جان چھوٹی، پر اب وہ پہلے سی بات نہیں رہی جو دادا کے زمانے میں تھی۔ اپن نے ساتھیوں کو دادا کا بھی بتایا۔ اپن کی طرح وہ سالے بھی بہت روئے بیٹے لیکن رو کر مگی تو ممبر کرنا ہی تھا، سو اپنی مولی کمال کے ساتھ سب جی رہے ہیں۔ اپن اپنے طور پر اڈا سنبھالنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ادھر مجھ والا اڈا نانا کے ساتھ بانٹ لیا ہے۔ بل جل کر کسی نہ کسی طرح گاڑی چل رہی ہے۔ اپن کو تو جیسے تیسے اسی دھندے میں رہنا ہے لیکن تو کل سکا ہے اس چکر سے، اس لیے اچھا ہے کہ نکل جا۔“

رامو اسے بہت دیر تک سمجھاتا رہا۔ خود وہ بھی پاکستان جانے کا فیصلہ کر ہی چکا تھا۔ دوستوں کے مشورے نے اس فیصلے پر مہر تصدیق ثبت کر دی اور وہ دل پر بہت سے دکھوں کے بوجھ کے ساتھ ٹھوڑی سی آس لیے ایک بار پھر ہجرت کے لیے تیار ہو گیا۔ پہلی ہجرت میں اس نے اپنے خونی رشتوں کو چھوڑا تھا اور دوسری ہجرت میں وہ دوبارہ ان رشتوں کی طرف واپس لوٹ رہا تھا۔

☆ ☆ ☆
کبھی کبھی ایک فیصلہ انسان کی پوری زندگی کو بدل دیتا ہے۔ جو لیت کی زندگی کبھی بدل سکتی تھی اور اب وہ جو لیت کے بجائے جیلہ کی جس کے دن کا آغاز نماز فجر سے ہوا تھا۔ نماز اس نے چاند بانو کے ساتھ پڑھی اور پھر تیار ہونے کے لیے دوبارہ اپنے کمرے میں واپس آگئی تھی۔ جو فیصلہ نے شروع سے اسے بہت غریبے کا لباس پہننے کی عادت ڈالی تھی۔ حوصلہ ملی قیام کے عرصے میں اس نے شلوار قمیص اور دوپٹے کا استعمال شروع کر دیا تھا اور آج جیلہ کی حیثیت سے اپنے دن کا آغاز کرتا تو دینا اوڑھتے ہوئے بخود بھی

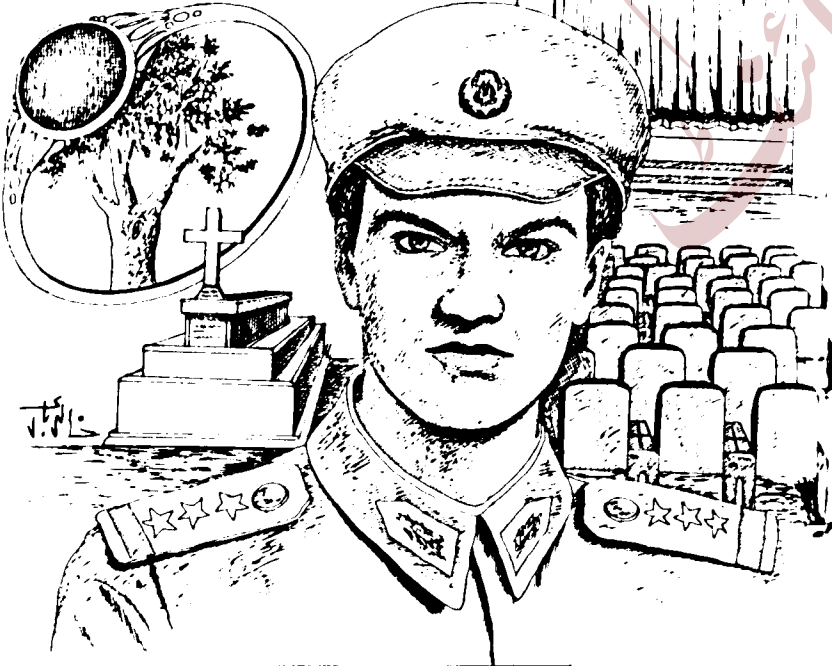
دوراہا

وسیلہ حنا تون

کبھی کبھی فرض اور احسان کے درمیان بڑی دلچسپ معرکہ آرائی ہو جاتی ہے۔ احسان کہتا ہے میری برتری تسلیم کی جائے اور فرض کہتا ہے مجھے ہر صورت ادا کیا جائے... ایسے میں مطلوب مشکل کا شکار ہو کر اس رستے پر پی چلنا چھوڑ دیتا ہے جس پر یہ دونوں آمنے سامنے کھڑے ہوتے ہیں۔ اس نے بھی تیسرا راستہ اختیار کر کے احسان کو بھی خوش کر دیا اور فرض کی ناراضگی سے بھی بچ گیا۔

جرام کی دنیا میں دیانت داری کی تلوار پر کھڑے پولیس آفیسر کی جہات مدنی

دستک کی آواز سے اس کی آنکھ نہیں کھل سکتی تھی کیونکہ وہ بہت جلدی تھی ڈور بیل کی آواز تھی جس نے اسے گہری نیند سے بیدار کر دیا تھا۔ لیغینٹ کائنات تھوڑی دیر پہلے صحن سے چور بستر پر لیٹا تھا اور لیٹتے ہی غافل ہو گیا تھا۔ اسے دروازہ بعد سونا نصیب ہوا تھا۔ ایک دولت مند آدمی رہنا لڑکے قتل کی واردات نے شبہ قتل کے تمام افراد کی نیندیں حرام کی ہوئی تھیں۔ گوکہ وہ مجرم کی شخصیت سے ابھی ناواقف تھے لیکن اس کے گرد پھیلا ہوا جال بڑی تیزی سے سینٹا



حصول کے لیے اپنے تئیں ایک آسان راہ ڈھونڈ لی م عارف کی خود کشی کے بعد اس کے اندر کچھ بدلاؤ نظر آ رہا تھا اور اس نے سوچا تھا کہ ماجدہ صمدی کی کیفیت سے آئے تو اس کے لیے کوئی مناسب انتظام کر دے گی! اس کے کچھ کرنے سے پہلے ہی قادر شاہ کا داؤد چل گیا اور ماجدہ کو لے اڑا۔

”آپ ماجدہ کی فکر چھوڑیں میڈم! وہ مرے! ہے اور بہت بڑے آدمی کے گھر پیش سے رہ رہی ہے۔ نے بس نکاح نہیں پڑھایا، باقی ماجدہ پورے بیوی وار۔ مرے کر رہی ہے۔ اس بے چارے کی اپنی بیوی تو کسی کی نہیں ہے۔ ستارے ہمارے اور بستر پر ہی بڑی رہتی ہے۔ کچھ لوگ یہ بھی بولتے ہیں کہ پاگل شاگل ہو گئی ہے اس۔ میاں کرے میں بند کر کے رکھتا ہے۔ اب جو بھی بات آدمی کو عورت کی ضرورت تو ہے اور میں نے ماجدہ کو ہا پہنچا کر اس کی ضرورت پوری کر دی تو کیا برا کیا۔ یہی تو سو درک ہے۔“ قادر شاہ نے مستقل اس کے ساتھ تسخیر انداز اختیار کر رکھا تھا۔

”کون سے وہ آدمی! مجھے اس کا نام بتاؤ؟“ اس۔ قادر شاہ کے انداز کو نظر انداز کر کے بہت ضبط سے پوچھا۔ ”اس آدمی کا نام جان کر آپ کیا کریں گی میڈم وہاں آپ کا زور نہیں چلے والا۔ وہ آپ کے باپ کی فکر آدمی ہے بلکہ ان سے زیادہ حیثیت رکھتا ہے۔ نوار صاحب تو لٹ پٹ کر آئے ہیں اور کلیم بھر بھر کر اپنا کا چلا رہے ہیں، اس کا تو یہاں بڑا کاروبار چل رہا ہے! بہت بڑے بڑے لوگوں سے تعلقات ہیں۔ آپ بہت زور لگا کر بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ پائیں گی۔“ قادر شاہ کا اندہ بدستور ہی تھا۔

”میں کیا کر سکتی ہوں اور کیا نہیں، یہ تمہارا مسئلہ نہیں تم مجھے اس آدمی کا نام بتاؤ؟“ اس نے قادر شاہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنی بات پر زور دیا۔

”آپ اتنی خند کر رہی ہیں تو بتادیجئے میں نام۔ ام کا نام ہے۔“ قادر شاہ نے جو نام لیا، اسے سن کر وہ ہاتھ جگہ سکتے زور رہ گئی۔ اس نام سے شاید اسے زندگی میں ہم نجات نہیں ملنے والی تھی۔

زندگی کے تلخ و ترش حقائق اور محبت کی خریب کاریوں کا مزید احوال اگلے مادہ ملاحظہ فرمائیں

اور کر رہی تھی۔ اس وقت بھی اس نے کچھ ضروری دفتری کام انجام دیا اور انتظامی امور کا جائزہ لینے کے خیال سے باہر نکلتی۔ باہر نکلتے ہی اس کی قادر شاہ سے ڈبھبھڑ ہو گئی۔ ماجدہ نے نیاب کے بعد سے وہ اسے نظر نہیں آیا تھا۔ آج نظر آیا تو برداشت نہیں ہوا اور اس کے سر پر جا بٹنی۔ قادر شاہ سے دیکھ کر مونچھوں کو تڑپا دینا ہوا نظریہ انداز میں مسکرایا۔

”ماجدہ کہاں ہے؟“ قادر شاہ کی مسکراہٹ نے اس کے تن بدن میں آگ لگا دی اور اس نے سخت لہجے میں دریافت کیا۔

”اتنے غصے سے کیوں بات کرتی ہیں میڈم۔۔۔۔۔ آپ کی طرح ہم بھی سوئل در کر ہیں۔“ اس نے لفظوں پر زور دیتے ہوئے مستحکم اڑانے والے انداز میں جواب دیا۔

”لغت ہے تم جیسے آدمی پر جو سوئل درک کے نام پر دلائی کرتا بھرتا ہے۔“ اس کا غصہ اور بھی سوا ہو گیا۔

”آپ مانو نہ مانو، دلائی بھی سوئل درک ہے۔ بے چاری غریب ہے اسرار لڑکیوں کو ہم دلالوں کی وجہ سے روٹی، کپڑا اور ٹھکانا مل جاتا ہے اور کسی ”ضرورت مند“ کی ضرورت پوری ہو جاتی ہے۔“ اس کی ڈھٹائی کی انتہا تھی کہ وہ اپنے مکروہ دھندے سے انکار کرنے کے بجائے اس کے حق میں دلائل دے رہا تھا۔

”ضرورت مند۔۔۔۔۔ تم عیاشوں کو ان کی عیاشی کا سامان فراہم کرنے کے لیے مجبور لڑکیوں کو غلامت میں دھکیل دیتے ہو اور ان ہوں پرستوں کو ضرورت مند قرار دے رہے ہو۔“ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ قادر شاہ کا منہ چھڑوں سے سرخ کر دے لیکن پھر اس نے خود پر قابو پایا اور زور معتدل لہجے میں پوچھنے لگی۔

”ماجدہ کہاں ہے؟ مجھے اس کا پتا بتاؤ۔“ ”چھوڑو جی! آپ اس کا پتا ٹھکانا معلوم کر کے کیا کریں گی۔ ایک کو یہاں سے نکال کر لے گئی ہیں، کافی ہے۔ زیادہ۔۔۔۔۔ کا مجمع لگایا اپنی کوٹھی پر تو لوگ کہیں گے نواب صاحب نے پھلکا کھول لیا ہے۔“ قادر شاہ خیانت سے ہنس کر بولا تو وہ اپنی جگہ تاؤ کھا کر رہ گئی۔ حقیقتاً وہ خود بھی ماجدہ کو فوری طور پر کوٹھی لے جانے کا فیصلہ اسی لیے نہیں کر پائی تھی کہ اس کی بدنامی اسدا اللہ کی نیک نامی کے لیے داغ نہ بن جائے۔ چاند بانو کا معاملہ مختلف تھا۔ اس کے اندر خیر کی خواہش تھی اور وہ مشکل حالات میں بھی عزت کی زندگی جیتنے کی جدوجہد کر رہی تھی جبکہ ماجدہ نے گندگی کو اپنا نصیب سمجھ کر قبول کر لیا تھا اور آسائش کے

تھا اور توقع تھی کہ آئندہ جو میں گھنٹوں کے دوران وہ
کچن کی چوہے کی طرح گھبر کر گھٹنے میں کس دیں گے۔ یہی
دیکھ کر لیٹن نے اسے گھر جا کر سونے کی ہدایت کی تھی تاکہ
گھنٹوں کی نیند لے کر وہ تازہ دم ہو جائے۔ اسے سفاک
تاش کے مقابلے میں بیدار ذہن اور چست جوانوں کی
ضرورت تھی۔ مجھے ہوئے، نیند کے مارے ہوئے ماتحت کسی
بجرم کا پوری صلاحیتوں کے ساتھ مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔
لیفٹیننٹ کلشن کی بیوی اور بارہ سالہ بیٹی اسکول کی
چھٹیاں گزارنے دوپٹے کے لیے ایک عزیز کے گھر
دروازہ قحبہ میں گئے ہوئے تھے۔ کمانڈر پولیس بیڈ
کوارٹر میں کھانا چکا تھا۔ اس لیے گھر آتے ہی وہ لباس
تبدیل کے بغیر بستر پر دروازہ ہوا اور لٹے ہی گہری نیند میں
ڈوب گیا۔ اب گھنٹی کی آواز سن کر آٹھ گھنٹہ کی تو اسے محسوس ہوا
جیسے وہ ایک لمحے کے لیے بھی نہ سو یا ہو۔ وہ آنکھیں بند کیے
چپ چاپ بڑا رہا۔ گھنٹی کی آواز دوبارہ آئی۔ بہت مختصر سے
دوٹنے کے لیے جیسے کسی نے ڈور تیل کے شٹن پر انگلی رکھ کر فوراً
بٹائی ہوا اور پھر بھی دنگ۔

”کون ہے؟“ لیفٹیننٹ نے جھلا کر کہا اور جسم کی
ساری توانائی سمیٹتے ہوئے بستر چھوڑنے کی تیاری کرنے
لگا۔ دنگ کی آواز درمیان میں ادھوری رہ گئی۔

اس نے دروازہ کھولا تو ایک اجنبی کو اپنے دروازے
پر کھڑا پایا۔ پورچ میں گئے ہوئے ہلکی قوت کے بلب کی
روشنی میں لیفٹیننٹ کلشن نے نیند سے بھول آکھیں پھاڑ
کر نوادرو کو پہچاننے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ اجنبی نے
ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور بڑی
بے تکلفی سے اس طرح اندر داخل ہوا جیسے وہ اس کا اپنا مکان
ہو۔ لیفٹیننٹ کلشن نوادرو کے روپے پر کچھ حیران ہوتا ہوا
ایک طرف ہٹ گیا اور اجنبی نے اندر داخل ہو کر دروازہ بند
کر دیا۔ پھر اس نے دروازے سے ٹپک لگائی اور پیشانی پر
جھکا ہوا ہیٹ ڈرامائی انداز میں اوپر اٹھا دیا۔ جیسے اسے توقع
ہو کہ اس کا میزبان فوراً ہی اسے پہچان لے گا۔

”میں سوچ رہا تھا کہ شاید تم بھی دروازہ نہ
کھولو۔“ اس نے کہا۔ ”میں نے..... اگر اپنی آنکھوں سے
جھپکے اندر جاتے ہوئے نہیں دیکھا ہوتا تو یہی گھمٹا کہ مکان
میں کوئی بھی موجود نہیں ہے۔“

”کون ہو؟“
نوادرو اس طرح دروازے سے ٹپک لگائے گھر سے
سانس لے رہا تھا جیسے اعصابی کشیدگی کم کرنے کی کوشش

کر رہا ہو۔ ”تو تم مجھے نہیں پہچانتے؟“ اس نے طنز کر
ہوئے عجیب سے لہجے میں کہا۔
کلشن زندگی بھر وہ مخصوص لب و لہجہ فراموش نہ
کر سکتا تھا۔ وہ فوراً نوادرو کو پہچان گیا۔
”تو تم مجھے نہیں پہچانتے یا پہچانا نہیں جانتے؟“
نے طنز لہجے میں دوبارہ کہا اور اس کی نظر میں گھٹتی ہو
لیفٹیننٹ کلشن کی بارہ سالہ بیٹی بار بار کی تصور پر جا کر رہا
تھیں اور چند لمحوں بعد پلٹ کر لیفٹیننٹ کی طرف لو۔
آئیں۔ ان آنکھوں میں اب مضحکہ اڑانے والی چمک
ہو چکی تھی۔ وہ خاموش رہا، اسے کچھ کہنے کی ضرورت
نہیں تھی۔ لیفٹیننٹ کلشن اسے پہچان گیا تھا۔ نوادرو۔
اس کی ملاقات پانچ سال قبل ہوئی تھی۔ جب وہ صرا
سراخ رساں ہو کر آتا تھا۔ پانچ سال قبل گزرے ہوئے
نا قابل فراموش لمحات لیفٹیننٹ کلشن کی آنکھوں کے سامنے
گھومتے گئے۔

☆☆☆

سراخ رساں کلشن ڈیوٹی سے فارغ ہو کر پولیس
کوارٹر کی عمارت سے باہر نکلا۔ اس نے گیراج سے اب
آٹھ سال پرانے ماڈل کی بھاری بھر کم گاڑی نکال
سکریٹ سلگا یا اور گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

وہ اپنی زندگی سے بہت مطمئن اور آسودہ تھا۔ اس
عمر پینتیس سال تھی۔ وہ ایک بہت اچھی بیوی کا شو
اور ایک بہت پیاری بیٹی کا باپ تھا۔ اس کے سامنے ایک
وسیع اور خوشگوار مستقبل تھا۔ ابھی وہ صرف اول درجہ
کا سراخ رساں تھا۔ اس کے بعد اسے لیفٹیننٹ اور کمیشن
سبز حیاں چڑھنی تھیں اور وہ کس سے اوپر بھی جاسکتا تھا
پولیس کے شعبے میں ترقیاں ملنے کی رفتار بہت سست ہوتی۔
لیکن ناقابل حصول نہیں ہوتیں۔ اصل مشکل کمیشن
مجددے کے بعد شروع ہوتی ہے۔ وہ رات بہت خوبصورت
تھی۔ زندگی بہت حسین تھی، بے اختیار وہ ایک مقبول و مہم
گنجانے لگا۔

اس کا مکان شہر کے نواحی علاقے میں ایک پہاڑ
پر واقع تھا جس کے دامن میں ایک جمیل تھی۔ ایک تعمیر
ادارے نے کچھ عرصہ قبل اس پہاڑی پر مکانات تعمیر کر کے
فروخت کیے تھے۔ اس نے گاڑی چڑھائی پر ڈال دی اور
پھر گیران میں کھڑی کرنے کے بجائے دروازے کے پار
روک دی کیونکہ وہ بیوی اور بیٹی کے ساتھ فلم دیکھنے کا ارادہ
رکھتا تھا۔ اس نے زور سے ہارن بجایا۔ پورچ کی قیروٹر

والی اس کی بیوی دلیپز کی ٹیلا سیریز پر رک گئی۔ بیٹی اڑتی
آئی اور اس کے گلے میں انہیں ڈال کر جمبول گئی۔
جود دیکھتا تھا، وہ بھی کہتا تھا کہ بیٹی بہت خوبصورت
بڑی پیاری ہے۔ وہ انہیں سات سال پہلے قدرت کی
طوفان سے تحفے میں ملی تھی۔ ”چلو جلدی کرو، ہم لوگ فلم
دیکھنے جا رہے ہیں۔“

اس کی بیوی جیسے تالی سے دور کھڑی اس کے قریب
آنے کا انتظار کر رہی تھی، یہ سن کر ایک حرکت میں آ گئی۔
”ہم لوگ کھانا کھا چکے ہیں۔ تمہارا کھانا میز پر لگا ہوا ہے
اور الٹ..... بار بار! ادھر آؤ، دیکھو تمہارا ہیٹ کہاں رکھا
ہوا ہے۔“

اس نے گاڑی موڑ کر پہاڑی کے نیچے جانے والے
رخ پر ڈال دی۔ ان کے پاس وقت کم تھا اور کھانے کے
بعد وہ فوراً روانہ ہونا چاہتا تھا۔ بیٹی بیٹ پیٹے ہوئے دوڑتی
ہوئی مکان سے باہر نکلی۔

”آپ کھانا کھالیں یا! میں گاڑی میں آپ کا
انتظار کر رہی ہوں۔“ وہ بہت خوش نظر آ رہی تھی۔

وہ مسکرا دیا۔ ”ٹھیک ہے، دیکھو ہارن مت بجاتا۔“
وہ اندر داخل ہوا اور بیوی کو خوش میں بھر کر ایک
طویل بوسہ دیا۔ میز پر کھانا پٹا ہوا تھا جسے دیکھ کر ایک اس
کی بھوک بھی چمک گئی۔ اس نے ایک کرسی پیچھے کھینچی جس کا
رخ دروازے کی طرف تھا۔ اس کی بیوی ایک پلیٹ اس کی
طرف بڑھانے لگی۔ بس یونہی اس نے سر اٹھا کر پورچ کی
طرف دیکھا تو وہاں کوئی گز رہے محسوس کی۔ وہ کرسی پر بیٹھے
بیٹھے فضا میں معلق ہو گیا۔ پورچ خالی پڑا تھا اور اس کی گاڑی
غائب تھی۔

کری لڑھکتی ہوئی فرش پر گری، اس سے پہلے ہی وہ
نشت گاہ سے گزرتا ہوا پورچ تک پہنچ چکا تھا۔ عقب میں
زانا سینڈلوں کی کھٹ کھٹ سنائی دے رہی تھی۔ وہ دوڑتا
ہوا پورچ سے باہر نکلا۔ اس کی نظروں کے سامنے ڈھلان تھی
اور اس کی گاڑی چھلکتی ہوئی پہاڑی سے نیچے جا رہی تھی۔
اس کی رفتار پچھلے پچھلے بڑھتی جا رہی تھی۔ انجن خاموش تھا جس
کا مطلب یہ تھا کہ بار بار بے ہوش ہو رہا تھا۔

سڑک کے دونوں طرف تیز روشنی والے بلب لگے
ہوئے تھے جن کی وجہ سے سڑک خوب روشن تھی۔ ان کی
ایک قطار سیدھی جمیل کی طرف جاتی تھی اور دوسری
قطار دائیں جانب مڑتی ہوئی شہر کی طرف نکل جاتی تھی۔
آٹھ سال پرانے ماڈل کی فورڈ گاڑی بھاری بھر کم تھی.....

سڑک پر بغیر لہرائے بالکل سیدھی جا رہی تھی۔ ایک لمحے کے
لیے ایک چھوٹا سا ہاتھ کھڑکی سے باہر نکلا اور پھر فوراً اندر چلا
گیا۔ کلشن کو عقب میں کوئی آواز سنائی نہیں دی لیکن پیچھے
مڑ کر دیکھے بغیر ہی اسے معلوم ہو گیا کہ اس کی بیوی بے ہوش
ہو کر زمین پر گر پڑی ہے۔ وہ پہاڑی سے نیچے کی طرف اتنی
تیزی سے دوڑا کہ اس نے زندگی میں کسی اتنی تیز دوڑ نہیں
لگائی تھی۔

دیکھتے ہی دیکھتے اس کی نظروں کے سامنے سب کچھ
انتہائی تیزی، انتہائی خاموشی کے ساتھ ختم ہو گیا۔ ایسا
دہشت ناک منظر جو زندگی میں بھی بکھاری کسی کی نظر آیا ہو۔
چند لمحوں پر وہ بیسیں پر سناکت فلم کی طرح وہ منظر قائم رہا اور
پھر غائب ہو گیا۔ لیکن دیکھنے والے کی نظروں کے سامنے وہ
مرے دم تک قائم رہتا۔ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ آہستہ آہستہ اس
کے اور گاڑی کے درمیان فاصلہ کم ہوتا جا رہا تھا، لیکن فاصلہ
منٹے سے پہلے ہی گاڑی پہاڑی کے نیچے پہنچ گئی جس کے
دامن میں بڑی خوبصورت جمیل واقع تھی۔ گاڑی اچھل
کرفت چلتی پر چڑھی جس کے دوسری طرف تین فٹ اونچی
دیوار کھڑی تھی۔ وہ دیوار توڑتی ہوئی اس کی نظروں سے
غائب ہو گئی۔ وہاں بس دھول اور مٹی کے سوا کچھ بھی نظر نہیں
آتا تھا۔

وہ اندھا عند جمیل کی طرف بھاگا۔ اس کے پیروں
کے قریب بہت زور سے بریک چپچ، کوئی غصے سے چپچا۔ وہ
پیچھے دیکھے بغیر تین فٹ اونچی دیوار پھلانگتا ہوا کٹ سمیت
جمیل میں کود گیا۔ جس مقام پر اس کی گاڑی جمیل میں ڈوبی
تھی، وہاں بے شمار ٹیلے اٹھ رہے تھے۔ پانی سے نگر اتے ہی
اسے یاد آیا کہ وہ تو بھرا کی کی ابجد سے بھی واقف نہیں ہے
لیکن اس حقیقت نے اس پر ذرا بھی گھبراہٹ طاری نہیں
کی۔ وہ صرف ایک تیزی سے گزرتا ہوا خیال تھا۔ اس وقت
اس کی پوری کائنات ایک نئے سے وجود میں سٹ آئی تھی
جو گاڑی میں بند جمیل کے اندر موت و ذیست کی کشش میں
جلا تھا۔

اس نے جھلاٹک ہی قلا لگائی تھی، وہ چھاتی کے بل
پانی پر گرا اور پانی کی ٹکر نے اس کا وجود ہلا دیا۔ پیٹ
اور سینے پر شدید چوٹ لگی، وہ ہاتھ بھر ہار ہوتا ہوئے نیچے بیٹھے لگا
پھر پانی نے آہستہ سے اسے اوپر اٹھکیل دیا۔ اس کی سمجھ میں
نہیں آ رہا تھا کہ وہ کھرا کی میں گئے داخل ہو۔ اسے یہ بھی
معلوم نہیں تھا کہ پانی میں سانس کس طرح لی جاتی ہے، وہ
دوبارہ پانی میں ڈوبا چلا گیا..... جلد ہی اس کے پیچھے

سانس لینے کے باعث دیکتے ہوئے انگارے بن گئے۔ اس پر سچ کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔ ایک لمبے کے لیے وہ پانی کی سطح پر ابھرا لیکن ایسے موقعوں سے قائلہ اٹھانے کا اس کو سلیقہ نہیں تھا۔ وہ ایک مرتبہ پھر پانی میں ڈوب گیا۔ اب وہ خود مر رہا تھا۔

اسے پتا نہیں کہ کب اسے طاقت ور، مہربان ہاتھوں نے اپنی گرفت میں لیا اور اسے موت کے جبروں سے باہر کھینچا۔ چند لمحوں بعد وہ پانی سے نکل کر ہوا میں آگیا۔ مگر وہ زمین پر لینا ہوا تھا، اس کا سینہ دھوکنی کی طرح جل رہا تھا۔ کچھ ہوش و حواس بحال ہونے پر اس نے آنکھیں کھولیں، کوئی نامعلوم شخص اس کے قریب کھڑا تھا۔ اس کا لباس پانی میں شرابور تھا لیکن وہ خود پر سکون نظر آ رہا تھا۔ اسے آنکھیں کھول کر دیکھ کر اس کے دھن سے کہا۔ ”تم احمق ہو، جب تمہیں تیرا نہیں آتا تھا تو تم نے جمیل میں کیوں چلا تھک لگا کی؟“

کلنٹن نے کہنیوں کے بل اٹھنے کی کوشش کی۔ اس نے اکھڑی ہوئی سانسوں اور بے تماشا اُشتی ہوئی کھاسی کے دوران بڑی مشکل سے اپنے دھن سے کہا۔ ”میری بچی..... وہ گاڑی..... گاڑی میں ہے جو..... جمیل کے اندر.....“

اس کا قہرہ عمل ہونے سے خوشتر ہی ابھی اس کے سامنے سے غائب ہو گیا اور کچھ دیر بعد اسے اپنے قریب بار بار کے کھانسنے کی آواز سنائی دی، وہ انجینی دھن کی گود میں تھی۔ اس کا چہرہ نیلا پڑ چکا تھا لیکن دھن کی آمد و رفت جاری تھی۔ کلنٹن نے اپنے دھن کو انتہائی تشکر بھری نظروں سے دیکھا۔ چند لوگ وہاں جمع ہو گئے تھے اور اس نے بچی کو زمین پر لٹا دیا اور ایک شخص پیٹ دیا کہ پانی باہر نکالنے لگا۔ جب وہ پرسکون انداز میں سانس لینے لگی تو کلنٹن نے اٹھ کر اپنی بچی کو سینے سے لگا لیا اور مجمع میں دھن کو تلاش کرتے ہوئے نظریں دوڑائیں۔ ”وہ کہاں گیا؟“

اسے پس منظر میں ایک گاڑی اشارت ہونے کی آواز سنائی دی۔ ”ظہور“، کلنٹن پوری قوت سے چیخے ہوئے بے تماشا گاڑی کی طرف بھاگا۔ وہ بیچ سڑک پر کھڑا ہو گیا۔ گاڑی رک گئی۔ اسٹیرنگ وھیل کے پیچھے بیٹھے ہوئے شخص نے کھڑکی سے سر نکال کر سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ انجینی کا دایاں ہاتھ زخمی ہو گیا تھا جس پر اس نے کوئی کپڑا باندھ لیا تھا۔

کلنٹن گاڑی کے قریب آ کر جک گیا۔ اس کے دونوں ہاتھ دروازے کے ہینڈل کے قریب شکر گزاری

والے انداز میں پھیلے ہوئے تھے۔ احسان کا بوجھ اتار دینی تھا کہ اس کی زبان ساتھ بندے بار ہی تھی۔

”اب کیا بات ہے؟“ انجینی دھن نے روکے لیے میں بے صبری سے سوال کیا جیسے اسے کہیں جانے کی بہت جلدی ہو۔

تشکر کے جذبات زبان سے ادا کرنے ویسے ہی مشکل ہوتے ہیں۔ خاص طور پر اس وقت جب دوسرا فریق اپنے احسان کا تذکرہ سننے پر تیار نہ ہو۔ کلنٹن صرف اتنا ہی کہہ سکا۔ ”میں آپ کو بتا نہیں سکتا کہ آپ نے مجھ پر کتنا بڑا احسان کیا ہے۔“

”میں خود حیران ہوں کہ میں نے یہ کیسے کیا۔“ اس نے طر کرتے ہوئے ایسے لہجے میں کہا جیسے وہ خود پر کوئی فخرہ جست کر رہا ہو۔ ”میں نے اپنی زندگی میں پہلے بھی کوئی ایسا کام نہیں کیا۔“

”لیکن کیا میں آپ کے لیے کچھ نہیں کر سکتا؟“ کلنٹن نے اٹھا آہر لہجے میں کہا۔ ”کم از کم اپنا نام تو بتا دیں؟“ کلنٹن کو اس اٹھا کا جو جواب ملا وہ زہر میں بجا ہوا تھا۔ ”جہیں میرے نام سے کیا لینا ہے؟ میں لوگوں کو اپنا نام بتاتا نہیں پھرتا۔“

شکر گزاری کے جذبات اٹھتے ہوئے نکاسی کے منطقی تھے۔

اس وقت اگر وہ شخص گھونسا مار کر کلنٹن کے دانت بھی توڑ دیتا تو وہ قطعی برا نہیں مانتا۔ جب انجینی اپنا نام بتانے پر آمادہ نہیں ہوا تو کلنٹن نے اپنا تعارف کرایا۔ چند لمبے اس کا دھن خاموشی سے اسے گھورتا رہا۔ اس نے نظریں جھکا کر کلنٹن کی اگلیوں کی طرف دیکھا جو دروازے کے ہینڈل پر جمی ہوئی تھیں۔ ان نظروں کا مطلب بالکل واضح تھا۔ ہاتھ ہٹاؤ..... مجھے دیر ہو رہی ہے۔

”سب یہی کہتے ہیں۔“ اس کے دھن نے خشک لہجے میں کہا اور دوسرے لمبے گاڑی ایک جھٹکالے کر تیزی سے آگے بڑھ گئی۔

☆☆☆

”تم..... تم وی شخص ہو..... وی جو پانچ سال پہلے..... جمیل پر.....“ لیفٹیننٹ کا چہرہ خوشی اور تشکر کے لمبے جھٹکاتے دیکھنے لگا۔ اس نے گرم جوشی سے مصالحتی لہجے ہاتھ بڑھایا بلو واردا سے نظر انداز کرتا ہوا نشست گاہ کی طرف بڑھ گیا۔ لیفٹیننٹ کا چہرہ بجمہ گیا۔ وہ نشست گاہ میں داخل ہوا تو اپنے دھن کو بے پروا انداز میں ایک کرسی کے

اندرو دھنسا ہوا پایا۔ اس کے چہرے کے دائیں جانب خون لگا ہوا تھا۔

لیفٹیننٹ کلکشن اب پوری طرح بیدار ہو چکا تھا۔ اس نے غور سے پہلی بار اپنے من کا جائزہ لیا اور نا قابل فہم وجہ کی بنا پر خوفزدہ ہو گیا۔

”تمہیں چوٹ کیسے لگی؟“

نوادرد نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

”چوٹ نہیں لگی، ابھی کچھ دیر پہلے تمہارے ہی ایک ساتھی نے مجھ پر گولی چلائی تھی، یہ اسی کا کرشمہ ہے۔“

لیفٹیننٹ کلکشن کا چہرہ نامعلوم خوف کے زیر اثر آہستہ آہستہ سپید پڑتا جا رہا تھا جیسے کوئی بوند بوند کر کے اس کے چہرے کا خون چھوڑ رہا ہو۔ اجنبی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے

ذاتی رابطے کی مدد سے وہ کچھ بتانا چاہتا تھا جسے کلکشن نہیں جانتا چاہتا تھا۔ ”تم مجھ سے یہ کیوں نہیں پوچھتے کہ میں تمہارے گھر میں تمہارے پاس کیوں آیا ہوں؟“

کلکشن جبک کر پیچھے ہٹ گیا۔ ”مجھے کوئی ایسی بات مت بتاؤ جس پر بعد میں تمہیں پچھتاؤ پڑے۔“ اس نے جلدی سے کہا۔

”تم مجھ سے یہ کیوں نہیں پوچھتے کہ میں تمہارے گھر، تمہارے.....“ نوادرد دھیمے لہجے میں اپنا سوال دہرانے لگا۔

”خاموش!“ کلکشن نے چیخ کر کہا۔

”نہیں، میں تمہیں اس کی اجازت نہیں دے سکتا۔“ اس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ ”تم اپنے فرار کا راستہ محفوظ رکھنا چاہتے ہو؟ تم نے اپنے دل کے دروازے بند کر لیے ہیں تا کہ چند منٹ بعد تمہارے ساتھی تلاش کرتے ہوئے یہاں پہنچیں تو تمہارا ضمیر تمہیں ملامت نہ کر سکے؟ تم میرا دوسرا روپ بھی پہچان لو گے۔ میں فورمین ہوں۔ ریٹائلڈ کا قاتل، جسے پولیس والے گزشتہ ایک ہفتے سے بڑی شدت کے ساتھ تلاش کر رہے ہیں۔ اب بتاؤ کیا کرنا چاہتے ہو؟“

”اوہ میرے خدا!“ کلکشن نے حلق سے کراچے ہوئے کہا اور سر کے اگلے ہوئے بے ترتیب بالوں میں انگلیاں پھیریں۔ ”تمہیں پتا نہیں ہے، میں کون ہوں؟“

”تو تمہارا خیال ہے کہ اگر مجھے یہ پتا ہو تا تو میں تمہارے قریب بھی نہیں آتا..... کیوں؟“ فورمین نے طنز سے لہجے میں پوچھا کرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے معلوم تھا کہ تم کون ہو اور اسی لیے میں یہاں آیا ہوں۔ اس دن تم نے خود

اپنا تعارف کراتے ہوئے مجھے بتایا تھا کہ تمہارا حلق پولیہ کے شیعہ نسل سے ہے۔ اس کے بعد میں نے ایک بار تمہارا تصویر اخبار میں دیکھی جب تم نے ایک پولیس آفیسر کا قاتل کو گرفتار کیا تھا اور اسی کا نام بے برکتیں ترقی دے

لیفٹیننٹ بنا دیا گیا تھا۔ تم سے بنیادی فطرتی یہ ہوتی ہے کہ تم نے مستقل ایک جگہ رہائش اختیار کی ہوئی ہے۔ پولیہ والوں کو اپنی رہائش تبدیل کرتے رہنا چاہیے۔ اس۔

بڑے فائدے پہنچتے ہیں۔“

لیفٹیننٹ کلکشن جھناتا ہوا دروازے پر گیا اور دو نو پٹ پورے کھول دیے۔ ”دفعہ ہو جاؤ۔“ اس نے چیخ کر ”نورا یہاں سے چلے جاؤ۔ میں بس تمہارے لیے اتنا کر سکتا ہوں۔“

فورمین دہلی کی تصویر کو گنگلی باندھے بڑے اطمینان سے اس طرح دیکھتا رہا جیسے وہ کمرے میں تنہا ہو۔ ”کیا ان کے بال واقعی سنہری ہیں جیسے کہ تصویر میں نظر آ رہے ہیں کیا اس کے ہونٹوں پر ہر وقت ایسا ہی ہنس بکھرا ہوتا ہے؟“

جتنے ہوئے اس کے رخساروں میں گڑھے پڑ جاتے ہیں؟“

”نکل جاؤ خونی، قاتل!“ کلکشن پوری قوت سے چیخا۔

”میری کوئی پٹی تو نہیں لیکن مجھے معلوم ہے کہ یہ کس طرح اپنی حمت کا اظہار کرتے ہیں۔ کبھی وہ کرسی سے پیچھے آ کر چپکے سے گلے میں بائیں ڈال دیتے ہیں اور کبھی سامنے گھٹنوں کے بل زمین پر گھڑے ہو کر گود میں سر راہ دیتے ہیں۔ پتا نہیں تمہاری پٹی کس طرح اپنی حمت کا اظہار کرتی ہے کلکشن لیکن وہ جو طریقہ بھی اختیار کرتی ہے، مجھ میرے فطرتی ہی تمہیں وہ ہنسی سکراتی نظر آتی ہے۔ کیا تا، ہے تمہاری پٹی کا کلکشن؟“

”باربرا۔“ کلکشن نے شکست خوردہ انداز میں کہ اور دوسرے دوسرے قدم اٹھاتا ہوا فورمین کے سامنے بیٹ گیا۔ بہت دیر تک وہ خاموش بیٹھ رہے، کم از کم کلکشن کو کچھ محسوس ہوا جیسے بہت وقت گزر گیا ہو۔

”تمہارے پاس سگریٹ تو ہوگا؟“ فورمین نے سکوت توڑتے ہوئے بڑی بے فطرتی سے کہا۔

کلکشن نے کوٹ کی جیبوں پر ہاتھ مارا، اس کے پاس سگریٹ نہیں تھا۔ فورمین اٹھا اور میز پر رکھے ہوئے پیکیٹ سے سگریٹ نکالا اور اطمینان سے اپنی جگہ بیٹھ کر تبا کوٹھی سے لطف اندوز ہونے لگا۔

بہت دیر بعد کلکشن نے خیالات سے چوکتے ہوئے

راغایا اور فورمین کی طرف دیکھا۔ ”میں ایک ڈسے وار پولیس افسر ہوں فورمین۔“ اس نے ایک گہرا سانس لینے ہوئے کہا۔ ”تمام حالات کا جائزہ لینے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ میں تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔“

فورمین نے پرسکون انداز میں سگریٹ کی راگہ جھاری۔ ”تمہیں میرے لیے کچھ کرنے کی ضرورت ہی نہیں، بس مجھے یہاں اس وقت تک رہنے کی اجازت دے دو جب تک تمہارے ساتھیوں کا جوش و خروش ٹھنڈا نہیں پڑ جاتا۔“ پھر تم اپنا رخ دوسری طرف کر لینا اور میں دروازہ کھول کر وہاں چلا جاؤں گا۔ اس طرح ہمارا حساب بے

باق ہو جائے گا۔“

”تم خونی ہو..... تم نے ایک انسان کو انتہائی سنگ دلی، بے رحمی سے قتل کیا ہے۔“

”لیکن پولیس افسر ہونے کی وجہ سے تم اپنے اخلاقی فرض سے سبکدوش تو نہیں ہو جاتے۔ جس رات میں نے تمہاری پٹی کی جان بچائی تھی، اس سے پہلے بھی ایک قاتل کر چکا تھا۔ اس کے باوجود تم نے انہی ہاتھوں سے اپنی پٹی کی جان قبول کر لی تھی۔ وہ آج اسی طرح سانس لیتی ہے۔ اس کے پیچھے بڑے اسی طرح پانی سے خالی ہیں۔ اس کی آنکھیں اسی طرح روشن ہیں جیسے کئی شریف اور قانون کے

باندھ شہری نے اس کی جان بچائی ہو۔ میں نے سیکل میں گودنے سے پہلے اس قاتل کے اچھے اور بُرے پہلوؤں پر تم سے بحث نہیں کی تھی۔ میں نے تمہیں ایک زندگی لوٹائی۔ تم میرے مقروض ہو، میں تم سے ایک زندگی کا مطالبہ کرتا ہوں، اپنی زندگی کا۔“

”تم کچھ چنا چاہتے ہو؟“ کلکشن نے غضب ناک لہجے میں پوچھا۔ تین مرتبہ وہ غلط سمت کی طرف مڑا۔ تب اسے یاد آیا کہ شروب کی بوتلیں کہاں رکھی رہتی ہیں۔

فورمین بہت پرسکون اور پُر اعتماد نظر آ رہا تھا یا شاید یہ بھی اس کے سیکل کا حصہ تھا، پرسکون اور پُر اعتماد نظر آ رہا جیسے اسے کلکشن کے رد عمل کا پہلے ہی سے علم ہو۔ اسے اس امر کا پورا یقین ہو کہ کلکشن بالآخر اسے پتا دے دیں پر مجبور ہو جائے گا۔ کچھ دیر بعد اس نے شروب کی چسکیاں لینے ہوئے کہا۔ ”اس قدر تردد کرنے کی ضرورت نہیں۔“ پھر اس نے کلکشن کو ایسی نظروں سے دیکھا جیسے وہ اس قسم کے آدمی کو زندگی میں پہلی بار دیکھ رہا ہو۔ ”تم دیانت دار ہو، کیوں ٹھیک ہے؟“ اور سچائی کا راستہ بھی کبھی بے حد تکلیف پہنچاتا ہے۔ میں نے اس دن ہی تمہارے بارے میں یہ اندازہ

قابلِ رحم

لاڑکی: کیا تم نے میرے ابا سے میرا رشتہ مانگا تھا؟

لاڑکا: ہاں۔

لاڑکی: پھر انہوں نے کیا کہا؟

لاڑکا: انہوں نے پوچھا ایک میں تمہارا کتنا روپیہ جمع ہے؟ میں نے کہا، دس ہزار۔

لاڑکی: پھر؟

لاڑکا: انہوں نے وہ ساری رقم مجھ سے ادھار مانگ لی۔

ایک وقت میں ایک

ایک صاحب تقریر کر رہے تھے۔ اچانک ہنڈال کے پیچھے سے ایک گدھے نے رینگنا شروع کر دیا۔

سامعین میں سے کسی نے آواز لگائی۔

”ایک وقت میں ایک ہی بولے۔“

جواب

دورانِ سفر ریل میں ایک آدمی نے دوسرے سے پوچھا۔

”تمنازک طرف منہ کر کے پڑھو؟“

جواب آیا۔ ”جس طرف تمہارا سامان رکھا ہوا ہے۔“

مرسلہ: ریاضِ بٹ، حسن ابدال

لطیفہ

لاڑکی: ”میری ائی کو تم بہت پسند آئے۔“ سردار شربتاتے ہوئے۔ لیکن میں شادی صرف تم ہی سے کروں گا خالہ سے بولو مجھے بھول جائے۔“

مرسلہ: راحیلہ شفیق، نیکو راہی سندھی ہوٹل

احساس

بہوی نے شوہر سے شکایت کرتے ہوئے کہا۔

لگا لیا تھا کہ جو شخص میرا کی سے ناواقف ہو اور بھرے جبک پانی میں چلا گیا لگا دے، وہ دیانت دار اور اصول پرست ہی ہو سکتا ہے۔ اسی لیے میں یہاں آیا ہوں۔ میں کسی پولیس افسر کے ساتھ اتنا بڑا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ اصول پرست آدمی جہاں بے حد خطرناک ہوتا ہے، وہیں بے ضرر بھی ہوتا ہے۔

کنکشن کچھ نہیں بولا۔ وہ خاموشی سے خلا میں کسی غیر مرئی نقطے کو گھورتا رہا۔

”کیا یہاں شراب کی صرف یہی ایک بوتل ہے؟“
کنکشن نے غائب دماغی سے اثبات میں سر ہلایا۔ اس نے پانی کا تالین پر گرنے کی آواز کی تو سراخا کہ فورمین کی طرف دیکھا جو شروپ کی بوتل کا منہ کھول کر تالین پر بہا رہا تھا۔ اس نے کچھ بھی نہ کہا، اس جیسی دس لاکھ باتوں کی اس وقت کوئی اہمیت نہیں تھی۔ بس ایک ہی اہم مسئلہ تھا جو اس کی مکمل توجہ کا مستحق تھا۔

”زیادہ پینے سے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں متاثر۔۔۔ ہوئی ہیں۔“ اس نے فورمین کو وضاحت کرتے ہوئے سنا۔ اس وقت ہم دونوں کا ذہن بالکل صاف ہونا چاہیے تاکہ ہم صحیح نتائج اخذ کر سکیں اور ان کی روشنی میں صحیح فیصلے کیے جا سکیں۔

کنکشن نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس کی حد تک یہ بات درست تھی۔ شروپ کا زیادہ استعمال اسے جذباتی بنا دیتا اور موجودہ حالات میں وہ خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ جذباتی کیفیت کے زیر اثر وہ اپنے فرض اور اپنے قرض دونوں میں سے کسی کو بھی بہت زیادہ اہمیت دے سکتا تھا۔ اس نے اپنے گلاس میں بچا ہوا شروپ بے رحمانہ انداز میں خود بھی تالین پر انڈیل دیا۔

”تم خاموش نہیں رہ سکتے؟ بوتل ہی رہو گے اہم سوکیوں نہیں جانتے؟“ اس نے خواب گاہ کے کھلے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تم اندر جا کر سوکیوں نہیں جانتے؟ میں تمہاری میں کچھ سوچتا چاہتا ہوں۔“ فورمین نشست سے اٹھ گیا۔ اس نے کھڑے ہو کر ایک طویل آنکرائی لی اور خواب گاہ کی طرف بڑھنے لگا۔

”غصہ وہ تمہارے پاس کوئی اختیار ہے؟“
”ہاں، کیوں نہیں؟“ فورمین نے پھر بدوائی سے رپو اور نکال کر کنکشن کی طرف بڑھایا۔ ”تمہیں گرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ تمہاری حیثیت تپ کے پتے کی سی ہے۔ میرے پاس ہارنے کے لیے اب کیا رہ گیا ہے۔“ وہ

ڈھیلے ڈھالے انداز میں چلتا ہوا خواب گاہ میں داخل ہو گیا۔ چند لمحوں بعد کنکشن نے فرش پر جوتے کرنے کی آواز سنی پھر ستر کے اسٹریک چرچرائے اور خاموش ہو گئے۔ وہ فورمین کا رپو اور اٹھا کر اس کی کولیاں نکالنے لگا۔ چند منٹ بعد اسے خراٹوں کی آواز سنائی دی۔ کنکشن مٹھیاں بھیچتا ہوا اپنی نشست سے کھڑا ہو گیا اور بے چینی سے بیٹھتی دائرے کی شکل میں تالین پر لیٹنے لگا۔

دس منٹ بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ کنکشن کا افسانہ ہوا قدم فضا میں صلیق رہ گیا۔ دستک کی آواز دوبارہ ابھری اور اس کے ساتھ ہی ڈور تیل بجنے لگی۔ وہ ساکت ایک جگہ کھڑا رہا۔
”کنکشن! کیا تم اندر ہو؟“ باہر سے کسی نے پکار کر کہا۔ کنکشن اس آواز کو پہچان گیا۔ وہ شبیئل کے سراخ رساں نام کی آواز تھی۔

اس نے پہلے خواب گاہ کا دروازہ بند کر لیا پھر مکان کا داخلی دروازہ کھولا۔ نام کے ساتھ ایک اور سراخ رساں تھا۔ انہوں نے رپو اور ہو شروپ سے باہر نکالے ہوئے تھے۔ کنکشن پر نظر پڑتے ہی ان کے سرخ زمین کی طرف ہو گئے۔ ”کیا بات ہے؟“ کنکشن نے بے جا ہی لیتے ہوئے دریافت کیا۔

”فورمین ایک مرتبہ پھر ہماری ناکا بندی تو ذکر فرما رہے ہیں؟ میں کامیاب ہو گیا ہے۔ لیفٹیننٹ، بالکل آخری لمحات میں جب ہم اس پر ہاتھ ڈالنے والے تھے۔ ایک ٹیسی ڈرائیو رکابیاں ہے کہ اس نے مجرم کو پہاڑی کے درائن میں اتارا تھا۔ وہ یہاں نہیں چھپا ہوا ہے، ہم ایک ایک گھر کی تلاش لے رہے ہیں۔“

”وہ میرے مکان میں داخل نہیں ہوا۔“ کنکشن نے ساٹ لپٹے میں کہا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو دوسرے کی چٹائی کش نہیں کی۔ اس نے صرف اتنا کہا۔ ”مجھے اسے آنکھیں نہیں مل رہیں۔ دو منٹ قدموں پر کھڑا ہونا بھی دشوار ہے اور پھر میں ڈیوٹی پر بھی نہیں ہوں۔“

نام نے اسے عجیب نظروں سے دیکھا۔ وہ پلٹا اور اپنے ساتھی کے ہمراہ واپس چلا گیا۔ اس نے جاتے جاتے بلند آواز میں کہا۔ ”کوئی بات نہیں لیفٹیننٹ۔۔۔۔۔۔ آپ آرام کریں۔ مجھے افسوس ہے، ہم نے آپ کی نیند میں خلل ڈالا۔“

کنکشن نے دروازہ بند کر دیا اور سر جھکائے ایک منٹ تک خاموش کھڑا رہا پھر وہ اپنے جوتوں کو دیکھ رہا ہو لیکن

اس کی آنکھیں کچھ بھی نہیں دیکھ رہی تھیں۔ اسے عقب سے فورمین کی خاموشی اور پرسکون آواز سنائی دی۔ ”تو تم نے اپنے ساتھیوں سے غلط بیانی کی، انہیں رخصت کر دیا۔“ کنکشن نے پلٹ کر اسے دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ ”میں بیٹھ ہی چکا ہوں گھونپنے کا قائل نہیں ہوں۔ یہ میرا اصول نہیں ہے، نہ ہی میں تم سے خوف زدہ ہوں۔“

”درست ہے۔“ فورمین نے اعتراف کرتے ہوئے کہا۔ ”تم مجھ سے تو کہیں، اپنے ضمیر سے خوفزدہ ہو اور اپنی بیٹی کی آنکھوں سے۔“

اب کنکشن نے پلٹ کر اپنے مہمان کو گھور کر دیکھا۔ ”یہ میرا مسئلہ ہے تمہارا نہیں۔ تمہیں بوتلے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔“ اس نے جارحانہ انداز میں مٹھیاں پیچھنے ہوئے فورمین کی طرف قدم بڑھائے۔ ”تم میری نظروں سے دور ہو ورنہ دونوں ہاتھوں سے اس مسئلے کا گھاگھونٹ دوں گا۔“

خواب گاہ کا دروازہ بند ہو گیا اور کنکشن ایک مرتبہ پھر اپنے خیالوں کے ساتھ تہا رہ گیا۔ ”اوہ گاڈ!“ اس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ ”کیا یہ رات بھی تم نہیں ہوگی؟“

☆☆☆☆

فورمین جب صبح کچھ میں داخل ہوا تو کنکشن ناشائستہ کر رہا تھا۔ ابھی سورج طلوع نہیں ہوا تھا اور کھڑکی سے باہر ہر جگہ سکون بخش روشنی پھیلی ہوئی نظر آرہی تھی۔ فورمین ایک منٹ تک کنکشن کو خاموشی سے دیکھتا رہا۔ ”کیا یہ قیدی کا آخری ناشتا ہے؟ اتنی جلدی ناشتا تیار کرنے کی کیا تک ہے؟“

کنکشن جواب میں خاموش رہا۔ اس نے مہمان کو ناشتے کی میز پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ فورمین ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ کنکشن نے کافی سے بھری ہوئی ٹیپلی اٹھائی اور ٹیپلی میز پر رکھ کر اپنے مہمان کے سامنے بیٹھ گیا۔ فورمین کچھ دیر اسے دیکھی سے دیکھتا رہا۔

تمہارے طبقے سے ظاہر ہوتا ہے کہ تم رات بھر نہیں سوئے۔ میں شرط لگا سکتا ہوں کہ تم نے رات تالین پر لیٹتے ہوئے نزاری ہے۔“

”میں تمیں مرتبہ کوشش کرنے کے بعد کافی تیار کرنے میں کامیاب ہو ہوں۔“ کنکشن نے سبک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جس کی سطح پر ضائع شدہ کافی کی تہ جی ہوئی تھی۔ ”اگر ضرورت محسوس ہو رہی ہو تو اپنے لیے کافی نکال لو۔“

وہ میز پر آنے سے پہلے اس طرح ہپ ہپ ہپ ہپ ہونے لگا کہ کافی کی پی رہے تھے جیسے وہ گھر سے دوستوں اور ان کی بی بیوں موجود نہ ہوں۔ فورمین نے اچانک سوال کیا۔ ”تم اس مکان کا کتنا کرایہ ادا کرتے ہو؟“

”پچاس ڈالر۔“
”میں نے بھی کسی مقام پر اتنی دیر قیام نہیں کیا کہ اسٹے ایک ماہ کا کرایہ بھرنا پڑے۔“
”کاش تم کہیں تک گرا کر ایک جگہ رکے تو شاید آج یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔“

لیکن میں بھر سکوت غاری ہو گیا۔ آہستہ آہستہ فضا میں کشیدگی پیدا ہونے لگی جس کا منبع کنکشن کی ذات تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے کرسی کے کنارے بڑی مضبوطی کے ساتھ پکڑے ہوئے تھے جیسے وہ کسی بھی لمحے اٹھ کر کھڑا ہو جائے گا۔ فورمین جلدی جلدی سکرینٹ کے کش لینے لگا، فورمین کی نظریں کنکشن کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں اور لیفٹیننٹ بھی کچھ نظریں اٹھا کر اپنے مہمان کو دیکھ لیتا تھا۔

”کیا بات ہے، تمہارے چہرے کا رنگ اڑ گیا ہے؟ تم کھ پھر کھ سفید پڑتے جا رہے ہو کنکشن۔ آئیے میں ڈرا اپنی شکل تو دیکھوں۔“

کنکشن نے کہا۔ ”تم کچھ کرنا چاہتے ہو تو شروع ہو جاؤ۔ ابھی سورج ہے ورنہ پھر ہم ہیڈ کوارٹر چلتے ہیں۔“
”تم اب تک فرار کا راستہ تلاش کر رہے ہو؟“
فورمین نے صغیرا ڈراتے ہوئے کہا۔ ”کنکشن تم ایسا نہیں کر سکو گے۔ تمہیں اپنا قرض چکانا پڑے گا۔“

کنکشن اپنی نشست سے اٹھا اور خاموشی کے ساتھ بکس سے نکل گیا۔ چند منٹ بعد وہ جب واپس آیا تو اس نے کوٹ پہنا ہوا تھا اور اس کے ہاتھ میں مکلی ہوئی ہتھکڑی لگ رہی تھی۔ ”پلو جلدی کرو۔“ اس نے لمبہ مضبوط بتاتے ہوئے فورمین سے کہا۔ ”ہاتھ آگے بڑھاؤ، ہمیں فوراً ہیڈ کوارٹر چلنا ہے۔“

فورمین نے آہستہ آہستہ ایک ہاتھ میز کی سطح پر پھیلا دیا اور پھر کنکشن کے چہرے پر نظریں جمائے اس ہاتھ کی آستین چڑھانے لگا۔ کبھی سے اوپر سفید جلد پر ایک لمبے دلم کا نشان واضح طور پر نمایاں تھا جس میں ناگے بھی آئے تھے۔ ”اس دن جیل کے اندر گاڑی کا شدید ٹوڑنے ہوئے یہ دلم آیا تھا۔“ اس نے آہستہ آہستہ ایک ایک لفظ جاتے ہوئے کہا پھر وہ خاموش ہو گیا۔ اس کی نظریں ہوشیار مٹھیاں

کے چہرے پر جی ہوئی تھی اور ان سے مسخر جھک رہا تھا۔
کلنٹن کے ہونٹ سفید پڑ گئے۔ اس نے ایک بار پلکیں جھپکائیں اور پھٹکڑی فورمین کی دوسری کلائی میں ڈال دی۔ کلک کی آواز کے ساتھ پھٹکڑی بند ہوئی۔ فورمین اپنی نشست سے اٹھ گیا اور کلنٹن کے پیچھے پیچھے بچن سے باہر نکل آیا۔ ”تم نے جس کام کا بیڑا اٹھا یا ہے اسے پورا نہیں کر سکو گے۔“ اس نے منہ پر ہونے پر سکون لہجے میں کہا۔ ”نا کامی تمہارے چہرے پر لکھی ہوئی ہے۔ تم اپنے محسن کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کر سکتے۔“
بچن کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ اس پر لٹکا ہوا پردہ ایک کنارے سے کھٹکا ہوا تھا۔ کلنٹن نے کھڑکی کے پاس سے گزرتے ہوئے پھٹکڑی کی چابی باہر اچھال دی۔
”جہیں اپنی ذات پر اعتماد نہیں رہا۔“ جہیں معلوم ہے کہ جو کام تم کرنے جا رہے ہو، وہ غلط ہے۔ تم اپنے میر کی ملامت سے خوف زدہ ہو کہ وہ کہیں جہیں صحیح کام کرنے پر مجبور نہ کر دے۔“

بچی کی فریم شدہ تصویر میز پر اوندمی رکھی ہوئی تھی۔ فورمین نے قریب سے گزرتے ہوئے اپنی تصویر کو دیکھا۔ ”جہیں جرات پیدا کرنے کے لیے یہ کام بھی کرنا پڑا؟“ اس نے کہا اور کلنٹن نے نشست گاہ سے باہر نکلتے ہوئے بچن دبا کر روٹی ٹکڑی کر دی۔ تصویر تاریکی میں دم ہوئی۔ باہر اتنی روشنی نہیں پہنچی تھی جو کمرے کے کونوں کو بھی روشن کر دیتی۔
”اس سے کیا ہوتا ہے۔“ فورمین نے اس کی توجہ مبذول کراتے ہوئے کہا۔ ”تصویر نہ سہی، تم اپنی بچی کو تو روز دیکھو گے۔ تم اس کا چہرہ تو اس طرح الٹا کر کے نہیں چھپا سکتے، اس کام کی یاد رکھو؟“

کلنٹن نے داخلی دروازہ کھولا اور فورمین کو ساتھ لے کر باہر نکل آیا۔ ”نہ تو میں گزراؤں گا، نہ تم سے رحم کی ہیک مانگوں گا۔“ فورمین نے کہا۔ ”میں تمہارے لیے اس معاملے کو اتنا زبردست بنانا دوں گا کہ تم اسے حلق سے نیچے نہیں اتار سکو گے۔ اگر میں بزدل ہوتا، کمزور ہوتا تو تمہارے لیے یہ مسئلہ بہت آسان ہو جاتا، کیوں ٹھیک ہے نا؟“

قاتل کا قیاس درست تھا۔ اس کا شاہد غیر معمولی تھا۔ اگر وہ کلنٹن کے سامنے گزراؤں گا، اتجا کرتا، مزاحمت کرتا یا مفروضہ جرم کا کردار پیش کرتا تو اپنے احسان کا حق کمزور کر لیتا۔ کلنٹن اسے فوراً زمین پر گھٹینا ہوا میڈیکل کوارٹر لے جاتا لیکن اس نے احسان کا قرض وصول کرنے کا جو طریقہ اختیار کیا تھا وہ.....

کلنٹن نے دروازہ مقفل کیا اور دونوں ساتھ ساتھ چلے گئے۔
”جہیں اس کا راتے پر حقا دیا جائے گا۔“ فورمین نے شتر چبوتے ہوئے کہا۔ ”ترتی بھی دی جائے گی۔ تم لیفٹیننٹ سے کیپٹن بن جاؤ گے۔ تمہارے سامنے رکھ بھری نظروں سے جہیں دیکھیں گے۔ کوئی بھی احسان فراموشی پر نہیں ملے نہیں دے گا۔ کوئی بھی تم سے یہ نہیں کہے گا کہ ایک آدمی تم پر اعتماد کر کے تمہاری پناہ میں آیا تھا۔ وہ تمہارا محسن تھا جس نے جہیں ایک زندگی بخشی تھی اور تم نے اس کے احسان کا، اس کے اعتماد کا یہ بدلہ دیا۔ کلنٹن! تم خدا کی بنائی ہوئی زمین پر حقیر ترین، ذلیل ترین شے ہو۔ کسی آوارہ کتے کو اگر کوئی بھی ایک لقمہ کھلا دے تو وہ کتا بھی ہمیشہ احسان مند ہوتا ہے۔ اس ہاتھ پر بھی نہیں لپکتا جس نے ایک بار اس کے منہ میں لقمہ ڈالا ہو۔“
”خاموش ہو۔“ کلنٹن نے چیخ کر کہا۔
وہ آہستہ آہستہ پہاڑی پر سے اترتے رہے۔ سڑک کے دونوں جانب استادہ بجلی کے کھمبے روشنی کو چمکاتے تھے۔ جیسے ہی وہ کوئے پر منبرے مقامی تھانے کے دروازے پر جلتا ہوا سبز رنگ کا بلب دور ہی سے نظر آگیا۔ بلب پر نظر پڑتے ہی فورمین اس طرح جھجکا جیسے وہ اندر ہی اندر سڑک گیا ہو۔
”اگر تم مجھے اندر لے گئے تو وہ مجھے جان سے مار دیں گے۔“ فورمین نے کہا۔ ”جہیں معلوم ہے، تم جانتے ہو میں غلط نہیں کہہ رہا۔ اس کے بعد تم کچھ بھی کرو، کتنا ہی زور لگاؤ، دنیا کی کوئی طاقت مجھے زندہ باہر نہیں نکال سکے گی۔ ابھی وقت ہے، ابھی کچھ نہیں بڑا کلنٹن..... سوچ لو۔ میں نے تمہاری بچی کی زندگی جہیں لوٹائی تھی۔ اب میں اس کے عوض آخری بار تم سے ایک زندگی طلب کرتا ہوں۔ میری اپنی زندگی، میرا قرض واپس لوٹا دو۔ میرا حساب بے باق کرو۔“

کلنٹن کا چہرہ بسنے میں نہا گیا۔ صبح کی سپیدی میں اس کے چہرے کا رنگ ہلکا سا لکڑی نظر آ رہا تھا۔ اس کے جڑے تختی کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ اس نے ایک ہاتھ کی ہتھی باندی اور فورمین کی کیپٹن میں ڈھونڈا۔
”تم انسان نہیں ہو۔“ فورمین نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔
”تم پولیس والے ہو۔“ اس نے سڑک پر قہقہہ دیا

اور بے خوفی سے تھانے کی طرف بڑھنے لگا۔

☆☆☆

لیفٹیننٹ کلنٹن گاڑی سے اتر ا۔ فورمین اس کے ساتھ تھا۔ وہ بالکل خاموش تھا۔ وہ ساتھ ساتھ میڈیکل کوارٹر کی عمارت میں داخل ہوئے اور ایک طویل راہداری طے کرتے ہوئے ایک کمرے میں چلے گئے۔ میز کے پیچھے شیڈول کے کیپٹن اسٹرنس نے فون پر کسی سے گفتگو ختم کر کے ٹیلیفون بند کر دیا اور سوالیہ نظروں سے لیفٹیننٹ کلنٹن کی طرف دیکھنے لگا۔
”ملازم فورمین حاضر ہے کیپٹن۔“ لیفٹیننٹ کلنٹن نے عجیب سے ساٹ لہجے میں کہا۔
کیپٹن اسٹرنس کا چہرہ خوشی سے دکنے لگا۔ وہ جوش میں اپنے ماتحت کی غیر فطری حالت کو محسوس کرنا بھول گیا۔ اگر اس نے کلنٹن پر طاری وہ عجیب سی کیفیت محسوس کر لی تھی تو اس کی اہمیت سمجھنے میں نا کام رہا تھا اس نے میز میں لگا ہوا ٹیٹن دبا دیا۔

لیفٹیننٹ کلنٹن اس اثنا میں اپنا بگلی ہولسٹر نکال کر کیپٹن کے سامنے میز پر رکھ چکا تھا۔ اس نے سینے پر لگا ہوا شاتھی جی کوچ کر ہولسٹر کے پاس پھینک دیا پھر کوٹ کی اندرونی جیب سے ایک شدہ کاغذ نکال کر اسے احتیاط سے میز پر رکھ دیا۔
”یہ ریلو اور ہے..... یہ جی ہے اور یہ رہا میرا استعفا۔“
حیرت کی شدت سے کیپٹن اسٹرنس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ سرت کی وجہ سے چہرے پر امنڈنے والی سرخی زردی میں تبدیل ہو گئی۔ قوت کو بانی سلب ہو گئی پھر بڑی مشکل سے اس کے حلق سے صرف یہ آواز نکل سکی۔
”استعفا؟“

”میں ایسی ملازمت پر لعنت بھیجتا ہوں جو انسان کو کتے سے بھی بدتر بنا دے۔“
”سنو کلنٹن! ایک منٹ..... ادھر آؤ!“
لیکن لیفٹیننٹ کلنٹن جو صرف کلنٹن رہ گیا تھا، کمرے سے باہر نکل چکا تھا۔

☆☆☆

ٹیلیفون کی گھنٹی نے انہیں چونکا دیا۔ وہ نشست گاہ میں بیٹھے شام کے وقت کافی پیچھے ہوئے رگوں میں تازگی پیدا کر رہے تھے۔ کلنٹن نے اٹھ کر ریسورکان سے لگا یا۔
”ہیلو کیپٹن؟“
”بول رہا ہوں۔“ آواز پہچانتے ہی اس کے لیون

پر بے ساختہ مسکراہٹ ابھر آئی۔

”لیفٹیننٹ..... اس نے تمہارے لیے آخری پیغام چھوڑا تھا۔ میں نے سوچا کہ میں خود جہیں وہ پیغام پہنچا دوں۔ تم مجھے تھامیں کسی کی بات کر رہا ہوں؟“
”ٹھیک ہے میں سمجھا گیا۔ کیا کہا اس نے؟“ کلنٹن کی گرفت ریسورکان پر مضبوط ہو گئی اور اس کے اعصاب تن گئے۔ کمرے کی فضا ایک تخت تبدیل ہو گئی جسے اس کی بیوی اور بچی نے فوراً محسوس کر لیا۔ وہ ہاتھ روک کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔

”اس نے کہا تھا کہ کلنٹن سے کہنا کہ ہماری ملاقات پھر ہوگی۔ وہ جب چاہے مجھے اس کی آنکھوں میں تلاش کر سکتا ہے۔ اس سے کہنا کہ وہ مجھے ہمیشہ اپنا بھڑپاے گا۔“
”ٹھکرے کیپٹن۔“
”لیکن کلنٹن.....“

کلنٹن نے آہستہ سے ریسورکان پر ڈل پر رکھ دیا۔ چند لمحوں میں وہ چپ چاپ اسی طرح کھڑے کچھ سوچتا رہا۔ پھر وہ اپنے اس نے اپنی بچی کی طرف دیکھا جو یوں خوشگوار ماحول کو کشیدہ ہوتے دیکھ کر پریشان نظر آ رہی تھی۔
”بار بار..... ادھر آؤ، میرے پاس۔“

بچی سمجھ ہوئے انداز میں کرسی سے اٹھی اور اپنے ڈیڈی کے قریب آکر کھڑی ہو گئی۔ کلنٹن نے جبکہ کراس کی نیلی نیلی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا۔

”آپ کیا دیکھ رہے ہیں ڈیڈی؟“ بچی نے ڈرتے ڈرتے سوال کیا۔ اس کی بیوی دہشت زدہ سی خاموش بیٹھی ہوئی تھی۔

”کچھ نہیں گڑیا۔“ کلنٹن ایک گہرا سانس لیتے ہوئے سیدھا کھڑا ہو گیا۔ ”میں دیکھ رہا تھا کہ کہیں تمہاری آنکھوں میں ایک شیطان تو نہیں چھپ گیا۔“

”شیطان؟“ بچی نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔ ”پھر نظر آیا آپ کو؟“

”شیطان تو نہیں، ہاں تمہاری آنکھوں میں مجھے خالق کی شہید پر نظر آئی جسے شاید میں بھی نہ دیکھ پاتا اور شاید آئندہ کبھی بھی نہ دیکھ سکوں۔“

بچی نہ سمجھنے والے انداز میں مسکراتی ہوئی اپنی ماں کے پاس آگئی۔ کلنٹن بھی مسکراتا ہوا اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔ وہ بہت سرور اور مطمئن نظر آ رہا تھا جیسے اس کے سر سے بہت بڑا بوجھ ہٹ گیا ہو۔

نفس کاقیدی

ملک صندر حیات

جتنی یہ کائنات پرانی ہے شاید زن، زن زمین کا جھگڑا بھی اتنا ہی پرانا ہے۔ فقط چہرے بدل جاتے ہیں۔ جذبات کا بہانہ وہی رہتا ہے۔ ویسے ہی نفس اپنی ذات کو اہمیت دیتا ہے اور پھر ہمیشہ کی طرح ایک چور خیال اسے اپنا مفاد حاصل کرنے کے لیے جرائم کی جانب چپکے سے دھکیل دیتا ہے۔ انسان کتنی خوبصورتی اور مکاری سے ایک محبت پانے کے لیے دوسری تمام محبتوں کا خون کر کے جانے کیسے خوش اور مطمئن رہ لیتا ہے... مگر ایسا ہمیشہ ممکن نہیں شاید، کیونکہ ضمیر کی تلوار اسے نہ تو خوش رہنے دیتی ہے اور نہ ہی سکون کا سانس لینے دیتی ہے۔ وہ بھی بھاگتا پھر پاتا تھا... اپنے ہی سانس سے خوفزدہ تھا لیکن لہو کی ایک ایک بوند اپنے قاتل کا پتا دے رہی تھی۔ ملک صندر جیسے مسیحانوں کو انصاف کے لیے ڈھونڈ رہی تھی۔ ایسے میں بھلا بکرے کی مار کب تک خیر مانتی... اور پھر شر پھیلائے والوں کو خیر کبھی پناہ نہیں دیتا تو اسے کیسے پناہ مل سکتی تھی۔

ایک ماں جائے کی سنگدلی اور خود مرضی کا دلخراش واقعہ

میں نے باری باری اطلاع کنندگان کے چہروں کا جائزہ لیا۔ وہ سیدھے سادے دیہاتی تھے۔ میں نے پوچھا۔ ”کون کل ہوا؟“
”جیلا...“ ایک نے بتایا۔ اس کا اصل نام تو جمیل ہے مگر لوگ اسے جیلا کہتے ہیں۔
”قتل کی واردات کس جگہ ہوئی ہے؟“ میں نے سوال کیا۔ ”اور قاتل کون ہے؟“
”قاتل کا تو کچھ پتا نہیں سرکار۔“ مسکین صورت والے ایک دیہاتی نے جواب دیا۔ ”جیلا کی شادی ہونے والی تھی... اس کی لاش اور کھیتوں میں پڑی ہے۔“
میرے استفسار پر انہوں نے بتایا کہ وہ مرزاپور سے تعلق رکھتے تھے اور یہ واقعہ بھی مرزاپور کے علاقے ہی میں پیش آیا تھا۔ ان دنوں میری تعیناتی ضلع شیخوپورہ کے ایک دور دراز قصبے میں تھی۔ مرزاپور سے قصبے کی حدود میں آتا تھا۔ مرزاپور نامی یہ گاؤں ضلعی سرحد پر

مئی کا مہینا جا رہا تھا۔ گرمی عروج پر تھی۔ دھوپ میں ایسی تیزی تھی کہ سورج کی شعاعیں بدن کے آ رہے ہو جاتی تھیں اور چند لمحوں کے آسمان میں رہنے کے بعد یوں محسوس ہوتا تھا کہ کھوپڑی میں سے بیجا بھل کر چہرے پر آ جاتے گا۔

موسم شدید ہوا لہذا سب اسی کی قدرت کا کرشمہ ہے جو کل کائنات کا مالک ہے اور اس کا کوئی بھی کام مصلحت سے خالی نہیں ہوتا۔ مئی میں گندم کی فصل تیار ہو جاتی ہے اور اس فصل کی پکائی کے لیے تیز دھوپ درکار ہوتی ہے۔ انسان اگر مہر اور شکر سے کام لے تو وہ قدرت کی بے بہا رحمتوں سے کما حقہ استفادہ کر سکتا ہے۔

ان دنوں گندم کی کٹائی کا دور چل رہا تھا۔ ایسی ہی ایک جس زون میں تیار ہو کر تھا۔ پچھلے تو ایک اندھ ہٹاک خبر میری شہر تھی۔ مرزاپور سے دو افراد آئے تھے اور انہوں نے بتایا کہ ایک بندے کا قتل ہو گیا ہے۔

گیا ہو۔ اس سلسلے میں تو صدیق ہی آپ کو بتا سکتا ہے۔“
”ٹھیک ہے، یہ سوال میں صدیق ہی سے کروں گا۔“
میں نے کہا پھر پوچھا۔ ”تم نے بتایا ہے کہ تم تینوں باپ بیٹے مل کر کھیتی باڑی کرتے ہو۔ کیا کل بھی تم تینوں ہی کھیتوں میں موجود تھے؟“
”جی نہیں۔“ اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ”میری کمر میں شدید تکلیف تھی اس لیے میں گھر پر آرام کر رہا تھا۔ جیلا اور شلا کو میں نے گندم کی کٹائی کے لیے کھیتوں میں بھیج دیا تھا۔“

شیلے اس کی مراد جیلا کا بڑا بھائی کھیل تھی۔ میں نے ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔ ”اب تمہاری کمر کی تکلیف کا کیا حال ہے؟“
”جواب! کیا بتاؤں.....“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”اس واقعے نے تو میری کمری توڑ دی ہے..... مجھے اپنی کوئی تکلیف یاد نہیں..... میرا جوان جہان ہاتھ پر ہو گیا.....“

میں رفیق کے جذبات اور احساسات کو بہ خوبی سمجھ رہا تھا۔ جوان بیٹے کی الم ناک موت نے بوڑھے باپ پر قیامت ڈھا دی تھی اور بیٹا بھی وہ جس کی چند ماہ بعد شادی ہونے والی تھی۔

”میں نے جیلا کے بائیں ہاتھ پر ایک پٹی باندھی دیکھی ہے۔“ میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ”کیا تم اس بارے میں کچھ بتا سکتے ہو؟“

”وہ پٹی تو میں نے بھی دیکھی ہے تھانے دار صاحب۔“ وہ کمزوری آواز میں بولا۔ ”کل صبح گھر سے جب وہ نکلا تھا تو اس کے دونوں ہاتھ سلامت تھے۔ لیکن فصل کی کٹائی کے دوران میں اس کے ہاتھ پر چوٹ لگ گئی تھی اس لیے پٹی باندھی گئی۔“

”ہوں.....“ میں نے خود کلامی کے انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ”جیلا عموماً کتنے بچے تک کھیتوں سے گھر آ جایا کرتا تھا؟“

”ہم تینوں مغرب کی اذان سے پہلے ہی کام روک دیا کرتے تھے۔“ اس نے بتایا۔ ”پھر ایک ساتھ ہی گھر جاتے تھے۔“

”کل تم کمر کی تکلیف کے باعث کھیتوں میں آئے ہی نہیں تھے۔“ میں نے کہا۔ ”کیا جیلا اور شلا مغرب کی اذان سے پہلے گھر پہنچتے تھے؟“

”صرف شلا پہنچتا تھا جواب!“ اس نے جواب دیا۔

”یا گیا.....“
”میں کیا کہوں جی۔“ وہ بے چارگی سے بولا۔
”نارنج ہی بھرتا جاتا ہے۔“
”تم نے بتایا ہے کہ چند ماہ بعد جیلا کی شادی ہونے والی تھی۔“ میں نے رفیق کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے استفسار کیا۔ ”تم نے متوال کارشتہ کہاں طے کیا تھا؟“
”اپنے بڑے بھائی صدیق کی لڑکی سے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”نبیلہ صدیق کی اکلوتی بیٹی ہے۔“
”کیا تمہارا بھائی صدیق بھی مرزا پوری میں رہتا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں جناب۔“ اس نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بتایا۔ ”صدیق مرزا پور سے آٹھ میل دور ایک گاؤں حویلی مراد میں رہتا ہے جناب۔ وہاں اس کی مٹھانی اور دودھ دہی کی دکان ہے۔“

اگرچہ مرزا پور اور حویلی مراد کے بیچ اور کوئی گاؤں نہیں پڑتا تھا۔ یہ دونوں دیہات زرعی اراضی کے ذریعے ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تھے لیکن سرحدی تقسیم کی رو سے مرزا پور ضلع شیخوپورہ میں اور حویلی مراد ضلع لاہل پور میں شمار ہوتا تھا۔

”رفیق! ایک بات کا سوچ سمجھ کر جواب دیتا۔“ میں نے رازدارانہ انداز میں کہا۔ ”اس رشتے کے حوالے سے تمہاری یا جیلا کی کسی سے کوئی ناراضی یا لڑائی وغیرہ تو نہیں ہوئی تھی؟“

”بالکل نہیں تھانے دار صاحب۔“ وہ جلدی سے بولا۔
”ایسا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا تھا۔“

”اور ادھر حویلی مراد کے بارے میں کیا کہتے ہو؟“
”جی..... میں سمجھا نہیں!“ وہ ابھمن زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

”میرا مطلب ہے، جیلا سے رشتہ طے ہونے سے پہلے نبیلہ کے لیے کوئی اور رشتہ بھی آیا تھا؟“ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”کوئی ایسا رشتہ جسے تمہارے بھائی نے ٹھکرا دیا ہو اور وہ جیلا کا دشمن بن گیا ہو.....؟“

”دیکھیں جی، جس گھر میں میری کا درخت لگا ہو، وہاں پتھر تو آتے ہی ہیں۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔

”اسی طرح جس گھر میں جوان لڑکیاں یا لڑکی ہو، وہاں رشتے بھی آیا ہی کرتے ہیں۔ ظاہر ہے، نبیلہ کے اور بھی رشتے آئے ہوں گے لیکن میرے علم میں ایسی کوئی بات نہیں کہ صدیق کے انکار پر کوئی صدیق کا یا جیلا کا دشمن بن

نہیں ہوئی کہ اپنی موت سے قبل متوال بڑے اٹھاک سے گندم کی کٹائی میں مصروف تھا کہ کسی شقیں القاب شخص نے کسی بھاری آہنی چیز سے ضرب لگا کر اسے موت کی نیند سلا دیا تھا۔

جیلا کی لاش کا تفصیلی جائزہ کر لینے کے بعد میں نے جائے وقوعہ کا جائزہ لیا۔ آٹھ میل یا باندھوسکا۔ جیلا کی لاش کو چھلپاتی دھوپ میں رکھنا مناسب نہیں تھا لہذا میں نے اس کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے ضلعی اسپتال بجوا دیا پھر موقع پر موجود افراد سے پوچھ گچھ کرنے لگا۔ میرے مختص انداز سے کے مطابق، وہاں ایک درجن سے زیادہ لوگ موجود تھے جن میں متوال کا باپ رفیق اور بڑا بھائی کھیل بھی شامل تھے۔ یہ تینوں باپ بیٹے آج کل گندم کی کٹائی میں مصروف تھے۔ رفیق چندہرائز اراضی کا مالک تھا اور یہی اراضی ان کا ذریعہ روزگار تھا۔

رفیق کی عمر پچاس سے تھوڑی تھی۔ وہ عام سی شکل صورت کا مالک ایک کسان تھا۔ جوان بیٹے کی موت نے اسے تو ذکر رکھ دیا تھا۔ میں اسے لے کر ایک درخت کے نیچے آ بیٹھا۔ وہاں پر موجود افراد نے ہمارے لیے ایک چار پائی کا بندوبست کروا دیا تھا۔

”رفیق!“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”مجھے تمہارے بیٹے کی الم ناک موت کا بہت دکھ ہے۔ میں اسے زندہ تو نہیں کر سکتا لیکن یہ میرا وعدہ ہے کہ بہت جلد میں جیلا کے قاتل کو کیفر کردار تک پہنچا دوں گا۔“

”تھانے دار صاحب! جیلا کی چند ماہ بعد شادی ہونے والی تھی۔“ وہ روہائی آواز میں بولا۔ ”پتا نہیں، کس ظالم کی نظر اسے کھائی۔“

”جیلا کو جس ظالمانہ انداز میں موت کے گھاٹ اتارا گیا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قاتل کے دل میں اس کے لیے بہت زیادہ نفرت تھی۔“ میں نے رفیق کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اب تم مجھے بتاؤ گے کہ جیلا کی دھنسی کس شخص سے تھی؟“

”کسی سے نہیں جناب۔“ وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”دیا تو اپنے نام سے کام رکھتا تھا۔ اس کے نہ تو دوست تھے اور نہ ہی دشمن۔“ انوں بھائی مل کر کھیتی باڑی میں میرا ہاتھ بٹاتے تھے۔

”لیکن یہ بھی شکیات ہے کہ کوئی خواخواہ کسی کی جان نہیں لیتا۔“ میں نے کہا۔ ”میں نے بھی قیامت پر یہ نہیں بان سکتا کہ بغیر دھنسی کے تمہارے بیٹے کو اتنی بے دردی سے قتل

واقع تھا۔ اس کی مغربی سمت میں ضلع لاہل پور (سویڈوہ فیصل آباد) اور جنوبی سمت میں ضلع اوکاڑہ تھا۔ ضلع اوکاڑہ اور شیخوپورہ کے درمیان دریائے راوی رواں دواں تھا۔ اگر اوکاڑہ سے مشرقی جانب سفر کریں تو راوی کے ساتھ ساتھ ضلع قصور اور پھر ضلع لاہور آتا تھا۔ شیخوپورہ بے یک وقت راوی کے کنارے سے لاہور قصور اور اوکاڑہ سے جڑا ہوا تھا۔ یہی راوی آگے مغربی جانب بڑے اور ملتان کو بچ کر تھا جب کہ اس کا بالائی کنارہ لاہل پور اور ٹوبہ ٹیک سنگھ سے لگا ہوا تھا۔

میں نے ایک کاغذ پر نقشہ کھینچا اور اطلاع کنندگان کے ہمراہ جائے وقوعہ پر پہنچ گیا۔ تاہم نگاہ کھیتوں کا وسیع سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ یہ مرزا پور کی زرعی اراضی تھی جو مغربی سمت آگے جا کر ضلع لاہل پور کی اراضی سے مل جاتی تھی۔ لاہل پور کی حدود میں پھیلا گاؤں حویلی مراد تھا۔ مرزا پور اور حویلی مراد میں لگ بھگ آٹھ میل کا فاصلہ تھا۔ یہ دونوں اپنے اپنے ضلع کے سرحدی گاؤں تھے۔

جائے وقوعہ ایک ایسا کھیت تھی جس میں آدمی فصل کی کٹائی ہو چکی تھی اور آدمی فصل ابھی باقی تھی۔ متوال نبیل عرف جیلا کی لاش کھیت کے اس حصے میں پڑی تھی جہاں کٹائی کا عمل جاری تھا۔

میں انکڑوں چیل کر جیلا کی لاش کا معائنہ کرنے لگا۔ متوال کی کھوپڑی کا براہر کیا گیا تھا۔ سر کے عقبی حصے میں کسی بھاری آہنی شے سے ایسی خوف ناک ضرب لگائی گئی تھی کہ اس کی کھوپڑی فتح کر رہ گئی تھی۔ کھوپڑی کی حالت بتاتی تھی کہ اس مہلک ضرب کے بعد وہ چند منٹ میں ”انا اللہ“ ہو گیا ہوگا۔ سر والی چوٹ سے نکلنے والے خون نے اس کا چہرہ اور بدن کا بالائی حصہ تر بہ کر دیا تھا تاہم اس وقت وہ خون جم کر خشک ہو چکا تھا۔ میرے مختص انداز سے کے مطابق، جیلا کو موت کے منہ میں گئے بارہ گھنٹے سے زیادہ کا وقت ہو چکا تھا۔

میں نے الٹ پلٹ کر جیلا کی لاش کا معائنہ کیا تو اس کے بائیں ہاتھ پر ایک پٹی باندھی دکھائی دی۔ پٹی والا کپڑا بھی خون آلود تھا اور یہ خون اس کے ہاتھ والے زخم سے خارج ہو کر کپڑے تک پہنچا تھا۔ جیلا کی کھوپڑی کے عقبی حصے پر نکلنے والی چوٹ سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس کی بے خبری میں سر کو نشانہ بنایا گیا تھا۔ اس کی لاش کے قریب ہی درستی بھی پڑی ہوئی تھی اور ایک جانب کٹی ہوئی گندم کا انبار بھی دکھائی دے رہا تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں قطعاً کوئی دشواری محسوس

”ایسا اس نے ساتھ نہیں تھا۔ جب میں نے شیلہ سے جیلا کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ فصل کاٹنے ہوئے دراق سے جیلا کا ہاتھ زخمی ہو گیا تھا لہذا اس نے جیلا کے ہاتھ پر ہٹی باندھی اور اسے گھر جانے کے لیے کہہ دیا پھر وہ خود اپنے کام میں مصروف ہو گیا تھا۔“

”اوہ.....“ میں نے ایک گہری سانس خارج کی۔ ”جیلا مغرب کی اذان سے پہلے ہی کھیتوں سے روانہ ہو گیا لیکن گھر نہیں پہنچا۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ جیلا کتنے بچے کھیتوں سے نکلا تھا؟“

”اگر آپ یہ سوال شیلہ سے کریں تو وہ آپ کو بہتر طور پر بتا سکے گا۔“ وہ بے بسی سے بولا۔ ”میرا دام کام نہیں کر رہا تھا نہ دار صاحب۔“

”ٹھیک ہے، باقی کی پوچھ مجھ میں شیلہ سے کرتا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”بس، تم آخری سوال کا جواب دے دو.....“ لچائی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس لی پھر پوچھا۔

”جب گزشتہ رات جیل عرف جیلا گھر نہیں پہنچا تو آپ لوگوں کو تشویش نہیں ہوئی۔ آپ لوگوں نے اسے تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی؟“

”ہم نے پورا مرزا پور چھان مارا تھا۔“ وہ دہمی لہجے میں بولا۔ ”پوری رات ہم نے پریشانی میں جاگ کر گزار دی ہے۔ اس کی ماں کا تو برا حال تھا۔ ہماری نظریں گھر کے دروازے پر لگی ہوئی تھیں۔ ہوا سے دروازہ ہلکا تھا تو یہی لگتا تھا کہ جیلا آ گیا ہے لیکن وہ نہیں آیا..... اور پھر صبح اس کی موت کی خبر آ گئی۔“

”جیلا کی موت کی خبر آپ لوگوں تک کس نے پہنچائی تھی؟“ میں نے استفسار کیا۔ ”شوکت علی نے۔“ رفیق نے بتایا۔ ”کون شوکت علی؟“

”مرزا پور ہی کا وسیک ہے جی۔“ اس نے جواب دیا۔ ”چار سال پہلے تو ج میں بھرتی ہوا تھا۔ آج کل چھٹی پر گاؤں آیا ہوا ہے۔“

”ٹھیک ہے رفیق!“ میں نے اس کا کندھا چھو تپا ہے ہوئے کہا۔ ”اب تم گھر جا کر آرام کرو۔ اگر کوئی ضروری بات ہوئی تو میں تمہیں تھانے بلالوں گا یا خود تمہارے گھر آ جاؤں گا۔“

میں نے رفیق کو فارغ کرنے کے بعد موقع پر موجود افراد سے بھی پوچھ چوچھ کی لیکن کوئی خاص بات پتا نہ چل سکی۔

تھوڑی دیر بعد فوجی جوان شوکت علی بھی وہاں آ گیا تو میں نے اس سے بھی دو باتیں کر لیں۔ شوکت علی کی عمر پچیس کے ارد ب قریب رہی ہوگی۔ وہ ایک گہرو جوان تھا، میں نے رکی علیک سلیک کے بعد اس سے کہا۔

”شوکت علی! مجھے پتا چلا ہے کہ جیلا کی لاش آج صبح تم نے دریافت کی ہے؟“

”میں نے نہیں۔“ ڈبوئے۔ ”وہ ذوقی اعزاز میں بولا۔ میں نے انہیں زندہ انداز میں پوچھا۔ ”ڈبو کون؟“

”ڈبو میرے کتے کا نام ہے۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”اوہ.....“ میں نے غصہ سے ہونے لہجے میں کہا۔

”تفصیلات کیا ہیں؟“

”تھانے دار صاحب! میں نے ایک ٹل ڈاگ بالا ہوا ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”اگرچہ میرا زیادہ تر وقت پاک وطن کی سرحدوں کی حفاظت میں گزارتا ہے لیکن میں جب بھی چھٹی پر مرزا پور آتا ہوں تو ڈبو پر خاص توجہ دیتا ہوں جس میں صبح کی سیر بھی شامل ہے۔“ وہ لمبے بھر کو رکا۔ ایک گہری سانس لی پھر سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے بولا۔

”آج صبح بھی میں ڈبو کے ساتھ دریا کی طرف جا رہا تھا۔ جب میں رفیق کے کھیتوں میں سے گزارا تو ڈبو نے ایک طرف گردن اٹھا کر زور زور سے بھونکن شروع کر دیا۔ میں نے اس کی ”آواز“ پر توجہ دی اور اس کی رسی کو ڈھیلا کر دیا پھر خود بھی اس کے ہمراہ بھاگنے لگا۔ ڈبو مجھے اس مقام پر لے گیا جہاں جیلا کی لاش پڑی تھی۔ بس، یہ ہے ساری کہانی۔“

کتا بہت حساس جانور ہے۔ اس کی سونگھنے کی حس بہت تیز ہوتی ہے۔ اسی طرح اس کی سننے کی حس بھی قابل ذکر ہے۔ ڈبو نے اپنی قوتِ شامہ اور قوتِ سماعت کی مدد سے جیلا کی لاش کو دریافت کر لیا تھا۔ میں نے ب کوفارغ کیا اور ٹھیک عرف شیلہ سے پوچھ چوچھ کرنے لگا۔

متنول جیل عرف جیلا کی عمر کا اندازہ میں نے میں کے آس پاس لگا لیا تھا۔ ٹھیک عرف شیلہ اپنے متنول بھائی سے پانچ سال بڑا تھا۔ میں نے نہایت ہی مختصر مگر مناسب الفاظ میں شیلہ سے جیلا کو پیش آنے والے واقعے پر گہرے دکھ اور رنج کا اظہار کیا پھر پوچھا۔

”مجھے پتا چلا ہے کہ تم نے فل بیا کو شام سے پہلے گھر بھیج دیا تھا لیکن وہ گھر نہیں پہنچا اور آج صبح اس کی لاش ملی ہے۔ یہ کیا معما ہے؟“

نفس کا قیدی

”میری تو خود کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا نے دار صاحب۔“ وہ خواب ناک لہجے میں بولا۔ ”پتا نہیں، کس ذلیل انسان نے میرے بھائی کی جان لے لی۔ بھائی، بھائی کا بازو ہوتا ہے.....“ اس کی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔ ”اب میں جیلا کے بغیر کیسے جی سکوں گا!“

اس کی تم آٹھیں اندر سے کبوتر کے خون کے مانند سرخ ہو رہی تھیں۔ یقیناً رفیق کی طرح وہ بھی ساری رات جاگتا رہا ہوگا۔ یہ لالی رت جگے ہی کی تھی۔ اس پر منتظر اچھوٹے بھائی کی حسرت ناک موت نے اسے اندر باہر سے توڑ کر رکھ دیا تھا۔

”وہ ذلیل انسان زیادہ دیر تک میرے ہاتھ سے بچ نہیں سکتا۔“ میں نے ٹھیک کا کندھا چھو تپا ہے ہوئے کہا۔ ”تمہیں حوصلے سے کام لینا ہوگا اور میرے ساتھ تعاون بھی کرنا ہوگا۔“

”میں ہر قسم کے تعاون کے لیے تیار ہوں جی۔“ وہ ہاتھ کی پشت سے اپنی آنکھوں میں اتر آنے والے آنسوؤں کو صاف کرتے ہوئے بولا۔ ”آپ حکم کریں۔“

پتا نہیں، کیوں..... مجھے یوں محسوس ہوا تھا کہ جیسے اس کا لہجہ، اس کی سوچ کا ساتھ نہ دے رہا ہو۔ مطلب یہ کہ اس کے الفاظ..... اور چہرے کے تاثرات میں رپلا نظر نہیں آتا تھا۔ شاید یہ غلط فہمی کا نتیجہ تھا۔ جیلا کی ناگہانی موت نے اسے بری طرح بے حال کر رکھا تھا۔

”مجھے بتایا گیا ہے کہ تم نے پچھلے روز جیلا کو شام سے پہلے گھر بھیج دیا تھا۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ”اس کی کوئی خاص وجہ؟“

”گندم کاٹنے ہوئے اس کے بائیں ہاتھ پر دراقی چل گئی تھی جس نے جیلا کی دو انگلیوں کو بری طرح زخمی کر دیا تھا۔“ شیلہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”میں نے جلدی سے اس کے ہاتھ پر ہٹی باندھی اور اسے گھر جانے کے لیے کہا۔ بس، اتنی ہی بات ہے۔“

”ہاتھ زخمی ہونے والا واقعہ کل کتنے بجے پیش آیا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”صبر کا وقت تھا جی۔“ اس نے بتایا۔ ”میں نے اذان کی آواز بھی سنی تھی۔“

”تو کیا تمہارے کہنے پر جیلا گھر چلا گیا تھا؟“

”پتا نہیں جناب۔“ وہ جربز ہوتے ہوئے بولا۔ ”میں نے دیکھا نہیں تھا۔“

”دیکھا نہیں تھا..... کیا مطلب؟“ میں نے چونک کر

اس کی طرف دیکھا۔ ”کیا تم دونوں بھائی ایک ہی کھیت میں فصل کی کٹائی نہیں کر رہے تھے؟“

”جی نہیں۔“ وہ ٹپکی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”جیلا تو اسی کھیت میں گندم کاٹ رہا تھا جہاں اس کی لاش پڑی لی ہے جبکہ میں دوسری جانب ایک اور کھیت میں تھا۔ میں تو یہی سمجھا تھا کہ وہ میرے کہنے پر کام چھوڑ کر گھر چلا گیا ہوگا لیکن یہ تو کوئی اور ہی قصہ نکل آیا۔“

”مثلاً..... کون سا قصہ نکل آیا؟“ میں نے بے ساختہ پوچھا۔

”بھئی..... بھئی کہ..... وہ گھر نہیں گیا اور.....“ وہ نکلت زندہ انداز میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”اور اصرار ہی کام میں لگا رہا اور..... کسی بد ذات نے اسے قتل کر دیا۔“ بات کے اختتام پر وہ باقاعدہ ہچکیاں لینے لگا۔

میں نے چند لمحوں انتظار کیا کہ اس کی حالت سنبھل جائے پھر پوچھا۔ ”تم کون سے کھیت میں فصل کاٹ رہے تھے؟“

اس نے ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔ ”وہاں.....!“

مذکورہ کھیت، جائے وقوعہ سے کافی فاصلے پر تھا۔ ان دونوں کھیتوں کے بیچ چار پانچ کھیت آتے تھے جن میں گندم کی فصل تیار کھڑی تھی۔ یہ سارے کھیت (کم و بیش پندرہ ایکڑ اراضی) رفیق کی ملکیت تھے جس میں فصل کی کٹائی کا مکمل جاری تھا۔ ایک سرے سے جیلا اور دوسرے سرے سے شیلہ گندم کی کٹائی کا کام کر رہے تھے۔ جائے وقوعہ گاؤں کی مخالف والی سمت میں تھا جبکہ جس کھیت میں شیلہ کٹائی کر رہا تھا، وہ گاؤں والی سمت کی ایک سائز پر تھا۔ شیلہ نے مجھے بتایا کہ گزشتہ روز اس نے مغرب سے تھوڑی دیر پہلے اپنا کام روکا اور پھر گھر کی جانب روانہ ہو گیا۔

”جب تم کام ختم کر کے گھر جا رہے تھے تو تم نے جیلا والے کھیت کی طرف جھانکا تھا؟“ میں نے ایک نوری خیال کے تحت پوچھ لیا۔

”نہیں جی، میں نے اس کی ضرورت محسوس نہیں کی۔“ وہ ٹپکی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”میرے ذہن میں یہی تھا کہ جیلا گھر جا چکا ہوگا لہذا میں بھی سدا گھر ہی چلا گیا تھا۔“

”لیکن جیلا گھر نہیں پہنچا اور یہ تو بیشک بات تھی۔“ میں نے غصہ سے ہونے انداز میں کہا۔ ”کیا تم نے یہ پتا کرنے کی کوشش کی کہ وہ کہاں غائب ہو گیا؟“

مشتاق باجوہ سے رکی سی پوچھ کچھ کے بعد میں مذکورہ حوالہ آ کر لکھ کو اپنے ساتھ لے آیا اور مشتاق باجوہ کو ہدایت کر دی کہ وہ اگر کوئی بھی غیر معمولی بات دیکھے یا محسوس کرے تو فوراً مجھے اطلاع دے۔ اس نے میرے احکام پر عمل کرنے کا یقین دلایا تھا۔

مشتاق باجوہ کی راضی شیخ پورہ اور لائل پور کی سرحد کے ساتھ گلی ہوئی تھی تاہم اس کا شمار مرزا پور یعنی شیخ پورہ ہی میں ہوتا تھا۔ جیسا کہ میں نے پہلے ہی بتایا کہ دوسری جانب ضلع لائل پور کا پہلا گاؤں حویلی مراد تھا جہاں متحول کا تیا صدیق طوائی رہتا تھا۔ مرزا پور اور حویلی مراد میں آٹھ میل کا فاصلہ مائل تھا جس کے دو میل شیخ پورہ میں اور چھ میل لائل پور کے علاقے میں آتے تھے۔

جیلا کا قتل مرزا پور (شیخ پورہ) میں ہوا تھا اور یہ ہتھوڑا شیخ پورہ کے آخری کنارے پر مشتاق باجوہ کے کھیتوں سے ملا تھا جس سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ اگر اسی ہتھوڑے سے جیلا کو قتل کیا گیا تھا تو قاتل اپنا کام کرنے کے بعد لائل پور کی طرف گیا تھا اور راستے میں اس نے یہ ہتھوڑا مشتاق باجوہ کے کھیتوں میں چھپک دیا تھا۔ اس کا ایک اور بھی مطلب تھا اور وہ یہ کہ قاتل کا تعلق لائل پور کے سرحدی گاؤں حویلی مراد سے ہو سکتا تھا.....!

اس خیال نے میرے اندر سنسنی کی ایک لہری دوڑا دی۔ اگر میں درست سمت میں سوچ رہا تھا تو پھر اس امر میں کسی شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی تھی کہ جیلا کے ساتھ دشمنی حویلی مراد کی جانب سے کی گئی تھی۔

میں نے مذکورہ خون آلود ہتھوڑے کو لیبارٹری ٹیسٹ کے لیے ضلعی اسپتال بھجوا دیا تاکہ اس بات کی تصدیق ہو سکے کہ اس کے سر پر پائے جانے والے بال جیلا ہی کے تھے یا کسی اور کے۔ دینے بجھے اس بات کا یقین تھا کہ میں آ کر قاتل تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اگر یہ ہتھوڑا کسی اور جگہ استعمال ہوا ہوتا تو پھر اس کے سر پر انسانی بالوں کی موجودگی کا کوئی جواز نہیں جتا تھا اور وہ بھی خون میں چپکے ہوئے بال.....!

اگرچہ مرزا پور اور حویلی مراد کے درمیان زیادہ فاصلہ نہیں تھا لیکن حویلی مراد کا علاقہ تیسرے قحطی کے حدود میں نہیں آتا تھا کیونکہ حویلی مراد ضلع لائل پور میں تھا اور مرزا پور ضلع شیخ پورہ میں۔ میں نے آئندہ روز حویلی مراد جانے کا پروگرام ترتیب دیا اور اپنے کوارٹر میں آ گیا۔

میرے اندر سے یہ آواز آ رہی تھی کہ حویلی مراد کا

ابا کار خاے مستعد اور کھون لگانے کے باہر ثابت ہوئے تھے جی میں نے انہیں اس نوعیت کی ذمہ داری سونپی تھی۔ شام سے تھوڑی دیر پہلے ایک اہم اطلاع مجھے تک پہنچی۔ اطلاع کنندہ بھی ایک کسان ہی تھا جس کی زمین شیخ پورہ اور لائل پور کی سرحد کے ساتھ گلی ہوئی تھی۔ مذکورہ کسان کا نام مشتاق باجوہ تھا۔ میں نے مشتاق باجوہ کو فوراً اپنے پاس بلا لیا۔

مشتاق باجوہ کی عمر چالیس سے تجاوز تھی۔ وہ ایک پت قامت اور فربہ اندام شخص تھا۔ میں نے اسے بیٹھنے کے لیے کہا اور پوچھا۔

”باجوہ جی! کیا خبر لائے ہو؟“

”میرے کھیتوں میں ایک ہتھوڑا ملا ہے سرکار۔“ وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔ ”بس جی..... یہی بتانے آپ کے پاس چلا آیا ہوں۔“

”کیسا ہتھوڑا؟“ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”کہاں ہے وہ ہتھوڑا؟“

”وہ تو ادھر میرے کھیتوں ہی میں پڑا ہے۔“ وہ جلدی سے بولا۔ ”میں نے اسے اٹھا لیا ہتھوڑا لگانے کی بھی کوشش نہیں کی۔ مجھے پتا چلا ہے، جیلا کو کسی ایسے اوزار سے ہلاک کیا گیا ہے اسی لیے میں نے اس ہتھوڑے کو بالکل نہیں چھینڑا اور سیدھا آپ کے پاس چلا آیا ہوں۔“

”یہ تم نے شکل مندی کا ثبوت دیا ہے باجوہ۔“ میں نے سراہنے والی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ خوش ہو گیا۔

میں نے ایک کانٹیل کو ساتھ لیا اور مشتاق باجوہ کی معیت میں اس مقام پر پہنچ گیا جہاں مذکورہ ہتھوڑا پڑا ہوا تھا۔ دھوپ کا زور تو ٹوٹ چکا تھا تاہم فضا میں ابھی تک حرارت اور تازگی موجود تھی۔۔۔ سورج غروب ہونے میں ابھی کم دہائیں ایک گھنٹا باقی تھا۔

میں نے انکڑوں بیچہ کر اس ہتھوڑے کا جائزہ لیا اور میرے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔ ہتھوڑے کے سر پر یعنی اس کے آہنی حصے پر خشک خون لگا ہوا تھا اور اس جتنے ہوئے خون میں مجھے چند بال بھی چپکے دکھائی دیے۔ مذکورہ ہتھوڑے کا سر اتنا زہنی تھا کہ اس کی ایک ہی ضرب کسی بھی انسان کی کھوپڑی کو چھاننے کے لیے کافی تھی۔ اگر جیل عرف جیلا کو اسی ہتھوڑے کی مدد سے موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا تو پھر یہ بات بھی ملے تھی کہ اس کے سر پر جما ہوا خون اور اس خون کے ساتھ چپکے ہوئے بال یقیناً جیلا ہی کے تھے۔

رشتے داری کا تنازع تھا۔“ میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا پھر کھیل سے پوچھا۔ ”کیا جیلا کا کسی سے رقم کے لین دین کا کوئی معاملہ تھا؟“

”نہیں جی۔ میرے علم میں تو ایسی کوئی بات نہیں۔“ وہ جلدی سے بولا۔ ”اگر ایسا کچھ تھا تو وہ جیلا ہی کو پتا ہوگا۔“ یہ تو مجھے احساس ہو گیا تھا کہ قاتل کی اچال کھیل سے کام کی کوئی بات معلوم نہیں ہو سکتی تھی لہذا میں نے اسے اس تاکید کے ساتھ فارغ کر دیا۔

”کھیل! تم اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھنا۔ جیسے ہی تمہیں کوئی خاص بات پتا چلے مجھے فوراً اطلاع کرنا۔“ اس نے میری ہدایت پر عمل کرنے کا وعدہ کیا اور میں دوپہر سے تھوڑی دیر پہلے قحطی کے واپس آ گیا۔ وہی وقت تھا جب سورج، بقیول کے، سواتیزے پر آ تھا اور ہر کوشت و پوست کے جان دار کو کٹائی بنانے کے موڈ میں تھا۔

☆☆☆

قتل کی کسی بھی واردات کی تفتیش میں دو چیزیں نہایت ہی اہمیت کی حامل ہوتی ہیں۔ اول، قاتل کا تحرک دوم، آ کر قاتل..... اور جیلا کے قتل کے سلسلے میں، ابھی تک یہ دونوں چیزیں میری دسترس سے باہر تھیں۔ میری اب تک کی پوچھ کچھ کے نتیجے میں یہی بات سامنے آئی تھی کہ متحول کی کسی کے ساتھ کسی قسم کی دشمنی نہیں تھی لیکن میں یہ بات ماننے کو ہرگز تیار نہیں تھا کیونکہ جس انداز میں جیلا کی زندگی کا چراغ گل کیا گیا تھا، وہ شدید ترین پاپندیدگی اور گہری نفرت کو ظاہر کرتا تھا اور جہاں تک آ کر قاتل کا معاملہ تھا تو میرے حیطہ اندازے کے مطابق وہ کوئی آہنی سلاح، کوئی ہتھوڑا یا کوئی بھی لوہے کی بھاری شے ہو سکتی تھی۔ جیلا کی کھوپڑی کا مقبض حصہ اتنی بے دردی سے چٹخا یا گیا تھا کہ بھیجا بھی باہر جھانکنے لگا تھا۔ یہ کاری ضرب شدید شیش اور غیٹہ و غضب کے عالم میں ہی لگائی گئی تھی۔

میں نے اپنے ایک سادہ لباس الہکار کو اس کام پر مامور کر دیا کہ وہ مرزا پور میں کچھ پھر کر معلوم کرنے کی کوشش کرے کہ متحول کی کسی شخص کے ساتھ کسی قسم کی دشمنی یا کم از کم ناراضی تو نہیں تھی۔ میں نے ایسے ہی ایک اور سادہ لباس الہکار کو حویلی مراد روانہ کر دیا۔ رفتی نے مجھے بتایا تھا کہ متحول جیلا کی اپنے تیا کی بیٹی نبیلہ سے شادی ہونے والی تھی۔ متحول کا تیا صدیق حویلی مراد ہی کا گاؤں میں رہتا تھا۔ اس الہکار نے حویلی مراد میں کن لینا تھی کہ شاید قاتل کی اس واردات کا کوئی سراغ مل جائے۔ یہ دونوں

”جی..... میں نے پورے مرزا پور میں اسے دھونڈنے کی کوشش کی۔“ وہ دھکی لہجے میں بولا۔ ”لیکن وہ کہیں نہیں ملا..... آہ! میرا بھائی.....!“

”کیا تم جیلا کو تلاش کرتے ہوئے اپنے کھیتوں کی طرف بھی گئے تھے؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں جی..... میں ادھر نہیں گیا۔“ وہ ابھمن زدہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

”کیوں؟“ میں نے سرسراہتی ہوئی آواز میں استفسار کیا۔

”سیدھی سی بات ہے جی.....“ میرے سوال کے جواب میں اس نے بتایا۔ ”ادھر اس وقت کون ہو سکتا تھا۔ کھیتوں میں کام کرنے والے لوگ اندر میرا ہونے سے پہلے اپنے اپنے گھروں میں چلے جاتے ہیں اور جیلا کو تو میں نے عصر کے وقت ہی وہاں سے مخرج دیا تھا اس لیے کھیتوں میں جا کر، رات کے اندر میرے میں اسے تلاش کرنے کا خیال میرے ذہن میں ہی نہیں سکتا تھا۔“

”تمہارے خیال میں جیلا کی موت کا ذمہ دار کون ہو سکتا ہے؟“ میں نے نفوس لہجے میں استفسار کیا۔

”م..... مجھے..... کیا پتا۔“ جواب.....! ”وہ بری طرح گڑبڑا گیا۔“ میں..... اس بارے میں کچھ..... نہیں بتا سکتا.....“

”تمہیں کسی پر شک ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں..... نہیں جناب۔“

”دیکھو کھیل! پولیس کے کام کرنے کا اپنا ایک انداز ہے۔“ میں نے اس کی گھبراہٹ کو رفع کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”ہمیں تفتیش کا آغاز کرنے کے لیے کسی اشارے کی ضرورت ہوتی ہے۔ تمہارے باپ نے مجھے بتایا ہے کہ جیلا کی کسی کے ساتھ کوئی دشمنی وغیرہ نہیں تھی اور تمہیں بھی کسی پر شک نہیں ہے تو پھر تفتیش کی گاڑی آگے کیسے بڑھے گی.....“ لگائی توقف کر کے میں نے ایک آسودہ سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”یہ تم بھی مانو گے کہ جس شخص نے بھی تمہارے بھائی کی جان لی ہے، وہ اس سے شدید نفرت کرتا تھا..... تم نے جیلا کی لاش کا معائنہ کیا ہے؟“

”اللہ غارت کرے اس بد بخت کو۔“ وہ آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”پتا نہیں، ہماری خوشیوں کو کس منہوں کی نظر لگ گئی ہے.....“

”متحول کی کسی سے کوئی دشمنی نہیں تھی اور نہ ہی کوئی

دورہ کافی سودمند ثابت ہوگا۔ شاید یہ میری چھٹی حس تھی!

☆☆☆

آئندہ روز میں علی الصباح لاکھ پور کے لیے روانہ ہو گیا۔ اگر میں حویلی مراد جانے کے لیے چھتوں والا راستہ اختیار کرتا تو زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے میں وہاں پہنچ جاتا لیکن مجھے ڈائریکٹ وہاں نہیں جانا تھا۔ اس سلسلے میں ٹکڑے جاتی خانہ پُری بہت ضروری تھی۔ حویلی مراد ضلع لاکھ پور میں تھا اور یہ علاقہ میرے تھانے کی حدود میں نہیں آتا تھا لہذا وہاں کسی قسم کی تقویت سے پہلے متعلقہ افراد کو اطلاع دینا ضروری تھا۔

میں پہلے ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر لاکھ پور پہنچا۔ وہاں متعلقہ افسران کو اپنی آمد کی غرض و غایت سے آگاہ کیا۔ اس کے بعد میں اس تھانے میں پہنچ گیا جس کی حدود میں حویلی مراد آتا تھا۔ وہاں کا تھانہ انچارج میرا پرانا شاستا تھا۔ اس نے میرا پُر تپاک استقبال کیا اور جب میں نے اسے اپنی آمد کے بارے میں بتایا تو اس نے دوستانہ انداز میں کہا۔
”ملک صاحب! آپ نے خواہ مخواہ ہیڈ کوارٹر میں حاضری لگانے کی رحمت کی۔ سید حامیرے پاس آ جاتے۔ یہ تھانہ بھی آپ ہی کا ہے۔“

”آپ کی محبت اور غلوں کی میں دل سے قدر کرتا ہوں۔“ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔
”لیکن ضابطے کی کارروائی بھی ضروری ہے نا۔ اگر کوئی کام طریقے سلیقے سے ہو جائے تو اس میں کیا حرج ہے۔“
”آپ ٹھیک کہتے ہیں ملک صاحب۔“ اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ”واقعی اس میں کوئی حرج نہیں۔ آپ چاہیں تو میرے محلے میں سے ایک دو اہلکار بھی اپنے ساتھ لے جائیں۔ آپ مجھے ہر قسم کے تعاون کے لیے ہمیشہ تیار رہیں گے۔“

میرا ایک خاص آدمی سادہ لباس میں پہلے سے حویلی مراد میں موجود تھا۔ میں نے تھانہ انچارج کو اس کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا، میں نے کہا۔

”آپ کے تعاون کا بہت شکریہ جناب لیکن میں سمجھتا ہوں کہ زیادہ بھیڑ بھاڑ لگانے کی ضرورت نہیں۔ میں بہت سادگی کے ساتھ متحمل کی ہونے والی سسرال سے تھوڑی پوچھ کر دوں گا اور وہاں چلا جاؤں گا۔“

”جیسی آپ کی مرضی صاحب۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لیے میں بولا۔ ”کسی بھی سرے پر اگر میری یا میرے محلے کی مدد کی ضرورت پیش آئے تو کسی تکلف کی ضرورت نہیں۔ میں حاضر ہوں۔“

”ضرور بتاؤں گا۔ اگر ضرورت محسوس ہوئی تو۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”اور کوئی خاص بات پتا چلی تو وہ بھی آپ سے شیئر کروں گا۔“

”اس اعتماد اور بھروسے کا شکریہ ملک صاحب!“ وہ زبردست مسکراتے ہوئے بولا۔

تھانہ انچارج نے ٹھنڈے مشروب سے میری تواضع کی اور مجھے ایک تانے میں بٹھا کر حویلی مراد کی جانب روانہ کر دیا۔

”حویلی مراد“ کا نام چودھری مراد علی کے نام پر رکھا گیا تھا لیکن اب چودھری مراد اس دنیا میں باقی نہیں تھا۔ کافی عرصہ پہلے اس کا انتقال ہو گیا تھا۔ ان دنوں چودھری مراد کا پوتا چودھری امداد اس گاؤں کا والی وارث تھا۔ مجھے پتا چلا کہ چودھری امداد علی کے باپ چودھری ششاد کا دو سال پہلے انتقال ہو گیا تھا۔ اس کے بعد چودھری امداد علی نے اس گاؤں کی چودھراہٹ سنبھال لی تھی۔ میں چودھری امداد اور اس کی حویلی کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھتا پوچھتا سید حاصد ترقی ملواری کی دکان پر پہنچ گیا۔

مذکورہ دکان بند تھی۔ میں نے پڑوسی دکان دار سے پوچھا۔ ”صدا ترقی نے آج دکان نہیں کھولی؟“
اس نے آنکھیں میچ کر کھولیں پھر گہری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”آپ کو پہلے بھی نہیں دیکھا۔ کیا آپ حویلی مراد میں رہتے ہو؟“

میں اس وقت سول ڈپارٹمنٹ میں تھا۔ اگر میں پولیس کے یونٹارم میں ہوتا تو یہ دکاندار مجھے دیکھتے ہی چونک جاتا۔ میں نے اس عمر رسیدہ شخص کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

”ہاں چاچا..... میں ادھر ایک دو بار ہی آیا ہوں۔“
”کہاں سے آئے ہو جوان؟“ وہ دلچسپی لیتے ہوئے بولا۔

”نوپہ ٹیک سنگھ سے آیا ہوں۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”صدا ترقی سے میری دور کی رشتے داری ہے۔ اسی سے ملنے آیا تھا لیکن اس کی دکان بند پڑی ہے۔ لگتا ہے، مجھے اب اس کے گھر ہی جانا ہوگا۔“
”گھر جانے کا بھی کوئی غائدہ نہیں۔“ صدا ترقی ملواری کے پڑوسی دکاندار نے بتایا۔

”قائمہ کیوں نہیں چاچا؟“ میں نے سوالیہ نظروں سے اسے گھورا۔

اس شخص کی عمر ساٹھ سے ستواڑھ تھی تاہم وہ ساٹھا پانچوا

کے نزدیک کھٹک آیا اور پوچھا۔
 ”چاچا! تم تو ایسے کبہ رہے ہو جیسے کمالا کے بیٹے جتا
 میں کوئی عیب ہو.....؟“
 ”اللہ تمہارا بھلا کرے۔“ وہ آنکھیں سکڑ کر مجھے
 دیکھتے ہوئے بولا۔ ”جتنی کوئی ایک نقص ہو تو بتاؤں گا۔
 اس کی ایک آنکھ کا رخ گل ہے اسی لیے اسے اس کا ناجا
 کہتے ہیں۔ آج تک کسی نے اسے سیدھے نام ”جمال دین“
 سے نہیں پکارا۔ پھر وہ کچھ کرتا کرتا ابھی نہیں۔ اپنے بڑے
 باپ کی مدد کرنے کے بجائے وہ سارا سارا دن آوارہ گردی
 میں گزار دیتا ہے۔ ایسے لنگھے آوارہ سے صد ہا کیسے اپنی
 پھول ایسی بیٹی کی شادی کرو تا۔“
 ”خٹک کہتے ہو چاچا! ماں باپ کو اپنی اولاد کے
 مستقبل کے بارے میں بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا
 چاہیے۔“ میں نے تائیدی انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ”صد ہا
 نے اس رشتے سے انکار کر دیا، یہ اس کا حق تھا، پھر نہ ماری
 کیسی.....؟“
 ”کمالا تو انکار سن کر خاموش ہو گیا تھا۔“ خیر دے بتایا۔
 ”مگر کمالا جیسا پر بہت تھلا یا تھا۔ اس نے ادھر ادھر ایسی
 باتیں بھی کیں جن سے دھمکی مچتی تھی۔ مثلاً اس نے کسی سے کہا
 میں لوہار کی اولاد ہوں۔ میرا ہاتھ کسی ہتھوڑے سے کم
 نہیں۔ ایک ہاتھ بھی پڑ گیا تو ہوش ہٹکا نے آ جا میں گے۔“
 ”اوہ..... واقعی.....؟“ میں نے تشویش بھرے لہجے
 میں کہا۔ ”جیسا کہ میں نے تو خطرناک دھمکی پوچھ دی ہے۔“
 ”میرا خیال ہے، یہ سب اس کی جھنجھلاہٹ کا نتیجہ
 تھا۔“ خیر دین نے کہا۔ ”جیسا کہ ایسی باتیں سن کر ہی صد ہا
 نے کمالا کو لہار سے بات کی تھی۔ تمہاری گرامری ہوئی اور
 معاملہ رفع دفع ہو گیا تھا۔“
 خیر دین معاملے کے ”رفع دفع“ ہونے کی بات کر رہا
 تھا لیکن میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بج رہی تھی۔ میں
 نے جیلا کی لاش کا پھر جائزہ لیا تھا۔ اس کے سر کے عقبی
 حصے میں کسی بھاری آہنی شے سے ضرب لگا کر کھوپڑی کو
 چٹا یا گیا تھا اور پھر مشتاق باجوہ کے کھنٹوں میں سے ایک
 خون آلود ہتھوڑا بھی برآ دھوا تھا جس پر جے ہوئے خون
 میں انسانی بال بھی چپکے ہوئے تھے۔ اغلب امکان یہی تھا
 کہ جیلا کو کسی ہتھوڑے کی مدد سے موت کے گھاٹ اتارا
 گیا تھا اور اب..... خیر دین چاچا مجھے کمالا کے نادر خیالات
 سے آگاہ کر رہا تھا..... میں لوہار کی اولاد ہوں۔ میرا ہاتھ
 کسی ہتھوڑے سے کم نہیں۔ ایک ہاتھ بھی پڑ گیا تو ہوش

”ماں صد ہا! کہتے تو تم خٹک ہی ہو۔“ رفتی نے
 کہی۔ ”نہی کی ہے کہا۔“ لیکن جیلا ضد کر رہا ہے کہ وہ نبیلہ
 - ثانی کی کرے گا۔“
 ”خٹک ہے رفتی! ہم جیلا کی ضد پوری کر دیتے
 ہیں۔“ صد ہا نے قسمی لہجہ میں کہا۔ ”میں اپنی اولاد کی
 نیشوں کا خیال رکھنا چاہیے۔“
 ”پتر جواد.....!“ اپنی بات کی وضاحت کرنے کے
 بعد خیر دین چاچا مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”میں سمجھتا ہوں، صد ہا کا
 پند کہ کوئی بیٹی نہیں تھا اس لیے اسے جیلا کی خواہش کی کچھ
 زیادہ ہی پروا تھی۔ خیر..... دونوں طرف کسی کو کوئی اعتراض
 نہیں تھا لہذا نبیلہ کا رشتہ جیلا سے طے ہو گیا اور صد ہا نے
 کچھ کی سائنس لی کہ بیٹی ٹھکانے لگی ورنہ وہ خاصا پریشان
 رہنے لگا تھا۔“
 آخری جملہ خیر دین چاچا نے بڑے معنی خیز انداز میں ادا
 کیا تھا لہذا میں نے سوال کرنے میں ذرا تردد کیا۔
 ”صد ہا کس بات کے لیے پریشان تھا چاچا؟“
 ”پتر! تم کافی سمجھدار اور سیانے ہو۔“ وہ سمجھانے
 والے انداز میں بولا۔ ”جس گھر میں جوان لڑکی ہوتی ہے
 وہاں سب کی نظریں لگی رہتی ہیں۔ کوئی بھی رشتہ بیچ دے،
 آپ اس کے سر میں ڈنڈا توڑی مار سکتے ہیں!“
 ”خٹک کہتے ہو چاچا۔“ میں نے کرید کا عمل جاری
 رکھتے ہوئے کہا۔ ”کیا نبیلہ کے اور بھی رشتے آئے
 ہوئے تھے؟“
 ”ہاں..... یہاں حویلی مراد میں بھی بعض لوگ نبیلہ
 کے رشتے میں دلچسپی لے رہے تھے۔“ اس نے گہری سنجیدگی
 سے بتایا۔ ”لیکن صد ہا چونکہ نبیلہ کو اپنے بھائی کے گھر میں
 بیٹا جاتا تھا اس لیے وہ سب کونخ ہی کرتا رہا۔ وہ اس
 ”انکار“ والے معاملات سے خاصا پریشان رہنے لگا تھا کیونکہ
 بعض لوگ انکار سن کر راضی بھی ہو جاتے تھے۔ کمالے سے
 تو اس کی اچھی خاصی منہ ماری بھی ہوئی تھی۔“
 ”کون کمالا؟“ میں نے سرسراہٹ ہوئی آواز میں پوچھا۔
 ”کمال دین لوہار پتر۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے
 بولا۔ ”ادھر حویلی مراد میں ایک ہی لوہار ہے..... کمالا۔ کمالا
 اپنے بیٹے جیلا کی شادی نبیلہ سے کرنا چاہتا تھا کیونکہ جیلا نبیلہ
 پر عاشق ہو گیا تھا مگر صد ہا نے چٹا انکار کر دیا اور..... اچھا
 ہی کیا۔“
 میرے اندر سنسنی کی ایک لہری دوڑ گئی۔ مجھے یوں
 محسوس ہوا کہ کوئی اہم بات سامنے آنے والی ہے۔ میں خیر دین

اس کی خوشیاں دیکھنا بھی نصیب نہ ہوئیں۔“ میں نے دل
 شکستہ لہجے میں کہا۔
 ”یہ دنیا دکھوں کی گھری ہے پتر۔“ وہ قلفیانہ انداز
 میں بولا۔ ”صد ہا کے پہلے دو بیٹے دو سال اور پانچ سال کی
 عمر میں فوت ہو گئے تھے۔ یہ نبیلہ اچھا اور ماحد کے بعد پیدا
 ہوئی تھی۔ صد ہا کا خیال تھا کہ وہ نبیلہ کی شادی اپنے چھوٹے
 بھائی رفتی کے بڑے بیٹے کھیل سے کرے گا۔ دونوں
 جانب رشتے کی بات چلی لیکن پھر اچانک سب کچھ بدل
 گیا.....“ وہ بولتے بولتے رک گیا۔
 ”سب کچھ بدلے کیسے ہو گیا؟“ میں نے چونکے ہوئے
 لہجہ میں دریافت کیا۔
 ”پتر! تم نے اپنا نام نہیں بتایا۔“ وہ اچانک مجھ سے
 مستغفر ہوا۔ ”اور یہ بھی بتاؤ، ادھر تو یہ کیک سنگھ میں تم کرتے
 کیا ہو؟“
 ”چاچا! میرا نام ملک جواد ہے۔“ میں نے جواب
 دیا۔ ”اور میں زمین دار کرتا ہوں۔ اللہ نے چند کٹے
 (ایکر) زمین دے رکھی ہے۔ بس عزت شرم سے گزارہ
 ہو رہا ہے۔“
 ”ملک جواد.....!“ وہ خود کلامی کے انداز میں بولا۔
 ”صد ہا نے بھی تمہارا ذکر نہیں کیا۔“
 ”تمہاری بہت دور کی رشتے داری ہے چاچا اور ملنا
 جانا بھی بہت کم ہوتا ہے۔“ میں نے بات بتاتے ہوئے کہا
 پھر اپنے مطلب کی طرف آتے ہوئے پوچھا۔ ”چاچا! تم
 ہمارے سنے کہ صد ہا نبیلہ کی شادی کھیل عرف شیلہ سے کرنا
 چاہتا تھا پھر سب کچھ بدل گیا.....؟“
 ”ہاں پتر!“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے
 بولا۔ ”رشتے کی بات تقریباً طے ہونے ہی والی تھی کہ جیلا
 نے ضد پکڑ لی۔“
 ”کیسی ضد؟“ میں نے پوچھا۔
 ”وہ نبیلہ سے شادی کرنا چاہتا تھا۔“ خیر دین چاچا نے
 بتایا۔ ”صد ہا کو جب اس بات کا پتا چلا تو اس نے زیادہ
 مزاحمت نہیں کی۔ وہ اپنے چھوٹے بھائی کے دونوں بیٹوں
 سے بہت محبت کرتا ہے اور انہیں اپنی ہی اولاد کی طرح سمجھتا
 ہے۔ اس نے رفتی سے کہا۔
 ”فیہا! میرے لیے تمہارے دونوں بیٹے برابر ہیں۔
 نبیلہ کی شادی شیلہ سے ہو یا جیلا سے، وہ تمہارے گھر ہی میں
 جائے گی۔ شیلہ کے بارے میں میرا خیال اس لیے تھا کہ وہ بڑا
 ہے، اصولی طور پر پہلے بڑے بیٹے کی شادی ہونا چاہیے۔“

کی عملی تفسیر دکھائی دیتا تھا۔ صد ہا نے طوائف کی دکان کے برابر
 میں اس نے پرچوں کی دکان کھول رکھی تھی۔ میرے
 استفسار پر اس نے بتایا۔
 ”مگر میں کوئی بھی نہیں ہے۔ وہ سب لوگ ادھر مرزا
 پور گئے ہیں۔“
 میری معلومات کے مطابق، صد ہا نے طوائف کی جیلی
 میں اس کی بیوی کیز قاطرہ اور بیٹی نبیلہ کے سوا اور کوئی نہیں
 تھا۔ میں نے کہا۔
 ”چاچا! تمہارا مطلب ہے صد ہا، اس کی گھر والی
 اور بیٹی تینوں مرزا پور گئے ہیں؟“
 ”جی..... میرا ایسی مطلب ہے۔“ اس نے اثبات میں
 گردن ہلائی۔ ”اس وقت صد ہا کے گھر پر تلا لگا ہوا ہے۔“
 مجھے یہ اندازہ قائم کرنے میں ذرا سی بھی وقت محسوس
 نہیں ہوئی کہ جیلا کے قتل کی خبر حویلی مراد پہنچ چکی تھی، ورنہ
 صد ہا ایڈکسپن کا باجماعت مرزا پور چلے جانے کا کوئی جواز
 نہیں دیتا تھا۔ اس دعا کا نام مجھے خیر دین معلوم ہوا تھا۔
 ”خیر دین چاچا.....“ میں نے تشویش بھرے لہجے میں
 استفسار کیا۔ ”یہ اچانک صد ہا کی بیوی بچوں کے ساتھ مرزا
 پور کیوں چلا گیا۔ سب خیر تو ہے؟“
 ”خیر نہیں ہے پتر۔“ وہ دھکی شکل بناتے ہوئے
 بولا۔ ”صد ہا نے اپنی لڑکی کی شادی چھوٹے بھائی کے
 بیٹے سے طے کر رکھی تھی۔ اس لڑکے کو کسی نے قتل کر دیا۔“
 ”اوہ.....“ میں نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے
 کہا۔ ”تم رفتی کے چھوٹے بیٹے کھیل عرف جیلا کی بات
 کر رہے ہو؟“
 ”ہاں پتر.....!“ اس نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔
 ”کل دن میں مرزا پور سے جیلا کے قتل کی خبر آئی تھی اور یہ
 لوگ کل شام سے پہلے ہی یہاں سے روانہ ہو گئے تھے۔“
 چاچا خیر دین سے واقف ہوا تھا۔ میں نے اس کی
 اسی فطرت یا عادت سے قانکہ اٹھانے کی کوشش کی اور
 بڑے دھیمے اور غیر محسوس انداز میں اسے گھنٹے لگا۔
 ”پچھلی دفعہ جب صد ہا میرے پاس نوپے کیک سنگھ
 آیا تھا تو اس نے بتایا تھا کہ اس سال جیسے ہی گرمیاں ختم
 ہوں گی، وہ نبیلہ کی شادی کر دے گا۔“
 ”ہاں پتر..... اس کا ارادہ تو بھی تمہارے..... وہ
 رنجیدہ ہو گیا۔“ اب تو جیلا ہی نہیں رہا..... پھر نبیلہ کی اس
 سے شادی کیسے ہوگی!“
 ”ہائے، بے چارے صد ہا کی ایک ہی بیٹی ہے اور

ٹھکانے آجائیں گے.....!

میں نے کانجا کے نام پر دائرہ لگا یا لیکن خیر و چاچا پر یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ میری اندرونی کیفیت کیا ہے۔ میں نے سرسری لہجہ میں کہا۔

”چاچا! تم نے سن رکھا ہوگا..... جو کہ جیتے ہیں، وہ برستے نہیں اور جو جوتکتے ہیں، وہ کاٹنے نہیں۔ بس، جہاں کی وہ بات بھی ایسی ہی ہوگی۔“

”ہاں بچہ۔ میرا بھی یہی خیال ہے۔“ وہ تائیدی انداز میں بولا۔ ”مٹی پاؤں کیسے کی باتوں پر.....“

اس لیے مجھے اس کا نشیلم کی جھلک نظر آئی جسے میں نے گزشتہ روز حویلی مراد کو دیکھا تھا۔ وہ مجھ سے کافی فاصلے پر کھڑا تھا لیکن ظاہر ایسا ہی کر رہا تھا کہ اسے خیر دین سے کوئی دلچسپی نہیں۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ کا نشیلم مجھے دیکھ کر ہی ادھر آیا تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے میں نے محسوس کر لیا کہ اس کے پاس کوئی اہم خبر ہے۔ میں نے خیر دین کو نشانے کی غرض سے کہا۔

”ٹھیک ہے چاچا! میں اب چلا ہوں۔ صدیقہ واپس آئے تو اسے میرا سلام ضرور دیتا۔ میں اگلے ہفتے دوبارہ پھر گاؤں گا۔“

”ٹھیک ہے بچہ..... میں صدیقہ کو تمہارے بارے میں بتا دوں گا۔“ اس نے کہا۔

میں اسے سلام کر کے گلی میں ایک جانب چل پڑا۔ میں نے کا نشیلم کو کسی قسم کا کوئی اشارہ نہیں کیا تھا۔ میں خیر دین پر اس حوالے سے کوئی تاثر نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ مجھے امید تھی کہ کا نشیلم بھی میرے پیچھے آئے گا..... اور ایسا ہی ہوا۔

میں گلی میں چند قدم ہی چلا تھا کہ کا نشیلم باسط علی میرے قریب آ گیا۔ میری طرح وہ بھی سادہ لباس میں تھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ جلدی سے بولا۔

”ملک صاحب! آپ یہاں.....؟“

”ہاں..... میں ذرا صدیقی کو چیک کرنے آیا تھا۔“ میں نے جواب دیا۔ ”مگر وہ لوگ تو کل شام سے ادھر مرزا پور گئے ہوتے ہیں۔“

”مٹی ملک صاحب۔“ اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ”جیلا کی موت کی خبر جیسے ہی یہاں پہنچی، یہ لوگ روانہ ہو گئے تھے۔“

”تم نے اب تک کیا ریسرچ کی ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”جناب! مجھے پتا چلا ہے کہ جب جیلا بچھلی مرتبہ

حویلی مراد آیا تھا تو اس کا جبراً سے اچھا خاصا جھگڑا ہو گیا تھا۔“ باسط علی نے بتایا۔ ”اور جبراً نے جیلا کو کافی پھینسی پھیل بھی لگائی تھی۔“

”یہ جبراً کون ہے؟“ میں نے چوٹے ہوئے لہجہ میں سوال کیا۔

”ادھر حویلی مراد ہی کا دستیک ہے جناب۔“ کا نشیلم نے بتایا۔ ”اس کا نام تو نذیر ہے مگر پورے گاؤں میں وہ جبراً کے نام سے مشہور ہے۔“ تا کا چلا تا ہے۔ لاری اڑے سے سوار یوں کو حویلی مراد کے لے کر آتا ہے۔ کافی اکثر مزاج اور ہاتھ چٹ ہے۔“

”اس کا سارا اکڑ پٹ تو میں ناک کے راستے نکال دوں گا۔“ میں نے سناتے ہوئے لہجہ میں کہا۔ ”بتاؤ، جبراً سے جیلا کا جھگڑا کس بات پر ہوا تھا؟“

”یہ معلوم نہیں ہوسکا ملک صاحب۔“ وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔ ”میں نے کئی لوگوں سے اس بارے میں پوچھا ہے مگر کسی نے کوئی مقول جواب نہیں دیا۔ بعض لوگوں کا تو یہ خیال ہے کہ جبراً کو چھڑا کرنے کے لیے کسی وجہ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ تو ہواؤں سے بھی جھگڑا کر لیتا ہے۔“

”اس جبراً بلڈ سے تو ملاقات کرنا ہی پڑے گی۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا پھر پوچھا۔ ”کیتنا عرصہ پہلے کا واقعہ ہے جب جبراً اور جیلا میں مار پیٹ ہوئی تھی؟“

”گنگ بنگ دو ماہ پہلے جناب۔“ باسط علی نے جواب دیا۔

”ہم چلتے ہوئے باتیں بھی کرتے جا رہے تھے کہ میں نے سامنے سے دو پولیس اہلکاروں کو اپنی جانب بڑھتے دیکھا۔ وہ سیدھے ہماری ہی طرف آ رہے تھے۔ پاس آ کر ان دونوں نے مجھے سلیوٹ کیا پھر ایک نے کہا۔“

”ملک صاحب! ہمیں انچارج صاحب نے بھیجا ہے۔“

”کیوں..... سب خیریت تو ہے نا؟“ میں نے سوالیہ نظر سے باری باری ان کی طرف دیکھا۔

”جی خیریت ہے۔“ دوسرے نے جواب دیا۔ ”ہم آپ کے کسی کام میں مداخلت نہیں کریں گے۔ آپ کو جو بھی نصیحت کرنا ہے وہ ضرور کریں۔ انچارج صاحب نے ہمیں حکم دیا ہے کہ آپ کے قریب رہیں اور کسی سلسلے میں آپ کو اگر ہماری مدد کی ضرورت ہو تو ہم آپ کا حکم بجالائیں۔“

میں ابھی طرح سمجھ رہا تھا کہ انچارج نے اپنے دو اہلکاروں کو مجھ پر نگاہ رکھنے کے لیے بھیجا تھا۔ وہ چھ پچھ

نفس کا قیدی

”ہمارے پاس جب تک کسی کی شکایت نہیں آتی، ہم کوئی کارروائی نہیں کرتے۔“

”اور جب شکایت آ جاتی ہے تو.....؟“ میں نے رک کر سوالیہ نظر سے باری باری ان دونوں کی طرف دیکھا۔ ”تو ظاہر ہے جی..... پھر تو انکیشن لیریا ہی پڑتا ہے۔“ وہ جلدی سے بولا۔ ”فریادی کی شکایت دور کرنا ہمارا فرض بنتا ہے۔“

”بس تو پھر تم دونوں انکیشن کے لیے تیار ہو جاؤ۔“ میں نے کہا۔ ”سمجھو، میں شکایت کر رہا ہوں۔“

ان دونوں نے انہیں زندہ انداز میں پہلے ایک دوسرے کو دیکھا پھر سوالیہ نظر سے مجھے نکلنے لگا۔ ”کیسی شکایت ملک صاحب؟“

”گھبرانے کی ضرورت نہیں۔“ میں نے تسلی بخش لہجہ میں کہا۔ ”شکایت بہت سادہ سی ہے۔ میں یہاں نیل عرف جیلا آف مرزا پور کے قتل کی تحقیق کے سلسلے میں آیا ہوں اور مجھے شک ہے کہ اس معاملے میں جیلا جبراً کا کوئی ہاتھ ہو سکتا ہے۔“

”اوہ..... اس نے گہری سانس خارج کی پھر مستغرق ہوا۔“ اس سلسلے میں ہمارے لیے کیا حکم ہے۔ ہمیں جبراً اور جیلا کے ساتھ کیا کرنا ہے؟“

”ان دونوں کے ساتھ جو بھی کرنا ہے، وہ میں خود کروں گا۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”تم ان دونوں کو پکڑ کر تھانے لے آؤ۔ میں تمہارے انچارج صاحب کے پاس جا رہا ہوں۔“

”مٹی ٹھیک ہے ملک صاحب۔“ یکے بعد دیگرے انہوں نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

تھانے کی جانب سفر کے دوران باسط علی نے مجھ سے پوچھا۔ ”ملک صاحب! جبراً والا معاملہ تو میں نے آپ کو بتایا ہے۔ یہ جیلا کا کیا قصہ ہے؟“

”بڑا دلچسپ اور اہم قصہ ہے۔“ میں نے کہا۔ ”جیلا، متوکل کی مکینئر نیلہ پر عاشق ہو گیا تھا اور اس نے نیلہ کا رشتہ بھی بیجا تھا لیکن ادھر سے جیلا نکلا ہو گیا جس پر یہ بہت حملہ آیا تھا اور مجھے پتا چلا ہے کہ اس نے جیلا کی سیدگی باتیں بھی کی تھیں جس سے خطرناک دمکی کی جھلک نظر آتی تھی۔“

ابھی تک میں اس کیس پر اپنی گرفت مضبوط نہیں کر سکا ہوں لہذا چھوٹی سے چھوٹی بات کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتا۔“

”یہ تو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں ملک صاحب۔“ وہ گہمیر انداز میں بولا۔

”ہم تجویزی دیر کے بعد تھانے پہنچ گئے۔ میں نے تھانہ کی خبر نہیں۔“ وہ صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔

سنہری اقاوال

☆ خنہ کی حالت میں انسان حق پر قائم نہیں رہ سکتا۔

☆ تارے آسمان کی زینت ہیں اور تعلیم انسان زمین کا زیور۔

☆ کردار، اخلاق، جرأت اور استقلال یہ وہ چار ستون ہیں جن پر انسانی زندگی کی عمارت کھڑی ہے۔

☆ تین چیزیں آپس میں محبت کو فروغ دیتی ہیں۔ ایک سلام کرنا، دوسرے مجلس میں دوسروں کے لیے جگہ بنانا تیسرے لوگوں کو اچھے نام سے پکارنا۔

☆ خنہ کو پی جانے سے معاف کر دینا زیادہ بہتر ہے۔ کیونکہ جو شخص معصوم پی جانے اور معاف نہ کرے تو میں ممکن ہے کہ اس کے دل میں کینہ پیدا ہو جائے، جو دل کے لیے ایک بڑی بیماری ہے۔

☆ بڑے آدمی اچھی چیزوں کو چھوڑ کر ہر چیز میں بُرائی تلاش کرتے ہیں جس طرح مکی خوبصورت چیزوں کو چھوڑ کر فم پر بیٹھتی ہے۔

☆ جو کتاہ کر کے اترائے، اسے شیطان سمجھو۔

☆ نیک دل انسان دشمنوں کے ساتھ بھی نیکی کرنے سے نہیں چھوڑتا۔ صندل اس کھاڑے کا منہ بھی خوشبودار کر دیتا ہے جو اسے کاٹتا ہے۔

☆ ظالم سوار کو اس کا گھوڑا اگر ادا دیتا ہے۔

☆ بلند حوصلہ انسان یقیناً اپنی منزل پالیتا ہے۔

☆ انتخاب: ریاض بہت، حسن ابدال

محل اور تربیوز

☆ ایک غریب آدمی نے تربیوز خریدا اور گھر آ کر جب اسے کھا تو اس میں سے جن برآمد ہوا اور بولا۔ "کیا تم سے میرے آقا۔"

☆ غریب آدمی خوش ہو کر بولا۔ "تم مجھے ایک عالی شان محل بنا دو۔" اس کی فرمائش سن کر جن خنہ سے بولا۔ "یا گل ہو گئے ہو کیا۔ ارے بے وقوف اگر میں گل بنا سکتا تو کیا خود تربیوز میں رہتا؟"

☆ مرسلہ: جاوید اختر رانا، پاک چین شریف

اتے ہی فریادی لہجے میں کہا۔

"تمہارے دار صاحب! میرے ساتھ بڑی زیادتی ہو رہی ہے۔ آپ کے بندے نے مجھے ساری رات جگایا ہے۔ آخر میرا قصور کیا ہے؟"

"قصور تمہارا یہ ہے کہ تم جہانگیر نال ہو۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "حالا نکہ تمہاری اپنی ناک کا دور دور تک کوئی امکان نظر نہیں آتا۔"

"میں تو چاہتا ہوں جی کہ میری بھی شادی ہو اور میری جی جی چڑے مگر کچھ ہوتا ہی نہیں۔" وہ سکین سی صورت بناتے ہوئے بولا۔ "اور سے یہ بھی کچھ میں نہیں آ رہا کہ آپ مجھے اور جی کو کیوں پکڑ لائے ہیں۔"

"تم جی جی نہیں، صرف اپنی فکر کرو۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "اور تمہیں میں اس لیے پکڑ کر لایا ہوں تاکہ تمہاری شادی کر سکوں۔ پھر لوگ تمہاری جیج میں شامل ہو سکیں۔"

اس نے الجھن اور بے چینی کے لے چلے تاثرات سے مجھ کو کھانگھرنے سے کچھ نہیں بولا۔ میں نے کہا۔

"جہاں تمہاری جیج چڑھنے میں تو ابھی تھوڑا وقت باقی ہے۔ اس سے پہلے تمہیں ایک بے کتاہ کی لاش کو کندھا دینا ہو گا۔"

"آپ..... جیلا کی بات کر رہے ہیں....." وہ ایک آنکھ سے مجھ کو دیکھتے ہوئے بولا۔ "لیکن اس کے جنازے سے میرا کیا تعلق؟"

"وہی تعلق جو ایک لوہار کا تھوڑے سے ہوتا ہے!" میں نے سرسراہٹ ہوئی آواز میں کہا۔ "یا جو تعلق ایک عاشق نامراد کا اپنے رقیب رو سیاہ سے ہوتا ہے۔"

"تم..... میں کچھ سمجھا نہیں جانتا۔" وہ فکر مند لہجے میں بولا۔

"حوالدار کا ایک ہاتھ بڑ گیا تو سب کچھ مجھ میں آجائے گا جہا۔" میں نے طنز سے لہجے میں کہا۔ "فرزند علی لوہار تو نہیں مگر اس کا ہاتھ باداں (بڑا تھوڑا) سے بھی زیادہ اہمراک ہے۔"

"جہا نہیں جانتا! آپ کس قسم کی باتیں کر رہے ہیں۔" وہ بھی مجھے اور بھی حوالدار کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

میں نے حوالدار سے کہا کہ وہ چلی الماری میں سے آئینہ نکال کر لائے۔ فرزند علی نے فوراً میرے حکم کی تعمیل کر دی۔ آئینہ قتل میری میز پر سج گیا تو میں نے مذکورہ

رپورٹ بھی آگئی تھی۔ مذکورہ رپورٹ کے مطابق، اس تھوڑے پر جہا ہوا خون اور اس خون میں چپکے ہوئے بال متقول جیلا ہی کے تھے لہذا اس بات میں کسی شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی تھی کہ جیلا عرف جیلا کو اس تھوڑے کی مدد سے موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔

آئینہ قتل میرے ہاتھ لگ چکا تھا۔ اب قتل کے محرک تک پہنچنا باقی تھا۔ اس کے بعد قاتل کی گردن میری گرفت میں ہوئی۔ گزشتہ روز میں جو لی مراد سے جیلا کو چران اور جہا لوہار کو اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ ہم شام کے وقت تھانے پہنچے تھے لہذا میں انہیں حوالدار کے سپرد کر کے اپنے کوارٹر میں چلا گیا تھا۔ یہ دونوں ایسے افراد تھے جن سے پوچھ گچھ کافی نتیجہ خیز ثابت ہو سکتی تھی۔

میں نے ضروری کارروائی کے بعد جیلا کی پوسٹ مارٹم شدہ لاش ریتی کے گھر بھجوا دی اور حوالدار کو اپنے پاس بلا لیا۔

"ہاں فرزند علی!" حوالدار میرے پاس آیا تو میں نے پوچھا۔ "حوالہ جیوں نے زبان کھولی یا کوئی اور قارمولا آ زمانا پڑے گا؟"

"ملک صاحب! شرافت کا زمانہ کہاں ہے۔" حوالدار نے جوش بھرے لہجے میں کہا۔ "اگر آپ تھوڑی سختی کی اجازت دیں تو ان کے بدن کا ایک ایک جوڑ بولنے پر مجبور ہو جائے گا۔ ابھی تک آپ کے حکم پر میں نے بہت ہلکا ہاتھ رکھا ہوا ہے اسی لیے وہ کچھ قوت لے کر تیار ہی نہیں ہیں۔"

"اگر ضرورت محسوس ہوئی تو میں تمہیں فوری پیٹھ دے دوں گا۔" میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ "فی الحال تم انہیں میرے پاس لے آؤ مگر باری باری۔"

"جی ملک صاحب۔" اس نے فرمانبرداری سے گردن ہلائی اور پوچھا۔ "پہلے کس کو لاؤں جہا؟"

"جہا دین عرف جہا کو۔" میں نے کہا۔

"اوکے سر!" یہ کہتے ہوئے فرزند علی میرے کمرے سے نکل گیا۔

ایک منٹ کے بعد جہا دین عرف جہا میرے سامنے حاضر تھا۔ اس کی عمر تیس کے قریب رہی ہوگی۔ وہ ایک دبلا پتلا اور دراز قامت شخص تھا۔ اس نے ہرے پریشانی سی ڈانڈھی بھی رکھی ہوئی تھی اور ایک آنکھ کا چراغ بھی لگ گیا تھا۔ انکلی آنکھ اور چہرے کے تاثرات میں مکاری اور عیاری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اس نے میرے پاس

انچارج کو مختصر الفاظ میں صورت حال سے آگاہ کیا اور پھر کہا۔ "میں جہا اور جہا کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔" اس نے گہری نظر سے مجھ کو دیکھا اور بولا۔ "ملک صاحب! کیا ان بندوں سے سینیں پر پوچھ گچھ نہیں ہو سکتی؟"

"ہو سکتی ہے لیکن قتل کی واردات چونکہ میرے تھانے کی حدود میں ہوئی ہے لہذا میں ان مشکوک افراد سے تفتیش اپنے تھانے ہی میں کرنا چاہتا ہوں۔"

وہ جبریز ہوتے ہوئے بولا۔ "مجھے آپ کی مرضی ملک صاحب۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ آپ انہیں اپنے ساتھ لے جاسکتے ہیں۔"

"آپ فکر نہ کریں۔ آپ کے علاقے کے بندوں کے ساتھ میرے تھانے میں کسی قسم کی زیادتی نہیں ہوگی۔" میں نے اطمینان دلانے والے انداز میں کہا۔ "یہ دونوں جی سلامت آپ کو واپس مل جائیں گے۔"

"او..... نہ جی..... قتل والی کوئی بات نہیں۔" وہ جلدی سے بولا۔ "اگر ان دونوں کا یا ان میں سے کسی ایک کا متقول والے معاملے سے کوئی تعلق نہ ملتا ہے تو آپ ان کی ہڈیوں کا سرمہ بھی بنا سکتے ہیں۔"

"میرا خیال ہے، ہڈیوں تک جانے کی نوبت نہیں آئے گی۔" میں نے متنی خیز انداز میں کہا۔ "گوشت اور پوست ہی سے کام چل جائے گا۔"

وہ پرمٹنی انداز میں سر ہلا کر رہ گیا۔

☆☆☆

اگلے روز پوسٹ مارٹم کی ابتدائی رپورٹ آگئی۔ مذکورہ رپورٹ کے مطابق، متقول جیلا کی موت انہیں مئی کو عصر اور مغرب کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ موت کا سبب سر میں لگنے والی وہ کاری ضرب تھی جس نے متقول کی کھوپڑی کا مٹھی حصہ بری طرح چٹا دیا تھا۔ متقول کے سر پر یہ وارد اس کی بے خبری میں کیا گیا تھا۔

پوسٹ مارٹم رپورٹ کے ساتھ ہی ٹیکسیل ایگزامینری رپورٹ بھی شملک مئی جس کے مطابق، اس کے معدے سے کسی نشہ آور ادویہ کے آثار ملے تھے۔ یا تو متقول کسی نشہ کا عادی تھا اور یا پھر کھانے کے ساتھ کوئی نشہ آور شے اس کے معدے تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ یہ ایک اہم اطلاع تھی۔

مشائق باجوہ کے کچھ توں سے ملنے والا تھوڑا بھی میں نے تجربے کے لیے لیبارٹری بھجوا دیا تھا۔ اس کے ٹیسٹ کی

انجام سے دو چار کروں۔

☆☆☆

دوپہر کے بعد ایک ادبیز عرض مجھ سے ملنے قاتنے آیا۔ میں نے اسے کمرے میں بلا لیا۔ رکی ملک ملک کے بعد جب اس نے اپنا تعارف کرایا تو میں چونک اٹھا۔

”ملک صاحب! امیرانہ رانا اقبال ہے۔“

جیرا بلینڈ نے مجھے بتایا تھا کہ وہ رانا اقبال کا نمک خوار اور احسان مند ہے۔ میں نے فوراً اندازہ قائم کر لیا کہ وہ اپنے بچپن کے پیچھے آیا تھا۔ اس کے چہرے پر رعوت تھی۔

”رانا صاحب! آپ حویلی مراد سے تشریف لائے ہیں نا؟“ میں نے کہا۔ ”آپ کو اپنے بندے کی بہت فکر ہوگی۔“

”اپنے جاں نثروں کی فکر تو کرنا ہی پڑتی ہے نا ملک صاحب۔“ وہ سینہ چوڑا کرتے ہوئے بولا۔ ”مجھے پتا چلا ہے کہ آپ نے جیرا کو جیلا کے قتل کے الزام میں تفتیش کے لیے یہاں بند کر رکھا ہے۔“

”آپ کو بالکل ٹھیک پتا چلا ہے۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”تفتیش جاری ہے۔“

”جیرا آپ کو یہ نہیں بتایا کہ قوہ کے روزہ نہ تو حویلی مراد میں تھا اور نہ ہی مرزا پور میں۔“ وہ مجھے کچھ سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔

”جی رانا صاحب! اس نے مجھے بتایا ہے۔“ میں نے اشات میں گردن ہلائی۔ ”وہ اپنی خالہ غنورا سے ملنے لاہور گیا ہوا تھا۔“

”پھر جی آپ نے اسے قاتل میں بند کر رکھا ہے؟“ وہ دکھائی لہجے میں بولا۔ ”ایک بندہ جائے وقوعہ سے درجنوں میل دور تھا پھر وہ اس معاملے میں کیسے ملوث ہو سکتا ہے۔!“

”اگر انہیں سچی کی شام جیرا واقعی باغبان پورہ لاہور میں اپنی خالہ غنورا کے پاس تھا تو پھر یقیناً اس کا جیلا کی موت سے کوئی تعلق نہیں جوڑا جاسکتا۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”لیکن جیرا کا ادھر آپ کا بیان ہے۔ ابھی اس بیان کی تصدیق نہیں ہوئی اور جب تک تصدیق نہیں ہو جاتی، جے اے کوٹک سے پاک اور اس کیس سے بری الذمہ نہیں سمجھا جاسکتا۔“

”آپ کس قسم کی تصدیق کرنا چاہتے ہیں؟“ وہ سپاٹ آواز میں بولا۔

”میں نے اپنے ایک بندے کو ماسی غنوراں کی

مال غنوراں کے پاس لاہور میں تھا۔ اگر اس کے بیان میں کوئی تیر پھر نہیں تھا تو پھر وہ جیلا کے قتل میں ملوث نہیں ہو سکتا۔ ماسی کو مرزا پور کے کیمت، باغبان پورہ لاہور سے کافی دور کی دوری پر تھے اور جیرا کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ ایک وقت ان دو مقامات پر پایا جائے۔“

”کیا غنوراں خالہ تمہارے اس بیان کی تصدیق کرے گی؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کیوں نہیں جناب۔“ وہ بڑے اعتماد سے بولا۔

”خالہ غنوراں ضرور میری بات کی گواہی دے گی۔“ ”ٹھیک ہے، میں کسی المکار کو لاہور بھیج کر خالہ غنوراں سے تمہارے بیان کی تصدیق کروا تا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”جب تک تم سرکاری مہمان کی حیثیت سے ادھر نوالات ہی میں رہو گے۔“

”مجھے آپ کی مرضی جناب۔“ وہ مسکین سی صورت بنا کر بولا۔ ”میں تو عاجز اور بے چارہ سا بندہ ہوں۔“

”تم جتنے عاجز اور لاچار ہونا، یہ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔“ میں نے طنز میں نیچے ہوئے الفاظ میں کہا۔ ”تمہارے پیسے اکثر جیرا بلینڈ سے میرا واسطہ پڑتا رہا ہے۔“

وہ کچھ نہیں بولا اور میں نے اسے حوالات میں بھجوا دیا۔ جس زمانے کا یہ واقعہ ہے اس وقت فنگر پرنس اٹھانے کا رواج عام نہیں ہوا تھا اور اگر کوئی مستعد تفتیشی افسر ایسی جرأت نہ دے کر بھی کرتا تھا تو عدالت اس کی کوشش کو خاطر خواہ اہمیت نہیں دیتی تھی۔ کسی بھی طرز کو مجرم ثابت کرنے کے لیے بڑے ٹھوس ثبوت عدالت میں پیش کرنا پڑتے تھے۔ آج کل کی طرح ہمارے زمانے میں آسانیاں میسر نہیں ہیں۔

اگر اس وقت فنگر پرنس کا رواج عام ہوتا اور عدالت بھی ان کی اہمیت کو قدر کی نگاہ سے دیکھتی تو میں آؤ قتل کے چوبلی دے پر سے اٹھیں کے نشانات کو اٹھا کر جیرا بلینڈ اور بھانجے نال کے فنگر پرنس سے بچ کر کے فوراً اس بات کا اندازہ لگا سکتا تھا کہ ان دونوں کا جیلا کے قتل سے کوئی تعلق ہے یا نہیں اور یہی عمل دیگر مشکوک افراد کے ساتھ بھی دہرایا جاسکتا تھا۔

میں نے جیلا کی لاش اس کے دروازے کے حوالے کر دی تھی اور مجھے پتا چلا تھا کہ اس کی تدفین مصر اور مغرب کے بچ کر دی جائے گی۔ مجھے جیلا کی الم ناک موت کا بہت دکھ تھا اور میری دلی خواہش یہی تھی کہ میں جلد از جلد اس کے قاتل تک پہنچ کر اسے عبرت ناک

بتایا۔ ”وہ کہہ رہا تھا، یہ تکی رانا ہیں۔ ایک دنسل پہلے لوگ کہہ رہا ہوا کرتے تھے، کھوتے جراتے تھے اور ڈھوتے تھے۔ پھر اچانک یہ رانا بن گئے۔“ وہ سہا ہوا کر کے لیے متوقف ہوا پھر اپنی بات مکمل کر کے ہوئے بولا۔

”جیلا کی یہ بکواس سن کر تو میرے تن بدن میں آم لگ گئی تھی۔ وہ تو لوگوں نے بچ بچاؤ کر دیا اور نہ میں کہنے کی۔“

”جان لے لیتا۔!“ اس کے ادھر سے جملے کو نہ مکمل کرتے ہوئے کہا۔ ”ہیں نا۔۔۔۔۔ تم یہی کہنے والے تھے نا؟“

”ایسا ہو بھی سکتا تھا، قاتلے دار صاحب!“ وہ جوڑ میں بول گیا۔

”اس موقع پر لوگوں نے بچ بچاؤ کر دیا اور ایسا نہیں ہو سکا۔“ میں نے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ”لیکن تم مسلسل اس تاک میں رہے کہ جیلا آٹھکانے لگا سکے اور پھر انہیں کسی کو نہیں ایسا موقع مل گیا اور نہ نے ہتھوڑے کا مہلک وار کر کے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔“

”یہ غلط ہے جی۔“ وہ جلدی سے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”میں نے جیلا کو قتل نہیں کیا۔ میں تو اس طرف آیا بھی نہیں اور انہیں کسی کو تو میں گھر میں بھی نہیں تھا۔“

”گھر میں نہیں تھے۔“ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ”پھر کہاں تھے تم؟“

”میں لاہور گیا ہوا تھا اپنی خالہ سے ملنے۔“ اس نے بتایا۔ ”تمہاری خالہ لاہور کے کس علاقے میں رہتی ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”باغبان پورہ میں۔“ اس نے جواب دیا۔

”تمہاری خالہ کا کیا ہے اور اس کے گھر کا پتا کیا ہے؟“

”خالہ غنوراں۔“ اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا پھر غنوراں کا ایڈریس مجھے لوٹ کر دیا۔

”تم غنوراں سے ملنے کب لاہور گئے تھے؟“ میں نے پوچھا۔ ”اور تمہاری واپسی کب ہوئی تھی؟“

”میں اتوار انہیں سچی کی صبح لاہور کے لیے روانہ ہوا تھا اور دوپہر کا کھانا میں نے غنوراں خالہ کے ساتھ اس کے گھر میں کھایا تھا۔“ اس نے بتایا۔ ”پھر اگلے دن یعنی سوموار کی صبح میں واپس آیا تھا۔“

جیرا کے بیان کے مطابق، وہ وقوعہ کے وقت اپنی

حویلی مراد روانہ کر دیا تھا تاکہ وہ بھائی اسٹوری کی تصدیق یا تردید کر سکے۔

جیرا کو جان گھسے ہوئے بدن کا مالک تھا۔ اس کی عمر پچیس کے ارب قریب تھی۔ اس کی رعیت گندی تھی اور وہ ہاتھ پاؤں کا خاصا مضبوط دکھائی دیتا تھا۔ وہ میرے سامنے گردن جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے کہا۔

”جیرا! کیا تمہیں پتا ہے کہ میں تمہیں یہاں کیوں لے کر آیا ہوں۔؟“

”آپ جیلا کے قتل کی تفتیش جو کر رہے ہیں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”لیکن یہ سمجھ نہیں آیا کہ میرا اس بندے سے کیا تعلق واسطہ۔“

”بہت گہرا تعلق ہے اور بہت مضبوط واسطہ۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”دو ماہ پہلے کا واقعہ بھول گئے ہو کیا؟“

”کون سا واقعہ جی؟“ وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

”جب تمہارا جیلا سے جھگڑا ہو گیا تھا۔“ میں نے۔۔۔ بدستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تم نے بار بار کر جیلا کے تختے کھول دیے تھے اور اسے خطرناک نتائج کی دھمکیاں بھی دی تھیں۔۔۔۔۔ میں نہیں جانتی۔“

”وہ جناب۔۔۔۔۔ وہ ناگواری سے بولا۔ ”اس نے بات ہی ایسی کر دی تھی کہ مجھ سے برداشت نہیں ہو سکا اور میں نے اس پر ہاتھ اٹھا دیا تھا۔“

”اس نے تمہیں ایسا کیا کہہ دیا تھا؟“ میں نے جیرا لہجے میں استفسار کیا۔ ”کیا جیلا نے تمہیں کوئی ماں بہن کی گالی دی تھی؟“

”ماں بہن کی گالی تو میں شاید برداشت کر جاتا۔“ وہ سکتے ہوئے انداز میں بولا۔ ”لیکن میں رانا جی کے خلاف ایک لفظ نہیں سن سکتا۔“

”کون رانا جی؟“ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”رانا اقبال جناب۔“ اس نے بتایا۔ ”میں نے رانا جی کا نمک کھایا ہے اور ان کے مجھ پر بہت سارے احسان ہیں۔

یہ جو میں گھوڑا ٹانگا چلاتا ہوں۔۔۔۔۔ یہ بھی انہوں نے ہی مجھے بنا کر دیا ہے۔ وہ میرے ان داتا ہیں قاتلے دار صاحب۔“

”اچھا جی۔۔۔۔۔ میں نے خود کھلائی کے انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ”جیلا نے تمہارے رانا جی کی شان میں ایسی کون سی کٹافنی کر دی تھی کہ تم نے اسے روٹی کی طرح دھتک کر کھایا؟“

”اس نے رانا جی کا مذاق اڑایا تھا۔“ جیرا نے

میں ایسی بات کی تھی جس پر جبر کو چوان آئے سے باہر ہو گیا تھا۔ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”لیکن جیلانے... خواہوا ایسی بات نہیں کی تھی۔ اس سے پہلے جبر امیری بیٹی نبیلہ کے حوالے سے کافی کچھ کہہ چکا تھا۔ جیلانے تو اس کی بکواس کا جواب دیا تھا۔“

یہ ایک نیا زاویہ سامنے آ رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ”ایک بات کچھ نہیں آتی مدیتا۔ جبر کی تہمیداری بیٹی سے کیا دشمنی کہ وہ اس کے بارے میں اتنی سیدھی بکواس کرتا پھرے؟“

”جبر کی نہیں، اس کے پرائیویٹ باپ رانا اقبال کی نبیلہ سے دشمنی ہے۔“ وہ زہر خند لہجے میں بولا۔ ”جبر نے تو رانا کو خوش کرنے کے لیے اس دن جیلانے مار پیٹ کی تھی۔“

”میں اب بھی کچھ نہیں سمجھا؟“ میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ”نبیلہ اور رانا اقبال کی دشمنی کی کیا تک نفی ہے؟“

”میں آپ کو سمجھاتا ہوں تمہارے دار صاحب۔“ وہ بڑے رمان سے بولا۔ ”اصل بات یہ ہے کہ کچھ عرصہ پہلے رانا اقبال نے نبیلہ سے شادی کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ وہ بیوی بچوں والا ہے۔ آپ خود سوچیں، اس رشتے کے لیے میں کیسے ہاں کر دیتا۔ میں نے اسے صاف انکار کر دیا۔ اس نے میرے انکار کو اپنی توہین سمجھا اور ایک روز وہ نبیلہ کا راست روک کر کھڑا ہو گیا۔ نبیلہ اس وقت اپنی سہیلیوں کے ساتھ کھیتوں کی طرف جا رہی تھی۔ نبیلہ نے اس سے بچنے کی کوشش کی لیکن وہ بدتمیزی پر اتر آیا۔ نبیلہ کا بھی دماغ گھوم گیا۔ اس نے رانا کو خوب کھری کھری ستا دیں۔ اس ہنگامے پر وہاں کافی لوگ جمع ہو گئے اور معاملہ رفع دفع کروا دیا گیا لیکن رانا ایک کمینہ اور کینہ پرور شخص ہے۔ وہ اپنی بے عزتی کو بھولنا نہیں اور جب میں نے نبیلہ کا رشتہ جیلانے سے کر دیا تو اس نے نبیلہ کے بارے میں اتنی سیدھی باتیں کرنا شروع کر دیں لیکن میں نے اس کی بکواس پر توجہ نہیں دی مگر جب اس کے بیچے جبرانے جیلانے کے سامنے نبیلہ کے بارے میں غلط الفاظ استعمال کیے تو وہ برداشت نہ کر سکا اور اس نے مجھے رانا اقبال کی اصلیت کھول کر بیان کر دی جس کے نتیجے میں ان کے درمیان مار پیٹ ہوئی تھی۔“

تو گویا یہ ”ایک اثار سوہیاد“ والا قصہ تھا۔ نبیلہ کا رشتہ تو جیلانے سے ہوا تھا لیکن اس رشتے سے پہلے حویلی مراد

مدیتا طوائی کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات اُٹھ رہے تھے۔ اس نے تیز لہجے میں پوچھا۔ ”وہ یہاں کیا لے آیا تھا؟“

”اپنے نمک خوار جبر کو چوان کو لینے۔“ میں نے لایا۔ ”لیکن میں نے اسے سوکھا ہی فرغایا۔“

”اچھا کیا آپ نے۔“ وہ اطمینان کی سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ”مجھے یہ بندہ زہر لگتا ہے۔“

مجھے یوں محسوس ہوا کہ مدیتا طوائی اپنے دل میں رانا اقبال کے لیے غم و غصے کے جذبات رکھتا تھا۔ میں نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

”تمہیں رانا اقبال کیوں زہر لگتا ہے؟“

”وہ کم ذات اور کمینہ ہے۔“ وہ غرت بھرے لہجے بولا۔

”میں نے سنا ہے، وہ اصلی رانا جی راجپوت بھی نہیں۔“ میں نے کرینے والے انداز میں مدیتا طوائی سے پوچھا۔ ”اس نے اپنی ذات بدل رکھی ہے۔“

”جناب! تین چار سلسلے پہلے یہ لوگ کبھار ہوتے تھے۔“ وہ برا سانس دیتے ہوئے بولا۔ ”اس وقت یہ کہیں اور رہتے تھے۔ پھر ان کے پاس کہیں سے چمڑا آ گیا۔“

جب یہ ہمارے علاقے میں آ کر رہے تو خود کو رانا کھلوانا شروع کر دیا۔ یہ ہے ان کی ہنسی۔“

”اوہ!...“ میں نے سر اٹھنے والی نظر سے مدیتا کو دیکھا۔ ”تم تو ان لوگوں کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہو۔ تمہیں یہ بھی علم ہو گا کہ ان کے پاس دولت کہاں سے آگئی تھی؟“

”مجھے صحیح طور پر تو پتا نہیں لیکن سنا ہے، انہوں نے کوئی بہت بڑا ڈاکا ڈالا تھا۔“ اس نے بتایا۔ ”اس ڈاکے سے حاصل ہونے والے مال و دولت نے انہیں کبھار سے رانا بنا دیا۔ کھوتے چرانے والے زمین دار بن گئے۔“

”یہی بات جیلانے نے اپنی موت سے دو ماہ پہلے جبر کو چوان سے کہی تھی۔“ میں نے مدیتا طوائی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”جس پر جبر کو طیش آ گیا تھا اور اس نے جیلانے کے ساتھ مار پیٹ کی تھی۔“

”یہ بات آپ کو جبرانے بتائی ہے؟“

”ہاں۔“ میں نے اثبات میں گردن ہلاتی۔

”تو پھر اس نے آپ کو آدمی بات بتائی ہے جناب۔“ اس نے کہا۔

”آدمی بات... کیا مطلب ہے تمہارا؟“

”یہ سچ ہے کہ جیلانے اس روز رانا اقبال کے بارے

جائے واردات سے کافی دور تھے تو پھر انہیں مزید رگ مناسب نہیں تھا لہذا میں نے اس ہدایت کے ساتھ آگے جانے کی اجازت دے دی کہ وہ مجھے اطلاع دیے بغیر علاقہ چھوڑ کر کہیں نہیں جائیں گے۔

اگلی صبح میں نے متول کے باپ رفیق کو تھا۔ بلا لیا۔ اس کا بڑا بھائی صدیق عرف مدیتا بھی ساتھ چلا آیا تھا۔ میں نے دونوں کو اپنے سامنے بٹھالیا پھر رُٹے سے پوچھا۔

”جی، تمہارے دار صاحب۔“ اس نے دکھ بھرے لہجے میں جواب دیا پھر سوالیہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

”جیلانے کا قتل کا کچھ پتا چلتا ہے؟“

”ابھی تک کچھ پتا نہیں چلا لیکن بہت جلد قاتل میرے گرفت میں ہو گا۔“ میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ”میں اسی سلسلے میں تمہیں یہاں بلایا ہے۔“

”میں کیا کر سکتا ہوں جناب!“ وہ بے بسی سے بولا۔ ”تم بہت کچھ کر سکتے ہو رفیق۔“ میں نے اس کی ہمد بندھا تے ہوئے کہا۔ ”تمہیں کو کچھ ترے رشتے لگے ہیں۔ میں آ سلسلے میں تم سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔“

”جی ضرور... میں حاضر ہوں۔“ وہ کمزور سے لہجے میں بولا۔

”تمہارے دار صاحب! مجھے پتا چلا ہے کہ آپ نے حویلی مراد سے کتنا بڑا اور جبر کو چوان کو بھی پوچھنا چاہتے تھے۔“

”لے تمہارے بلا تھا۔“ مدیتا طوائی نے متول لہجے میں مجھ سے استفسار کیا۔ ”انہوں نے کچھ اگلا کہ نہیں؟“

”انہوں نے کچھ لگایا ہی نہیں تھا تو اگلے کھار سے۔“ میں نے سختی خیز انداز میں کہا۔ ”بہر حال، میں نے ان دونوں سے کڑی تنقید کی ہے اور ان دونوں کو اس سلسلے میں بے قصور پایا ہے۔“

”دوہ کہ روز وہ دونوں مرزا پور سے بہت دور تھے۔ کانا بجا اپنے دوستوں قادر، ناصر اور حفیظ کے ساتھ سہ پہر ساڑھے تین بجے سے شام سات بجے تک راوی میں نہاتا رہا تھا، ہندوانے کھانا بنا کر اٹھارے تاش کھلنا رہا تھا جبکہ جبر کو چوان اس دن اپنی خالہ غنوراں سے ملنے لاہور کے ایک محلے باغبان پورہ گیا ہوا تھا۔ ان دونوں کا جیلانے کے قتل سے کوئی تعلق واسطہ نہیں اس لیے میں نے انہیں جانے کی اجازت دے دی۔“

”لجائی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس لی پھر مدیتا کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”کل رانا اقبال بھی میرے پاس آیا تھا۔“

طرف روانہ کر دیا ہے۔“ میں نے متول انداز میں کہا۔ ”وہ جیسے ہی واپس آئے گا، جبرانے کی تصدیق یا تردید ہو جائے گی اور اس کے بعد ہی میں جبرانے کے بارے میں کوئی فیصلہ کر سکوں گا۔“

”میں جانتا ہوں، آپ نے جبر کو ایک معمولی سے واقعے کی وجہ سے اٹھالیا ہے۔“ وہ جذبات سے عاری لہجے میں بولا۔ ”کچھ عرصہ پہلے جبر کا جیلانے سے جھگڑا ہو گیا تھا اور آپ کو شک ہے کہ جبرانے اسی بنا پر جیلانے کو کھانے لگا دیا ہے... ہیں نا؟“

”بات تو آپ کی درست ہے رانا صاحب۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”لیکن شاید آپ کو پتا نہیں کہ قانون کی نظر میں معمولی سے معمولی بات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ اگر جبر بے قصور ثابت ہوا تو میں اسے چھوڑ دوں گا۔“

”اچھا ہوتا، آپ جبر کو ابھی میرے ساتھ جانے دیتے۔“ وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔ ”میں اس کی ضمانت دیتے کو تیار ہوں۔“

”اتنا تیز نہ بھاگیں رانا صاحب!...“ میں نے اسی کے انداز میں جواب دیا۔ ”ابھی ضمانت کا وقت نہیں آیا۔ اگر میں نے آپ کے بندے کے خلاف پرچہ کاٹ دیا تو پھر آپ عدالت میں جا کر اس کی ضمانت کرانے کی کوشش کیجیے گا۔“

وہ چند لمحات تک خشکی نظر سے مجھے دیکھتا رہا پھر ایک پھل سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ”یہ آپ ٹھیک نہیں کر رہے ملک صاحب۔ آپ نے میرا مان بھی نہیں رکھا!...“

”میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ قانونی تقاضے پورے کرنے کے لیے میں کیا ٹھیک کر رہا ہوں اور کیا غلط۔“ میں نے واضح الفاظ میں کہا۔ ”اور جہاں تک آپ کے مان اور احترام کا تعلق ہے تو میں بڑے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ میں نے آپ کو بہت عزت دی ہے۔“

جب اس نے دیکھا کہ میرے سامنے اس کی وال نہیں گل سکتی تو وہ خشکی بھرے انداز میں مجھے ”خدا حافظ“ کہہ کر تھانے سے رخصت ہو گیا۔

شام سے پہلے یہ ثابت ہو گیا کہ جیلانے کو پیش آنے والے افسوس ناک واقعے سے نہ تو جملہ کا تعلق ہے اور نہ ہی جبر کا کیونکہ حویلی مراد سے جیلانے کی بیان کی اور لاہور سے جبرانے کی تصدیق ہو گئی تھی۔ جب یہ دونوں افراد

میں اس سے شادی کے کئی خواہش مند موجود تھے..... میں نے صدی طوا کی سے ایک اہم سوال کیا۔
 ”تم کیا کہتے ہو..... کیا جیلا کو جیش آنے والے واقعے میں رانا اقبال کا کوئی ہاتھ ہو سکتا ہے؟“
 ”اللہ ہی بہتر جانتا ہے تھانے دار صاحب!“ وہ ایک گہری سانس لیتے ہوئے بولا۔ ”میں خود خواہی پر اہم لگا کر اپنی ملی خراب نہیں کرنا چاہتا۔ ویسے میں اتنا جانتا ہوں کہ وہ بہت کمینہ اور بد ذات ہے۔“

میں رانا اقبال سے گزشتہ روز مل چکا تھا۔ صدی طوا کی کچھ غلط بھی نہیں کہہ رہا تھا۔ میں نے اس شخص میں کافی غرور پایا تھا۔ بہر حال، صدی طوا کی زبانی جو حالات مجھ تک پہنچے تھے ان کی روشنی میں میں رانا اقبال کو تیسرے نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی گہرائی کا بندوبست کرنا ضروری تھا۔
 ”رہتی!“ میں نے محتول کے باپ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تم نے مجھے رانا اقبال کے بارے میں پہلے کیوں نہیں بتایا تھا؟“

”مجھے بھی ابھی پتا چلا ہے جناب۔“ وہ جلدی سے بولا۔
 میں نے سوالیہ نظر سے صدی طوا کی طرف دیکھا۔
 ”فیکا ٹھیک کہہ رہا ہے تھانے دار صاحب۔“ صدی طوا کی نے تعجب سے کہتے ہوئے کہا۔ ”اسے صرف اتنا پتا تھا کہ حویلی مراد میں نیلے کے کئی رشتے آئے ہوئے تھے لیکن میں نے اسے رانا اقبال کی کمینگی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔“

”ٹھیک ہے، میں آپ لوگوں کی بات کا یقین کر لیتا ہوں۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا پھر رہتی سے مخاطب ہوتے ہوئے اضافہ کیا۔

”میں نے کل جیلا کی لاش تمہارے گھر بھجوا دی تھی تاکہ اس کی تدفین میں کوئی مزید تاخیر نہ ہو لیکن اس لاش کے ساتھ اسپتال سے جو رپورٹ آئی ہے، اس میں بعض باتیں ایسی لکھی ہوئی ہیں کہ ان کی تصدیق یا تردید صرف تم ہی کر سکتے ہو اور میں نے اسی لیے آج تمہیں تھانے بلایا ہے۔“

وہ بہتر کوش ہو گیا۔ صدی طوا کی بھی سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے فیکا کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”کیا جیلا کوئی نشوونما بھی کرتا تھا؟“
 ”نہیں جناب، بالکل نہیں۔“ اس نے نفی میں گردن ہلائی۔
 ”کوئی سکرپٹ، پان، ایون، چرس، حقہ، تبا کو یا

کچھ اور.....؟“ میں نے کہا۔ ”یا کوئی دوا وغیرہ؟“
 سکرپٹ، حقہ، تبا کو یا اگرچہ ان نشے میں شامیج ہوتے تھے جیسا میکیل انجیر امریکی رپورٹ میں لکھا تھا لیکن میں نے روادری میں فیکا سے سب کچھ پوچھ لیا تھا۔

”کچھ بھی نہیں سکرپٹ۔“ وہ بڑے اعتماد سے بولا۔
 ”میرے دونوں بیٹوں نے کبھی کسی قسم کا کوئی نشہ نہیں کیا آپ یہ بات کیوں پوچھ رہے ہیں؟“

”میں اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ اس کی رپورٹ میں بھی لکھا ہے۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”جیلا کے معدے سے حاصل ہونے والے مواد میں کسی نشہ آور چیز کی آمیزش پائی گئی ہے۔ اگر وہ کسی قسم کا نشہ نہیں کرتا تھا تو پھر کھانے میں اسے کچھ ملا کر دیا گیا تھا۔“
 صبح کے ناشتے میں اور یا پھر دوپہر کے کھانے میں.....“ میں نے لگائی توقف کر کے گہری نظر سے فیکا کو دیکھا پھر ان الفاظ میں اضافہ کیا۔

”اور رپورٹ میں یہ بھی لکھا ہے کہ جیلا پر اس کی بے خبری میں وار کیا گیا تھا یعنی جب اس کی موت واقع ہوئی تو وہ کسی نشہ آور شے کے زیر اثر تھا۔ اگر یہ پتا چل جائے کہ اس کے معدے میں وہ نشہ آور چیز کس نے پہنچائی ہے تو پھر قاتل تک پہنچنا بہت آسان ہو جائے گا اور..... اس سلسلے میں صرف تم ہی راہ نمائی کر سکتے ہو۔“

”میں کیا کہوں تھانے دار صاحب۔“ وہ عاجزانہ انداز میں بولا۔ ”میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ جیلا کسی قسم کا نشہ نہیں کرتا تھا۔ میں نے اسے کبھی سکرپٹ تک پیتے نہیں دیکھا۔“

”دوہرے کے روز بیچ گھر سے نکلے وقت اس نے کیا ناشتا کیا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”جناب! جب کیتھوں میں باقاعدہ کٹائی یا بیجائی کا کام چل رہا ہوتا ہے تو ہم لوگ صبح سویرے خالی پیٹ ہی نکل جاتے ہیں تاکہ دوپہر سے پہلے زیادہ سے زیادہ کام سمجھ سکیں۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”اس روز بھی یہ دونوں بھائی کھائے یہ بغیر ہی کیتھوں کی طرف چلے گئے تھے۔“

”میں جانتا ہوں۔“ میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی۔ ”جب کسان خالی پیٹ ملی الصباح کیتھوں میں پہنچ کر کام میں جت جاتا ہے تو دوپہر سے پہلے اس کے گھر کی کوئی عورت ناشتا پانی لے کر کیتھوں کی طرف ضرور

نفس کا قیدی

میں طوط تو نہیں؟

”صنوبر ادھر مرزا پوری کا رہنے والا ہے تھانے دار صاحب!“ رتی نے کہا۔ ”اس وقت وہ کیتھوں میں ہوگا۔“
 میں نے فوراً ایک ہلکا کرکیتھوں کی طرف دوڑا یا کہ وہ صنوبر کو اپنے ساتھ لے آئے پھر میں رتی عرف فیکا کی جانب متوجہ ہو گیا۔

”صنوبر کس قاش کا بندہ ہے؟“ میں نے پوچھا۔
 ”بھلا ناس ہے جناب.....!“

”مطلب تمہیں صنوبر پر پورا پورا ہوسا ہے؟“
 ”اگر آپ یہ سمجھ رہے ہیں کہ صنوبر نے کھانے میں کچھ ملا دیا ہوگا تو ایسی کوئی بات نہیں تھانے دار صاحب۔“ وہ سنجیدہ لہجے میں بولا۔ ”ہم نے پہلے بھی کئی بار صنوبر کے ہاتھ کھانا بھیجا ہے۔ اس کی ہم لوگوں سے کوئی دشمنی نہیں۔“
 ”اس روز کھانے میں کون کون سی چیزیں شامل تھیں؟“ میں نے ایک دوسرے زاویے سے سوال کیا۔
 ”تندور (خنور) کی روٹیاں تھیں۔“ رتی نے بتایا۔
 ”اس کے ساتھ لکڑی، اچار تھا اور دھنسی آم تھے۔“

ان دنوں آم پک چکے تھے اور آم کے باغات میں ہر جانب رونق نظر آتی تھی۔ گرمیوں کے موسم میں اجار روٹی اور لکڑی کا بڑا عمدہ میل جتا ہے اور اگر سر ہو کر کھانا کھائیں تو پھر کسی سایہ دار درخت کے نیچے لمبی ٹان کر بھی سونے کو بی چاہتا ہے۔ ایک امکان یہ بھی تھا کہ جیلا اس کھانے کے زیر اثر اپنے ماحول سے غافل ہو گیا ہوگا لیکن یہاں پر ایک اہم سوال سر اٹھاتا تھا اور وہ یہ کہ..... یہ کھانا تو دونوں بھائیوں نے کھایا تھا پھر شیلہ (کلیل) پر غفلت کی کیفیت طاری کیوں نہ ہوئی؟

اس سوال کے ذیل میں یہ سوال بھی موجود تھا..... کہیں ایسا تو نہیں کہ شیلہ نے کھانا کھایا ہی نہ ہو؟

ان تمام سوالات کے جواب حاصل کرنے کے لیے کلیل عرف شیلہ کا تفصیلی انٹرویو بہت ضروری تھا۔ میں نے بیس مئی کو جائے وقوعہ پر اس سے سرسری پوچھنا چھ کی گئی تاہم اس وقت تک یہ کیس مکمل اندازے میں تھا لیکن اب اس کے بہت سے پہلو حل کر سائنے آچکے تھے لہذا اس مرحلے پر شیلہ سے بات چیت سودمند ثابت ہو سکتی تھی۔ میں نے رتی سے پوچھا۔

”کلیل اس وقت کہاں ہے؟“
 ”وہ ادھر گھر پر ہی ہے جناب۔“
 ”تم جب گھر پہنچو تو اسے میرے پاس بھیج دینا۔“

جانتی ہے۔ عموماً کھیت میں کام کرنے والے افراد دس اور گیارہ بجے کے درمیان گھر سے آیا ہوا ناشتا کرتے ہیں اور پھر دوبارہ اپنے کام میں جت جاتے ہیں۔ یہ ناشتا اتنا توی ہوتا ہے کہ پھر دوپہر کے کھانے کی ضرورت پاتی نہیں رہتی اور کسان شام میں واپس آ کر گھر ہی میں سر ہو کر کھانا کھاتا ہے۔ فیکا جی! تم سے میرا سوال یہ ہے کہ..... میں نے لگائی توقف کر کے اس کی آنکھوں میں جھانکا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”انہی مئی کو جیلا کے لیے کھانا لے کر کون کیتھوں کی طرف گیا تھا..... تم یا تمہاری بیوی آسی؟“
 ”جب ہم تینوں باپ بیٹے کیتھوں میں مصروف ہوتے ہیں تو میری گھر والی ہمارے لیے ناشتا کھانے لے کر کیتھوں میں جاتی ہے۔“ رتی عرف فیکا نے جواب دیا۔
 ”لیکن میں نے آپ کو پہلے بھی بتایا ہے، اس روز میری مگر میں بہت زیادہ تکلیف مگی اور میں کام پر نہیں گیا تھا۔“
 ”تو تم یہ کہنا چاہے ہو کہ آج کھانا لے کر کیتھوں میں مگی تھی؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں جی، آسی تو سارا دن میری دیکھ بھال میں مگی رہی تھی۔“ اس نے بتایا۔
 ”پھر کھانا کس نے پہنچایا؟“ میں نے کڑے لہجے میں دریافت کیا۔ ”اب یہ نہیں کہتا کہ اس دن کھانا مگی ہی نہیں۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ بتاتی ہے کہ جب جیلا کو موت کے گھاٹ اتارا گیا، اس کے معدے میں کھانا موجود تھا اور اس کھانے کے اندر کسی نشہ آور شے کے آثار بھی پائے گئے ہیں.....!“

”جی، میں آپ سے جھوٹ کیوں یوں گا۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”اس دن شیلہ اور جیلا کے لیے کھانا کیا تھا۔“

”کون لے کر گیا تھا ان کا کھانا؟“
 ”اس بندے کا نام صنوبر ہے جی۔“ اس نے بتایا۔
 ”میری گھر والی نے صنوبر کے ہاتھ ان دونوں کا کھانا بھجوا دیا تھا۔“
 ”صنوبر کون ہے؟“ میں نے ٹٹولنے والی نظر سے رتی عرف فیکا کو گھورا۔ ”اور کہاں مل سکتا ہے؟“

مجھے شک گرا تھا کہ کہیں اس بندے نے کھانے میں کچھ ملا تو نہیں دیا تھا جس کی وجہ سے جیلا بے خبری کی حالت میں چلا گیا اور قاتل کو اپنا کام کرنے میں کسی دشواری کا سامنا نہیں ہوا۔ ان خیالات کے دوران ہی میرے ذہن نے یہ بھی سوچا، ابکیں یہ صنوبر ہی جیلا کے کل

میں نے کہا۔ ”پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔“ میں نے تسلی بھرے انداز میں کہا۔ ”بس معمول کی پوچھ گچھ کرنا ہے۔ ہو سکتا ہے، کوئی ایسی بات سامنے آجائے جو جیلا کے قاتل تک رسائی کو آسان بنا دے۔“

”جی بہت اچھا۔“ وہ تعاون آمیز انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”میں ابھی اسے آپ کے پاس بھیجتا ہوں۔“

”تھانے دار جی!“ صدیقہ نے براہ راست مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھا۔ ”آپ نے خبر اور کاغذات سے جو تفتیش کی ہے، اس سے کوئی ایسا سراغ ہاتھ لگا جو جیلا کے قاتل کو پکڑ دے؟“

”ابھی تک تو کوئی ایسا سراغ میرے ہاتھ نہیں لگا۔“ میں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ”اسی لیے میں نے ان دونوں کو جانے کی اجازت دے دی تھی لیکن مجھے یقین ہے کہ آنے والے دو تین دن میں، میں قاتل کی گردن تاپنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔“

”ان شاء اللہ.....! تمہیکانے بے چارے سے کہا۔

صدیقہ بولا۔ ”اللہ آپ کو کامیابی دے تھانے دار صاحب۔“ یہ ”دو تین دن“ والی بات میں بے بس ساختہ کہہ دی تھی۔ اس کے پیچھے کوئی خاص منطق نہیں تھی۔ بس میرے اندر سے بے آواز اٹھ رہی تھی کہ یہ کیس حل ہونے میں اب زیادہ دن نہیں لگیں گے۔

”تم کب تک مرزا پور میں ہو؟“ میں نے صدیقہ سے پوچھا۔

”بس جی، آج ہم لوگ واپس چلے جا رہے ہیں۔“ اس نے بتایا۔ ”ہمیں جیلا کی موت کا دکھ تو بہت ہے مگر کیا کریں جی۔ جو اللہ کی مرضی.....!“

”بالکل، اللہ کی مرضی بڑی اہم ہے۔“ میں نے کہا۔ ”جیلا کی موت نے ہر ذی روح کو سو گوار کر دیا ہے۔ اللہ کو منظور ہی نہیں تھا کہ نبیلہ کی جیلا سے شادی ہو۔ شاید اللہ نے تمہاری خواہش کو پورا کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔“

”میری کون سی خواہش تھانے دار صاحب؟“ وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگا۔

”گھبرانے کی ضرورت نہیں۔“ میں نے جلدی سے کہا۔ ”میں اللہ کی مرضی کی بات کر رہا ہوں۔ میں نے سنا ہے تم نبیلہ کی شادی تکمیل سے کرنا چاہتے تھے لیکن جیل نے ضد کی اور نبیلہ کا رشتہ تکمیل سے طے ہو گیا..... ہیں نا؟“

”میری یہ خواہش بڑی اصولی تھی سرکار۔“ وہ

صفائی چیش کرتے ہوئے بولا۔ ”تکلیل بڑا ہے۔ اس کی شادی پہلے ہونا چاہیے تھی لیکن جب جیلا نے ضد پکڑ لی اور فیکا اس کے سامنے مجبور ہو گیا تو پھر میں نے اپنی خواہش کو ایک طرف ڈال دیا۔ میرے لیے دونوں بھائی ایک جیسے تھے۔ وہ ایک لمحے کے لیے رکا پھر سرسراتی ہوئی آواز میں استغفار کیا۔

”مگر آپ کو یہ بات کس نے بتائی؟“

پھر وہ اپنے چھوٹے بھائی فیکا کی طرف دیکھنے لگا۔

میں نے اس کی نگاہ کے منہمک کوچ کر لیا اور کہا۔

”تم غلط سمجھ رہے ہو صدیقہ۔ بات مجھے رفتی نے

نہیں بتائی بلکہ خیر و چار چار فروش نے بتائی ہے۔“

”خیر و.....!“ اس کی حیرت دو چند ہوئی۔ ”مگر وہ تو

ادھر حویلی مراد میں ہوتا ہے۔“

”تو میں نے کب کہا کہ وہ وہاں نہیں ہوتا؟“ میں

نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

”خیر وہاں آیا تھا یا آپ وہاں گئے تھے؟“ اس

نے سوال کیا۔

”میں وہاں گیا تھا اکیس تاریخ کو مگر تھانے دار کی

حیثیت سے نہیں بلکہ تمہارا ایک دور کا شے دار بن کر۔ میں

نے خیر و کو اپنا نام لک جو دیا بتایا تھا اور کہا تھا کہ میں نوپیک

تک سے آیا ہوں۔ خیر و کے ساتھ میری کافی گپ شپ رہی

تھی۔ تم جب واپس جاؤ گے تو وہ تمہیں میرے بارے میں

ضرور بتائے گا۔“

”اچھا جی۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

میں نے کہا۔ ”صدیقہ! اب جتنی جلدی ممکن ہو، نبیلہ کی

شادی تکمیل سے کرو تا کہ ان لوگوں کا دکھ کم ہو.....“

”میں آپ کی بات سمجھ رہا ہوں تھانے دار

صاحب۔“ وہ بکیر کی طرح میں بولا۔ ”اللہ کے ہر کام میں کوئی

نہ کوئی مصلحت ضرور ہوتی ہے۔ نبیلہ کے نصیب میں جیلا تھا

یہی نہیں..... بولتے بولتے وہ خاموش ہو گیا۔ اس کی

آنکھوں میں اداسی اتر آئی تھی۔ چند لمحات کے بعد وہ

بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

”ماتم والے گھر میں ذرا سکون ہو جائے تو پھر اس

بارے میں کچھ سوچتے ہیں۔“

وہ دونوں بھائی مزید کچھ دیر تک میرے پاس

بیٹھے رہے پھر مجھے سلام کر کے رخصت ہو گئے۔ صدیقہ کو

آج ہی واپس حویلی مراد جانا تھا لہذا وہ زیادہ دیر یہاں

نہیں رک سکتا تھا۔

نفس کا قیدی

”تم نے وہ کھانا کس کے حوالے کیا تھا؟“ میں نے پوچھا۔ ”جیلا کو یا تھا یا شیلہ کو؟“

”شیلہ کو جناب۔“ اس نے بتایا۔ ”میرے راستے

میں سب سے پہلے وہی آتا تھا۔“

میں نے جائے وقوعہ کا تفصیلی معائنہ کیا تھا۔ جہاں

جیلا کوئل گیا تھا، وہ حصہ گاؤں کی مخالف سمت میں پڑتا

تھا جبکہ شیلہ گاؤں والی سمت میں فصل کی کٹائی کر رہا تھا۔

دونوں مقامات میں چار پانچ کھیت کا قاصد حاصل تھا جس

میں گندم کی بکلی ہوئی فصل کھڑی تھی۔ مگر کار بیان منطقی

اور جغرافیائی طور پر درست تھا۔ گاؤں کی جانب سے

آنے والے کسی بھی شخص کا واسطہ پہلے شیلہ سے پڑتا تھا۔

”کیا ان دونوں نے تمہارے سامنے کھانا کھایا

تھا؟“ میں نے سوالات کے سلسلے کو آگے بڑھاتے

ہوئے پوچھا۔

”نہیں جناب!“ اس نے نفی میں گردن ہلائی۔

”میں وہ کھانا شیلہ کو کھاتا رہا کہ بڑھ گیا تھا۔ انہوں نے کب

کھانا کھایا، کھایا یا نہیں کھایا، میں اس بارے میں کچھ

نہیں جانتا۔“

”جیلا کی پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق، جیلانے

اس روز کھانا کھایا تھا۔“ میں نے پتہ دستور اس کے چہرے

کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ”اور اس کھانے میں

کوئی نشہ آور شے بھی ملی ہوئی تھی جس کی وجہ سے جیلا غفلت

کا شکار ہو گیا تھا چنانچہ قاتل نے اس کی بے خبری کا فائدہ

اٹھایا اور اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔“

”ایسی نشہ آور چیز اس کھانے میں کون ملا سکتا ہے

اور کیوں؟“ وہ حیرت بھرے لہجے میں بولا۔

اس کی حیرت میں مجھے کہیں مصنوعی پن نظر نہیں آیا

تاہم میں نے مگر پڑھائی جاری رکھی اور کہا۔

”ان دونوں سوالات کا جواب تم مجھے دو گے!“

”میں کیوں جی۔“ وہ متوجہ لہجے میں بولا۔ ”میرا

اس معاملے سے کیا تعلق؟“

”دیکھو مگر!“ میں نے بڑی رسائی سے کہا۔ ”جیلا

کی ماں آپ سے بی بی نے وہ کھانا تمہارے حوالے کیا۔ کوئی

ماں اپنے بیٹے کے کھانے میں نشہ آور چیز کیسے ملا سکتی ہے؟ تم

نے وہ کھانا لا کر شیلہ کے حوالے کر دیا۔ شیلہ، جیلا کا بڑا بھائی

ہے۔ وہ بھی اس قسم کی گھٹیا حرکت نہیں کر سکتا۔ اب آجاکے

تم ہی باقی بیچے ہو.....!“

میں نے دانستہ جملہ ادھر اچھوڑا تو وہ تڑپ کر بولا۔

”تمہاری دیر کے بعد میرے تھانے کا اہلکار مگر کوئے

لا گیا۔ میں نے پوچھ گچھ کے لیے فوراً اسے اپنے پاس

لایا۔“

مگر ایک عام سی شکل صورت کا مالک تھا۔ اس کی عمر

تیس کے قریب تھی۔ وہ اپنے تھانے بلائے جانے پر کافی

تھرا یا ہوا تھا۔ میں نے اسے بیٹھنے کے لیے کہا اور پوچھا۔

”کیا بات ہے مگر! تمہارے چہرے پر ہوائیاں

کیوں اڑ رہی ہیں؟“

”بس جی، کبھی پولیس یا تھانے سے واسطہ جو نہیں

پڑا۔“ وہ کمزوری آواز میں بولا۔

”واسطہ رکھا کرو نا!“ میں نے اس سے تفرقہ لیتے

ہوئے کہا۔ ”پولیس والے بھی تمہاری طرح انسان ہی ہوتے

ہیں..... اپنے پاس آنے والے کو کچھ نہیں چاہتے!“

وہ بڑی فرمانبرداری سے بولا۔ ”ٹھیک ہے جی۔

اب میں آپ کے تھانے میں آتا ہوں گا۔“

”جب بھی ادھر سے گزر دو، مجھے سلام کر لیا کرو۔“

میں نے کہا پھر پوچھا۔ ”جانتے ہو، میں نے اس وقت تمہیں

یہاں کیوں بلایا ہے؟“

”آپ جیلا کے قتل کی تفتیش کر رہے ہیں۔“ اس نے

جواب دیا۔ ”اسی سلسلے میں آپ مجھ سے کبھی پوچھ گچھ کرنا

چاہتے ہیں۔“

”شباباش!“ میں نے سر اپنے والے انداز میں

کہا۔ ”بس، تو پھر شروع ہو جاؤ۔ مجھے بتاؤ کہ جیلا کو کس

نے قتل کیا ہے؟“

”میں کیا بتا سکتا ہوں جی۔“ وہ بے چارگی سے بولا۔

”میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔“

”میں نے سنا ہے، وقوعہ کے روز تم ہی جیلا اور شیلہ کو

کھانا دینے گئے تھے؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں

دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”جی، آپ نے بالکل ٹھیک سنا ہے۔“ اس نے

اثبات میں گردن ہلائی اور بتایا۔ ”اس دن چار فیکا تیار

تھا۔ چارچی آسیر اس کی دیکھ بھال میں لگی ہوئی تھی لہذا

جب میں ان کے گھر کی طرف سے گزرا تو انہوں نے کھانا

مجھے تمہارا یا اور میں کھانے لے کر کھیتوں کی جانب چل پڑا۔“

”اس کھانے میں کیا کیا تھا؟“

”کسی کا ڈول (بائی) تھا، روٹیاں تھیں، اجارہ اور

دہی آم تھے۔“ اس نے فیکا کے بیان کی تصدیق کرتے

ہوئے کہا۔

”اس کا نام خادم حسین ہے۔۔۔۔۔ خیریت تو ہے نا؟“
 ”ابھی تک تو خیریت ہی ہے۔“ میں نے سنتا ہے
 ہوئے لہجے میں کہا۔ ”لیکن لگتا ہے، خادم حسین کے آنے
 کے بعد خیریت کا سوا ستیاناس ہو جائے گا۔“
 ”ایسا کیا ہوئے والا ہے ملک صاحب؟“ اس کے
 چہرے پر حیرت بھری آنکھیں پڑا ہوئی۔

میں نے سرخ چہرے میں سیاہ وادہ کالی ڈوری والا
 تعویذہ فرزند علی کو دکھایا اور کہا۔

”تھوڑی دیر پہلے مشتاق باجوہ یہ تعویذہ لے کر آیا
 ہے۔ یہ تعویذہ بھی اسی کھیت سے ملا ہے جہاں سے پہلے وہ
 آہنی تھوڑا ملا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اس تعویذہ کا تعلق جیلا
 کے کٹل سے ہے۔ اگر ہم اس تعویذہ کے مالک تک پہنچ جائیں
 تو پھر قاتل تک رسائی بہت آسان ہو جائے گی۔“

حوالدار نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔
 ”آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں ملک صاحب۔ اس تعویذہ
 کی سلائی کو دیکھ کر لگتا ہے کہ اسے کسی نے حال ہی میں
 تیار کیا ہے۔“

”اور یہ سلائی ایسے ماہر انداز میں کٹی گئی ہے جو کسی
 ماہر فن موہنی ہی کا کارنامہ ہو سکتا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اور تم
 نے بتایا ہے کہ اس گاؤں میں صرف ایک ہی موہنی ہے،
 خادم حسین۔۔۔۔۔!“

”بالکل ملک صاحب۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے
 ہوئے بولا۔ ”میں ابھی خادم حسین کو تھانے بلاتا ہوں۔“

فرزند علی میرے کمرے سے رخصت ہوا تو میں اس
 تعویذہ اور اس کے مالک کے بارے میں سوچنے لگا۔ اغلب
 امکان یہی تھا کہ مذکورہ تعویذہ اسی شخص کا ہوگا جس نے وہ
 آہنی تھوڑا مشتاق باجوہ کے کھیتوں میں پھینکا تھا۔ اس تعویذہ
 کی گرہ والا حصہ بتاتا تھا کہ تعویذہ کا گلے سے لگنا، گرہ مکمل
 جانے کے سبب تھا اور جب تعویذہ گرا تو اس شخص کو مطلق
 احساس نہیں ہوا ہوگا ورنہ یہ سراسر مشتاق باجوہ کے کھیتوں
 میں چھوڑنے کی غلطی نہ کرتا۔ وہ آہنی تھوڑا اس نے اپنی
 مرضی سے پھینکا تھا اور یہ تعویذہ آپ اس کے گلے سے
 نکل کر کھیتوں میں پہنچ گیا تھا۔

آدمے گھنٹے کے بعد خادم حسین موہنی میرے سامنے
 بیٹھا تھا۔ وہ گہری رنگت کا مالک ایک سوکا سڑا عمر رسیدہ شخص
 تھا۔ چہرے کے ساتھ دن رات مصروف رہنے کی وجہ سے
 وہ خود بھی چہرے ایسا ہی ہو گیا تھا۔

”حکم سرکار۔“ میرے کچھ بولنے سے پہلے ہی اس

”ملک صاحب!“ وہ اپنی جیب کی جانب ہاتھ
 دھاتے ہوئے بولا۔ ”آپ کو تو پتا ہی ہے کہ آج کل گندم کی
 مالٹی کا بیزن چل رہا ہے۔ میں بھی اپنے کھیتوں میں فصل کی
 مالٹی میں مصروف تھا تو یہ چیز میرے ہاتھ لگ گئی۔“

بات کے اختتام پر اس نے اپنا ہاتھ جب جیب
 سے باہر نکالا تو مجھے اس کے ہاتھ میں ایک تعویذہ دیا ہوا
 سامانی دیا۔ اس نے وہ تعویذہ میری جانب بڑھا دیا۔ میں
 نے مذکورہ تعویذہ کو اپنے ہاتھ میں لے کر اس کا معائنہ کیا۔
 وہ کالی ڈوری میں پرویا ہوا چہرے کا ایک تعویذہ تھا۔
 بڑے کارنگ سرخ تھا اور اس میں متشدد تعویذہ کا ساڑھ ایک
 انچ بانی ڈیزہاچ رہا ہوگا۔ تعویذہ کی ڈوری کی گرہ مکمل ہوئی
 تھی۔ میں نے فوراً اندازہ لگایا کہ وہ تعویذہ حامل تعویذہ کے
 گلے سے ایسے چپکے سے گر گیا ہوگا کہ اس شخص کو پتا بھی نہیں
 چلا ہوگا۔

میں نے اس تعویذہ کو ہاتھوں میں گھمانے پھرانے
 کے بعد مشتاق باجوہ سے سوال کیا۔ ”یہ تعویذہ تمہیں کہاں
 سے ملا ہے؟“

”میرے ایک کھیت میں سے ملک صاحب۔“ اس
 نے جواب دیا۔ ”یہ کھیت اس کھیت سے جڑا ہوا ہے جہاں
 سے وہ خون آلود تھوڑا ملا تھا۔“

”اوہ۔۔۔۔۔“ میں نے ایک تشویش بھری گہری
 سانس خارج کی پھر پوچھا۔ ”کیا تم اس تعویذہ کو پہچانتے
 ہو؟ میرا مطلب یہ ہے کہ کیا تمہیں معلوم ہے، یہ کس کا
 تعویذہ ہو سکتا ہے؟“

”نہیں جناب! میں اس تعویذہ کے مالک کے بارے
 میں کچھ نہیں جانتا۔“ وہ غلی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔
 ”لیکن ایک بات میں بڑے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اس
 تعویذہ کا جیلا کے قاتل سے کوئی نہ کوئی تعلق ضرور ہے۔“

”تمہاری بات میں خاصا وزن ہے باجوہ!“ میں نے
 سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”آزاد کٹل اور اس تعویذہ
 کا ایک ہی کھیت سے بازیا ہوا اس امر کی دلیل ہے کہ
 جب قاتل نے وہ آہنی تھوڑا تمہارے کھیت میں پھینکا تو یہ
 تعویذہ بھی اس کے گلے سے مکمل کر رہی ہو گیا ہوگا۔“

مزید دس پندرہ منٹ کی گفتگو کے بعد میں نے مشتاق
 باجوہ کو رخصت کر دیا اور حوالدار کو اپنے پاس بلایا۔

”فرزند علی!“ میں نے حوالدار کی طرف دیکھتے
 ہوئے کہا۔ ”مرزا پور میں کتنے موہنی ہیں؟“

”صرف ایک ہی ہے ملک صاحب۔“ اس نے جواب

انہیں مئی کو عصر اور مغرب کے درمیان جیل عرف جیلا
 کو کھو پڑی پر آہنی تھوڑے کی ایک طوقالی ضرب لگا کر
 موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔ آزاد کٹل میں بازیا ہوا کرچکا
 تھا لیکن ابھی تک اس قاتل کا عرق مکمل کر سامنے نہیں آ سکا تھا
 لہذا قاتل کی گردن میرے آہنی ہاتھوں کی گرفت سے ابھی
 دور تھی۔

میں نے پچھلے تین چار دن میں جو بھی تفتیش کی تھی،
 اس کے خاطر خواہ نتائج حاصل نہیں ہو سکے تھے۔ کچھ
 واقعات و شواہد ابھر کر سامنے آتے تھے لیکن چند قدم آگے
 بڑھنے کے بعد اس کیس کے منظر نامے پر تاریکی چھا جاتی
 تھی اور تفتیش کی گاڑی بندگی میں پہنچ کر رک جاتی تھی۔
 میں نے ہمت نہیں ہاری تھی اور مجھے یقین تھا کہ بہت
 جلد جیلا کا قاتل میری تحویل میں ہوگا۔ میں اپنی انہی
 کوششوں میں ذہن اور جسم کو تھکانے میں بہرمن مصروف تھا
 کہ ایک اہم سرا میرے ہاتھ لگ گیا پھر اس کیس کی پرتیں
 ایک کے بعد ایک کھلتی چلی گئیں۔

تیس مئی کی صبح سے رات تک میں بے حد مصروف
 رہا تھا لہذا جب میں اپنے کوارٹر میں جا کر سو یا تو بڑی گہری
 نیند آئی۔ میں ایسا بے خبر سو پا کر فجر کی نماز بھی نکل گئی۔ میں
 عموماً فجر اور عشا کی نماز کو خطا نہیں کرتا آلا یہ کہ کوئی بہت بڑی
 مجبوری آڑے نہ آ جائے جیسا کہ اس صبح ہوا تھا۔

میں چوبیس مئی کی صبح حسب معمول تیار ہو کر تھانے
 پہنچا تو ایک چونکا دینے والی خبر میری منتظر تھی اور اس خبر کا
 ماخذ تھا، مشتاق باجوہ۔ میں نے فوراً اسے اپنے پاس بلایا۔
 مشتاق باجوہ بہت قامت، فربہ اور چھوٹا زمیندار تھا۔
 اس کی زمین ضلع شیخوپورہ کی سرحد سے لگی ہوئی تھی تاہم اس
 زمین کا شمار مرزا پور یعنی ضلع شیخوپورہ ہی میں ہوتا تھا۔ آزاد
 کٹل وہ تھوڑا اسی کے کھیت سے ملا تھا۔

جب وہ میرے سامنے بیٹھ چکا تو میں نے اس کی
 آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”باجوہ! تمہارے
 چہرے کے تاثرات بتاتے ہیں کہ کوئی بہت ہی خاص خبر
 لائے ہو؟“

”آپ کا حکم تھا کہ اگر کوئی بھی غیر معمولی چیز میری
 نگاہ میں آئے تو میں فوراً آپ کو اطلاع دوں۔“ وہ جوش
 بھرے انداز میں بولا۔ ”بس، اسی لیے مج ہی صبح حاضر
 ہو گیا ہوں ملک صاحب۔“

میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور مشتاق باجوہ سے پوچھا۔

”اب کون سی اہم اطلاع لے کر آئے ہو؟“

”جناب! مجھے یقین ہے کہ آسیر چاچی اور شہلا، جیلا کے ساتھ
 کوئی دشمنی نہیں کر سکتے لیکن میں آپ کو بالکل سچ بتا رہا ہوں
 کہ میرا اس معاملے سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ آپ چاہیں
 تو مجھ سے بڑی سے بڑی قسم بھی لے سکتے ہیں اور پورے
 مرزا پور کے لوگوں سے پوچھ سکتے ہیں۔ کبھی میری جیلا سے
 کھٹ پٹ نہیں ہوئی۔ میں اس کا دشمن نہیں بن سکتا تھا نے
 دار صاحب۔“

”یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ تمہاری جیلا سے براہ
 راست کوئی دشمنی نہ ہو۔“ میں نے ایک امکان کی جانب
 اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”تم نے یہ کام کیسے کیا اور شخص کے
 کہنے پر کیا ہو۔ کوئی ایسا شخص جو اپنے دل میں جیلا سے
 شدید نفرت کرتا ہو۔۔۔۔۔؟“

”یہ تو ٹھیک ہی ہے کہ جس کسی نے بھی جیلا کی جانی
 ہے، وہ جیلا کو سخت پائند کرتا ہوگا۔“ وہ گہری سنجیدگی سے
 بولا۔ ”میں نے جیلا کی لاش کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے
 لیکن آپ میری بات کا یقین کریں کہ میں اس معاملے میں
 کسی بھی طور ملوث نہیں ہوں۔“

اس کی باتوں سے سچائی اور راست گوئی کی خوشبو
 آتی تھی۔ اگر وہ کوئی بہت بڑا جڈ بات کا ماہر ادا کار نہیں تھا
 تو میرا پیشہ ورنہ تجربہ بتاتا تھا کہ وہ غلط بیانی سے کام نہیں
 لے رہا تھا۔ اس کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد میں
 نے کہا۔

”ٹھیک ہے مندر! میں تمہاری بات کا یقین کر لیتا
 ہوں۔ تم یہاں سے جا سکتے ہو لیکن مجھے شگلی اطلاع دیے
 بغیر تم مرزا پور سے باہر نہیں نہیں جاؤ گے۔“

”اس کا مطلب ہے، آپ کا شک پوری طرح ختم
 نہیں ہوا؟“ وہ شاکي نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

”مندرجہ!“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔
 ”پولیس ڈیپارٹمنٹ میں ”شک“ کی بہت اہمیت ہے کیونکہ
 پولیس کی تفتیش کی گاڑی شک کے بیٹروں ہی سے چلتی ہے۔
 بہر حال۔۔۔۔۔“ میں نے کھاتی توقف کر کے ایک گہری سانس
 لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”تم بے فکر ہو کر جاؤ اور اپنی آنکھیں اور کان کھلے
 رکھنا۔ اگر تمہیں اس قاتل کی واردات کے حوالے سے کوئی بھی
 خاص یا عام بات پتا چلتی تو فوراً میرے پاس چلے آؤ۔“
 اس نے مجھے، میری ہدایات پر عمل کرنے کا یقین
 دلایا اور سلام کر کے تھانے سے رخصت ہو گیا۔

☆☆☆

”تھانے دار صاحب! سب خیریت تو ہے نا.....“

”آپ یہاں؟“

”بس شیلے سے کچھ سوال و جواب کرنا ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”میں نے کل آپ دونوں کو تاکید کی تھی کہ کمرہ چھینے ہی شیلہ کو میرے پاس بھیج دینا لیکن تم نے میری بات کو کوئی اہمیت نہیں دی!“

”تھانے دار صاحب! سب بات تو یہ ہے کہ پریشانی میں یہ بات ہمارے ذہن سے نکل گئی۔“ وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔ ”پھر جب ہم مرزا پور سے روانہ ہو رہے تھے تو فیکا نے زبردستی شیلہ کو ہمارے ساتھ کر دیا۔ یہ اپنے بھائی کی الم نامک موت پر بہت دگلی تھا۔ فیکا نے سوچا کہ شیلہ چند دن یہاں رہے گا تو اس کا دل بھل جائے گا۔“

میں نے ہنسیک میں ادھر ادھر نگاہ دوڑاتے ہوئے استفسار کیا۔ ”اس وقت وہ کہاں ہے؟“

”ابھی تھوڑی دیر پہلے تو وہ گھر کے اندر ہی تھا۔“ اس نے بتایا پھر وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور بولا۔ ”آپ آرام سے بیٹھیں۔ میں شیلہ کو ڈھونڈ کر لاتا ہوں اور آپ کی خاطر تواضع کا بھی بندوبست کرتا ہوں۔“

”اس تکلف کی کوئی ضرورت نہیں صدیق۔“ میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے منع کرتے ہوئے کہا۔ ”اس گھر کا ماحول سوگوار ہے۔ ہم یہاں پکک منانے نہیں آئے۔ بس، شیلہ سے چند سوالات کرنا ہیں۔ اس کے بعد ہم وہاں چلے جائیں گے۔“

”وہ تو فیک ہے جناب لیکن آپ پہلی مرتبہ میرے گھر آئے ہیں۔“ وہ اصرار ہی لہجے میں بولا۔ ”میں کچھ کھلائے پلائے تغیر آپ کو یہاں سے نہیں جانے دوں گا۔“

”شیک ہے صدیق! جیسی تمہاری مرضی۔“ میں نے بات کو ختم کرتے ہوئے کہا۔ ”جہیں جو بھی تکلف کرنا ہے، وہ سب بعد میں کرنا۔ فی الفور تم شیلہ کو میرے پاس بھیج دو۔“

”جی اچھا جناب.....“ یہ کہتے ہوئے وہ ہنسیک سے نکل گیا۔

میں اس وقت ہنسیک کے داخلی دروازے کے نزدیک بیٹھا ہوا تھا اور حوالدار فرزند علی میرے سامنے دوسری دیوار کے ساتھ۔ میں نے فوراً حوالدار کے ساتھ اپنی جگہ بدل لی۔

اس نے چونکے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ”اس کی کوئی خاص وجہ ملک صاحب؟“

”کی؟“

”فیکا نے بتایا ہے کہ وہ دو تین دن ادھر ہی رہے گا۔“

”لیکن میں دو تین دن تک اس کا انتظار نہیں کر سکتا۔“ میں نے اصرار ہی لہجے میں کہا پھر حوالدار کی جانب دیکھتے ہوئے اضافہ کیا۔ ”فرزند علی! تیری کرو۔ ہم ابھی حویلی مراد جا رہے ہیں..... سیدھے صدیق حلوئی کے کمرہ۔“

”جی ملک صاحب! بس پندرہ بیس منٹ کے بعد آپ مجھے بالکل تیار پائیں گے۔“ وہ جلدی سے بولا پھر مجھے سیلوٹ کرنے کے بعد روانگی کے انتظامات کرنے چلا گیا۔

☆☆☆

دوپہر کے وقت ہم حویلی مراد میں تھے۔ اس وقت ہم دونوں پولیس کے بیٹھنا شروع ہوئے۔ اب کی بار میں نے متعلقہ تھانہ انچارج آف حویلی مراد کی طرف جانے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی اور سیدھا صدیق حلوئی کے گھر کی طرف بڑھ گیا تھا۔ صدیق کی مٹھانی کی دکان گھر والے راستے پر ہی پڑی تھی اور اس کی دکان کے بازو میں خیر دین پر چون فروش کی دکان تھی۔ میں نے خیر دین کی دکان پر پہنچ کر تجزیہ لہجے میں استفسار کیا۔

”چاچا! کیا میرا دور کار شے وارد صدیق حلوئی وہاں آ گیا ہے؟“

خیر دین نے مجھے پہلے سول ڈریس میں دیکھا تھا۔ اب جو پولیس کی وردی میں دیکھا تو چونک اٹھا۔ سرسرائی ہوئی آواز میں متحضر ہوا۔

”جو ادھر! کیا تم پولیس والے ہو؟“

”ہاں چاچا! میں مرزا پور والے تھانے کا انچارج ہوں۔“ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

”بس، چاچا! پولیس کی نوکری میں سوسائٹس بدلنا پڑتے ہیں۔“

”تو اس دن تم سادہ لباس میں فٹیش پر تھے اور آج بارودی آئے ہو۔“ اس نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”لگتا ہے، اب مجرموں کی خیر نہیں۔“

”بس چاچا! دعا کرو، میں جلد از جلد جیل کے قاتل کو پکڑنے میں کامیاب ہو جاؤں۔“ میں نے کہا۔

”میری دعا میں تمہارے ساتھ ہیں پتر۔“ وہ خلوصی دل سے بولا۔ ”اللہ تمہیں بخیر دے گا۔“

ہم صدیق حلوئی کے گھر پہنچ گئے۔ اس نے ہمیں ہنسیک میں بٹھایا پھر پریشان لہجے میں بولا۔

چڑے میں منڈر کا لی ڈوری ڈال دوں۔“ وہ اپنی ہی دھن میں بولتا چلا گیا۔ اس نے جس بابا سے یہ تعویذ لیا تھا، اس کی ہدایت بھی کد لال رنگ کے کپے چڑے میں اسے منڈا ہے۔ میں نے پہلے اس تعویذ کو موسم جاے میں اچھی طرح لپیٹا پھر اپنی تیز نوک والی آر کی مدد سے لال چڑے کے اندر ہی دیا تھا۔ میں نے اس کی سلائی کے لیے موم کا مضبوط دھاگا استعمال کیا تھا تاکہ کسی قسم کا گرد و غبار یا پانی اس تعویذ کے اندر نہ پہنچ سکے۔“

خادم حسین کے انکشاف نے مجھے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اگر یہ تعویذ واقعی کلیل عرف شیلہ کا تھا تو پھر یہ سستی خیر سوال پیدا ہوتا تھا کہ تعویذ اس کیمت میں کیسے پہنچا جہاں سے آئے تھے؟ کیا وہ آہنی ہتھوڑا بھی شیلہ ہی نے مشاق باجوہ کے کیمتوں میں پھینکا تھا؟ اور کیا شیلہ کا جیلا کی موت میں کوئی ہاتھ تھا؟

بادی انکسر میں ایسا دکھائی نہیں دیتا۔ دونوں بھائیوں میں بہت اچھے تعلقات تھے۔ کچھ عرصے بعد جیلا کی شادی ہونے والی تھی اور شیلہ اس کی شادی کی تیاریوں میں پیش پیش تھا۔ میرے ذہن میں ایک سوال یہ بھی پیدا ہوا کہ ممکن ہے، شیلہ کو پھانسنے کے لیے کسی نے وہ تعویذ مشاق باجوہ کے کیمتوں میں پھینک دیا ہو.....

گزشتہ روز جب فیکا اور صدیق مجھ سے ملنے آئے تھے تو میں نے ان سے کہا تھا کہ وہ گھر جا کر شیلہ کو میرے پاس بھیج دیں لیکن شیلہ تھانے نہیں آیا تھا۔ میں پچھلے دن اس قدر مصروف رہا تھا کہ شیلہ میرے دھیان میں نہیں رہا تھا لیکن خادم حسین کے انکشاف کے بعد میں شیلہ سے ملنے کے لیے بے تاب ہو گیا تھا۔ میرے ذہن میں ایسے ڈھیروں سستی خیر سوالات جمع ہو چکے تھے جن کے جواب صرف اور صرف شیلہ ہی دے سکتا تھا۔

میں نے خادم حسین موم کی کو فارغ کیا اور اپنے ایک بندے کو کلیل عرف شیلہ کی طرف دوڑا دیا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ بندہ واپس آیا اور اس نے بتایا۔ ”ملک صاحب! شیلہ تو مرزا پور میں ہے ہی نہیں۔“

”کہاں چلا گیا وہ؟“ میں نے سرسراتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

”مجھے پتا چلا ہے، وہ کل اپنے چاچے بلکہ تاجیہ صدیق کے ساتھ حویلی مراد چلا گیا تھا۔“ اس نے بتایا۔

میں نے پوچھا۔ ”پتہ پتا چلا، شیلہ کی واپسی کب تک

نے سوال کر دیا۔“ آپ نے کیسے یاد کیا؟“

”خادم حسین! میں نے تمہارا بہت نام سنا ہے۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”مجھے پتا چلا ہے کہ تم مرزا پور کے اکلوتے مومچی ہو اور آ لے دو الے کے گاؤں میں بھی تمہارے مقابلے کا کوئی مومچی نہیں ہے۔ میں نے سوچا، آج میں بھی جہیں چیک کر لوں۔“

”آپ نے میرے بارے میں جو بھی سنا، وہ بالکل ٹھیک سنا ہے تھانے دار صاحب۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”لیکن یہ مجھے نہیں آیا کہ آپ میری کس قسم کی چیکنگ کرنا چاہتے ہیں.....!“

”میں سمجھتا ہوں۔“ میں نے بڑی رمان سے جواب دیا۔ ”تمہارا نام خادم حسین ہے اور میں تمہارے کام ہی کو چیک کرنا چاہتا ہوں۔“

”آپ مجھ سے کیا پوچھنا چاہتے ہیں ملک صاحب۔“ وہ بے حد سنجیدہ لہجے میں بولا۔ ”ذرا مل کر بتائیں.....!“

”تم اپنے نام سے حسین کے خادم ہو۔“ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ”اب دیکھنا یہ ہے کہ تمہارے اندر امام حسین کے اوصاف بھی موجود ہیں یا نہیں نام ہی کے خادم حسین ہو.....“

”لگائی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس لی پھر بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”جی..... میں نے ہمیشہ چائی کا ساتھ دیا ہے۔“ وہ سینہ پھلاتے ہوئے بولا۔ ”اور گہری بات کرنے کی کوشش کی ہے۔“

”ٹھیک ہے، میں ابھی تمہاری بات کی صداقت کو چیک کر رہا ہوں۔“ میں نے کہا پھر وہ چڑے کا تعویذ اس کی جانب بڑھاتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا تم اس تعویذ کو پہچانتے ہو؟“

”بالکل پہچانتا ہوں سرکار۔“ وہ کرارے لہجے میں بولا۔ ”میں اپنے ہاتھ کے لگائے ہوئے ایک ایک تروپے (سلائی) کو دوری سے دیکھ کر جانچ لیتا ہوں۔“

میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور پوچھا۔ ”پھر تو تمہیں یہ بھی یاد ہوگا کہ یہ تعویذ تم نے کس کے کہنے پر بنایا تھا؟“

میں نے ابھی تک خادم حسین کو مذکورہ تعویذ کی ہسٹری نہیں بتائی تھی۔ اس نے خاصی توانا آواز میں جواب دیا۔

”جی بالکل یاد ہے..... بہت اچھی طرح یاد ہے۔ یہ تعویذ میں نے جیلا کے بڑے بھائی شیلہ کے لیے بنایا تھا۔“

”کیا؟“ میں اپنی سیٹ پر اچھل کر رہ گیا۔

”شیلہ نے مجھ سے کہا تھا کہ میں اس کے تعویذ کو ال

مختصر... مختصر

جن

شادی کی ایک تقریب میں جن آگیا۔ اے دیکھتے ہی لڑکیوں کی چیخیں کھل گئیں۔ ایک بابا جی نے لڑکیوں کو دھوکہ دینے کے لیے کہا۔ لڑکیاں دھوکہ کھ گئیں تو انہیں دیکھ کر جن کی چیخیں کھل گئیں۔

کو

ایک کوٹھڑی کے ہاتھ سے گوشت لے اڑا۔ مولوی نے چلا کر ایسی بات کہی کہ کوٹھڑا کر گوشت واپس دے گیا۔ مولوی نے کہا..... بے غیرت صبح اعلان کر دوں گا کہ کوٹھڑا مال ہے۔

دعا

ایک آدمی دعا مانگ رہا تھا۔ مالک تو نے مجھے بچپن دیا چھین لیا، جوانی دی چھین لی، پیسہ دیا، واپس لے لیا مگر بیوی دی اور دے کے بھول گیا۔

وعدہ

گاہک نے دکا دار سے کہا۔ ”جب میں نے آپ سے سونے کی خریدی تو آپ نے وعدہ کیا تھا کہ میں ایک سونے کی چوڑی چاہے تو مجھے دے دیں گے۔“ گاہک نے کہا۔ ”جی فرمائیے کیا ہوا؟“

مرسلہ: وزیر محمد خان، محل ہزارہ

میں سیدھا گھر گیا تھا۔

”جی..... میں سیدھا گھر گیا تھا۔“

”اچھی طرح سوچ کر جواب دیا ہے؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں بہت دور تک جھانکتے ہوئے پوچھا۔ ”جی، جو بچہ ہے وہ میں نے آپ کو بتا دیا ہے۔“ وہ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولا۔

مجھے واضح طور پر محسوس ہوا کہ میرے کڑے سوالات نے اسے کافی بے چین کر دیا تھا۔ میں نے سرسراہٹے ہوئے لہجے میں کہا۔

”میں دے کر آگے بڑھ گیا تھا جبکہ.....“ لہائی توقف کر کے میں نے گہری سانس لی بھرپور دستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”جبکہ جیلا گاؤں کی مخالف سمت والے کھیتوں میں کام کر رہا تھا۔ کیا تم کھانا لے کر اس کے پاس گئے تھے یا وہ تمہارے پاس آیا تھا۔ ایک ساتھ کھانا کھانے کے لیے ضروری تھا کہ تم دونوں ایک ہی مقام پر موجود ہو؟“

”میں نے آواز دے کر جیلا کو اپنے پاس بلا لیا تھا۔“ وہ ہنستے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”پھر ہم نے ایک ساتھ بیٹھ کر کھانا کھا لیا تھا۔“

”اس کے بعد جیلا وہیں ان کھیتوں کی طرف چلا گیا تھا جہاں وہ فصل کی کٹائی کر رہا تھا؟“

”جی ایسا ہی ہوا تھا۔“ اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ”تم نے مجھے بتایا تھا کہ عصر سے پہلے جیلا کا ہاتھ درانی سے کٹ گیا تھا اور تم نے اس پر پٹی باندھ دی تھی اور اسے گھر جانے کے لیے کہہ دیا تھا کہ وہ زخمی ہاتھ کے ساتھ آرام کر سکے۔“ میں نے گریہ کا مکمل جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”پٹی کروانے وہ تمہارے پاس آیا تھا یا تم اس کی طرف گئے تھے؟“

”وہ میرے پاس آیا تھا۔“ اس نے جواب دیا۔ ”تم نے اس کے زخمی ہاتھ پر پٹی کی اور اسے گھر بھیج دیا؟“

”جی بالکل ایسا ہی ہوا تھا۔“

”جیلا جیلا تمہارے سامنے گھر کی جانب روانہ ہو گیا تھا؟“

”جی.....“ اس نے اثبات میں جواب دیا۔ ”پھر وہ واپس اسی جگہ کیسے پہنچ گیا جہاں کسی نے اسے موت کے گھاٹ اتارا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”میں بات تو میری سمجھ میں نہیں آ رہی جناب۔“ وہ مسکین سی صورت بنا کر بولا۔ ”میں نے تو اپنی آنکھوں سے اسے گاؤں کی طرف جاتے دیکھا تھا اور اس کے بعد میں مطمئن ہو کر اپنے کام میں جت گیا تھا۔“

”اور تم نے مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ شام سے تھوڑی دیر پہلے تم نے کام ختم کیا اور پھر گھر کی جانب چل پڑے تھے؟“

”جی بالکل ایسا ہی ہوا تھا۔“ اس نے تھوک نکلنے سے کہا۔

”اچھی طرح سوچ کر بتاؤ جیلا۔“ میں نے اس کے گرد اپنے سوالات کا دائرہ تنگ کرتے ہوئے کہا۔ ”تم دھوکہ دے کر روز کھیتوں سے نکل کر سیدھے گھر آئے تھے یا نہیں اور

بعد بولا۔ ”تھانے دار صاحب! آپ کسی پانی سے دل بہلا لیں اور جیلا سے جو پوچھتا ہے وہ بھی اطمینان سے پوچھ لیں۔ میں باہر چلا جاتا ہوں۔“ پھر وہ جیلا کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”ہتر! اگر اور کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے آواز دے لینا۔“

”جی تایا جی! آپ فکر نہ کریں۔“ جیلا نے مضبوط لہجے میں کہا۔

مطمئن ہونے کے بعد صدمہ چاٹوئی بیٹھک سے نکل گیا اور میں جیلا کی جانب متوجہ ہو گیا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”جیلا! تم سے میری ملاقات صرف اسی دن ہوئی تھی جب میں جاوے گا کہ روٹی کرنے آیا تھا لیکن پوسٹ مارم کی رپورٹ میں بہت سی ایسی چیزیں سامنے آئی ہیں جن کا جواب صرف تم ہی دے سکتے ہو۔“

میں نے دانستہ اپنا انداز بہت دھیمار کیا تاکہ اسے کسی قسم کا شک نہ ہو۔ وہ بڑے اطمینان سے بولا۔

”آپ پوچھیں جی، جو بھی پوچھتا ہے میں۔ میری تو یہی خواہش ہے کہ جیلا کا قاتل جلد از جلد قانون کی گرفت میں آجائے اور اس کا انجام جبر تک ہو۔“

”بالکل ایسا ہی ہو گا جیلا۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں بہت دور تک جھانکتے ہوئے کہا پھر پوچھا۔ ”کیا یہ درست ہے کہ دھوکہ دے کر روزم لوگوں کا کھانا مندر نامی ایک بندے نے کھیتوں میں پہنچایا تھا؟“

”جی مندر ہی نے پہنچایا تھا۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”لیکن اس کھانے کو آپ اتنی زیادہ اہمیت کیوں دے رہے ہیں تھانے دار صاحب؟“

میں نے اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔ ”اس... کھانے میں خوردگی روٹیاں، لسی، اچار اور دسی آم تھے؟“

”جی جی ہاں۔“

”کیا تم دونوں بھائیوں نے ایک ساتھ مل کر کھانا کھا لیا تھا یا الگ الگ؟“ میں نے سوالات کے سلسلے کو راز کرتے ہوئے پوچھا۔

”ایک ساتھ ہی کھا لیا تھا جناب۔“ وہ جبر جبر ہوتے ہوئے بولا۔

”تم کھیتوں کے جس حصے میں فصل کی کٹائی کر رہے تھے وہاں سے گاؤں زیادہ نزدیک تھا اسی لیے مندر کو کھانا

”بہت ہی خاص اخاص وجہ ہے۔“ میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”میں ادھر چنے کر جیلا کا انڈر پلو کروں گا اور تم دروازے کے نزدیک بالکل مستعد رہنا۔ ابھی میں دھوکہ سے نہیں کہہ سکتا کہ یہاں کیا صورت حال پیش آئے گی۔ اگر جیلا کسی بھی زادبے سے اپنے بھائی کے قتل میں ملوث ہے تو میرے سوالات اسے چکر کر رکھ دیں گے اور میں ممکن ہے، وہ یہاں سے فرار ہونے کی کوشش کرے۔ ایسے موقع پر تم اس کی کوشش کو ناکام بنا دو گے۔“

”جی، اب میں سمجھ گیا۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”آپ فکر نہ کریں۔ جیلا پر گہری نظر رکھوں گا اور اسے یہاں سے بٹنے بھی نہیں دوں گا لیکن مجھے نہیں امید کہ جیلا کا جیلا والے واقعے میں کوئی ہاتھ ہو۔“

”تم ٹھیک کہتے ہو فرزند علی!“ میں نے تائیدی انداز میں کہا۔ ”لیکن ہم کوئی رسک نہیں لے سکتے ورنہ بتا دیا کھیل بگڑ جائے گا۔“

”ہاں جی..... یہ بات تو ہے۔“ وہ معنی خیز انداز میں بولا۔ تھوڑی سی دیر میں جیلا بیٹھک میں داخل ہوا اور میری جانب بڑھتے ہوئے آواز بلند بولا۔

”السلام علیکم تھانے دار صاحب!“

اس کے چہرے پر کوئی خاص پریشانی مجھے نظر نہ آئی۔ ”علیک السلام!“ میں نے اس کے سلام کا جواب دیا اور اسے اپنے قریب ہی سامنے بٹھالیا پھر کہا۔ ”جیلا! اگر تم مرزا پور میں تھوڑی دیر کے لیے میرے پاس تھانے آجائے تو مجھے تمہارے پیچھے یہاں تک نہ آنا پڑتا۔“

”میں بہت معذرت خواہ ہوں تھانے دار صاحب۔“

وہ ندامت آمیز لہجے میں بولا۔ ”ابا اور تایا اپنی پریشانی میں آپ کا پیغام مجھ تک نہیں پہنچا سکے اور پھر میں ادھر ان لوگوں کے ساتھ ہی آ گیا۔“

اس کے پیچھے ہی صدمہ چاٹوئی بھی ایک دھکی ہوئی ٹرے اٹھائے بیٹھک میں داخل ہوا تھا۔ اس نے مذکورہ ٹرے کو ایک چھوٹی میز پر رکھنے کے بعد اس کا پردہ اٹھایا تو ٹرے کے اندر مجھے چڑے والی لسی کا بھرا ہوا جگہ رکھا دکھائی دیا اور اس جگہ کے ساتھ دو کنگ ساڑ گلاس بھی پڑے۔ علاوہ ان ٹرے کے اندر دو پلیٹیں بھی رکھی ہوئی تھیں جن میں سے ایک میں برنی کے ککڑے اور دوسرے میں کئے ہوئے آم کی قاشیں سجی ہوئی تھیں۔ صدیق حلوائی تھا۔ یقیناً یہ برنی اسی کی دکان کا تھوڑی سی۔

وہ ہمارے لیے دونوں گلاسوں میں لسی انڈیلنے کے

”لیکن مجھے ایک بندے نے کچھ اور ہی بتایا ہے۔!“

”کھگ۔ کیا۔۔۔۔۔۔ وہ نکتہ زدہ لہجے میں بولا۔“

”آپ کو۔۔۔۔۔۔ کس نے کیا بتایا ہے۔۔۔۔۔۔؟“

”اس بندے کا نام تو ابھی مجھے یاد نہیں آ رہا۔“ میں نے بہانہ بتاتے ہوئے کہا۔ ”لیکن اس نے مجھے بتایا ہے کہ انیس مئی کی شام یعنی وقوعہ کی شام اس نے تمہیں مشتاق باجوہ کے کھیتوں کی طرف جاتے دیکھا تھا۔“

”وہ۔۔۔۔۔۔ بندہ جھوٹ بولا ہے۔ بکو اس کرتا ہے۔۔۔۔۔۔ وہ کچپاتی ہوئی آواز میں بولا۔“ اسے کوئی غلط فہمی ہوئی ہوگی۔“

”ہاں۔۔۔۔۔۔ مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے۔“ میں نے اسے اپنے شیشے میں اتارتے ہوئے کہا۔ ”ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ تم اس روز کام ختم کرنے کے بعد کھیتوں سے سیدھے اپنے گھر گئے تھے۔“

”اللہ آپ کا بھلا کرے تمہانے دار صاحب۔ ابھی آپ نے جو کہا کچھ سچ ہے۔“ وہ اطمینان بخش سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ”لوگ تو پتا نہیں، کہاں کہاں کی اڑاتے رہتے ہیں۔“

”اور میں سب کی سن لیتا ہوں مگر چین اسی بات کا کرتا ہوں جو حقیقت برحق ہوتی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اگر میں لوگوں کی اتنی سیدھی باتوں پر بنجیدہ ہو جاؤں تو پھر ہوگئی تمہانے داری۔“

وہ مطمئن ہو کر ترقی نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں مختلف زاویوں سے اسے گھسنے کی کوشش میں لگ ہوا تھا۔ ہر تھوڑی دیر کے بعد میں اپنے سوالات کا موضوع تبدیل کر دیتا تھا تاکہ وہ یہ نہ سمجھ سکے کہ میں اسے گھیرنے کی سعی میں ہوں۔

”شیلہ! کیا تمہیں تعویذ دھاگے اور بابا لوگوں پر یقین ہے؟“ میں نے ایک نئے انداز سے سوال کیا۔

”جی بالکل!“ وہ بڑے مضبوط لہجے میں بولا۔

”اگر کوئی بابا پہنچا ہوا ہو تو اس کا تعویذ گولی کی طرح کام کرتا ہے۔“

”مطلب یہ کہ اس تعویذ سے گولی کا کام لے کر ہم کسی بھی شخص کو قتل کر سکتے ہیں؟“ میں نے بڑی مصومیت سے سوال کیا۔

”نہیں جناب۔۔۔۔۔۔ وہ جلدی سے بولا۔“ میں آپ کو یہ بتانا چاہ رہا تھا کہ اگر پیر کامل ہو تو اس کا تعویذ تیر کی طرح کام کرتا ہے۔ یعنی بڑی تاثیر والا ہوتا ہے۔“

”اچھا۔۔۔۔۔۔ اب سمجھا۔“ میں نے سرسری انداز میں

کہا پھر پوچھا۔ ”کیا اس سلسلے میں تمہارا کوئی ذاتی تجربہ بھی ہے؟“

”کیا ذاتی تجربہ جی۔۔۔۔۔۔ وہ ابھمن زندہ انداز میں میری طرف دیکھنے لگا۔“

”ارے یار۔۔۔۔۔۔!“ میں نے دوستانہ انداز میں بڑی بے تکلفی سے کہا۔ ”کیا تم کسی ایسے بابا کو جانتے ہو جس کے تعویذ میں جادو کی اثرات ہوں؟“

”جی بالکل جانتا ہوں۔“ وہ بڑے اعتماد سے بولا۔

”ادھر ٹوبہ یک سنگھ میں ایک بہت پختہ ہوئے بابا ہیں۔ وہ ناممکن کو ممکن بنا دیتے ہیں۔“

”اچھا۔۔۔۔۔۔!“ میں نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ”کیا تم بھی ان بابا سے ملے ہو؟ ان سے کوئی تعویذ وغیرہ بھی لیا ہے؟“

”جی۔۔۔۔۔۔ ایک ماہ پہلے ٹوبہ یک سنگھ والے بابا کے پاس گیا تھا۔“ اس نے بڑے فخر سے بتایا۔ ”اور ان سے ایک تعویذ بھی لیا تھا۔“

”شیلہ! میں تم سے یہ نہیں پوچھوں گا کہ تم نے کس مقصد کے لیے تعویذ لیا تھا کیونکہ یہ تمہارا ذاتی معاملہ ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میں تمہاری خواہش کی کرید میں نہیں پڑنا چاہتا۔“

”آپ بہت اچھے ہیں تمہانے دار صاحب!“ اس نے ایسے لہجے میں کہا جیسے اس کے سر پر سے منوں وزن اتر گیا ہو۔

”لیکن۔۔۔۔۔۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ ضرور پوچھوں گا کہ اس بابا کے تعویذ نے کام کیا۔۔۔۔۔۔ مطلب، تمہاری وہ خواہش پوری ہوگئی جس کی خاطر تم نے وہ تعویذ لیا تھا۔“

”جی تمہانے دار صاحب۔۔۔۔۔۔ وہ جذبات سے لبریز لہجے میں بولا۔ ”اس تعویذ نے بڑا فحش خاک کام کیا ہے۔ بس یوں سمجھ لیں کہ بہت جلد میری وہ خواہش پوری ہونے والی ہے۔“

”واہ وا۔۔۔۔۔۔“ میں نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

”جہیں میری طرف سے ایڈوانس مبارک ہو۔“

”بہت شکریہ تمہانے دار صاحب۔“ وہ ممنونیت بھرے لہجے میں بولا۔

میں نے فوراً پلٹا دیا اور اس کے گرد پھیلے ہوئے جال کو سینٹا شروع کر دیا۔ میں نے لہجے کا دوستانہ پن برقرار رکھتے ہوئے اس سے کہا۔

”شیلہ! کیا تم مجھے وہ طلسماتی تعویذ دکھا سکتے ہو؟“

”جی ضرور۔۔۔۔۔۔“ بے ساختہ اس کا ہاتھ گردن کی طرف چلا گیا پھر معذرت خواہانہ لہجے میں بولا۔ ”تمہانے دار صاحب! وہ تعویذ اس وقت میرے پاس نہیں ہے۔“

”پھر کہاں ہے وہ تعویذ؟“

”وہ میں نے اپنے گھر میں رکھا ہوا ہے۔“

”یعنی مرزا پور والے گھر میں؟“

”جی۔۔۔۔۔۔ جی۔۔۔۔۔۔ اسی گھر میں۔“ اس نے بتایا۔

”اچھی طرح سنجال کر رکھا ہے نا اس تعویذ کو؟“ میں نے تعذر بق طلب انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

”بالکل جناب! میں اس کرشنائی تعویذ کے حوالے سے کسی قسم کی بے احتیاطی کیسے برت سکتا ہوں۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”اس تعویذ سے تو میری بہت ساری امیدیں وابستہ ہیں۔“

”اس تعویذ کو اتار کر گھر میں رکھنے کی کوئی خاص وجہ ہے؟“

”جی تمہانے دار صاحب!“ وہ بڑی صفائی کے ساتھ مجھے اlobتائی کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ ”بابا نے کہا تھا کہ اگر گھر میں کسی بچے کی پیدائش ہو یا کسی کی موت واقع ہو جائے تو پھر چالیس دن کے لیے اس تعویذ کو اتار کر گھر میں کسی محفوظ مقام پر رکھ دینا اور میں نے ایسا ہی کیا ہے۔“

”گڈ۔۔۔۔۔۔!“ تعویذ کے حوالے سے میں اسے پوری طرح اپنے جال میں جکڑ چکا تھا لہذا میں دوسری جانب نکل گیا اور اس سے پوچھا۔ ”شیلہ! کیا تمہیں پتا ہے کہ جیلا کی پوسٹ مارٹم رپورٹ میں کیا لکھا ہوا ہے؟“

”نہیں جی۔۔۔۔۔۔“ وہ قدرے محظوظ انداز میں بولا۔ ”آپ بتائیں جی۔“

میں نے بتایا۔ ”اس رپورٹ میں واضح طور پر لکھا ہے کہ جیلا کے سر کو اس بے خبری میں نشانہ بنایا گیا تھا یعنی ان لکھات میں وہ کسی نشہ آور شے کے زیر اثر تھا۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے جناب۔۔۔۔۔۔“ وہ ابھمن زندہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

”رپورٹ میں بھی سب لکھا ہے شیلہ۔“ میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ”جیلا کے معدے سے کھانے کا جو مواد لیا گیا تھا، اس کے اندر کسی نشہ آور شے کے اثرات پائے گئے ہیں اور میری معلومات کے مطابق، جیلا کی قسم کا نشہ بھی نہیں کرتا تھا۔“

نفس کا قیدی

”ہاں جی۔۔۔۔۔۔ وہ کوئی بھی نشہ آور شے نہیں لیتا تھا۔“ وہ پُرسوج انداز میں بولا۔

”تم دونوں بھائیوں نے وقوعہ کی دوپہر ایک بجے جیلہ کر ایک ساتھ ایک جیسا کھانا کھایا تھا۔“ میں نے اپنے لہجے میں قدرے تیزی بھرتے ہوئے کہا۔ ”کیا کھانے کے بعد تمہیں بھی غشوگی یا بے خبری کا احساس ہوا تھا؟“

”بالکل نہیں جناب۔“ وہ بڑے اعتماد سے بولا۔

”میں ہشاش بشاش اپنا کام کرتا رہا تھا اور پھر شام میں اپنے گھر چلا گیا تھا۔“

”اب تمہارا کیا ارادہ ہے شیلہ؟“ میں نے سپاٹ آواز میں کہا۔

”میں دو تین دن ادھر تیا صدمہ دیکھ کر گھر ہوں گا۔“ اس نے بتایا۔ ”پھر واپس اپنے گھر مرزا پور چلا جاؤں گا۔“

”اور کیا میں تمہاری بے بے کا لازم ہوں جو یہاں بیٹھا دو تین دن تمہاری یک یک سنا رہوں گا۔۔۔۔۔۔؟“ میں نے رعب دار آواز میں کہا۔

میرے اچانک بدلنے سے تیاروں نے اٹھ بھا کر رکھ دیا، نکتہ زدہ آواز میں بولا۔ ”میں تمہا نہیں۔۔۔۔۔۔ تمہانے دار صاحب!“

”باقی کی باتیں میں تمہیں حوالات میں جا کر سمجھاؤں گا ذیل انسان۔“ میں نے دھاڑے مشابہ آواز میں کہا پھر حوالدار کی جانب دیکھتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کیا۔

”فرزند علی! اس عاقبت نااندیش کو گرفتار کرلو۔ فوراً۔“

اس اچانک بدلتی ہوئی صورت حال نے اسے چکر کر رکھ دیا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور جلی کی سرعت سے دروازے کی سمت دوڑ لگا دی۔

حوالدار نے اس کی ٹانگ میں ٹانگ پھنسا کر اسے روکنے کی کوشش کی۔ وہ فرزند علی کی ٹانگ کے ساتھ ایسا الجھا کہ منہ کے بل دروازے کے باہر کھن میں گرا۔ حوالدار نے چابک دستی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے الٹی بھٹکری پہنادی۔

یہ اٹھا بیٹھ دیکھ کر صدمہ طوا کی اور اس کی گھروالی کیز فاطمہ بھی وہاں آ گئے۔ میں نے زمین پر پڑے ہوئے شیلہ کی پسلیوں میں ایک زوردار ٹھنڈا رسید کرتے ہوئے گرج دار آواز میں کہا۔

”چپ چاپ اٹھ کر شرافت سے بیٹھا جاؤ ورنہ سر پر اتنے جوتے ماروں گا کہ آنے والی سات نکلیں جی پیدا



دُہرا انتقام

محمد یاسر اعوان

بدلے کی آگ میں جلنے والے بعض اوقات ایسا روپ دھارتے ہیں کہ ان کی تہ کا کپڑا پٹا نہیں چل پاتا۔ وہ جو جیون ساتھی بن جانے کے خواب دیکھ رہے تھے اچانک خوابوں کی تعبیر الٹی ہو گئی۔ حقارت آمیز سلوک کسی بھی انسان کو جانور بنا سکتا ہے۔ وہ جو اس کے دل میں بیٹھی تھی اچانک انھنے والی درد کی لہر بن کر اس کا دل ہی بند کر گئی۔

خون کی دہلی کھیلنے والی ایک دہلیز کے خیر کی ہے مگر کا حاصل

پولیس کے پہنچے پہنچے جیمز بڑی حد تک اپنی کیفیت پر مشکل قابو پا چکا تھا۔ اس سڑک کی دوسری طرف اس کی بیوی کے خون سے ایک جوہر سا بن گیا تھا۔ تفتیش کے دوران اس نے ایک ریسٹوران میں بیٹھ کر پولیس آفیسرز کو بتایا کہ اس کی بیوی پر موت کس طرح حملہ آور ہوئی تھی۔ وہ ایک فلم دیکھنے شہر آئے تھے۔ تقریباً 8 بجے، سینما ہاؤس کی جانب بڑھتے ہوئے اچانک اسے یاد آ گیا کہ وہ اپنی کار کی چابی غالباً آکٹیشن میں بھول آیا ہے۔ اس نے اپنی بیوی

ہوں گی۔“
”یہ آپ کیا کر رہے ہیں تھانے دار صاحب۔“
صدیہا طوائی اپنے بیٹے کی حمایت میں مجھ سے مستغیر ہوا۔
”آخر اس کا قصور کیا ہے؟“
”قصور.....!“ میں نے دانت پیٹے ہوئے کہا۔
”اس کم ذات نے اپنے سگے بھائی کو قتل کیا ہے..... میں نیل عرف جیلا کی بات کر رہا ہوں صدیہ!“
”مگر..... یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ وہ بے یقینی سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”شیلہ ایسا کیوں کرے گا؟“
”اس لیے کرے گا تاکہ نیلہ سے اس کی شادی ہو سکے۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا پھر اپنی جیب سے سرخ چمڑے میں منڈا ہوا کالی ڈوری والا تعویذ نکال کر شیلہ کی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے کاٹ دار آواز میں استغیر کیا۔
”یہ وہی تعویذ ہے تا جو تم کسی ٹوبہ بیک سنگھ والے بابا سے لائے تھے اور تمہارے بیان کے مطابق، یہ تعویذ اس وقت مرزا پور میں تمہارے گھر کے اندر ایک محفوظ مقام پر پڑا ہوا ہے۔!“
”یہ آپ کے پاس..... کیسے پہنچ گیا.....؟“ وہ جبر جبراتی ہوئی آواز میں بولا۔
”میں تمہارے ٹوبہ بیک سنگھ والے بابا کا بھی باپ ہوں۔“ میں نے کہا جانے والی نظروں سے اگلے گھور۔ ”میں نے اپنے جادو کے زور سے اس تعویذ کو تمہارے گھر سے نکال کر مشتاق باجوہ کے کیمپوں میں پہنچا دیا تھا..... جہاں تم نے وہ آہنی ہتھوڑا امیر کا تھا جس کی طوقانی ضرب سے تم نے اپنے بھائی جیلا کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔“
اس کی حالت ”نہ پائے رقت، نہ جائے ماندن“ والی تھی۔ میں نے نہایت ہی مختصر مگر جامع الفاظ میں صدیہ طوائی کو اس کے بیٹے کے کرتوتوں سے آگاہ کیا اور شیلہ کو گرفتار کر کے اپنے تھانے لے آیا۔

☆☆☆

میں کیا، کوئی بھی یہ تصور نہیں کر سکتا تھا کہ جیلا کو شیلہ نے بے دردی سے موت کے گھاٹ اتارا ہوگا لیکن حقیقت یہی تھی کہ وہ جیلا کا قاتل تھا۔

اس حقیقت تک رسائی حاصل کرنے کے بعد شیلہ کے لیے میرے دل و دماغ میں فصر بھر گیا تھا ہذا میں نے تھانے پہنچ کر اسے فرزند بلی کے حوالے کیا اور کہا کہ دل کھول کر اور جی بھر کر اس کی خاطر تواضع کرے۔

شیلہ نے ایک رات حوالات میں تختہ مشق بنے رہنے کے بعد اپنا جو بیان ریکارڈ کیا، وہ روکتے ٹھہرے کر دینے والا تھا۔ اسے جیلا سے شدید نفرت تھی۔ بچپن سے لے کر جوانی تک (شیلہ کے مطابق) جیلا نے اس کی ہر چیز پر قبضہ کرنے کی کوشش۔ کوئی کھانے پینے کی چیز ہو یا کوئی مملکت، جو شیلہ کو پسند آتا، جیلا ضد کر کے اسے حاصل کر لیتا تھا۔ پھر یہ معاملہ جب نیلہ سے شادی تک پہنچا تو شیلہ کی برداشت جواب دے گئی۔ یہاں بھی جیلا نے ضد کر کے نیلہ سے شادی کی بات کچی کرانی تھی۔

وہ نیلہ کو حاصل کرنے کے لیے ٹوبہ بیک سنگھ والے بابا کے پاس پہنچ گیا۔ اس بابا نے شیلہ کو کوئی فلسفاتی تعویذ دیا لیکن اس تعویذ نے خاطر خواہ کام نہیں کیا اور جیلا کی شادی سر پر آن پہنچی۔ اس صورت حال نے شیلہ کا دماغ خراب کر دیا اور وہ مدد کے لیے دوبارہ ٹوبہ بیک سنگھ والے بابا کے پاس پہنچ گیا۔ اس بابا نے نہایت ہی رازداری سے شیلہ کو ایک آئینہ یاد دلا اور شیلہ نے اس آئینے کو گھٹی جاسہ پہنا دیا..... جی، جیلا کو آہنی ہتھوڑے کی مدد سے موت کے گھاٹ اتارنے والا آئینہ یا اسی بابا نے شیلہ کو دیا تھا۔

شیلہ نے پہلے جیلا کے کھانے میں نشہ آور دوا ملائی تاکہ اسے اپنے دشمن کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں کسی وقت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ جب جیلا غفلت کی حالت میں پہنچا تو شیلہ نے اس کی کھوپڑی پر روزنی آہنی ہتھوڑے کی ضرب لگا کر اسے زندگی کی قید سے آزاد کر دیا تاکہ نہ رہے بانس اور نہ بچے بانسری۔ جیلا کی موت کے بعد ظاہر ہے نیلہ کی شادی شیلہ ہی سے ہوتی تھی۔ اس کیسے نے اپنے سوچے سمجھے ڈرامے میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے اپنے مردہ بھائی کا ہاتھ درآتی سے کاٹ کر اس پر پٹی بھی باندھ دی تھی تاکہ وہ جو اسٹوری دنیا والوں کو سنانے والا تھا، اس میں کوئی جھول نہ رہے۔

میں نے ٹوبہ بیک سنگھ والے شیطان بابا کو بھی گرفتار کر کے شیلہ کے شریک جرم کی حیثیت سے جیل بھجوا دیا۔
حسد اور جمن بہت تباہ کن جذبات ہیں۔ حسد کی آگ اور جمن کی پیش انسان کو اندر ہی اندر جلا کر کھوکھلا کر دیتی ہے پھر وہ دوسرے انسانوں کی زندگی سے کھیلنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتا۔
شیلہ نے جو کچھ کیا، وہ ایک سوچی سمجھی کہانی تھی لیکن اس کے ہاتھ کچھ نہ آیا۔
(تحریر: حسام بٹ)

سے رکے ہو گا اور وہاں کار کی طرف بڑھنے لگا جو ایک پراپرٹی آفس کے عقب میں پارک تھی۔ اس نے مشکل سے چالیس گز کا فاصلہ طے کیا ہو گا کہ اچانک اپنی بیوی کو اپنا نام لے کر چیخے ہوئے سنا۔ وہ گھبرا کر ایک دم پلٹا اور اپنی چالیس سالہ بیوی رینی کی طرف بھاگا جو اس وقت سڑک پر بے حس و حرکت پڑی تھی اور اس کی جیکٹ اور پتلون خون سے تر ہو رہی تھی..... وہ حملہ آور کی ایک جھلک بھی نہ دیکھ سکا لیکن فرط غم اور حیرت سے اسے گویا سستہ سا ہو گیا تھا..... وہ حملہ آور کا پیچھا کرنے کے بجائے بھاگ کر ریستوران میں پہنچا اور کسی سے چچا کر ایو کیمنس طلب کرنے کے لیے کہا۔

تھا۔“ وہ بولی۔ ”میرے مرد و مزر کو میری جانب آنے لگا اور اچانک رک گیا۔ وہ ایک گلی کے قریب تھا۔ میں نے اسے نظر کر بھاگتے ہوئے دیکھا۔ میری سماعت سے کسی کی بھی سی کراہ بھی نکل کر اٹھی۔ میں یہ دیکھنے کے لیے بھاگی کہ کیا ہوا ہے۔ ایسے میں، میں نے ایک سائے کو، جو گمات لگانے کے سے انداز میں بیٹھا تھا، اٹھ کر گلی میں بھاگتے دیکھا۔ میرا اندازہ ہے کہ وہ دو چلا ہوا تھا اور اس کا قد درمیان تھا۔ تاریکی کی وجہ سے میں کچھ دور دیکھنے سے قاصر رہی۔ لہذا کچھ کہہ نہیں سکتی کہ وہ مرد تھا یا عورت۔“

اپنا تک مجھے یوں لگا گویا مجھے میرا نام لے کر پکارا گیا ہو۔“
ایک ماہ بعد اسے دوبارہ چنانکر لایا گیا۔ اس مرتبہ
ایک ماہر نفسیات نے یہ کام سرانجام دیا۔ ”میں رہی کو جھنسنے
نہ سستا ہوں..... جیمو، جیمو!“ وہ بولا۔ ”میں چلتا ہوں،
لیکن مجھے کچھ نظر نہیں آتا۔ میں ادھر بڑھتا ہوں، جہاں
اسے چھوڑا گیا تھا۔ وہ وہاں نہیں ہے، میں دوڑنے لگتا
ہوں۔ میں انسانی ہیولوں کی طرف بڑھ رہا ہوں۔ کوئی اس
پر چمکا ہوا ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ وہ اس پر چمایا ہوا ہے۔
وہ کسی سیاہ کھوپڑی جیسا لگتا ہے۔ میں بے تحاشا اس کی
طرف دوڑنے لگتا ہوں۔ وہ سیاہ پلٹ کر مجھے دیکھتا ہے۔
اس کے سر پر اونٹنی کیپ ہے اور اس کیپ پر پیشانی کے
پاس سرخ دھاریاں ہیں۔“

کس میں کیسے فٹ ہو رہی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ وہ نوجوان لڑکی کون تھی۔ وہ 1975ء اور 1976ء میں کمرے سے بھاگ گئی تھی اور پولیس اسے ڈھونڈ کر واپس لے آئی تھی۔

”جتنی بات تو یہ ہے کہ.....“ ایک پولیس آفیسر نے رائے زنی کی۔ ”وہ ان لڑکیوں میں سے ہے، جو کبھی کبھی دردی میں دیکھ لیں تو اس کی دیوانی ہو جاتی ہیں۔ وہ تمہیں ساگا پورٹ یا اطراف کے دوسرے شہروں میں پولیس ہیڈ کوارٹر کے آس پاس منڈلاتی اور یہ کتنی نظر آئے گی کہ میں تھلاں آفیسر سے بات کرنا چاہتی ہوں۔ ایک مرتبہ ساگا پورٹ کے پولیس چیف نے اسے ہیڈ کوارٹر سے باہر نکل دیا تھا کیونکہ وہ ڈیک کے آس پاس، آفیسروں کو پریشان کر رہی تھی۔“

”ایک منٹ۔“ بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔
 ”میں خود آپ کے پاس آ رہا ہوں۔“
 ”میں انتظار کر رہی ہوں۔“ کیتھی نے کہا اور سلسلہ منقطع کر کے ایک وکیل کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔
 اس روز شام کے چھ بجے اس وکیل کے ٹیلی فون کی گھنٹی دوبارہ بجی۔ اس مرتبہ سراغ رساں ولیم ٹیلر، کیتھیرن کے پارمنٹ سے بول رہا تھا۔
 ”میں نے تمہیں یہ بتانے کے لیے فون کیا ہے کہ ہم کیتھیرن کو پوچھ پچھ کے لیے لالچ بیج لے جا رہے ہیں۔“ اس نے کہا اور ریسوررکھو یا پھر وہ کیتھی کی طرف مڑا۔ ”تم جب سے فون پر بات کرو۔“ اس نے خاص ہدایت کی۔
 کیتھیرن نے جب کیمبر کا نمبر ڈائل کیا اور اس سے باتیں کرنے لگی۔ پولیس آفیسر دوسری لائن پر یہ ساری باتیں سن رہا۔ اگلے روز اتوار تھا۔ سراغ رساں ٹیلر نے ایک بار پھر اسے جیمز سے بات کرنے کی ہدایت کی اور اس نے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔
 ”مجھے تم سے ایک بہت ضروری بات کرنی ہے۔“ وہ فون پر جیمز سے بولی۔ ”تم فوراً لالچ بیج کے ریسٹوران میں پہنچو۔ میں وہاں تمہارا انتظار کروں گی۔“
 بیلیس سالہ جیمز فوراً وہاں پہنچ گیا اور سراغ رساں ولیم، لیفٹیننٹ قاضی اور تین دوسرے سراغ رساںوں نے اسے اپنی بیوی کے قتل کی سازش اور پولیس فراہم کرنے پر گرفتار کر لیا۔ کیتھیرن بھی گرفتار ہو گئی۔ اس پر رینی جیمز کو جیس بائیں مرتبہ چاقو گھونپ کر قتل کرنے کا الزام تھا۔

☆☆☆

اس گرفتاری کا فوری رزلٹ ریلوے پولیس میں ہوا، جس نے جیمز کو فوری طور پر معطل کر دیا۔ وہ اپنی بیوی کے قتل کے بعد سے نیو یارک ریلوے پولیس ہیڈ کوارٹر میں قیدیت تھا۔ اس کی گرفتاری پر سب کو حیرت ہوئی لیکن اتنی نہیں، جتنی ایک پوچھ آگنا تزیین کو کیتھیرن کی گرفتاری پر ہوئی، کیونکہ وہ صرف چند ہی سال پہلے جیس بال کی ایک اسٹار کلاڈی بن چکی تھی۔
 ”وہ حد پُر جوش اور بے انتہا جارحیت پسند تھی۔“ اس کے سابق کوچ نے اخباری نمائندوں سے رابطہ قائم کرنے پر انہیں کیتھیرن کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا۔
 ”بس یہی اس کی معنی روش تھی لیکن ہر کوچ ایک کلاڈی کے اندر یہی خوبیاں دیکھنا چاہتا ہے لیکن یہ روش اسے قائلہ نہیں بناتی۔ وہ باہر سے سخت ہوئی مگر اندر سے

ایک بہت ہی پیاری لڑکی تھی۔“
 ”میں یہ تو نہیں کہہ سکتی کہ میں اس کی سبیلی تھی۔“ اس کی ٹیم کی ایک ساتھ کلاڈی نے اخباری نمائندوں سے کہا۔
 ”لیکن مجھے اس بارے میں سن کر بہت افسوس ہوا۔ وہ عام لڑکیوں سے بہت مختلف تھی۔ اسے ہر وقت کسی کی توجہ چاہیے تھی۔ آپ اس سے اچھی اچھی باتیں کریں، آپ کو اس سے بہتر سامع نہیں ملے گا لیکن جو بات اسے زہر تھی، وہ کوچ کی تنقید تھی۔“
 کیتھیرن کی ایک اور سبیلی نے رپورٹرز کو بتایا۔
 ”جیمز نے اس نوجوان لڑکی کے بہت بڑے خلا کو پُر کیا تھا۔ اسے احساسِ تحفظ دیا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ ہر وقت کوئی اس کے پاس رہے۔“

☆☆☆

دس ستمبر کو کیتھیرن تیس سال قید کے عوض رینی جیمز کے قتل کا اقرار کرنے اور جیمز کے خلاف گواہی دینے کے لیے تیار تھی۔ مقدمے کی سماعت کے دوران اس نے بیج کو بتایا۔ ”قتل کا سارا منصوبہ اس کے سابق محبوب جیمز نے بنایا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ وہ رینی کو لے کر فلم دکھانے جا رہا ہے، لہذا میں بزرگ کے کونڈے دان کے پیچھے چھپ جاؤں۔“ اس نے انکشاف کیا۔ ”پھر جب وہ اس کے ساتھ وہاں اس کونڈے دان کے قریب سے گزرنے لگا تو اس نے کچھ اونچی آواز میں کہا کہ وہ اپنی کار کی چابیاں شاید انیشین میں چھوڑ آیا ہے اور لینے کے لیے پلانا۔ میں اچھل کر کونڈے دان کے پیچھے سے باہر آ گئی۔“
 ”کیا تم نے رینی جیمز کو چاقو گھونپا تھا؟“ وکیل استغاثہ نے پوچھا۔
 ”ہاں۔“ اس نے حیرت سرگوشی کی۔ ”میں نے اسے چاقو گھونپا تھا۔“
 ”کیا تم نے اسے ایک سے زیادہ مرتبہ چاقو گھونپا تھا؟“
 ”ہاں ایک سے زیادہ مرتبہ۔“
 ”کیا تمہیں کوئی اقبال جرم پر مجبور کر رہا ہے؟“ بیج نے استفسار کیا۔
 ”صرف میرا ضمیر۔“ اس نے اطمینان سے جواب دیا۔
 اکتوبر کے دوسرے ہفتے کے دوران وکیل استغاثہ نے دلائل دیتے ہوئے جیمز کے بارے میں کہا۔ ”اس نے قتل کا منصوبہ بنایا، ایک چاقو خریدیا اور اپنی بیوی کو ذبح کر دیا۔ قاتلانہ حملے کے بعد وہ خاموشی سے ایک طرف

لہا رہا اور ایک بار بھی اپنی دم توڑتی ہوئی بیوی کو دلاسا دینے اس کے قریب نہیں گیا۔“
 وکیل دفاع نے دعویٰ کیا۔ ”جیمز اور رینی ایک اعلیٰ ذہنی گزرا رہے تھے پھر ایک دن ٹرین میں جیمز کی مداخلت کی گئی تھی۔ ان کے درمیان لگاہوں کے بارے ہوئے، جس کے نتیجے میں ان دونوں کے شب وروز ایک بڑل میں گزرنے لگے۔ میرا موکل اس خیال سے بے بہرہ سرور تھا کہ ایک جیس سالہ لڑکی نے اسے پرکشش اور توجہ بخش ایکٹیز پایا تھا لیکن کیتھیرن جیس سال کی کوئی ناول کی نہیں تھی۔ یہ وہی شخصیت کی مالک تھی۔ کیتھی تو یہ بے حد فزائش سیکرٹری ہوتی اور کبھی اس قدر ہنگامہ پرورد کہ اپنے جذبات پر قابو پائے میں ناکام رہتی۔ پھر اس کے بیٹے میں انتقام کی بھی دھن تھی کیونکہ میرے موکل جیمز نے اسے ایک دوسری لڑکی کا خاطر ٹھکرا دیا تھا۔ اس لڑکی نے میرے موکل کو اپنے انتقام کا نشانہ بنانے کے لیے اس کے گرد ایک جال بٹا۔ یہ اسے ٹھیک سمجھ رہی تھی اور میرے موکل کی گردن پھنسا کر لطف اندوز ہو رہی تھی۔“
 اکتوبر ہی کے آخری ہفتے میں کیتھیرن نے سرکاری گواہ کی حیثیت سے گواہی دیتے ہوئے کہا۔ ”جیمز نے میری بیویوں ساگرہ پر مجھے جنگی معنی کی انگوٹھی دی تھی۔ اس کے دو ماہ بعد وہ میرے ہو یوں کے پارمنٹ میں منتقل ہو گیا تھا، لیکن پھر یہ کہہ کر نکل گیا کہ میرے بچوں نے مجھ سے کہا تھا اگر آپ کو ہم سے محبت ہوگی تو آپ ہمارے پاس لوٹ آئیں گے۔“ اس نے ایک لمحہ توقف کیا اور پھر اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”جیمز نے رینی سے طلاق کے بارے میں بات کرنے کا وعدہ کیا تھا، لیکن کچھ دنوں بعد اس نے مجھ سے کہا کہ رینی اسے بلیک میل کر رہی ہے اور طلاق دینے پر راضی نہیں ہے۔ کیونکہ ایک مرتبہ وہ ایک سنگٹا ہوا سنگریٹ اپنے مکان میں صوفے کے گدے کے نیچے رکھا آیا تھا جس سے گھر میں آگ لگ گئی تھی۔ سب کچھ جل کر رہ گیا تھا اور انشورنس کمپنی نے جیمز کو بچپیس بڑا ڈالر ادا کیے تھے۔ رینی نے اسے دھمکی دی تھی کہ اگر اس نے اس سے طلاق لینے کی کوشش کی تو وہ اس کا پول کھول دے گی۔ ایک اور موقع پر اس نے بلیک میل کیے جانے کی مختلف کہانیاں سنائی تھیں۔“
 چند روزی کو کیتھیرن نے گواہی دیتے ہوئے مزید کہا۔ ”میں نے رینی سے بات کی تھی۔ یہ اسی زمانے کی بات ہے، جب جیمز میرے ہو یوں کے پارمنٹ سے

اپنے گھر لوٹ گیا تھا اور اس نے مجھے یہ کہنے کے لیے فون کیا تھا کہ وہ میرے پارمنٹ میں اب واپس نہیں آئے گا۔ میں نے فون پر رہی تھی کہ میں کسی کو نقصان پہنچانا نہیں چاہتی، میں تو صرف چاہنے اور چاہے جانے کی خواہش مند ہوں اور جیمز نے مجھے کہا تھا کہ وہ مجھے چاہتا ہے۔ جواب میں مجھے رینی نے غلیظ القابات سے نوازا اور کہا کہ میں پھر بھی اس کے شوہر سے نہ ملوں۔ اگر ٹی تو وہ میری ناک سے ساگا پورٹ کی ساری سڑکیں صاف کر دے گی۔ اس نے کہا کہ وہ جیمز کو چاہتی ہے اور جیمز بھی اسے چاہتا ہے۔ وہ پہلے بھی اسے دھوکا دے چکا ہے لیکن ہمیشہ اسی کے پاس لوٹ کر آتا ہے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ جیمز بہت جلد مجھ سے بھی اکٹا جائے گا اور یہ کہ جیمز اسے اس بارے میں سب کچھ بتا چکا ہے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کیا وہ جانتی ہے کہ جب وہ اسپتال میں تھی تو میں اس کے بستر پر سوتی تھی۔ اس نے کہا کہ وہ نہیں جانتی۔ ”کیتھی نے چند لمحے توقف کیا اور پھر گویا ہوئی۔“ اس فون کال سے صرف تین روز پہلے میں نے جیمز کے اصرار پر اپادین کر لیا تھا۔“
 ”پھر موسم بہار کے اوائل میں جیمز نے مجھ سے کہا کہ وہ رینی سے نجات حاصل کرنا چاہتا ہے۔ پہلے پہل وہ اسے شوٹ کرنا چاہتا تھا لیکن پھر کہا کہ اگر اس نے بازار سے کوئی ریو لو خرید کر اسے ہلاک کیا تو شہ اس پر جاے گا۔ وہ چاہتا تھا کہ یہ کام میں کروں، لیکن میرا نشانہ درست نہیں تھا کیونکہ میں نے بھی کئی بار ریو لو خریدیں چلایا۔ پھر وہ اسے قتل کے دوران کسی شے سے سر پر ضرب لگا کر ہلاک کرنے کے ارادے کا اظہار کرنے لگا۔ اس نے کہا پولیس یہی سمجھے گی کہ ہاتھ روم میں اس کا پاؤں پھسل گیا تھا اور وہ سر پر چوٹ لگنے کی وجہ سے ہلاک ہو گئی ہے پھر وہ اسے نشا آور چیز کھلا کر ہلاک کرنے کا ارادہ ظاہر کرنے لگا مگر پھر کہنے لگا کہ لوگوں کو معلوم ہو جائے گا۔“
 ”اس نے کار ایکسیڈنٹ کے بارے میں بھی سوچا، مگر پھر یہ سوچ کر ارادہ بدل دیا کہ اگر اس نے کار کے بریک میں کوئی خرابی پیدا کی تو شہ اس پر کیا جائے گا اور وہ یہ نہیں چاہتا تھا۔ آخر میں اس نے چاقو استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس فیصلے کے تحت وہ میرے دفتر سے آ کر مجھے لے گیا اور ہم ایک اسٹور میں چلے گئے۔ وہاں سے ہم نے ایک بلیو جیکٹ اور ایک ماسک خریدا، جس پر سرخ دھاریاں بنی ہوئی تھیں۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ رینی کو قتل دیکھنے کے لیے جائے گا اور اس سے کہے گا کہ وہ کچھ قتلے پر کار کو پارک

سہا ہے تاکہ وہ لوگ قلم دیکھنے کے بعد ایک اطالوی ریسٹوران میں ڈرنک کر سکیں۔ اس موقع پر مجھے ایک کوڑے دان کے پیچھے چھپ جانا تھا۔ جب وہ دونوں میرے قریب سے گزرنے لگتے تو وہ اس سے کہتا کہ چالی کاری میں بھول آیا ہے۔ ایسے میں مجھے کوڑے دان کے پیچھے سے نکل کر پٹی پر حملہ کرنا تھا اور اس کا پرس لے کر فرار ہو جانا تھا تاکہ یہ ڈشٹی کی واردات معلوم ہو۔

وہ کچھ دیر کی پھر اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ”جیونج سویرے میرے پاس آیا۔ وہ چاقو اپنے ساتھ لایا تھا۔ اس نے چاقو میرے حوالے کیا اور اس پر سے اپنی انگلیوں کے نشانات صاف کیے پھر اس کے دستے پر سیاہ ٹیپ لپیٹ دیا، تاکہ اس پر میری گرفت مضبوط رہے پھر اس نے مجھ سے شوق کرائی کہ کس طرح قاتلانہ حملہ کیا جاتا ہے اور چاقو گھونپا جاتا ہے پھر لکھ کر اس علاقے کا نقشہ بنا کر دیا۔“

”اس شام میں نیلی جیکٹ چڑھا کر ڈرائیو کرتی ہوئی لائٹ پیچ پیچ گئی اور کار سے اتر کر کوڑے دان کے پاس کھڑی ہو کر انتظار کرنے لگی۔ کاروں کی آمد و رفت جاری تھی پھر کچھ لوگوں کے ہاتھیں کرنے کی آواز سنائی دی، میں ڈرنکی اور واپس اپنی کار میں جا بیٹھی۔ وہاں سے روانہ ہونے کا ارادہ کر رہی رہی تھی کہ اسٹریٹ لائٹس میں وہ مجھے اپنی کار میں کونے سے مڑتا ہوا نظر آ گیا۔ میں اتر کر واپس کوڑے دان کے پاس چلی گئی اور اس کے پیچھے چھپ گئی۔ ماسک چہرے پر چڑھایا اور چاقو نکال کر انتظار کرنے لگی۔ میں کوڑے دان اور ایک نیلی کار کے درمیان تھی۔ وہ دونوں میرے قریب پیچھے چلے گئے۔ میری نظریں جیمز کی نظروں سے ٹکرائیں۔ رہنی اس کے دائیں طرف چل رہی تھی۔ اس نے اسے اپنی بائیں طرف یعنی میری طرف کر دیا اور کہا کہ وہ اپنی چابیاں کار میں بھول آیا ہے اور ایک منٹ میں واپس آتا ہے۔“

”اس کے بعد کیا ہوا؟“ وکیل استفسار نے پوچھا۔ ”میں نے دبی کیا، جو اس نے مجھے کرنے کو کہا تھا۔“ کیسٹریں نے نرمی سے جواب دیا۔ ”میں نے رہنی کو قتل کر دیا۔ میں نے اپنی جگہ سے چھلانگ لگائی اور چاقو اس کی پیٹھ میں گھونپ دیا۔ میں نے چاقو کے پھل کو اس کے گوشت میں اترتے ہوئے محسوس کیا۔ وہ بڑی بھیاں آواز میں جھنجھکی۔ میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور جب وہ مرنے لگی تو میں بھی اس کے ساتھ گر پڑی۔“

”کیا تم نے اس پر مزید وار کیے تھے؟“ وکیل استفسار نے پوچھا۔ ”ہاں کیے تھے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”تم نے اس پر وار کرتے ہوئے کیا محسوس کیا؟“ ”میرے دماغ میں جیمز کے صرف وہی جملے گونج رہے تھے، جو اس نے مجھ سے کہے تھے۔“ وہ بولی۔ ”جیمز نے تم سے کیا کہا تھا؟“ وکیل استفسار نے پھر پوچھا۔

”اس نے کہا تھا کہ اس امر کو یقینی بنانا کہ وہ مر چکی ہے اور اس سے کوئی بات نہ کرنا ورنہ اگر وہ بچ گئی تو مجھ جانے کی کہ یہ ہم تھے۔“

”پھر کیا ہوا؟“ ”اسے قتل کر کے میں اس کا پرس اٹھا کر تیزی سے اپنی کار میں جا بیٹھی اور ڈرائیو کرتی ہوئی اطلاع سٹی پیچ گئی، جہاں میں نے چاقو بھر اکال میں چھپک دیا۔ پھر ساری رات ایک سیسنو میں گزار دی۔“ اس نے جواب دیا۔

☆☆☆

ارٹکاپ جرم کے بعد کیسٹریں اپنے کیے پر اس قدر پشیمان اور پریشان تھی کہ پولیس سے رابطہ کرنے سے پہلے دو یادریوں اور کئی دوستوں کے سامنے اپنے جرم کا اقرار کر چکی تھی۔ پھر سراغ رسالوں کو اپنا اقبالی بیان دینے کے بعد، وہ ان کے کہنے پر جیمز سے فون پر گفتگو کرنے کے دوران آٹھ ساعت پہنچے پر رضامند ہو گئی تھی۔ اسے جیمز سے اپنے جرم کا اعتراف کرنا تھا۔

اس نے عدالت کو بتایا کہ وہ اپنے کے پر اس قدر پشیمان تھی کہ اس نے پندرہ خواب آور گولیاں نگل کر خودکشی کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہی اس موقع پر جیمز نے اسے اسپتال لے جانے کی پیشکش کی تھی مگر ایبویولنٹس طلب کرنے پر رضامند نہیں ہوا تھا اور وہ اس کی کار میں سوار ہونا نہیں چاہتی تھی، کیونکہ اسے ڈر تھا کہ جیمز اسے اسپتال لے جانے کے بجائے مرنے کے لیے کسی جنگل میں چھوڑ کر فرار ہو جائے گا۔ اس نے مزید بتایا کہ گرفتاری کے بعد کاؤنٹی جیل میں بھی اس نے ایک بار پھر فریش صاف کرنے والا میکینل پی کرا اپنی جان دینے کی کوشش کی تھی لیکن اسے بچا لیا گیا۔

”میں چاہتی تھی کہ پولیس مجھے پکڑ لے۔“ اس نے بیان دیتے ہوئے کہا۔ ”لہذا میں ان کے لیے جانے واردات پر قصد اپنا نشان چھوڑ گئی تھی۔ جیمز نے مجھے اس رات زہرات پہنچنے سے منع کیا تھا کیونکہ قاتلانہ حملے کے

...ان ممکن ہے، رہنی میرے ہارپا آویزے کو نوچنے کی کوشش کرتی لیکن میں نے اس موقع پر سارے زہرات مان رکھے تھے۔“

”کیا تمہیں جیمز کے خلاف کیس بنانے میں پولیس تعاون کرتے ہوئے لطف آیا تھا؟“

”بے حد۔“ اس نے جواب دیا۔ ”میں خود کو پولیس آفیسر تصور کرنا پسند کرتی تھی۔ مجھے ان کی محبت بہت عزیز تھی اور میں ان سے تعاون کر کے بہت خوش ہوتی تھی۔ انہیں دیکھ کر مجھے تحفظ کا احساس ہوتا تھا۔ میں ان کے شوق سے دیکھتی تھی۔ بچ پوجو تو میں شروع ہی سے پولیس آفیسر بننے کا خواب دیکھتی آئی تھی۔“

”کیا تم جیمز کے لیے جال بچھاتے ہوئے لطف اندوز ہوئی تھیں؟“ وکیل استفسار نے سوال کیا۔

”میں صرف یہ چاہتی تھی کہ انصاف ہو۔“ اس نے جواب دیا۔ ”اور میں اس کے تصور سے بے حد لطف اندوز ہوئی تھی۔ میں چاہتی تھی کہ ظلم کو کیفر کر داریک پہنچایا جائے میں اس کے لیے کوئی جال بچھانے کی کوشش نہیں کر رہی تھی۔ اگرچہ میرے دل میں جیمز کے لیے نفرت بھری ہوئی تھی کیونکہ اس نے ایک دوسری لڑکی کی خاطر مجھے ٹھکرایا تھا اور اپنے گھر سے بھی نکال دیا تھا۔“

”قتل کے بعد، جیمز سے تمہارے تعلقات کیسے رہے؟“ ”جڑ گئے تھے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”وہ مجھے فالتو بیڑہ روم میں سونے کے لیے کہتا تھا اور مجھے اس بات پر براغصہ آتا تھا۔“

☆☆☆

بارہ نومبر بروز جمعرات، جبوری نے کیسٹریں اور جیمز کے درمیان چار مختلف موقعوں پر ہونے والی گفتگو کا ٹیپ سنا جو کیسٹریں نے پولیس کی درخواست پر ٹیپ کیا تھا۔ تیس جون کو ہونے والی گفتگو میں، وہ جیمز سے یہ کہتی ہوئی سنائی دی کہ سراغ رسالوں کو بتایا ہے کہ ہم اس بھیاں کھل میں لوٹ ہیں۔ میرے خیال میں وہ سب کچھ جانتا ہے۔ ٹیپ ریکارڈر سے اس کی آواز ابھر رہی تھی۔ ”اور وہ میری مدد کرنا چاہتا ہے۔ وہ مجھ سے سب کچھ اگوا لے گا۔ ممکن ہے، وہ مجھے سوماورنگ کی مہلت دے دے اور پھر آ کر گرفتار کر لے۔ میں اپنے دفتر میں اس طرح ہراساں کیا جانا اور گرفتار ہونا پسند نہیں کروں گی۔ میرے خیال میں بہتر ہے کہ میں خود اس کے پاس چلی جاؤں اور اپنے جرم کا

اعتراف کر لوں۔“

”ایسا مت کرو۔“ جیمز کی ملتیانہ آواز ابھری۔ ”دیکھتی پلیز! میری جان، ایسا مت کرو۔ میں تم سے التجا کرتا ہوں، ایسا مت کرو۔ ایسا کرنا سراسر حماقت ہوگی، حد درجہ حماقت۔ میں اس کے سوا اور کیا کر سکتا ہوں۔ ہم نے ایک بہت ہی سنگین غلطی کی ہے، جسے اب ہم دونوں ہی بھگت رہے ہیں۔ ایسا مت کرو کہ دوسرے لوگوں کو بھی بھگتنا پڑ جائے۔ تمہارے والدین کو، تمہاری ملازمت کو، تمہارے پاس کو۔ ذرا ان کے بارے میں سوچو۔ ہم نے بہت بڑی غلطی کی ہے۔ اگر ہم اپنا منہ بند کر دیں اور ان سے یہ کہیں کہ ہاں ممکن ہے، میں نے جی جی بھکاری ہو کیونکہ میں نے بہت زیادہ پلٹ کر مٹی تھی۔ میں نہیں جانتا میں کیا کہہ رہا تھا۔“

پاکستان

ماہنامہ

کراچی

میں، قاری بہنوں کی دلچسپی کے لیے ایک نیا اور منفرد سلسلہ باتیں تمہارے خزاں کی... پیش کیا جا رہا ہے جس میں ہر قاری بہن دیے گئے سوالوں کے جوابات دے کر شمولیت اختیار کر سکتی ہے۔ آپ کے خیالات و احساسات ہمارے لیے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔

تو قارئین آج ہی

ماہنامہ پاکیزہ

اپنے ہمارے بک کروالیں

میں اس وقت اپنے کلینک میں بیٹھا تھا جب میری بیٹی نے مجھے ایک کلاسٹ کی آمد کی "نوید" سنائی۔

چند لمحات کے بعد میرے کمرے کا دروازہ کھلا اور میری متوقع کلاسٹ کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کی آمد کے ساتھ ہی خوشبو کا ایک خوشگوار سا جھونکا میرے منتوں سے

دوسروں کو بھگنے کا دعویٰ کرتے والوں کا خود سے بے خبری کا اعجاز

اس نفسا نفسی کے دور میں ہر ایک شخص اپنے نفس کے زندان میں قید دکھائی دیتا ہے اور کوئی یہ نہیں سوچ پارہا کہ مفاد پرستی کا یہ زہر ایک مرض کی شکل اختیار کرتا جا رہا ہے۔ وہ جو خود کو مسیحہ قرار دیتے تھے خود بھی اسی زندان میں قید ہو گئے البتہ انہیں اپنی اس قید کا ادراک تک نہ تھا۔

نفسیاتنی مریض

کبیر عباسی



”مکہ پہنچا دیا جاؤں گا، جہاں اس وقت کمزرا ہوں۔“
 ”اپنے ان جملوں کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟“ وکیل استغاثہ نے پوچھا۔ ”ہم نے منصوبہ بنایا تھا۔ یہ بالکل بے داغ تھا۔ ہم نے اس پر عمل کیا اور اب معاملہ ختم ہو چکا ہے۔“

”میں اس کے اور اپنے تعلقات کے بارے میں کبہر ہاتھ۔“ جیمز نے اصرار کیا۔
 وکیل دفاع نے بحث لپیٹنے ہوئے جیوری سے کہا کہ وہ کیہ ترین کی شہادت کو مسترد کر دیں کیونکہ یہ ایک کینہ پرورد اور انتقام پرورد لڑکی ہے۔

"میرے موکل سے صرف اس لیے انتقام لینا
نہ تھا چاہتا ہے کہ میرے موکل نے اسے ٹھکرار کرکے اور لڑکی سے
انتقام پرورد لڑکی ہے، جس نے سب
کچھ خد کیا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا میرا موکل اس درجہ
سفاک اور ظالم ہے؟ کیا یہ درد مند و مفت ہے، جس نے اپنی
بیوی اور اپنے بچوں کی ماں کے قتل کا منصوبہ بنایا تھا؟ یہ
جاننے کا سب سے آسان طریقہ تو یہ ہے کہ آپ سرکاری
نگواہوں کے بیانات سنیں اور ان کے فراہم کردہ ثبوت
یکسلیس لیکن میں آپ کو یہ آسان راستہ اختیار کرنے کا
مشورہ نہیں دوں گا۔ کیونکہ چوٹ کھاٹی ہوئی نامن اور ٹھکرائی
ہوئی عورت سے زیادہ غضب ناک شے اور کوڑی نہیں ہوتی۔
تیس کا زاپاتی بھی نہیں سمجھنا۔ قتل کی کوئی سازش نہیں کی گئی
تھی۔ میرے موکل جیسے کوئی آلہ قتل نہیں خریدتا اور نہ
اس نے اس سے قتل کرایا تھا۔"

”یہ وہ ایمیں ہے، جس نے اپنی بیوی کی ہلاکت کا سامان کیا۔“ وکیل استغاثہ نے ترکی پر ترکی جواب دیا۔ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ یہ تین کی شخصیت میں، بی غای صحیح لیکن اس کی انسانی انجمنوں نے اسے عدالت کے روبرو جانے سے نہیں روکا۔ قتل کا محرک، بلیک میٹنگ، حرص یا زنا کی خواہش، کچھ بھی رہا ہو۔ یہ ساری چیزیں اس کے بیان کی بنیاد کو تھوڑے پھینکی ہیں۔“

اٹھائیس نومبر جمعے کے روز، جبوری نے سات گھنٹے کے غور و خوض کے بعد جبر کو اپنی بھئی کو قتل کرنے، قتل کی سازش کا ارادہ ساز باز کرنے اور اسے لوٹنے کی سازش کا چنانچہ 25 ہزار روپے مقرر کرتے ہوئے سزا کے حکم کا انتظار کرنے کے لیے اسے ایس کاؤنٹی جیل بھیجے گا حکم سنا دیا۔

ایک اور موقع پر جمگوٹی آواز سب سے ابھری۔ ”اور تم خود کو بالکل ثابت نہیں کر سکتیں۔ تم میرے ساتھ چاقو خریدنے گئی تھیں..... میرا مطلب ہے..... جیٹ اور ماسک خریدنے گئی تھیں۔ ہم نے مل کر منصوبہ بنایا تھا۔ یہ بالکل بے داغ منصوبہ تھا۔ ہم نے اس پر عمل کیا۔ اب معاملہ ختم ہو چکا ہے اور اب تم یہ نہیں کہہ سکتیں کہ تم جاتی ہی نہیں تھیں کہ کیا ہو رہا تھا۔ تمہیں پرسکون رہنا ہوگا اور تم وہ کہتی ہو۔ میں جانتا ہوں کہ وہ کہتی ہو۔ تم کوئی سوچ نہیں ہو کہ ذرا سی مگر سی پمبل جاؤ۔ بے بی! اس آزمائش سے گزر جاؤ پلیز۔“

چودہ نومبر کو جیڑ اپنی صفائی پیش کرنے کے لیے
کشمیرے میں آن کھڑا ہوا۔

”میرے اپنے بوی کول کر کے کی کوئی سازش نہیں کی تھی۔“ اس نے کہا۔ ”جوشپ عدالت میں گیا یا ستایا گیا، وہ محض کتھرین کی اس چال کا ایک حصہ ہے، جو وہ میرے ساتھ چلتی آ رہی ہے۔ مجھ محض اس لیے اس کی ہر بات کی تائید کر رہا تھا کہ اسے صحیح راہ پر لاسکوں اور حقیقت کی دنیا میں لاسکوں۔ یہ ایک پاگل لڑکی ہے۔ اس کی آنکھوں میں ہر وقت ایک دیشیاتی چمک رہتی ہے۔ میں ڈرتا تھا کہ ایک دن یہ پاگل ہم دونوں کو نیل کی ہوا کھلائے گی..... تاہم یہ ایک اچھی بینہ دار نہیں۔“

”میں اپنی بیوی کی موت کے ایک مہینے بعد سے صرف جسمانی سکون کی خاطر اس سے ملنے لگا تھا، پھر جب میں اس کے بجائے ایک دوسری لڑکی سے ملنے لگا تو اس کے ایک ماہ بعد یہ غفل کی فرضی کہانی گھڑنے لگی۔ اس کی یہ من گھڑت کہانی سن کر مجھے پہلے پہل اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ مجھے سخت دکھ پہنچا اور میں بے حد دہشت زدہ ہو گیا۔ کیونکہ یہ جو کچھ کہہ رہی تھی، اس کی نویت ہے حد سنگین اور تشویشناک تھی۔ اس کی باتیں ناقابل یقین تھیں۔ مجھے صرف اور صرف اس بات کا یقین تھا کہ میری بیوی مر چکی ہے۔ میں نہیں جانتا تھا کہ یہ میرے خلاف کیا کر سکتی تھی لیکن اس نے مجھ سے کہا کہ جیبر، میں مزید زہر وہیں روہ سکتی۔۔۔ میں ایک پادری کے پاس گئی تھی اور میں نے اس کے سامنے اعتراض جرم کر لیا ہے۔۔۔ اس پادری نے سب کچھ سن کر کہا۔۔۔ میں نے سوچا کہ یہ لڑکی، بالکل پاگل ہے۔۔۔ اور پھر اس نے میری گردن چھسادی۔ میں نے سراخ رساں ولیم کو کال کرنی چاہی لیکن میں جانتا تھا کہ میں مشتبہ ہوں اور وہ لوگ اس کی بات پر یقین کر لیں گے چنانچہ میں نے کبھی پولیس کو کال نہیں کی۔۔۔ مجھے ڈر تھا کہ اس کی وجہ سے میں اس

اخلاقی سموتے ہوئے کہا۔

وہ سمجھتے ہوئے میرے سامنے بیٹھ گئی۔ اس کے چہرے پر جھکن کے ساتھ ساتھ تذبذب کے آثار بھی تھے۔ اس کے متعلق مزید بتانے سے پہلے میں آپ کو اپنے بارے میں کچھ بتا دوں۔ میں ایک نفسیات داں ہوں۔ شادی شدہ ہوں اور میرا دو سال کا ایک بیٹا سا بچہ بھی ہے۔ امام ہمارے شادی کے دس سال بعد پیدا ہوا۔ ہم دونوں میاں بیوی کی جان بھر لی میں انگریزی ہے۔

میری عمر اسی سال ہو چکی ہے مگر دیکھنے میں پینتیس سے زیادہ کا نہیں لگتا، سب کو اپنی عمر پینتیس سے زیادہ بتاتا بھی نہیں ہوں۔

اسلام آباد کے ایک پوش علاقے میں میرا کلینک ہے۔ کچھ عرصہ پہلے تک تو میں ہمیشہ اپنے نفسیات داں بننے پر بچتا رہا۔ کھانا کھاتا رہا۔ ہمارے ہاں نفسیاتی علاج کو لوگ شکی نہیں سمجھتے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ وہ اگر اپنا کوئی نفسیاتی عارضہ لے کر کسی نفسیاتی معالج کے پاس گئے تو لوگ انہیں پاگل سمجھتا شروع کر دیں گے۔ لوگوں کی اس سوچ کے باعث کیریئر کے آغاز میں مجھے بھی کافی مسائل کا سامنا کرنا پڑا مگر آخر کار کچھ ”جوڑ توڑ“ کر کے میں اس علاقے میں اپنا کلینک بنانے میں کامیاب ہو گیا۔

شروع میں مجھے اپنی یہ سرمایہ کاری بھی ذوقی ہوئی نظر آتی مگر آہستہ آہستہ میرا کام چل نکلا۔ ملک میں حالات کی خرابی کی وجہ سے تقریباً ہر کوئی کسی نہ کسی نفسیاتی عارضے کا شکار نظر آتا ہے۔ میں نے اس چیز کا فائدہ اٹھایا، کبیل پر اپنے کلینک کے اشتہارات چلائے۔ کچھ لوگوں کا اشتہاری مہم کے لیے انتخاب کیا۔ دراصل یہ لوگ میرے حلقہ احباب میں سے ہی تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ وہ میری ”قابلیت“ کی فرضی کہانیاں اپنے حلقہ احباب میں پھیلا دیں۔ اس کے علاوہ نفسیاتی بیماریوں کے متعلق شعور اجاگر کرنا بھی ان کی ذمہ داری میں شامل تھا۔ جب وہ یہ کام کرنے کے بعد یورپ کی مثالیں دیتے کہ وہاں نفسیاتی معالج سے علاج کرانا اتنا ہی عام ہے جتنا دیگر جسمانی امراض کا علاج تو لوگ موم ہو جاتے۔

شاید یہ بھی ہمارے لوگوں کا ایک نفسیاتی عارضہ ہی ہے کہ باؤرن اور ترقی یافتہ ممالک کو جانے کے شوق میں ہم ہر کام میں یورپ کی تقلید کرتے ہیں۔

خیر میں آپ کو اپنی ”مارکیٹنگ فورس“ کی ”فورس“ کے بارے میں بتا رہا تھا۔ وہ اس طریقے سے ”مکیر“ کے

مریضوں کو میرے پاس بھیجتے اور میں انہیں فی کلائنٹ کے حساب سے کچھ کمیشن دے دیتا۔ ویسے تو وہ بھی کھاتے بیٹے لوگ تھے بلکہ کچھ تو شیک شاہک دولت مند بھی تھے مگر پیسے کے برے لگتے ہیں۔ وہ بھی صرف تھوڑی سی زبان بولانے کی بدولت سواپ اللہ کے کرم سے میرا کام بھی چل نکلتا تھا اور میرے دوستوں اور رشتے داروں کو بھی اضافی آمدنی حاصل ہو رہی تھی اور کیا چاہیے تھا ہمیں۔

اب آتے ہیں میری اس خاتون کلائنٹ کی طرف۔ وہ میرے سامنے بیٹھ کے اپنے ہونٹ کاٹنے لگی۔ ساتھ ہی وہ اپنی انگلیاں مروڑ رہی تھی۔ اس کی یہ حرکات اس کے اندرونی اضطراب کی نشاندہی کر رہی تھیں۔

میرے پاس زیادہ تر خواتین کلائنٹس ہی آتی ہیں اور ان میں سے زیادہ تر ایسی ہی ”حرکات“ کر رہی ہوتی ہیں۔ میں نے ہل بھر میں ہی اس کی کیفیت نوٹ کر لی اور فوراً اس سے زیادہ اہم ”نوٹ“ کرنے کے قابل چیزوں کی طرف توجہ مرکوز کر لی۔

اس کے لباس اور ہنڈ بیگ سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کا تعلق زیادہ دولت مند گھرانے سے نہ سہی، کسی کھاتے پیتے گھرانے سے تھا۔ گویا وہ میری آمدنی میں خاطر خواہ اضافے کا باعث بننے کی ”اہلیت“ رکھتی تھی۔ آپ کو یہ بات بھی بتا دوں کہ میں فیس مریض کی ”مالی حالت“ کا اندازہ لگانے کے بعد ہی طے کرتا ہوں یہ اور بات ہے کہ میں مریض کو یہی بتاتا ہوں کہ فیس ان کے کیس کی نوعیت دیکھ کے طے کی جائے گی۔

میں نے اس کے حلیے کا غیر محسوس انداز میں تعقیلی جائزہ لینے کے بعد مطمئن ہو کر اس کی آنکھوں میں جھانکا تو اسے اپنی طرف دیکھتے ہی پایا۔ میں اپنے لہجہ میں شیرینی گھولتے ہوئے بولا۔ ”جی ٹیم! میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“

”مجھے سزا عارفہ عجیب نے آپ کے بارے میں بتایا تھا۔“ وہ اتنا بتا کر میری طرف خنجر نظروں سے دیکھنے لگی۔

”اوہ، مس عارفہ میری کلائنٹ ہیں۔ وہ کچھ عرصہ میرے پاس زیر علاج رہی ہیں اور اب بالکل شیک ہیں۔ امید ہے آپ کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔“

عارفہ میرے ایک دوست کی بیوی تھی۔ وہ ”مارکیٹنگ“ کے دوران یہی کہانی سنا کر کلائنٹس کو ”مکیر“ تھی، ہوس میں نے بھی اپنی متوجہ کلائنٹ کو وہی کہانی سنائی۔

”مسئلہ میرا نہیں ہے۔“ میری بات سننے ہی وہ قدرے

تیز انداز میں بولی۔

میں نے اس کا لہجہ نظر انداز کر دیا کہ نفسیاتی مریضوں کے علاج کے لیے ہمیں مختلف قسم کے رویوں کو سہتا پڑتا ہے۔ یہ میرے لیے معمول کی بات تھی۔

کچھ دیر بعد وہ پھر گویا ہوئی۔ اس بار اس کا لہجہ معمول کے مطابق تھا۔

”ڈاکٹر صاحب! آپ ”سائیکالوجیکل پرائلم“ کو کیسے ”ڈیفائن“ کرتے ہیں؟“ اس نے اٹھتے اٹھتے سوال کیا۔

اس کا سوال سن کے میں ہلکا سا ہلکا۔ ایف اے کی نفسیات کی کتاب میں نفسیاتی عارضے کی جو تعریف اور اقسام میں ”رٹی“ تھیں، وہ اب کہاں یاد تھیں۔ مجھے۔ بہر حال اسے مطمئن کرنا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ میں نے ذہن میں ایک مناسب سی تعریف سوچی۔ سوچی کیا بلکہ ”مکیر“ اور گویا ہوا۔

”سائیکالوجی کی رو سے میں آپ کو اس کی تعریف بتاؤں تو شاید آپ کو سمجھنے میں دشواری ہو۔ بس آپ یہ سمجھ لیں کہ جب کسی شخص کا رویہ عمومی رویے کے برعکس ہو تو ہم کہہ سکتے ہیں اسے ”سائیکالوجیکل پرائلم“ ہے۔“

وہ میری یہ ”جامع“ تعریف سن کر مطمئن نظر آنے لگی۔ ”گوروں“ کی زبان میں یہ بہت بڑی خوبی ہے کہ کوئی نامناسب ترین لفظ بھی ہو تو انگریزی میں ادا ہو سکی ہے وہ بڑا مناسب لگنے لگتا ہے۔ اب یہی دیکھ لیں کہ ”نفسیاتی مرض“ لفظ کتنا ”اکورڈ“ سا لگتا ہے جبکہ ”سائیکالوجیکل پرائلم“ کتنا اپنا پتا۔

”ہوں!.....! اس کا مطلب ہے وہ واقعی ”سائیکو“ ہیں۔“ وہ خود کھائی کے انداز میں بولی۔

”ہیم! آپ مجھے کچھ تفصیل بتانا پسند کریں گی؟“ ”میرے شوہر سائیکو ہیں۔ میں انہی کے سلسلے میں آپ سے بات کرنے آتی تھی۔“ انہی دہرائی میں وہ کافی پراعتاد نظر آنے لگی تھی اور اب روانی سے بات کر رہی تھی۔

میں ایک رف پڑا اور غسل لے کر اس سے بولا۔ ”اس بات کا آپ کو اب اور کیسے پتا چلا کہ وہ ”سائیکو“ ہیں؟“

”مختلف واقعات سے وہ سائیکو ثابت ہوتے ہیں۔ میں تو ان کی عادات سے سخت نالاں ہوں۔ آپ پلیز میری مدد کریں۔“ وہ روہانے انداز میں بولی۔

”جی، ہم اسی لیے تو یہاں بیٹھے ہیں۔ آپ کچھ واقعات کا ذکر کر رہی ہیں۔“ میں نے فوراً اس کی بات کا رخ اصل مسئلے کی طرف موڑا۔ درنہ خواہم عام طور پر اچھا خاصا

وقت جمہید باندھنے میں ہی ضائع کر دیتی ہیں۔

وہ پھر زور سے نظر آنے لگی۔ کچھ دیر کے بعد وہ گویا ہوئی۔ ”اب یہی رات کا واقعہ سن لیں۔ رات کو گیارہ بجے ہم سونے کی تیاری کر رہے تھے کہ چانک کال نکل گئی۔ ہمارا۔۔۔ بیروم دوسری منزل پر ہے، وہاں سے گیت نظر آتا ہے۔ انہوں نے کھڑکی کے آگے لگا پڑا اٹھا کر نیچے دیکھا۔

”اوہ، ارشد صاحب، اس وقت..... خیریت تو ہے؟“ وہ نیچے کچھ فکر مند سی ہوئی۔

”میں سمجھتا ہوں۔ ارشد ہمارا پڑوسی ہے اور اسے ہر دوسرے تیسرے روز ہی کوئی نہ کوئی کام ان سے پڑتا رہتا ہے۔ وہ میری طرف معذرت طلب نظروں سے دیکھتے ہوئے نیچے چلے گئے۔ میں اپنی جگہ بیچ دتا کہ کھا کر رہ گئی۔

”کچھ دیر بعد ان کی کال آئی کہ ارشد صاحب کا یو پی ایس مسئلہ کر رہا ہے۔ وہ اسے دیکھنے جا رہے ہیں۔ انہوں نے الیکٹریشن کا کام بھی سکھا ہوا ہے۔ مگر کے یو پی ایس میں کوئی مسئلہ ہو تو بھی خود غصہ کر لیتے ہیں۔ مگر کی تو خیر ہے مگر کسی پڑوسی کے یو پی ایس کو دیکھنے رات کے اس پہر جانا کہاں کی تک ہے؟ آپ ہی بتائیں، کیا یہ سائیکالوجیکل پرائلم نہیں؟“ وہ مجھے دیکھتے ہوئے رہی سے بولی۔

میرا خیال اس سے مختلف تھا۔ یہ نفسیاتی مسئلہ تو نہیں تھا مگر رات کو پڑوسی کے یو پی ایس کو شیک کرنے جانا وہ بھی ”مفت“ میں سمات کی انتہا ضرور ہے۔ بہر حال میں اس کے خیال کی نفی تو کر ہی نہیں سکتا تھا کہ اس کا کرنے سے میں اس سے ہونے والی متوقع آمدنی سے ہاتھ دھو سکتا تھا اور میں اس کے میاں کی طرح اتنا احمق نہیں تھا کہ ایسی سمات کرتا۔ سو میں نے کہا۔ ”آپ صحیح کہہ رہی ہیں۔ ان کے بارے میں مزید کچھ بتائیں۔“

”یہ ایسے ہی سب کے کام مفت میں بڑھ چڑھ کر کرتے رہتے ہیں۔ ان سے چھوٹے دو بھائی اور ایک بہن ہے۔ یہ ابھی جاب پر لگے ہی تھے کہ ان کے والد اور والدہ کا ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں انتقال ہو گیا۔ انہوں نے اپنی ذات کو بھلا دیا اور پہلے اپنے بھائیوں اور بہن کی تعلیم مکمل کرائی۔ وہ اپنی تعلیم مکمل کر کے جاب پر لگ گئے۔ اب ہوتا تو یہ چاہیے تھا کہ یہ اب اپنا گھر بسانے کا سوچتے مگر انہوں نے اپنے پیسوں سے سب کی شادیاں کرالیں۔ جب سب اپنے گھر کے ہو گئے تو پھر اپنی شادی پینتیس سال کی عمر میں جا کر کی۔ مجھ سے دس سال بڑے ہیں وہ۔“ اس نے رک کر مجھے دیکھا۔

بہترین تحریریں، لا جواب روداد اور
اعلیٰ داستانیں پڑھنے والوں کے لیے
سرگزشت کا مطالعہ ضروری ہے

سرگزشت
ماہنامہ

شمارہ جون 2017ء
کی جھلکیاں

حوالے ظیل

اسات کار کی داستان
زیست جسے ہر کام پر دکھ ملے

جانے سندھی فطرت

پاکستانی نسلی دنیا کے ایک
اہم شخصیت کا ذکر خاص

ماہنامہ پلاٹ

ان پرندوں کی کہانی جو تیزی
سے تابیاب ہو رہے ہیں

خود اعتمادی

ایک دوشیزہ کی سچ بیانی جس
نے اپنا ٹوٹا کمر بچا لیا

سرگزشت

ناسور ایک نہایت تیز رفتار طویل کہانی،
شمشال سے ٹورنٹو ایک الگ انداز

کی سرکہانی، جون کی شخصیت، اس
ماہ سے جزی شخصیات کا مختصر مختصر سا تذکرہ

اور بھی بہت کچھ جسے آپ کو پڑھنا چاہیے۔
آپ پڑھنا چاہتے ہیں۔

اور اگر آپ کے پاس ان کی کوئی تصویر ہے تو وہ بھی دے
ہائیں۔
”تصویریں تو ہیں مگر میرے سِل میں ہیں۔“ وہ
بیان کن انداز میں بولی۔

”کوئی بات نہیں، وہ آپ مجھے ”واٹس ایپ“ کر دیجیے
گا۔“ میں نے مسکرا کر کہا تو وہ مجھ سے رِف پینے لے کر اس پر
کی مطلوبہ معلومات لکھنے لگی۔

میں بخورا سے دیکھنے لگا۔ رِف پینہ پر قلم کھینچتے ہوئے
وہ انتہائی کم سن لگ رہی تھی۔ چند لمحات کے بعد ہی اس
نے پینہ میری طرف بڑھا دیا۔ اس کی لکھائی انتہائی صاف
اور واضح تھی۔ میں نے اس کی لکھائی کی تعریف کی تو وہ
شرمانے لگی۔

میں نے اپنا کارڈ اس کی طرف بڑھایا۔ ”اس پر
میرا ایل نمبر بھی لکھا ہوا ہے۔ اپنے مایاں سے کہیں بھی میری
ایڈ ”اتاقی“ ملاقات سین کر کے مجھے انعام کر دیجیے گا۔ آپ
بے فکر ہو جائیں، اب یہ مسئلہ آپ کا نہیں میرا ہے۔“ میری
تین دہائی پر وہ مطمئن انداز میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

”بہت شکریہ، ڈاکٹر صاحب! میں جلد ہی ان سے آپ
کی ملاقات کا بندوبست کر کے آپ کو بتا دوں گی۔“ وہ اٹھتے
ہوئے بولی۔

”جی ضرور۔“ میں مسکراتے ہوئے بولا۔

اس کے باہر نکلتے ہی میں نے انٹرکام اٹھایا اور اپنی
سیکرٹری سے بولا۔ ”پانچ ہزار۔۔۔۔۔“
چند لمحات کے بعد ہی سیکرٹری نے مجھے انٹرکام پر
اطلاع دی کہ اس نے پانچ ہزار بلا روڈ قند کے دے دیے
ہیں۔ میں نے مطمئن انداز میں سیٹ کی پشت سے ٹپک لگا
کے آنکھیں موند لیں۔

برائے دل کی بات ہے۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ میں آفس
میں قانع بیٹھا تھا کہ میرا سِل بج اٹھا۔ کوئی ابھنی نمبر تھا۔ میں
نے کال ریسیور کے سِل کاٹوں سے لگا لیا۔
”ہیلو ڈاکٹر عرفان؟“ دوسری طرف سے کسی نے سوالیہ
انداز میں پوچھا۔

”جی مگر مایہ، میں عرفان ہی بات کر رہا ہوں۔“
”ڈاکٹر صاحب، میں منم بات کر رہی ہوں۔ کل آپ
کے کلینک بھی آئی تھی اپنے شوہر کا ایک مسئلہ لے کر۔“ وہ
جلدی سے بولی تو مجھے یاد آیا کہ کل تو میں نے اس سے اس کا
نام تک نہیں پوچھا تھا۔ میں نے اس غلطی پہ خود کو کوسا اور اس

بڑے مایاں پر بے غرضی کے علاوہ ایمانداری کا بحوت بھی
سوار تھا۔

”ڈاکٹر صاحب! یہ تو آپ کو میں نے چند لمحوں دی
ہیں آپ ان سے ملیں تو آپ کو اندازہ ہو کہ وہ کہیں سے بھی
آج کے دور کے انسان نہیں نکلتے۔ اس دور میں چب سب کو
اپنی پڑی ہوئی ہے، وہ دوسروں کی فکر میں کھلتے رہتے
ہیں۔ اس کے لیے بھی نہ وہ کوئی وقت دیکھتے ہیں نہ
حالات۔ آپ پلیز میرے اس مسئلے کو حل کریں۔ ورنہ مجھے لگتا
ہے میں ان کی ان عادات کے باعث پاگل ہو جاؤں گی۔“ وہ
کپٹیاں ملتے ہوئے بولی۔

میں نے اسے ہمدردی سے دیکھا۔ اس کا مایاں واقعی
”سانیکو“ تھا کہ اس کا ہر رویہ ہی عمومی رویے کے برعکس
تھا۔ اس نفسانسی کے دور میں جب ہر شخص، ہر کام صرف اپنے
ہی فائدے کے مدنظر رکھ کر رہتا ہے، وہ دوسروں کی فکر میں کھل رہا
تھا۔ وہ تو کسی خیالی دنیا کا باشندہ لگ رہا تھا۔ اس کی نفسیات
میں واقعی کوئی چپچہ کی جی جو وہ عام معاشرے کی ذکر سے ہٹ
کے چل رہا تھا۔

میں نے خیالوں ہی خیالوں میں بڑے مایاں کی
”حرکات“ کا جائزہ لے کر انہیں ”نفسیاتی مریض“ کا
”سرٹیفکیٹ“ عنایت کر دیا۔

”میم! آپ کا مسئلہ ہو جائے گا، بس آپ اپنے
مایاں کی کہیں بھی مجھ سے ملاقات کرادیں۔“
میری بات سن کر وہ مطمئن نظر آنے لگی۔ ”جی، یہ
ٹھیک رہے گا۔ میں تو پریشان ہو رہی تھی کہ انہیں یہاں
کیسے لاؤں گی۔“

”میں سمجھتا ہوں، آپ ان سے میرا بطور نفسیات داں
تعارف بھی نہ کرائیے گا۔ میں خود ہی ان سے مل کر۔ ان سے
اپنی مطلوبہ معلومات حاصل کر کے ان کا علاج شروع کر
دوں گا۔“

”یہ ٹھیک رہے گا۔“ وہ جوش سے بولی۔ ”مگر آپ ان
کا علاج کیسے کریں گے؟“ اگلے ہی لمحے اس کے لہجے میں
ابھمن در آئی۔

”آپ اس کی فکر چھوڑیں۔ میں پہلے ان کے مرض اور
اس کی شدت کو سمجھ لوں پھر علاج بھی ہو جائے گا۔“ میں
مسکراتے ہوئے بولا تو اس کی آنکھوں میں تیرہائی ابھمن کافی حد
تک معدوم ہو گئی۔

میں نے اس کی طرف رِف پینہ بڑھایا۔ ”آپ اپنے
شوہر کا نام فون نمبر، مگر کا اور آفس کا ایڈریس اس پر لکھ دیں

یہ عورت بھی اکثر عورتوں کی طرح اپنی عمر کے حوالے
سے کافی حساس معلوم ہو رہی تھی جو فوراً وضاحت کرنے
لگی۔ خیر مجھے اس کی عمر سے کیا لینا دینا تھا، سو مختصر نظروں سے
اسے دیکھنے پر ہی اکتفا کیا۔

وہ کچھ لمحات کے توقف کے بعد پھر گویا ہوئی۔ ”اپنی
شادی کے کچھ عرصے بعد انہوں نے اپنا آبائی گھر اپنے
بھائیوں کے حوالے کیا اور خود نے گھر میں شفٹ ہو گئے جو
انہیں گورنمنٹ کی طرف سے ملا تھا۔ جن بھائیوں اور بہن کے
لیے انہوں نے اتنی قربانی دی کہ وہ اب بھی ان سے بس غرض کا
تعلق قائم رکھے ہوئے ہیں۔ یہ ہر ایک اینڈ پر انہیں اپنے گھر
کھانے پر مدد کر لیتے ہیں۔ وہ سب اپنے بچوں کے ساتھ آ
کے مفت میں کچھ کھاتے۔۔۔۔۔ ازلے الیلے ہیں مگر حال ہے جو ہمیں
بھی کسی نے اپنے گھر کھانے یا چائے پر بھی مدد گویا ہو۔ میں
ان کو سمجھا سمجھا کر تھک چکی مگر ان کے کان پر جوں نہیں
رہتی۔ اب آپ بتائیں کیا ان کا وہ عمومی رویے کے برعکس
نہیں بڑا ہوئے پر آئی تو ایک ہی سانس میں بولتی چلی گئی۔
اس عورت کا شوہر تو واقعی کوئی ”مہاشمس“ تھا جو اس دور

میں بھی اس انداز میں جی رہا تھا۔
”جی آپ درست کہہ رہی ہیں۔ ان کا رویہ آپ کے
ساتھ کیسا ہے؟“

”وہ میرا اور بچوں کا بھی ہر طرح سے خیال رکھتے ہیں
مگر بعض اوقات وہ دوسروں کے کام کرتے ہوئے ہمیں بھی
نظر انداز کر دیتے ہیں۔“ وہ کھوکھو کناں انداز میں بولی۔

”آپ کے مایاں کرتے کیا ہیں؟“ میں نے ایک
انتہائی ضروری سوال کافی دیر بعد کیا۔ حالانکہ یہ سوال مجھے
ابتدا میں کرنا چاہیے تھا۔ میں نے تو اس سے ابھی تک اس
کے مایاں کا نام تک نہیں پوچھا تھا۔ خیر، نام سے میرا کیا لینا
دینا تھا۔ البتہ کام کا پتا ہونا ضروری تھا۔ میں نے ایک بار
پھر خود کو کوسا۔

”سی ڈی اے میں انھارویں گریڈ کے ملازم ہیں۔“ وہ
خبر کے بجائے تنفر سے بولی۔ اب مایاں کا انھارویں اکیل
میں ہونا تو کافی ”کشش انگیز“ ہوتا ہے نہ کہ نفرت انگیز جس
پر لابی فغا لگ رہی تھیں۔

میں نے بھویر اچکا کے حیرت سے اسے دیکھا۔ وہ
میری آنکھوں میں حیرانی دیکھ کر پھر بولی۔ ”وہ اسکی سیٹ پر
ہیں جس سیٹ پر باقی لوگوں نے پورے شہر میں اپنے پلازے
کھڑے کر لیے ہیں مگر یہ ایک ہی پلاٹ پر اکٹھا کیے بیٹھے
ہیں۔“ اس کی بات سن کر مجھے اس کی عقلی کی وجہ کھائی۔ گویا

سے گویا ہوا۔
 ”جی مس مضم، کیسے کیسے یاد کیا؟ میں تو ابھی تک آپ کے شوہر کی تصاویر کے ”داس ایپ“ کا انتظار کر رہا تھا۔“
 ”اوہ، سوری..... وہ میں بھول ہی گئی۔“ وہ بولی تو اس کے لہجے میں شرمندگی تھی۔
 ”چلیں کوئی بات نہیں۔ بتائیں ابھی کیسے یاد کیا؟“
 ”وہ آپ نے کہا تھا کہ میں اپنے شوہر کی آپ سے انتقاد ملاقات گراؤں تو آج شام فارغ ہیں آپ؟“ وہ تذبذب کے عالم میں بولی۔
 ”فارغ تو نہیں مگر میں وقت نکال لوں گا۔ آپ بتائیں، کہاں آنا ہوگا مجھے؟“
 ”وہ اکثر شام کو ایک پارک میں جاتے ہیں۔ میں بھی آج ان کے ساتھ جا رہی ہوں۔ اگر آپ وہاں آ جائیں تو میں ان سے آپ کا تعارف کرا دوں گی۔ آپ ان سے بات کر لیجیے گا۔“ اس نے پارک کا نام بھی بتا دیا۔
 یہ پارک میرے گھر سے قریب ہی تھا اور اکثر میری بیوی بھی اصر شام کو جایا کرتی تھی۔ کچھ سوچ کر میں نے اسے اوکے کر دیا اور ساتھ ہی اپنا پروگرام بتا دیا۔
 ☆ ☆ ☆

تقریباً دو گھنٹے بعد میں پارک میں بیٹھا تھا۔ پارک کیا یہ ایک کھلا میدان تھا جس میں کچھ جموں لگے ہوئے تھے۔ سردیوں کے دن تھے۔ پارک میں انکا دکا لوگ ہی نظر آ رہے تھے۔
 عاتقہ کو بھی میں نے فون کر کے بلالیا تھا۔ میں اپنے دو سالہ بیٹے امام کے ساتھ کھیل رہا تھا کہ میں نے مضم کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ اس کے ساتھ ایک چنڈس سارو بھی تھا جو اس کا شوہر ہی ہو سکتا تھا۔ اس نے ٹراؤزر کے ساتھ ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ میرا تو خیال تھا کہ وہ قدرے عمر رسیدہ اور بوٹی سا نظر آنے والا شخص ہوگا مگر میری توقع کے خلاف وہ خاصا جوان اور دروازہ لگ رہا تھا۔ مضم نے بتایا تھا کہ وہ اس سے دس سال بڑا ہے جبکہ وہ دیکھنے میں اس سے بھی کم عمر لگ رہا تھا۔
 وہ میرے قریب پہنچ کر چوکتے ہوئے بولی۔
 ”اوہ عرفان صاحب! آپ یہاں؟“
 میں بھی جواب میں مضطرب اور امام کو گود سے نیچے اتارتے ہوئے بولا۔ ”بس فارغ تھا تو سوچا بیٹے کو ذرا باہر لی ہوا لگاؤں۔“
 ”اچھا کیا آپ نے، ورنہ آج کل تو ہر حضرات نے

پاس بیوی بچوں کے لیے وقت کم ہی ہوتا ہے۔“ اس نے اپنے شوہر کی طرف دیکھتے ہوئے طنزیہ انداز میں کہا۔ ”اوہ، میں آپ دونوں کا تعارف کرانا تو بھول ہی گئی۔“ وہ ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہوئے بولی۔
 ”یہ عرفان صاحب ہیں۔ عارفہ ان کی کزن ہے۔ اس کے گھر چند دن پہلے ان سے ملاقات ہوئی تھی اور یہ..... یہ میرے شوہر امیر صاحب ہیں۔ یاد رہے، امیر ان کا نام ہے۔ آپ انہیں سچ سچ کا امیر نہ سمجھ لیجیے گا۔“ وہ کھٹکھٹلاتے ہوئے بولی۔
 میں نے مسکراتے ہوئے ”نام کے امیر صاحب“ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ”سنا ہے نام کے اثرات ہوتے ہیں۔ یہ آج نہیں تو کل ضرور امیر ہو جائیں گے۔“ میرے لہجے میں خوش خلقی کھلی ہوئی تھی۔
 امیر صاحب میرا ہاتھ تمام کر بولے۔ ”جی بالکل، نام کے اثرات ابھی ہوتے ہیں۔ ویسے میں اتنا امیر ہو چکا ہوں جتنا میں ضروری سمجھتا ہوں۔“ اس کے لہجے میں عجب بے نیازی تھی۔
 بھلا امارت کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ جو یہ صاحب ”اتنی سی“ دولت پر ہی اکتفا کر کے بیٹھ گئے تھے۔ میں ان کے خیالات سے متفق نہیں تھا مابں مسکراتے رہی اکتفا کیا۔
 مضم نے امام کو اٹھانے کی کوشش کی تو وہ رونے لگا۔ اس نے جھپٹنے ہوئے اسے واپس نیچے چھوڑ دیا۔ وہ بھانسا ہوا اپنی پاں کی طرف چلا گیا جو پاس ہی ایک بیچ پر بیٹھی تھیں دیکھ رہی تھی۔ میں اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”یہ عاتقہ ہے۔ میری بیوی۔“
 مضم اس کی طرف بڑھ گئی جبکہ میں امیر کو لے کر ایک دوسری بیچ کی طرف بڑھ گیا۔
 ”ماشاء اللہ، آپ کا بیٹا بہت کیوٹ ہے۔“ وہ امام کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔
 میں نے محبت باش نظروں سے اسے بیٹے کی طرف دیکھا جو بیچ سے کچھ فاصلے پر جموں کے پاس کھڑا تھا۔
 اچانک میرا ایل بجنے لگا۔ یہ میرے ایک کلاسٹ کی کال تھی۔ ”ایسکیمو زنی۔“ میں نے معذرت خواہانہ انداز میں امیر کی طرف دیکھا اور بیچ سے اٹھ گیا۔
 کچھ دور جا کر میں اپنے کلاسٹ سے بات کرنے لگا۔ بات کرتے کرتے مجھے امام کا خیال آیا۔ وہ مجھے کیسے نظر نہیں آ رہا تھا۔
 اچانک میں نے امیر کو چلائے سنا۔ ”عرفان صاحب!

ا.....“
 میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ ایک طرف کو بھاگ رہا تھا۔ میں نے اس سمت نظر دوڑائی تو ایک اپر پوش کو مارتے دیکھا۔ اس نے کندھے کے ساتھ ایک بچہ کو لگا دیا ہوا مارا مجھے امام ہی لگا۔
 میں نے بھی اس سمت دوڑ لگا دی۔ عاتقہ ہمیں بھاگتے لہر لہاتے لگی۔
 میرے قدموں میں جیسے بجلی بھرنی تھی۔ وہ شخص اب اپنی بیچ کر دوڑ کے کنارے کھڑی ایک کار کا دروازہ کھول رہا تھا۔ میں شاید دروازہ کھل نہیں رہا تھا۔ دوسرے ہاتھ سے اس نے امام کو اٹھا لیا ہوا تھا جو بالکل خاموش تھا۔
 وہ تو بھی کسی اجنبی شخص کو پاس نہیں آنے دیتا تھا اور یہاں اس شخص کے کندھے سے اتنی خاموشی سے لگا ہوا تھا میں نے مجھتے ہوئے حیرانی سے سوچا۔
 اتنے میں امیر اس کے کافی قریب پہنچ گیا۔ اس شخص نے امیر کو اتنے قریب دیکھا تو جب سے ہتھول نکال لیا۔ میں ہتھول دیکھ کر رک گیا لیکن امیر اب بھی بھاگ رہا تھا۔ اب وہ بھاگتے ہوئے میرے سامنے آ گیا تھا جس کی وجہ سے وہ جس میری نظر سے واپس ہو گیا۔
 اچانک میں نے امیر کو گرتے دیکھا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اپنے کندھے میں ایک انگارہ سا اتارتے محسوس کیا۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ کچھ لمبے میں ہی میں ہوش و حواس سے بیگانہ ہو چکا تھا۔
 ☆ ☆ ☆
 یہ تقریباً ایک ماہ بعد کی بات ہے۔ میں عاتقہ کے ساتھ بہت سے تحائف سے لدا چھندا امیر کے گھر جا رہا تھا۔ شاید یہ میری زندگی کا پہلا موقع تھا جب میں نے بغیر کسی غرض اور ایج کے کسی کے لیے تحائف خریدے تھے۔
 میرے کندھے کا ڈر خیمہ چکا تھا۔ اب مجھے بازو ہلاتے ہوئے تمغوی تکلیف تو ہوتی تھی مگر یہ تکلیف قابل برداشت تھی۔ میرے کندھے میں گولی لگی تھی جس نے کندھے کی ہڈی کو تھکایا تھا۔ ڈاکٹرز نے آپریشن کر کے گولی نکال لی تھی۔
 میرا کافی خون بہہ گیا تھا۔ بروقت مجھے طبی امداد ملتی تو میری موت واقع ہو سکتی تھی۔
 مجھے بعد میں بتا چلا تھا کہ امام کھیلتے کھیلتے دور چلا گیا تھا۔ اسے اکیلا دیکھ کر اس شخص نے اسے بے ہوش کر کے اندھے پر اٹھا لیا تھا۔ اسی وقت امیر کی نظر اس پر پڑی۔ ”خدمت خلق“ کا جذبہ تو اس میں کوٹ کوٹ بھرا ہوا

تھا۔ میں اس کے اس ”جذبہ“ کا ”علاج“ کرنے کے لیے ہی تو اس سے ملا تھا۔
 میں اس سے بھی کچھ فاصلے پر تھا۔ اس نے مجھے آواز لگاتے ہی اس شخص کی طرف دوڑ لگا دی۔
 جب اس شخص نے امیر پر فائر کرنے کے لیے ہتھول سیدھا کیا تو وہ تیزی سے بیٹھ گیا۔ وہ گولی میرے کندھے میں لگی۔
 امیر اتنے میں اس شخص کے انتہائی قریب پہنچ چکا تھا۔ اس نے جست لگا کر اس شخص کے پیٹ میں مگر ماری تو وہ اڑتا ہوا دور جا کر۔
 امام اور ہتھول دونوں اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئے۔ امیر نے اس شخص کو پکڑ لیا۔ اتنے میں کچھ اور لوگ بھی موقع پر جمع ہو گئے۔ انہوں نے پہلے تو اس شخص کی خوب دھلائی کی اور پھر اسے پولیس کے حوالے کر دیا۔ بعد میں بتا چلا کہ وہ شخص انوکھا کاروں کے ایک گروہ سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ لوگ بچوں کو انوکھ کر کے ان کے اعصاب فروخت کرنے کے گروہ دھندے میں ملوث تھے۔ اس شخص کی نشاندہی پر اس کے دیگر ساتھیوں کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔
 میڈیا نے اس واقعے کی بھرپور رپورٹ کی تھی۔ امیر اس واقعے کا ہیرو تھا۔ اس کی ہمت و جرات کو خوب خراج تحسین پیش کیا گیا۔ وہ یکدم ہی پورے شہر میں مشہور ہو گیا۔
 کچھ لوگوں نے مجھے بھی اٹھا کے اسپتال پہنچا دیا۔ اسپتال میں گزر رات میرے اندر بہت سی تبدیلیاں لے آیا۔ امام میں تو میری جان تھی۔ اگر امیر اپنی جان پر کھل کر اسے نہ بچاتا تو میں تو زندہ رہ کر ہو جاتا۔
 اب مجھے احساس ہو رہا تھا کہ نفسیاتی مریض وہ نہیں، میں تھا بلکہ ہمارا پورا معاشرہ ہی نفسیاتی مریض ہے۔ وہ تو شاید معاشرے کا واحد نارمل انسان ہے۔ ”نفسیاتی مریض“ تو ہر وہ فرد ہے جو معاشرے کے ”ساتھ“ چل رہا ہے۔ دوسروں کو دھکیلے ہوئے، پکڑے ہوئے، جبر کہ جس اپنے فائدے کو ہی.... منظر رکھے ہوئے، آگے ہی آگے بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ پتا نہیں ”حقیقت میں ہم آگے جا رہے ہیں یا پیچھے.....“
 اس ”نفسیاتی مریض“ نے میری پوری نفسیات ہی بدل ڈالی۔ اب میں نے بھی اس کی طرح عام معاشرے سے ہٹ کے چلنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اس راہ میں مشکلات تو ہیں مگر اصل کامیابی بھی اسی راستے پر چل کے ملتی ہے۔ آپ لوگ میرے لیے دعا کیجیے گا اللہ مجھے اپنے فیصلے پر عاقبت قدر رکھے۔ آمین۔

مہفل شہر و سخن

✽ مسٹر ایڈمنسٹریشنل مینجر مہندر معاویہ..... خاندان
گردنیں وار دی گئیں کھائیں اتاری گئیں
مشق بکارت ہی رہا یار نہیں تو کچھ نہیں
✽ وسیم اکرم..... مہر شاہ خاندان

ہم تو اک حرف محبت سے بھی مر سکتے ہیں فراز
تیر کیوں ڈھونڈ کے لاتے ہونٹانے کے لیے

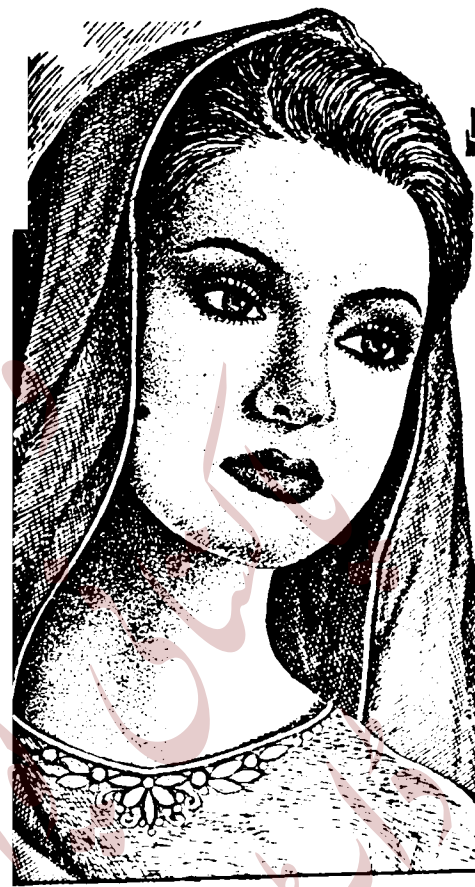
✽ محمد نعیم پاشا..... ملتان
تو نے اپنا بنا کے چھوڑ دیا
کیا اسیری ہے کیا رہائی ہے



✽ محمد شہباز ناز..... سرگودھا
جس شہر شکر میں ہے بشر بھولا خدا بھی
مل مل کے وہاں روٹی ہے مٹی سے گنا بھی
✽ انڈر شیدیال..... خیبر پور میر، سندھ
وقت اچھا بھی آئے گا ناصر
غم نہ کر زندگی پڑی ہے ابھی
✽ ناہید یوسف..... اسلام آباد
عجب ہے رات سے ان آنکھوں کا عالم
یہ دریا رات بھر چلتا رہا ہے
✽ اسد خان..... مانسہرہ

نہ سید ہونٹ نہ خوابوں میں صدا دو ہم کو
مصلحت کا یہ تقاضا ہے بھلا دو ہم کو
ہم حقیقت ہیں تو تسلیم نہ کرنے کا سبب
ہاں اگر حرب غلط ہیں تو مٹا دو ہم کو
✽ عزیز بن لاشاری..... لندن

اس نے خوشبو کی طرح میری پذیرائی کی
کو کچھ بچیل گئی بات شناسائی کی
اس نے ایک لمحے کو ماتھے پر سے ہاتھ دھرا
روح تک آگئی تاثیر میسائی کی



✽ ظفر اقبال ظفر..... کارہ شرقی
بچایا تھا جسے کبھی سورج کی کرنوں سے ہم نے
اب دھوپ اوڑھے پھرتا ہے سارے شہر میں
✽ رعنا رضوی..... یو کے
دل کا کسی نگاہ سے ٹکرا کے ٹوٹا
تھا حادثہ ضرور مگر خوشگوار تھا
✽ ہادیہ ایمان، ماہا ایمان..... فورٹ عباس
بعد تو یہ کے بھی پیر کا نہیں جاتا مجھ سے
ہم لے بیٹے ہوئے ہیں نوٹے ہوئے پیانے کو
✽ علی ننگ..... خاندان
تھ سے دُش ہے کہیں تیرے تصور کا جہاں
تو میرے پاس بھی ہوتا تو میں تھا ہوتا

✽ لبنی وکیل..... کوئٹہ
دل بھی پاگل ہے کہ اس شخص سے وابستہ ہے
ہر نہ کسی اور کا ہونے دے نہ اپنا رکھے
✽ محمد شہباز اکرم نوٹی..... پاکپتن شریف
ابھی آنکھوں پہ کروں گا سورۃ توبہ کی تلاوت
دلشیں یہ تیرے خواب دیکھنے کی گناہگار ہوئی ہیں

✽ جاوید اختر رانا..... پاکپتن شریف
جانے دے اے تصور چائناں نہ کر تلاش
ایسا نہ ہو کہ وہ کہیں دکن کے گھر لے
✽ ریاض بٹ..... حسن ابدال
لڑکیاں سب شیش گلوں کی بیانی جانیں گی
جھونپڑیوں میں بین کرتی بیٹیاں دیکھے گا کون
✽ عظیم احمد..... جنمک شہی
جس عہد میں لٹ جائے فقیروں کی کماٹی
اس عہد کے سلطان سے کچھ بھول ہوئی ہے

✽ صبا سحر..... کراچی
فضا میں پھیل چلی میری بات کی خوشبو
ابھی تو میں نے ہواؤں سے کچھ کہا بھی نہیں
✽ زوہب احمد ملک..... گلستان جوہر کراچی
فٹ پاتھ کی دیوار سے چپکے ہوئے ہے
اک روز ہواؤں کو درختوں پر لے لے تھے
✽ عبدالجبار رومی انصاری..... لاہور

کوئی ملال کوئی آرزو نہیں کرتا
تمہارے بعد یہ دل منگتو نہیں کرتا
کوئی نہ کوئی بری چیز ٹوٹ جاتی ہے
تمہاری یاد سے جب بھی وضو نہیں کرتا
✽ محمد قدرت اللہ نیازی..... خاندان
بہت ممکن تھارک جاتے، پکارا ہی نہیں تم نے
تیرے کوچے سے تو ہم اتنی جگت سے نہیں نکلے
قدم چوکھٹ پر رکھتے یہ بازو پھیل جاتے ہیں
محبت سے نکل آئے ہیں تیری عادت سے نہیں نکلے
✽ وزیر محمد خان..... گل بزارہ
لبو میں رنگ کی صورت بسا ہے تیرا خیال
میں کس طرح تیری یادوں سے فاصلہ رکھوں

✽ انعم کمال..... حیدر آباد

چنے نہیں دیتا کبھی رونے نہیں دیتا
یہ دل تو کوئی کام بھی ہونے نہیں دیتا
✽ نوشہہ گلزار..... ملکہ

چاند بھی ڈوب گیا مجھ گئے تاروں کے دیے
اس کی یادوں کا چراغ ہم نے بجایا ہی نہیں
✽ شاہینہ مہتاب..... چنیوٹ

اتنی آنکھوں کا تھا آنکھوں میں ٹھہرنا مشکل
ہم نے اسی واسطے ہر اک سے چرائی آنکھیں
✽ عمران شیر والی..... لاہور

میں وہ جس ہوں یہاں پیار کی جو لے کسی کو کبھی کسی
مجھے خرچ کر دیا سوچ کر میں بہت ہی کم ہوں بچا ہوا
✽ اختر پروین..... بہار کالونی کراچی

پاؤں پھیلانے تو پھر دیکھی نہیں چادر ہم نے
تجھ کو چاہا تو پھر اوقات سے بڑھ کر چاہا
زیت آسان ہو بھی سکتی تھی لیکن ہم نے
تیری چاہت کو ہر اک بات سے بڑھ کر چاہا
✽ امتیاز احمد..... چالہ

تیرے اعتبار میں کیا نہیں مجھے طرح سے نواز دے
بری سب دعائیں قبول ہوں سب بے پکٹی دعاتی ہو
✽ نعیم احمد..... بہاولپور

اس قدر غرق تو رکھتے ہیں زمانے والے
زندگی چھین کر چھینے کی دعا دیتے ہیں
✽ عاصم خان آفریدی..... لاہور

دل کے گھوڑے سب بازار لیے پھرتا ہوں
کاش ان سے تیری تصویر بنادے کوئی
✽ محمد آذین رضوان..... کورنگی، کراچی

فاصلے ایسے بھی ہوں گے یہ کبھی سوچا نہ تھا
سانے بیٹھا تھا میرے اور وہ میرا نہ تھا
آج اس نے درد بھی اپنے پیٹھ کر لیے
آج میں رویا تو میرے ساتھ وہ رویا نہ تھا
✽ سائرہ نواب..... پشاور

مری ٹوٹی ہوئی کلی! مرے اترے ہوئے پھول!
تمہاری ہی مہک سے ذہن انسان تازہ دم ہوگا
کھلے گا پھول بن کر، لہلہائے گا چمن بن کر
تمہاری یاد میں اشکوں سے جو رخسار غم ہوگا

نامراد

سلیم انور

عہد حاضر کی یہ خاصیت سامنے آئی ہے کہ اپنے ساتھ پر بھی اعتبار کرتے ہوئے اب انسان کو ہزار بار سوچ لینا چاہیے... وہ بھی ایک دوست کے روپ میں تھی مگر سایہ بن کر ساتھ رہنے والی اس شخصیت کا وار بڑا کاری نکلا... اور جب اچانک حقیقت سے پردہ اٹھ جانے پر اپنے ہی مہربانوں سے ملاقات ہوئی تو اس پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے... اس کے باوجود اس نے اپنی دوستی نہ اپنے کا ہیچ کیا ہوا تھا۔

چٹکسا کر دوستی کی قدر کرنے والے دو بے وقوفوں کا اعلیٰ نظر

کی آ جاتی اور میرے دتی ہوئے کی رقم میں خاصا اضافہ ہو جاتا۔
چٹکسا نے ہماری جیولری سے لدا اپنا ہاتھ میرے بازو پر رکھ دیا اور پوچھا۔ ”کیا میں تمہیں گھر چھوڑنے کے لیے ساتھ چلوں؟“
میں نے معنوی منونیت سے اس کی طرف دیکھا۔
”حکیم یو۔ ہم دونوں کا یوں پہلے چلے جانا مناسب نہیں ہوگا۔“
حقیقت میں میرے منصوبے کا انحصار اس کے یہاں رکھے اور وہ تمام داد و تحسین سینے پر ہی تھا جو لوگ اس پر

رائٹرز ڈنر اس وقت اپنی پوری ترنگ میں تاجب میں چٹکسا کی جانب جھکی اور اسے بتایا کہ میری طبیعت خراب ہو رہی ہے اور مجھے جانا ہوگا۔
”اوہ امینڈا! کیا واقعی؟“ چٹکسا کی بھوری آنکھیں میرے چہرے پر جم گئیں۔ مایوسی کے بادل اس کے چہرے پر منڈلانے لگے۔
ایسا ہی ہے کہ بریکٹ مسٹری رائٹرز... میں جواب میں یہ کہتا چاہتی تھی لیکن میں نے نہیں کہا۔ اس لیے کہ میں نے اس کے لیے اس سے بہتر کی چیز کا منصوبہ بنایا ہوا تھا۔
ایسا منصوبہ جس سے اس کے دتی ہوئے... رقم میں قدرے

نادید ریاض... نواب شاہ
پہلے دیوار ہے اک اور بھی دیوار بلند
ایک دیوار کے پیچھے کئی دیواریں ہیں
یہ احاطوں میں احاطے، یہ ضلیں، یہ حصار
دقت کی بات ہے، سب وقت کی رفتاریں ہیں
طارق خان... اسلام آباد
کچھ تو ہوتے ہیں عبت میں جنوں کے آثار
اور کچھ لوگ بھی دیوانہ بنا دیتے ہیں
پلوش خان... ہری پور ہزارہ
بال بکرا کے ٹوٹی تربت پر جب کوئی ملا جین روتی ہے
تو مجھ کو اگر خیال آتا ہے کہ موت کتنی حسین ہوتی ہے
صباحید... ننڈوالہ بار
تم نے ہی تو کہا تھا میں کتنی پہ بوجھ ہوں
آنکھوں کو اب نہ ڈھانپ مجھے ڈھٹا بھی دیکھ
عاصم خان... کراچی
دیکھ فروع کے لیے میں ہم سے بات نہ کر
ہم تو پاگل ہیں خداؤں سے الجھ جاتے ہیں
جنید احمد ملک... گلستان جوہر کراچی
ایک مٹی کا دیا تو کو سنہالے کب تک
تیل بھی ختم ہے، طوقاں بھی اٹھ آیا ہے
مہتاب احمد... حیدرآباد
دوستو! رخت سحر باندھ کے لپکو کہ یہاں
جو پڑاؤ کے لیے رکستے ہیں، رک جاتے ہیں
میر شگفتہ... دہاڑی
بھلا کسی کا ستاروں پہ کیا اجارہ چلے
زمانے بھر کے لیے وقف ہیں یہ قدیلیں
اعتراز ظفر... اسلام آباد
چمن سے آئیں صدائیں، نوائیں کاٹوں سے
کہ زیت قمرہ خیم بھی اور سنگ بھی ہے

سلیم قادر... میانوالہ راجھا
صبح میں دیکھتا ہوں شام کے آثار ابھی
زیت ہے میرے لیے مستقل آزار ابھی
شاہد علی... فیصل آباد
گل گل کے ابھرتی ہے جب چراغ کی ٹو
میں سوچتا ہوں کہ ان لرزشوں میں تو تو نہیں
ثمینہ ثاقب... ملتان
سمجھ میں نہ آ سکا یہ ظلم لیل و نہار
کہ دن طلوع نہ ہو پائے اور شام آئے
عاصمہ سعید... سرگودھا
کیا بتائیں کیا گزری تھی جب ہم کو معلوم ہوا
جن کو حقیقت ہم نے سمجھا وہ تو سب افسانے تھے
عاطف علی... میرپور خاص
آغاز میں کرتی ہوں ستر دیکھ کے جس کو
وہ شام کا تارا مجھے بھٹکائے بہت ہے
وسیم خان... چنیوٹ
عجب لمحوں میں شام و سحر گزار آئی
اڑتوں کی کڑی دوپہر گزار آئی
سفر تھا دھوپ کا اور راستہ بھی شیشے کا
بدن تھا موم کا سو مختصر گزار آئی
اسامہ جنید... کراچی
من کی آگ میں جلتے ہیں اور انکا دل پہ چلتے ہیں
دشت بلا میں لوگ جو کوئی شہر بسائے آتے ہیں
اسلم احمد... سکھر
جاؤ جہاں بھی جانا جاو، دل پہ دستک مت دینا
لنکی جاہت کیوں مانگے دل جس میں بس رسوائی ہے
اسامہ فیصل... ٹوبہ ٹیک سنگھ
راہ و فاق میں ہم کو اک احساس تھا خاطر داری کا
تجھ کو بھی ہم بھول گئے اور خود کو بھی نہ یاد کیا

محفل شعروسیخ

کوین
برائے
شعراء
جولائی
2017

نچاؤ کرنے کے پابند تھے۔

”ویل..... آل رانٹ۔ تو پھر تم سے گھر پر ملاقات ہوگی۔“ اس نے مجھے رخصت کرتے ہوئے کہا۔

ہمارا وہ گھر جہاں ہم کرائے پر رہتے تھے، بارہ میل کے فاصلے پر تھا۔ چلتی کی تحریر کی غیر متصفانہ کامیابی میرے حواسوں پر چھائی ہوئی تھی۔ اب چونکہ وہ نوٹوں میں مکمل رہی تھی تو اس نے اپنے لیے شہر کے ایک حصول علاقے میں اپنا ذاتی مکان لینے کا ارادہ کر لیا تھا۔

اس کا مطلب تھا کہ مجھے بھی کرائے کا موجودہ مکان چھوڑنا پڑے گا لیکن مجھے اپنے لیے اس سے بھی چھوٹا مکان لینا پڑے گا۔ اپنی گھٹیا سی ملازمت اور تحریروں سے حاصل ہونے والی حقیر سی آمدنی سے میرے دیگر اخراجات مشکل ہی سے پورے ہو سکتے تھے۔

میں نے اپنی پرانی فورڈ بیک ڈرائیو دے میں چھوڑ دی اور اپنا کام شروع کر دیا۔

سب سے پہلے میں نے چلتی کے بیڑوم کی کھڑکی کی اسکرین چاک کر دی۔ پھر احتیاط کے ساتھ کپڑے میں لپٹی ہتھوڑی کی مدد سے کھڑکی کا شیشہ توڑ دیا۔ گو میں اتنی کامیاب میٹری رائیو نہیں تھی جتنی کہ چلتی تھی لیکن میں اتنا ضرور جانتی تھی کہ کسی قسم کی مداخلت کو کیسے یہ ظاہر کیا جاسکتا ہے کہ یہ کسی بیرونی فروغ سے سنا تمام دی ہے۔

پھر عقی دروازے سے گھر میں داخل ہونے کے بعد میں نے مکان میں موجود تمام درازیں نکال کر فرش پر گرادیں اور ان میں موجود تمام اشیائوں بکھیر دیں جیسے کوئی نشیات کا عادی بے تابی سے نقدی کی تلاش میں رہا ہو۔

پھر میں نے چلتی کی بیش قیمت جیولری کی ہر شے کپڑے کی اس پوتلی میں بھری جس کا منہ ڈوری منہج کر بند کیا جاتا ہے۔ ساتھ ہی اپنی معمولی سی جیولری بھی اسی پوتلی میں منتقل کر دی۔ پھر اپنی کار کی جانب چل پڑی۔

میرا ارادہ یہ تھا کہ یہ پوتلی میں اپنی کار کی ڈکی میں موجود اسپرےڈر کے نیچے خالی جگہ میں چھپا دوں گی اور پھر گھر میں واپس آنے کے بعد پولیس کو فون کر کے ”تقب زنی“ کی واردات کی رپورٹ درج کرادوں گی۔

میں نے جوں ہی گھر سے باہر قدم رکھا تو سڑک پر ہیڈ لائٹ کی روشنی دکھائی دی جو ہمارے ڈرائیوے کی جانب گھوم رہی تھی۔ میں فوراً ہی لپک کر واپس گھر میں چلی گئی۔ چلتی وقت سے پہلے واپس آ گئی تھی۔

اب میں کیا کروں؟

میں بچن کی جانب دوڑ پڑی۔ جیولری کی پوتلی مجھے اپنے ہاتھوں میں بے حد بھاری محسوس ہو رہی تھی۔ میں بچن سے گزر کر لیونگ روم میں آ گئی۔ وہاں میری نظر بے ساختہ ہتھر کے بنے ہوئے بڑے سے آتش دان پر پڑی اور میں اس کی جانب لپکی۔

میں نے ایک جھٹکے سے فائز اسکرین کو کھولا اور اعدہ جبک گئی۔ میں نے جیولری کی پوتلی گھڑی کے تازہ ٹھنوں اور آگ جھلانے کی پھینچوں کے نیچے ٹھونس دی۔

میں اسی لمحے مجھے عقی دروازہ کھلنے کی آواز سنا دی۔ میں آتش دان سے باہر نکلی لیکن اس جگہ میں میرا سر آتش دان کے اوپری کنارے سے اتنی زور سے ٹکرایا کہ میری آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا اور میں لڑکھڑاتے قدموں سے کمرے سے نکل کر ہال دے کے دروازے کے پاس فرش پر جمول کھاتے ہوئے گر پڑی۔

”ایمنڈ! منجلیس چیخ پڑی۔“
”چور.....“ میں بڑبڑائی۔ ”میری چاک آہ نے اسے چرکنا دیا۔ اس نے مجھ پر ضرب لگادی۔ میرا سر.....“
”تمہارے سر سے خون بہہ رہا ہے۔“ چلتی نے کہا۔ ”میںیں ساکت کئی رہو۔ میں نائن ون ون پر کال کرنے جا رہی ہوں۔“

☆☆☆

میں نے پولیس کو بیان دیتے ہوئے بھی اداکاری کی کہ جیسے میرے سر پر کسی ہتھیار سے ضرب لگائی گئی ہو۔ بیان کے بعد ایک ونڈم سائبر امیڈک میرے زخم کی مرہم پٹی کرنے لگا۔

جب میں لیونگ روم میں پہنچی تو چلتی وہاں موجود تھی۔ وہ مجھے بتانے لگی۔ ”سراخ رساؤں کا سربراہ سراخ رساؤں میکی ہال میں ہے اور فائنک ٹیم کے ساتھ چینگ کر رہا ہے۔“

اور وہ وہی کچھ دیکھ رہا ہو گا جس پانچ تھی کہ وہ دیکھ لے، میں نے سوچا۔ گو حالات میرے اس منصوبے کے مطابق نہیں رہے تھے جیسا کہ میں نے ارادہ کیا ہوا تھا لیکن پرفیکٹ مسٹری رائیو چلتی اور گول چرے والے اور وینٹ سراخ رساؤں میکی کے پاس ایسا کوئی ٹیوی نہیں تھا کہ وہ مجھ پر کسی قسم کا ٹک کر سکتے۔

میری داستان اور ثبوت جیسے کرٹونی ہوئی کھڑکی کا شیشہ، بکھری ہوئی درازیں اور خالی جیولری بکس..... یہ اتر ہٹ پر فائیک چیزیں ہیں جن میں کسی قسم کا کوئی جمول نہیں تھا۔

”یقیناً تم اس کے عقی دروازے سے فرار ہونے کے بعد ہی انہوں بعد پہنچی تھیں۔“ میں نے چلتی سے کہا۔ ”خدا کا کمر ہے کہ تم اس وقت اپنے بیڑوم میں نہیں تھیں جب وہ“
”میں جملہ مکمل نہ کر سکی کیونکہ میری نگاہ بے ساختہ آتش دان کی مکمل ہوئی اسکرین پر جا پڑی تھی۔ جب میرا سر آتش دان کے اوپری کنارے سے ٹکرایا تھا تو ٹکراتے ہی میرا دھیان اس جانب سے ہٹ گیا تھا اور مجھے آتش دان کی اسکرین کو بند کرنے کا موقع ہی نہیں مل سکا تھا۔“
”اگر چلتی یا کسی اور نے اس جانب غور سے دیکھ لیا تو پھر.....؟ میں گھبرانہ ہو گئی۔“

”ایمنڈ! کیا بات ہے؟“ چلتی نے اپنی توجہ اس جانب مرکوز کرتے ہوئے پوچھا۔ میری نگاہیں جم کر رہ گئی تھیں۔ میرے حلق سے بے ساختہ ایک چیخ نکل گئی۔ چلتی نے چونک کر استہمامہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

”آؤج! میرے سر میں درد کی ٹیسس اٹھ رہی ہیں۔“ میں نے چلتی کو بتایا۔ ”پلیز، کیا تم میرے لیے کچھ اسکرین لاسکی ہو؟“
”کیوں نہیں۔“ وہ یہ کہتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔ میں نے لپک کر آتش دان کی فائز اسکرین بند کر دی۔ جب چلتی پانی کا گلاس اور اسکرین کے کربلی تو سراخ رساؤں میکی اس کے ہمراہ تھا۔

جب میں نے اسکرین کی گولیاں پانی کے ساتھ نگل لیں تو سراخ رساؤں میکی گویا ہوا۔ ”اب تم کیسا محسوس کر رہی ہو، میڈم؟“

”میرا خیال ہے کہ میں ٹھیک ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔ ساتھ ہی اسے متاثر کرنے کے لیے ہلکے سے کپکپانے لگی۔

”اور، تمہیں تو سردی لگ رہی ہے!“ چلتی نے کہا۔ ”میں ٹھنڈک کم کرنے کے لیے آتش دان میں آگ جلا دیتی ہوں۔“ اس نے طاق پر سے ماچس کی ڈیبا اٹھائی اور آتش دان کی فائز اسکرین کھول دی۔

”نہیں!“ میں ایک دم بول پڑی۔ ”میرا مطلب ہے اس کی ضرورت نہیں، چلتی۔ مجھے سردی نہیں لگ رہی ہے۔ صرف درد ہو رہا ہے اور.....“

لیکن چلتی نے پھینچوں کو آگ دکھادی جیسے میری بات سنی ہی نہ ہو۔ باقی الفاظ میرے حلق میں گھٹ کر رہ گئے۔ میری نظر اس آتش دان میں بھرتے شعلوں پر جمی گئی۔

جیولری! میں اسی جیولری پر اٹھار کے ہوئے تھی کہ اسے فروخت کر کے ایک مقول رقم حاصل کرلوں گی لیکن اب.....! یہ سچ نہیں ہو رہا تھا۔ مجھے موقع نہیں مل سکتا تھا کہ اب میں کچھ کر سکوں۔

”کیا کوئی گڑبڑ ہے؟“ سراخ رساؤں میکی نے میری کیفیت بھانپتے ہوئے پوچھا۔
”گڑبڑ؟“ میں اس کی جانب گھوم گئی۔ ”یہ کس قسم کا سوال ہے؟ میں لوٹا گیا ہے۔ مجھ پر جسٹانی حملہ ہوا ہے!“
”میرے خیال سے انکی کوئی بات نہیں، میڈم!“

”کیا؟“ میں پھٹ پڑی۔
”تم نے ایک عہدہ کہاں سنا لیکن نہ ہی میں نے اور نہ ہی میں چلتی نے اس پر یقین کیا ہے۔“
”کیوں؟“ میں یہ کہتے ہوئے چلتی کی جانب گھوم گئی اور میں نے جودیکھا، وہ منظر مجھے پسند نہیں آیا۔

”تم نے ایسا کیوں کیا، ایمنڈ؟“ چلتی نے پوچھا۔ اس کی آنکھیں افسردہ تھیں۔ ”کیا یہ میری تحریر سے حسد کا نتیجہ تھا؟ کیا تمہیں رقم کے لیے جیولری کی ضرورت تھی؟“
یہ کہہ کر چلتی نے کاؤچ کے پیچھے ہاتھ بڑھایا اور جیولری سے بھری پوتلی نکال کر مجھے دکھاتے ہوئے بولی۔

”جب تمہارے سر کے زخم کی مرہم پٹی کی جارہی تھی تو اسی وقت میں نے یہ پوتلی آتش دان میں سے نکال لی تھی۔ میں نے فائز پلیس کی اسکرین مٹی ہوئی دیکھی تو مجھے قدرے عجب ہوا۔ اس لیے کہ وہ آج سہرے اس وقت تک بندھی جب ہم ڈنر کے لیے گھر سے نکلے تھے۔ پھر کھڑکی کے ٹوٹے ہوئے شیشے کے ذرا سے اس تجس کو مزید تقویت پہنچادی.....“

”ڈراما؟“ الفاظ میرے حلق میں انک سے گئے۔ چلتی نے اداسی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ”ٹوٹے ہوئے شیشے کی کوئی بھی کچی پیروں سے دہنے سے قالین کے اندر دھنسی ہوئی نہیں پائی گئی جس کا مطلب تھا کہ کوئی شخص کھڑکی کے راستے کمرے میں اندر نہیں آیا تھا۔ کیا یہ درست ہے سراخ رساؤں میکی؟“

میری بھرکھرا سر اسٹیم سلیم بھالایا۔ ”بے شک۔“
پھر میری جانب دیکھتے ہوئے اس نے اپنی ہتھکڑیاں نکال لیں۔ ”میڈم! ایسا لگ رہا ہے کہ اب تمہارے رات کے منصوبے میں قدرے تبدیلی رونما ہو رہی ہے۔ تمہیں ہمارے ساتھ پولیس اسٹیشن چلنا پڑے گا۔“

میں نے چپ چاپ ہاتھ آگے بڑھا دیے۔



وقت بادشاہ اور کائنات کی ہر شے اس کی رعایا ہے لیکن... اس کی نہ کوئی شکل اور

نہی وجود ہے۔ اس کے باوجود یہی وقت روپ بدل کر

سامنے آن کھڑا ہوتا ہے۔ جس کی گردش انسان کی زندگی

میں بہت اہم کردار ادا کرتی ہے۔ یہ ایک ہی پل میں

کسی کو بادشاہت سے نوازتا ہے اور کسی کو زمین

کی خاک چائے پر مجبور کر دیتا ہے۔ کبھی دن

اور رات میں ڈھل کر عمروں کا نام پاتا ہے اور

موسم کی طرح گزر جاتا ہے۔ کبھی مہربان

اور مخلص دوست بن جاتا ہے اور کبھی

سفاک دشمن کا کردار ادا کرتا ہے۔ کبھی

محبت بن کر ہونٹوں پر ہنسی بکھیرتا ہے اور

کبھی درد کی صورت آنسو بن کر دلوں میں

گھائو ڈال دیتا ہے۔ چونکہ یہ کسی کا غلام

نہیں اسی لیے کسی کی پروا بھی نہیں

کرتا لیکن... اتنا سنگدل ہے جو اس کی پروا

نہیں کرتا اسے ایسی مار مارتا ہے کہ پینے کو دو بوند

پانی تک نہیں ملتا اور اتنا ہی ایمان بھی ہے کہ جس پر

اپنی مرضی سے مہربان ہو جائے اس کے لڑکھڑائے قدموں

سے بھی قدم ملا کر عروج عطا کرتا ہے مگر شرارت سے پلٹ کر ان کی

طرف بھی دیکھتا ہے جنہیں وہ بیچ بھنور میں تنہا چھوڑ آتا ہے۔ وہ بھی ایک ایسے ہی

مہربان لمحہ کا اسیر تھا... جسے یہ تک خبر نہ تھی کہ وہ کون ہے اور کس خاندان سے

وابستہ ہے۔ جس کی اپنی کوئی شناخت نہ تھی اس کے باوجود اس کی داستان حیات

میں چاہنے والوں کی کمی نہ تھی۔ دو مختلف معاشروں اور تہذیبوں کا حسین

امتزاج... ایک ایسا سلسلہ جو برسوں یاد رہے گا۔

قسط نمبر: 3

وقت

حسام ہمدانی

موت کے کنوئیں میں بھی وقت جس کا ہم رکاب

تھا، ایک ایسے پُر عزم بازی گر کی بازی گری

..... سنسنی خیز واقعات پر مشتمل ایک

دار باطویل داستان



گاڑی کی ڈرائیجک سیٹ پر ایک دراز قامت دہلا پٹا قمیص براجمان تھا۔ اس نے فلیٹ ہیٹ لگا رکھا تھا۔ جس کے اعتبار سے وہ بڑوں کا لم و صیغہ ڈھانچا نظر آتا تھا۔ اس نے شیشہ گرا کر اپنی سرخ آنکھوں سے میری طرف دیکھا پھر سیاہ آنکھوں سے بولا۔
”سمر علی! گیٹ ان۔“

وہ مجھے گاڑی کے اندر بیٹھنے کی دعوت دے رہا تھا اور میری نگاہ اس کے سراپا کا جائزہ لے رہی تھی خاص طور پر اس کی خون بار آنکھیں، طوطے کی چوچ ایسی ناک اور حتیٰ خز تاثر والے ہونٹ میرے اندر کسی نامعلوم خوف کو جگا رہے تھے۔ اس کو دیکھ کر میرے ذہن میں فریڈی کی کروگر کا چہرہ ابھر آیا تھا۔ وہی فریڈی کی کروگر جو ”اے نائٹ میز آن ایلم اسٹرینٹ“ نامی فلم میں خون آشام اور دشت ناک حرکتیں کرتا دکھائی دیتا ہے۔ جو لوگ ہارڈ انکس موزیو دیکھنے کے شوقین ہیں انہوں نے یقیناً ”اے نائٹ میز آن ایلم اسٹرینٹ“ کی سیریز دیکھی ہوگی۔ اس بار انڈیا سپر نیچرل فلم میں ٹین ایجرز پہلے خواب میں خود کو ٹھٹھاتا دیکھتے ہیں پھر یہ واقعہ حقیقت میں فریڈی کی کروگر کے ہاتھوں بھی پیش آتا ہے۔

میں یک دم اس ڈرائیور کو گھور رہا تھا فریڈی کی کروگر سے گہری مشابہت رکھتا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ کوئی ڈرائیور نہیں بلکہ یہ نفس غلیظ فریڈی کی کروگر ہی ہو جو مجھے درغلا کر اپنے ساتھ کھینے لے جانے کا ارادہ رکھتا ہو۔ کسی ایسے ویران مقام پر جہاں وہ اپنے استخوانی بیٹوں کے خطرناک کھیلے باخسوں کی مدد سے مجھے اٹا لٹھ کر سکے۔ شاید یہ سانے دار“ تاریک اور پراسرار ماحول کا اثر تھا یا پھر ”ایلم اسٹرینٹ“ کے الفاظ کی فسون گری یا پھر ان دونوں کے باہمی ملاپ کی کرشمہ کاری کہ میں چند لمحات کے لیے کسی بحر میں گرفتار ہو کر ”اے نائٹ میز آن ایلم اسٹرینٹ“ کے ماحول میں کچھ گیا اور... انٹر پورٹ بلوار کے خواب ناک پس منظر میں وہ ڈرائیور مجھے فریڈی کی کروگر کی لگا تھا۔

میری یہ کیفیت عارضی بلکہ لمحاتی تھی۔ جلد ہی میں اس ٹرانس سے نکل آیا۔ اسی لمحے ڈرائیور کی آواز دوبارہ میری سماعت سے ٹکرائی۔ ”سمر علی! آئی ایم فرام ڈیلفینیا۔ گیٹ ان پلیز۔“

اس تسلی بخش تعارف کے بعد میں نے اس کی دعوت قبول کر لی۔ اگلے ہی لمحے میں سیاہ گاڑی کی عقبی نشست پر ”گیٹ ان“ ہو چکا تھا۔ اس مقام سے پوسٹن دلیم ہالی انٹر پورٹ کا فاصلہ بہ مشکل دس منٹ کا تھا۔ یہ مسافت کم دیش

ڈیڑھ کلومیٹر کی تھی اس مختصری مہر ای میں ڈرائیور نے تمام اہم باتیں میرے گوش گزار کر دیں۔

اس نے مجھے اپنا نام نہیں بتایا اور نہ ہی میں نے اس سے پوچھا۔ اس نے مجھے آگاہ کیا کہ پوسٹن سے ڈیلٹا جانے کے لیے میری سیٹ یوٹائیڈ انٹر لائن کی فلائٹ ہو اے۔ دن سون بانن میں یک ہو چکی ہے۔ اس نے مجھے میرا ”پنی این آر“ نمبر بھی یاد دلا دیا اور کہا کہ انٹر پورٹ کچھ کر حلقہ کاؤنٹر سے میں اپنا ٹکٹ حاصل کر سکتا ہوں۔ اس نے مجھے ہدایت کی کہ فلائٹ کی روانگی میں جتنا وقت باقی بچا ہے وہ انٹر پورٹ کے احاطے ہی میں گزارنا ہے اور ادھر ادھر کہیں جانے کی کوشش نہیں کرنا۔ اس بنی اسٹیج کے بعد اس نے تصدیق طلب انداز میں میری طرف دیکھا پھر بے تاثر آواز میں بولا۔

”یو گیٹ مائی پوائنٹس سمر علی؟“
”نہیں... آف کورس۔“ میں نے کہا پھر پوچھا۔
”کیا یہ تمام ہدایات میڈیم ڈیلفینیا کی طرف سے ہیں؟“
وہ رکھائی سے بولا۔ ”ایسا ہی سمجھ لو۔“

میں نے اس فریڈی کی کروگر کا نقشہ کے کھردرے پن کا برا نہیں بنایا اور اپنی اسپورٹ کار کی چابیاں اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”یہ رکھ لو۔“
”ان کی ضرورت نہیں۔“ وہ ہنسنی انداز میں بولا۔
کم بحث نے ایک لمحے کے لیے گاڑی کی چابیوں کی طرف دیکھنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی تھی۔ میں نے نہ سنا بہت آمیزش لہجہ میں کہا۔

”میری گاڑی“ ہالی انٹر پورٹ ان“ کی پارکنگ میں کھڑی ہے۔ اسے وہاں سے نکالنے کے لیے ان چابیوں کی ضرورت پیش آسکتی ہے۔“

”میں نے کہا نا... نہیں!“ وہ دونوں انداز میں بولا پھر میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اضافہ کیا۔ ”میرے انداز سے کے مطابق“ تمہاری سرخ اسپورٹ کار کو ہوں کی پارکنگ سے نکال لیا گیا ہے اور اس وقت وہ ایک محفوظ مقام کی جانب رواں دواں ہے۔“

اس کے دیکھنے کے انداز میں ایسی سردہری تھی کہ مجھے اپنے پورے وجود میں ایک خوف ناک غنڈہ کی اتڑتی محسوس ہوئی۔ بے ساختہ میرے ذہن میں یہ جملہ ابھرا۔ ”میڈیم ڈیلفینیا تو میڈیم ڈیلفینیا کا ڈرائیور سبحان اللہ!“
میں نے اس خواب پریشان یعنی نائٹ میز سے کسی قسم کی بحث نہ کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ اس نے انٹر پورٹ کچھ

وقت

کر گاڑی روکی تو میں چپ چاپ گاڑی سے اتر کر انٹر پورٹ کی عمارت کے اندر دوئی تھنے کی جانب بڑھ گیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ وہاں کچھ دیر کا تھا یا فوراً ہی رخصت ہو گیا تھا کیونکہ میں نے ایک لمحے کے لیے بھی پلٹ کر اس کی طرف نہیں دیکھا تھا۔

میری فلائٹ صبح سات میں کی تھی۔ گویا جہاز کی پرواز میں ابھی کافی وقت باقی تھا۔ میں نے سب سے پہلے متعلقہ کاؤنٹر پر جا کر اپنا ٹکٹ حاصل کیا پھر پیٹ ہو جا کے لیے انٹر پورٹ کے کینے ٹیریا میں ٹکس گیا۔ اس وقت مجھے شدید بھوک کا احساس ستا رہا تھا۔

گزشتہ رات میں گیارہ بجے سونے کے لیے لیٹا تھا اور پروگرام کے مطابق ”آج صبح سات بجے مجھے بیدار ہونا تھا لیکن مقررہ وقت سے پہلے یعنی رات دو بجے میری آنکھ کھل گئی تھی۔ یہ خلاف پروگرام بیداری کتنی تسنی خیز تھی، اس کی تفصیل آپ جان کچھ ہیں۔ میرے حالات میں جو یا موزا آیا تھا، اس نے مجھے ڈیلفینیا کی مدد لینے پر مجبور کر دیا تھا اور اس وقت میں جو کچھ کر رہا تھا، یہ ڈیلفینیا کی ہدایات کے مین مطابق تھا۔

میں نے ایک طویل جماعی لی اور ناشتے کا آرڈر دے دیا۔ دوران سفر میں یوٹائیڈ انٹر لائن والے اپنے مسافروں کی خوب خاطر تواضع کرتے ہیں اور میری فلائٹ تو مین ناشتے کے وقت پر تھی لیکن اصل اہمیت ”ضرورت“ کی تھی۔ مجھے طلب ابھی محسوس ہو رہی تھی۔ میں منٹے کے ناشتے کے لیے تین چار کھینے ہوگا نہیں بیٹھ سکتا تھا۔

کینے ٹیریا کا ماحول بہت پرسکون تھا۔ یہاں بیٹھ کر میں ناشتے کے ساتھ ساتھ اپنے تازہ ترین حالات پر بھی غور کر سکتا تھا۔ میں نے پہلی فرصت میں ڈیلفینیا کا سیل نمبر اپنے سیل فون میں محفوظ کر لیا۔ یہ وہی نمبر تھا جس پر تھوڑی دیر پہلے اس نے مجھ سے بات کی تھی۔ اس کے علاوہ ڈیلفینیا کا ایک اور نمبر بھی میرے سیل فون میں محفوظ تھا۔ وہ گیلو سٹیلن کا لینڈ لائن نمبر تھا۔ میں نے پہلے اسی نمبر پر کال کی تھی لیکن مجھے بتایا گیا کہ میڈیم ڈیلفینیا اس وقت گیلو سٹیلن میں نہیں بلکہ ڈیلٹا میں تھی۔

ڈیلفینیا کی ذات میرے لیے ایک معاین کر رہ گئی تھی۔ وہ قدم قدم پر مجھے حیران کر رہی تھی۔ جب وہ پہلی مرتبہ مجھے لیک ٹیکس کے ایک ہالی سے پر ملی تھی تو اس وقت میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ زندگی میں کبھی مجھے اس کی مدد کی ضرورت پیش آئے گی۔ ان لمحات میں ڈیلفینیا نے مجھے

جو کھلی پیش کش کی تھی ”آج میں اس پیش کش سے فائدہ اٹھانے پر مجبور ہو گیا تھا۔ وقت بہت ہی سفاک اور عالم ہے۔ جب یہ کسی پر پڑتا ہے تو لگتا جاتا ہے۔“

ڈیلفینیا تو پراسرار شخصیت کی مالک تھی ہی اس کے ساتھ کام کرنے والے بھی کچھ کم جوئے نہیں تھے۔ رات دو بجے جب میں نے ڈیلفینیا کی تلاش میں گیلو سٹیلن فون کیا تھا تو وہاں سان لوئی ریزورٹ میں اس کا آدمی ہشاش بشاش جاگ رہا تھا اور پھر یہ... استخوانی بیٹگر... فریڈی کی کروگر کا ہم شکل ڈرائیور بھی اپنی نوعیت کا ایک منفرد شاہکار تھا۔ اس کی ادا میں سپر نیچرل یعنی مافوق الفطرت تو نہیں تھیں تاہم انہیں معقول اور صحت مند بھی نہیں کہا جاسکتا تھا۔

میرا ذہن ڈیلفینیا کو کھینے سے فی الحال قاصر تھا۔ مستقبل قریب یا مستقبل بید میں میرے ساتھ کیا ہونے والا تھا، یہ صرف میرے مالک کو معلوم تھا۔ سروسٹ میں حالات کے تیز و تند دھارے میں بیٹھ کر مجبور تھا اور ڈیلفینیا کی طاقت مجھے ہر پہل ایک نئی حیرت سے روشناس کر رہی تھی۔ اس نے جس سرعت اور کمائنڈ کے ساتھ مجھے پوسٹن سے ڈیلٹا پہنچانے اور میری اسپورٹ کار کو محفوظ مقام پر منتقل کرنے کا بندوبست کیا تھا اس سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ بڑے اختیار والی ایک دھانسو قسم کی لیدی ہے۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ ڈیلٹا میں اس کے مزید جوہر مجھ پر کھلیں گے۔

ڈیلفینیا کے حوالے سے اشاروں نے جو تجربہ کیا تھا، وہ الفاظ اب تک میرے ذہن میں محفوظ تھے۔ ڈیلفینیا کے وزینگ کارڈ پر نگاہ ڈالنے کے بعد اشاروں نے کہا تھا۔ ”اس کے کانٹیکٹ نمبر میں ”ڈیلٹا“ کی تکرار ہے۔ ایٹ ڈیلٹا ڈیرو ڈیلٹا فور قاتیو ڈیلٹا ڈیرو ڈیرو... جس سے لگتا ہے یہ عورت ڈیلٹا کر اس قسم کی کوئی شے ہے۔“

ڈیلفینیا سنیکل کر اس عورت تھی یا ڈیلٹا، اس کا فیصلہ تو آنے والے وقت ہی نے کرنا تھا لیکن اس کے بارے میں سوچے ہوئے آپوں آپ میرا دھیان شادو کی طرف چلا گیا تھا۔ شادو جب سے میری زندگی میں آئی تھی، ہنگاموں نے میرا دروازہ دھجھکا دیا تھا۔ اسی کی خاطر میرا لیونا ڈو سے بھڑا ہو گیا تھا اور پھر مارا ماری کا یہ سلسلہ اتنا آگے بڑھ گیا کہ میرے ہاتھوں لیونا ڈو کا ایک خاص آدمی پیلو اپنی جان سے چلا گیا۔ میں اس کی زندگی کا چراغ گل کرنے کا ہرگز ارادہ نہیں رکھتا تھا لیکن اس کی زبان کا قتل کھلانے کے لیے مجھے سختی سے کام لینا پڑا تھا اور یہ ”سختی“ اس کے لیے جان لیوا ثابت ہوئی تھی۔ اس میں افسوس کا پہلو یہ تھا کہ میں پیلو کی

زبان کھلوانے میں کلی طور پر کامیاب نہیں ہوا تھا۔ میں صرف اتنا ہی جان پایا تھا کہ لیونارڈ اس روز کیو جا چلا گیا تھا جس دن شارو منظر عام سے غائب ہوئی تھی۔ مجھے شک نہیں بلکہ یقین تھا کہ شارو کی کم شدگی میں لیونارڈ کا ہاتھ تھا لیکن میرے ہاتھوں عظیم الشان درگت بخوانے کے باوجود بھی چپلو نے یہ نہیں بتایا تھا کہ لیونارڈ شارو کو بھی اپنے ساتھ کیا بے گیا ہے۔ وہ اسی بات پر ڈارٹا ہاتھ کہ وہ شارو کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ ہاں البتہ اس نے یہ انکشاف کیا تھا کہ کارلوس، شارو سے متعلق تمام معلومات رکھتا تھا۔ کارلوس کے لیے چپلو نے ”پاس“ کا لفظ استعمال کیا تھا۔ تازہ ترین اطلاعات کے مطابق اسی کارلوس نے ایک جیکسن کی پولیس پر دباؤ ڈال رکھا تھا کہ وہ سرخ اسپورٹ کار والے اس دروازے کو جلد از جلد گرفتار کرے جس نے چپلو کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا اور..... یہ دروازے قیامت فیض کوئی اور نہیں بلکہ میں تھا..... اسد علی!

جب میں چپلو سے ”منٹ“ کرا اپنے آپارٹمنٹ آیا تھا تو اس وقت میں نے یہی سوچا تھا کہ اگلے روز کارلوس تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کروں گا تاکہ اس کی زبان سے شارو کا پتہ چکاں اگوا سکوں لیکن پھر آئندہ صبح میری آنکھ کھلنے سے پہلے ہی حالات نے اتنی تیزی سے پلٹا کھایا تھا کہ میں کارلوس کو تلاش کرنے کے بجائے خود کو بچانے کے لیے ایک جیکسن سے یوسٹن پہنچ گیا تھا اور اب تھوڑی ہی دیر میں ڈیس کے لیے پرواز کرنے والا تھا۔

شارو کے لیے تو میں فکر مند تھا ہی علاوہ ازیں میں اگلے سلطان کی طرف سے بھی پریشان تھا۔ وہ میرے سر پرست اور سچے خیر خواہ تھے۔ یہ بات میں ان کے علم میں لاپکا تھا کہ چپلو میرے ہی ہاتھوں جنم واصل ہوا تھا تاہم ابھی تھوڑی دیر پہلے اس کیس کی جوڈیو پلپ منٹ دیکھنے میں آئی تھی وہ انتہائی خطرناک تھی۔ اب تک میں محفوظ پوزیشن میں تھا لیکن تشویش کی بات یہ تھی کہ ایک جیکسن پولیس کو میرے حوالے سے بہت اہم معلومات حاصل ہو چکی تھیں جن کے سہارے ”ایل بی لی ڈی“ مجھ تک پہنچنے کی کوشش کر سکتی تھی۔ میں نے ڈیٹلیٹا کے توسط سے اپنی عینی کا ندوبت... تو کر لیا تھا لیکن اگلے سلطان..... یہ خبر زیادہ دیر تک ان سے چھپنے والی نہیں تھی۔

میں نے یوسٹن میں لیٹ ٹائٹ اس نیوز کا فالو اپ دیکھا تھا تو یقیناً آج ہی خبر بے بسی میں اگلے سلطان تک بھی پہنچا تھی۔ میرے حوالے سے ایسے ہولناک انکشافات کے

بعد ان کے دل و دماغ پر کیا گزرتی، اس کا تصور کر کے ہی مجھے وحشت ہونے لگی تھی۔ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی تھی..... کچھ بھی ہو سکتا تھا..... کچھ بھی!

☆☆☆

یونائیٹڈ انٹرنیشنل کے ٹیارے ہوا ہے۔ دن سین تائن نے اتحاد منٹ فضا میں رہ کر تین سو تیس کلومیٹر کا فاصلہ طے کیا اور ٹھیک آٹھ بج کر اٹھارہ منٹ پر وہ ڈیس کو فیلڈ انٹرنیشنل پر لینڈ کر گیا۔ انٹرنیشنل کے ضروری معاملات سے نمٹنے کے بعد میں نے ایک ٹیکسی ہار کی اور اپنی منزل کی جانب روانہ ہو گیا۔

ڈیٹلیٹا نے گزشتہ رات مجھے جو ایڈریس ٹیکسٹ کیا تھا، اس تک پہنچنا چنداں مشکل نہیں تھا۔ ڈیٹلیٹا اور ایلیم اسٹریٹ ڈیٹلیٹا کی مشہور معروف جگہیں تھیں کیونکہ ان کے ساتھ ایک ایسے شخص کی یادیں وابستہ تھیں جو کسی زمانے میں اس دنیا کا سب سے طاقتور انسان سمجھا جاتا تھا یعنی امریکا کا پینتیس واں صدر جے ایف کینیڈی۔

یہ ٹھیک ہے کہ جب کا یہ واقعہ ہے اس وقت میں اس دنیا میں موجود نہیں تھا۔ بائیس نومبر اس سو تیس سو تیس پیدا ہوا تھا۔ بہت پہلے کا زمانہ ہے۔

ڈیٹلیٹا ملازما کی ایک اپنی تاریخ بھی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہودیوں کی فری مین تنظیم نے ڈیس میں اپنا ہیڈ کوارٹر اسی ملازما میں قائم کیا تھا۔ ملازما سے ملحق، پندرہ ایکڑ پر مشتمل ایک وسیع و عریض ”ڈیس سٹی پارک“ بھی ہے جہاں کی رونق اور چہل پہل دیکھنے سے نقلت رکتی ہے۔ انٹرنیشنل سے ڈیٹلیٹا ملازما ایک ترین کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنے کے دوران میں میں ہاشمی کے وندھلوں میں جھانکنے پر اور وقت گزرنے کا ذرا بھی احساس نہیں ہوا۔ ٹھیک دس بجے ٹیکسی نے مجھے ڈیٹلیٹا ملازما کے سامنے ایلیم اسٹریٹ پر ڈراپ کر دیا۔ یہ ڈیس کا معروف ترین ڈاؤن ٹاؤن کا علاقہ ہے جہاں پر تین اسٹریٹ آپس میں باہمی ملاپ کرتی ہیں یعنی ایلیم اسٹریٹ، مین اسٹریٹ اور کمرشل اسٹریٹ۔ ڈیٹلیٹا ملازما، ایلیم اسٹریٹ اور مین اسٹریٹ کے وسط میں استادہ ہے اور..... ڈیس سٹی پارک نے اسے اپنے گھرے میں لے رکھا ہے کسی مہربان ماں کے مانند.....!

میں ابھی ڈیٹلیٹا ملازما سے چند میٹر دور ہی تھا کہ اس بلڈنگ کی چھت پر ”ہرز رینٹ اے کار“ کا بورڈ نظر آ گیا۔ سرخ رنگ سے ”ہرز رینٹ“ بہت نمایاں لکھا گیا تھا اور پچھلے رنگ سے ”رینٹ اے کار“ کے الفاظ لکھے دکھائی دیتے

وقت

نوٹ انداز میں بولی۔

اس کے انداز نے مجھے بتا دیا تھا کہ اس سے مزید بات نہیں ہو سکتی۔ میں نے فون بند کیا اور میوزیم کی لائبریری کی جانب بڑھ گیا۔

لائبریری میں اس وقت صرف ایک ہی شخص موجود تھا۔ یہ ایک اتفاق تھا یا کوئی منصوبہ بندی؟ دوست میں اس بارے میں اظہار رائے نہیں کر سکتا تھا۔ سبز آنکھوں اور درمیانے قد والا وہ سوئیڈ ہونڈی شخص مجھ پر نگاہ پڑتے ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا پھر زرب لب سکر اتے ہوئے مستتر ہوا۔

”اسد علی؟“

”نہیں..... آئی ایم۔“

اس نے معاملے کے لیے ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”گڈ مارنگ مسٹر علی!“

”گڈ مارنگ!“ میں نے اس کا ہاتھ تھامے ہوئے جوابا کہا۔ ”کیا میں مسٹر ایکس سے شرف ملاقات حاصل کر رہا ہوں؟“

”شیور!“ اس نے گرم جوشی سے میرا ہاتھ دایا اور اضطرابی لہجے میں بولا۔ ”آپ میرے ساتھ آئیں۔“ میں چپ چاپ اس کے ساتھ ہوا۔

ایکس مجھے مختلف راہروں میں سے گزار کر میوزیم کے عقبی حصے میں لے آیا پھر ایک لفٹ کی طرف پیش قدمی کرتے ہوئے اس نے مجھ سے پوچھا۔

”آپ کا سٹریکار ہا؟“

”شان دار!“ میں نے مختصر جواب دیا۔

”کوئی دقت باہریشانی تو نہیں ہوئی یہاں تک پہنچنے میں؟“ میں نے نفی میں گردن ہلائی اور کہا۔ ”بالکل نہیں۔“

”دش گڈ۔“ یہ کہتے ہوئے وہ لفٹ کے اندر داخل ہو گیا۔ میں نے بھی اس کی تقلید کی۔

یہ وہ لفٹ نہیں تھی جس کے ذریعے میں نیچے سے سکھہ فلور پر پہنچا تھا۔ یہ بالکل ایک الگ تھلک لفٹ تھی جس سے ”پرائیویٹ اینڈ کانفیڈنشل“ کا تاثر ملتا تھا۔ اب تک ڈیٹلیٹا کی ذات کے حوالے سے مجھے جو تجربات ہوئے تھے، ان کے ہرزوایے سے اسرار اور تجسس جھلکتا تھا لہذا اب میں نے حیران ہونا چھوڑ دیا تھا۔

لفٹ بڑی تیز رفتاری سے نیچے کی جانب آئی اور ایک مقام پر آ کر ٹھہر گئی۔ لفٹ کے اندر مختلف فلورز کی نشان دہی کرنے والی ڈیجیٹل اسکرین مجھے کہیں نظر نہیں آئی تھی اور نہ ہی فلور نمبر والا ڈسٹل دکھائی دیا تھا۔ اس کا ایک ہی مطلب

تھے۔ ساتھ ہی شیورٹ بھی لکھا ہوا تھا۔ اسی پلیٹی کے اوپر ایک ڈیجیٹل ٹائم بھی نصب کیا گیا تھا جو دیکھنے والوں کو کافی فاصلے سے وقت بتا دیتا تھا۔ مذکورہ کلاک میں اس وقت بج کے دس بجے تھے۔ میں ٹیکسی سے نکل کر ڈیٹلیٹا ملازما کی جانب بڑھ گیا۔

ڈیٹلیٹا ملازما کے کل سات فلور ہیں اور میری منزل یعنی یہ میوزیم چھٹے فلور پر بنایا گیا ہے۔ اسی لیے اسے ”سکھہ فلور میوزیم“ کہا جاتا ہے۔ گہرے سمورے رنگ کی اس بلڈنگ کے داخلی دروازے پر سفید سنگ مرمر لگا ہوا ہے اور پیشانی پر ”ڈیس کاؤنٹی ایڈمنسٹریشن بلڈنگ“ کے الفاظ دکھائی دیتے ہیں۔ میں لفٹ کے ذریعے چھٹے فلور پر پہنچ گیا جہاں پر یہ میوزیم قائم ہے۔

ڈیٹلیٹا ملازما میں داغ ”دی سکھہ فلور میوزیم“ ہر کو دو پہر بارہ بجے سے شام چھ بجے تک کھلا رہتا تھا۔ بچے کے باقی دنوں میں صبح دس بجے سے شام چھ بجے تک یہاں پر داخلے کی اجازت تھی۔ داخلے گٹ جانوں کے لیے سولڈ ڈار کا تھا اس کے علاوہ چلڈرن اور سینئر سٹیزنز کو کم مالت میں ٹکٹ مل جاتا تھا۔

میں مشکل کی صبح ڈیٹلیٹا ملازما پہنچا تھا لہذا میوزیم مجھے کھلا ہوا ملا۔ میوزیم کے اندر داخل ہونے سے پہلے میں نے اپنا سیل فون نکال لیا۔ ڈیٹلیٹا نے مجھے جو ٹیکسٹ کیا تھا، اس کے اینڈ پر ایک فون نمبر بھی دیا گیا تھا۔ وہ لینڈ لائن کا نمبر تھا۔ میں نے اپنے سیل فون سے وہ نمبر پیچ کیا۔ دوسری ہی گھنٹی پر کال ریسیور گئی۔

”دس از سکھہ فلور میوزیم؟“ دوسری جانب بولنے والی نے شائستگی سے کہا۔ ”وہاٹ کین آئی ڈو فار یو؟“

”آئی ڈاؤنٹ نوی میڈم ڈیٹلیٹا۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔

”یونیورسٹیز؟“ پوچھا گیا۔

”اسد علی!“ میں نے جواب دیا۔ ”فرام یوسٹن۔“

”ہولڈ آن پلیز!“ دوسری طرف سے کہا گیا۔

مجھے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ چند سیکنڈ کے بعد دی سوائی آواز دو بارہ میری ساعت سے ٹکرائی۔

”مسٹر علی! آپ میوزیم کی لائبریری میں تشریف

لے جا رہے ہیں۔ مسٹر ایکس وہاں آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔“

”مگر میں تو ڈیٹلیٹا سے ملنے آیا ہوں..... میں نے

نیم احتیاجی انداز میں کہا۔

”مسٹر ایکس آپ کو میڈم تک پہنچا دیں گے۔“ وہ دو

تھا کہ مذکورہ لفٹ "مسکھہ طور میڈیم" سے کسی خاص طور تک آمد شد کے لیے ہی استعمال ہوتی تھی۔ اغلب امکان یہی تھا کہ لفٹ گراؤ بذکورہ پر رکی ہوگی۔

جب الیکس نے لفٹ کا دروازہ کھولا تو میرے ذہن کو ایک جھٹکا لگا۔ ہم اس وقت ڈیلی ملازا کے بیس منٹ میں تھے۔ بلڈنگ کے خانے کے ایک حصے میں چند گاڑیاں کھڑی دکھائی دیں، گویا یہ حصہ پارکنگ کے لیے مختص تھا..... اور وہ بھی خصوصی افراد کے لیے۔

الیکس ایک چینی گاڑی کی جانب بڑھتے ہوئے بولا۔
"آج ابھی مسز علی۔"

میں پوچھتے ہی تیار نہ رہ سکا۔ "کیا میڈم ڈیلی ملازا میں موجود نہیں ہیں؟"

"وہ اپنے بچکے پر ہیں۔" اس نے بتایا۔ "میں آپ کو وہیں لے کر جا رہا ہوں۔"

"اوہ....." میں نے ایک گہری سانس خارج کی۔
"مطلب ابھی ہمیں مزید آگے نہیں اور جانا ہوگا؟"

"زیادہ دور نہیں۔" وہ گاڑی کو پارکنگ میں سے نکال کر مین روڈ پر لاتے ہوئے بولا۔ "بیس نو سو کلومیٹر کا سفر ہے۔ ہم پریسٹن ہالو جا رہے ہیں۔"

میں نے "پریسٹن ہالو" کا نام سن رکھا تھا۔ یہ ڈیلیس کا سب سے پوش رہائشی علاقہ ہے۔ یہاں پر بہت بڑے سیاسی راہ نما، بزنس مین اور اسی مرتبے کے افراد رہائش اختیار کرتا اور ڈر کر سکتے ہیں۔ کیلی فورنیا میں جو مقام سن و پل اور بیوریلی ہلز کی رہائش کو حاصل ہے، بالکل ویسی ہی یا اس سے قدرے زیادہ اہمیت اور قدر قیمت ڈیلیس کے "پریسٹن ہالو" کی ہے۔ اگر ڈیلیٹیا پریسٹن ہالو میں قیام پذیر رہی تو پھر اس کے اثر و رسوخ کو شک کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاسکتا تھا۔ مجھے یقین ہو چلا تھا کہ وہ ان حالات میں ضرور میری مدد کرے گی۔ اس سوچ سے مجھے گہرا اطمینان محسوس ہوا تھا۔

ڈیلیس کا ڈینی ٹیکاس کے بالائی یعنی شمالی حصے میں واقع ہے اور ہم اس وقت ڈاؤن ٹاؤن ڈیلیس سے شمال کی سمت بڑھ رہے تھے۔ ڈاؤن ٹاؤن سے پونے دس کلومیٹر شمال میں "پریسٹن ہالو" کا پوش علاقہ ہے۔ ہماری گاڑی "پریسٹن ڈرائیو" پر تیرتے ہوئے اپنی منزل کی جانب رواں دواں تھی۔ پریسٹن ڈرائیو کی حیثیت شہرگ ایسی ہے اور یہ دو اہم سڑکوں "ناچر ویت پائی وے" اور "ایل بی جے فری وے" کے قلمب سے گزرتی ہے۔ ایل بی جے فری

وے کا نام ایک سابق امریکی صدر لنڈن بی جانسن سے منسوب ہے۔ پریسٹن ڈرائیو کو "گولڈن کوریڈور آف ڈیلیس" بھی کہا جاتا ہے۔

اچانک میرا سٹیل فون جاگ اٹھا۔ میں نے ڈیلیٹیا کا ڈیڈی تو وہاں اٹکل سلطان کا نام چک رہا تھا۔ ایک لمحے کے لیے میرے جی میں آئی کہ کال اینڈ کر لوں۔ اگلے لمحے میرے ذہن میں خیال ابھرا "ابھی نہیں۔ پہلے ڈیلیٹیا سے مل لو پھر جو بھی صورت حال ہوگی اس کے تناظر میں اٹکل سے بات کرنا چاہیے۔ میں نے اس خیال کو ترجیح دی اور اٹکل کی کال کو کٹ کر دیا۔

انہوں نے دوبارہ کال کی، میں نے ایک مرتبہ پھر کال کاٹ دی۔

میں اگر چاہتا تو اپنے سٹیل فون کو سائلنٹ بھی کر سکتا تھا لیکن اس طرح اٹکل میری طرف سے تشویش میں مبتلا ہو جاتے کہ میں ان کی کال اینڈ کیوں نہیں کر رہا۔ میں نے دو مرتبہ ان کی کال کٹ کر کے یہ تاثر دیا تھا کہ میں فی الحال فون سننے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ اس کا یہ بھی مطلب تھا کہ میں خود ہی ٹھوڈی دیر کے بعد ان سے رابطہ کروں گا۔

الیکس نے دوران سفر میں مجھ سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ وہ بہت ہی مستعد اور بردبار شخص تھا۔ پونے دس کلومیٹر کے سفر کے بعد ہم پریسٹن ہالو کے رہائشی حصے میں پہنچ گئے۔ الیکس نے ایک عالی شان بنگلے کے سامنے گاڑی روک دی۔ مذکورہ بنگلے کے گیٹ کی بھل میں دیوار پر "سارا ملز" کے نام کی تختی لگی ہوئی تھی۔ مجھے گاڑی میں بیٹھا چھوڑ کر وہ نیچے اتار اور بنگلے کا گیٹ کھولنے کے بعد دوبارہ گاڑی میں آگیا۔ اس کی اس سیلف سروس نے مجھے کافی متاثر کیا۔

گاڑی بنگلے کے پورج میں رکی اور ہم دونوں گاڑی سے باہر نکل آئے۔ الیکس مجھے مختلف راہ داریوں سے گھمانے کے بعد پڑتیش لیوگ روم میں لے آیا پھر ایک آرام دہ صوفے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔
"تشریف رکھیں!"

بنگلے کے اندر چھائے ستائے اور خاموشی سے یہی اندازہ ہوتا تھا کہ وہاں میرے اور الیکس کے سوا اور کوئی بندہ بشر موجود نہیں۔ شاید اس نے میری آنکھوں کو پڑھ لیا تھا، میرے کسی سوال سے پہلے ہی وہ بول اٹھا۔

"میں میڈم کو آپ کی آمد کی اطلاع کرنے جا رہا ہوں۔"

میں نے شخص سر کو انتہائی جنبش دینے پر استغاثا کیا۔

ایکس کی بات سے یہ تو ظاہر ہو گیا تھا کہ ڈیلفینیا اس بنگلے کے اندر موجود ہے۔ میں تنہی ہی نگاہ سے لیوٹک روم کی آرائش و زیبائش کا جائزہ لینے لگا۔

وہ ایک کنگ سائز لیوٹک روم تھا۔ میرے اندازے کے مطابق وہاں بیک وقت تیس چالیس افراد بیٹھ کر میٹنگ کر سکتے تھے۔ مہمانوں کے بیٹھنے کے لیے دیواروں سے تھوڑا فاصلہ رکھ کر آرام دہ میز قیمت صوفے لگائے گئے تھے۔ صوفوں کے چھ میں فرش پر ایک عالی شان قالین بچھا ہوا تھا اور اس قالین کے اوپر متعلیٰ گلاس ٹاپ چوٹی میز بھی رکھی ہوئی تھی۔ ایک دیوار پر بڑا سا "ایل ای ڈی" اسکرین نظر آرہا تھا۔ لیوٹک روم کی سینئر ٹیبل پر ایک لیپ ٹاپ بھی موجود تھا۔ اس کمرے کی تین سے صاحب خانہ کے اعلیٰ ذوق ہونے کا پتا چلتا تھا۔

مجھے زیادہ دیر تک ڈیلفینیا کا انتظار نہیں کرنا پڑا۔ میں لیوٹک روم کا جائزہ لینے میں مصروف ہی تھا کہ وہ وہاں پہنچ گئی۔ ڈیلفینیا نے جینز پر پی شرت پہن رکھی تھی تاہم اس سادہ سے لباس میں بھی اس کی شخصیت کا تاثر بول رہا تھا۔ ہسپانوی لوگ ویسے بھی بہت پُرکشش اور جاذبِ نظر ہوتے ہیں۔ ڈیلفینیا نے اپنی گھمیری زلفوں کو کھلا چھوڑ رکھا تھا۔

یہ ڈیلفینیا سے میری دوسری ملاقات تھی۔ پہلی ملاقات ایک جینس کے ایک ہائی دے پر ہوئی تھی۔ وہ ملاقات اتنی مختصر تھی کہ میں اس پر توجہ نہیں دے پایا تھا لیکن میں اس وقت اس ہسپانوی دو تیز کے گھر میں بیٹھا تھا لہذا اس کا رعب حسن مجھ پر اثر انداز ہو رہا تھا۔ اس پر نگاہ پڑتے ہی میں ایک بار کی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"ہیفو..... ہیفو.....!" وہ ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے مزہم آواز میں بولی۔

میں ہنسنے لگا۔ وہ ایک شان بے نیازی سے چلتے ہوئے میرے سامنے والے صوفے پر براجمان ہو گئی پھر میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مستغرق ہوئی۔

"مجھ تک پہنچنے میں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟" اس کے استفسار سے گہری اپنائیت چمکتی تھی۔ میں نے بھی دوستانہ انداز میں کہا۔ "میں اس وقت جن حالات سے گزر رہا ہوں، اس میں چھوٹی موٹی تکلیف کا احساس کہاں ہوتا ہے مگر ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی.....!" "کون سی بات؟" وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔

"جب ہماری ملاقات پریسٹن ہالو کے اس بنگلے میں ہوا تھی تو پھر مجھے ذیلی پلازا کیوں بلایا گیا؟" میں نے اپنی

الجھن کو بیان کرتے ہوئے کہا۔ "اس گھماؤ گھماؤ کی آغوش ضرورت کیسا کی؟"

"ضرورت تھی!" وہ دونوں انداز میں بولی۔ "مگر اگر چاہتی تو ایکس کو انر پورٹ بھیج کر جہیں ریسیورڈ اسٹیج تھی۔ وہ تمہیں انر پورٹ سے سیدھا یہاں لے آتا لیکن میں نے ایسا نہیں کیا....." وہ سانس ہوا کرنے کے لیے رکی اور لمحاتی توقف کے بعد دوبارہ گویا ہوئی۔

"میں نے جو کچھ کیا اس کا ایک خاص مقصد ہے۔ بعض اوقات حالات ایسے ہوتے ہیں کہ ہمیں کئی قسم کی احتیاطیں کرنا پڑتی ہیں۔ تم اس وقت جس چوٹیشن میں بیٹھے ہوئے ہو، اس کا تقاضا یہی تھا۔ اپنی ہاؤ..... تم فکر نہیں کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"ٹھیکس!" میں نے ممنونیت بھرے لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ "اب مجھے کیا کرنا ہے؟"

"اس بات کا فیصلہ تموزی دیر کے بعد کرتے ہیں کہ تمہیں کیا کرنا ہے اور مجھے کیا کرنا ہے۔"

وہ معنی خیز انداز میں بولی۔ "پہلے تم سچ کریں گے۔ باقی باتیں بعد میں ہوں گی۔"

"مجھے بھوک نہیں ہے۔" میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

"تم فریٹس ہو جاؤ۔" وہ لیوٹک روم سے ملحقہ واش روم کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ "سفر کی حکمتِ اترے گی تو تمہاری بھوک خود بہ خود چمک اٹھے گی۔ جب تک میں کھانا لگواتی ہوں۔"

اس نے ایسے دل آویز انداز میں مجھے "فریٹس" ہونے کے لیے کہا تھا کہ میں انکار نہ کر سکا۔ میں نے سیلفون کو سائلنٹ پریسٹ کیا اور واش روم میں گھس گیا۔

☆☆☆

کھانا بہت لذیذ اور پُرکلف تھا۔ میں نے خوب سیر ہو کر کھایا۔ ڈیلفینیا نے بالکل ٹھیک کہا تھا۔ فریٹس ہونے کے بعد میری بھوک بھوک اٹھی تھی اور میں نے ڈٹ کر پیٹ پوجا کی تھی۔ گچ سے فارغ ہونے کے بعد ہم دوبارہ لیوٹک روم میں آ بیٹھے اور ہمارے درمیان باقاعدہ گفتگو کا سلسلہ چل نکلا۔ "کیا تم اس بنگلے میں اکیلی رہتی ہو؟" میں نے سوال کیا۔

"ہاں..... فی الحال تو اکیلی ہی ہوں۔" اس نے گول مول جواب دیا۔

"جہاں تک میرا اندازہ ہے یہ بنگلا بھی تمہارا نہیں۔"

وقت

میں نے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ "میں نے باہر ساراٹر" کی ٹیم پلیٹ لگی دیکھی ہے۔"

"یہ بنگلا ساراٹر ہی کا ہے۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ "سارا میری بہت اچھی دوست ہے۔ وہ ڈیٹس ہاؤس کی میئر بھی رہ چکی ہے۔ آج کل وہ اپنی فیکلٹی کے ساتھ آسٹریلیا کی ہوئی ہے اور اس کا یہ بنگلا عارضی طور پر میرے تصرف میں ہے۔"

"تمہارا اپنا ٹھکانا کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔ "میرا مطلب ہے تم کہاں رہتی ہو.....؟"

"میں کہیں نہیں رہتی اور میں ہر جگہ رہتی ہوں۔" اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"میں سمجھا نہیں۔" میں نے الجھن زدہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ "یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی شخص کہیں بھی نہ رہتا ہو اور وہ ہر جگہ موجود بھی ہو۔ تو خدا کی مفت ہے۔"

وہ میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے الٹا مجھ سے پوچھنے لگی۔ "علی! کیا تم نے زمینی خدا کے بارے میں سنا ہے؟"

"ہاں سنا ہے۔" میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "لیکن یہاں زمینی خدا کا کیا تذکرہ؟"

"تم نے خود ہی خدا کا ذکر نکالا ہے تو میں نے پوچھ لیا۔" وہ سرسری انداز میں بولی۔ "اپنی ہاؤ..... ہمیں اپنے ٹاپک پر آ جانا چاہیے۔"

"اوکے....." میں نے سرکوشانیا جینش دی۔ "علی! تم اس وقت دو زادیوں سے پریشان ہو۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ "نمبر ایک تمہاری دوست شاردو خائب ہو چکی ہے۔ نمبر دو ایک جینس پولیس ڈیپارٹمنٹ کو تمہاری تلاش ہے۔ وہ پیلو کے قاتل کی حیثیت سے تمہیں کوج رہے ہیں۔ ایم آئی راسٹ؟"

"نہیں! پیلو لیوٹک راسٹ!" میں نے کہا۔ "اور ان دو زادیوں میں اہمیت کے لحاظ سے شاردو تمہاری ترجیح ہے۔" وہ بہ دستور میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ "میں غلط تو نہیں کہہ رہی؟"

"نہیں۔" تم میرے جذبات کی عکاسی کرتے ہوئے بالکل درست انداز میں سوچ رہی ہو۔" میں نے غمیرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "شارو کی بازیابی میرے نزدیک زیادہ اہمیت کی حامل ہے اور میں نے اسی سلسلے میں تم سے مدد مانگی ہے۔"

"تم نے مدد مانگی ہے تو میں ضرور تمہاری مدد کروں گی۔"

مگر اس سے پہلے چند باتیں ملے ہو جان ضروری ہے۔" وہ خصوص انداز میں بولی۔

"مشلا کون سی باتیں ملے پانا ضروری ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"وہ بھی بتا دوں گی۔" وہ سرسری انداز میں بولی۔ "تمہارے نزدیک کون سی بات زیادہ اہمیت کی حامل ہے، یہ تمہارا اپنی مسئلہ ہے مگر میں سمجھتی ہوں کہ تمہارے دونوں ایجنز ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں اور ان دونوں مسائل کو ایک ساتھ ہی حل ہونا چاہیے۔"

"ٹھیک ہے جیسے تم مناسب سمجھو۔" میں نے تائیدی انداز میں کہا۔

"گھٹکو کو آگے بڑھانے سے پہلے میں تمہیں کچھ دکھانا چاہتی ہوں۔" اس نے لیپ ٹاپ کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اس کے بعد ہی ہم سچ سمت میں معاملات طے کر سکیں گے۔"

میں خاموشی سے اس کی حرکات و سکنات کا مشاہدہ کرنے لگا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ وہ مجھ سے کس قسم کے "معاملات" طے کرنے کا ارادہ رکھتی تھی اور یہ سب جاننے کے لیے اس کا جائزہ لینا ضروری تھا۔ میں اس کی جانب متوجہ ہو گیا۔

اس نے لیپ ٹاپ کو اٹھا کر اپنی گود میں رکھ لیا پھر اس کے ساتھ مصروف ہوئی۔ مذکورہ لیپ ٹاپ کیبلو کے ذریعے دیوار گیر ایل ای ڈی سے کنکٹ تھا۔ اگلے ہی لمحے ایل ای ڈی روشن ہو گیا۔ ڈیلفینیا کی خردلی اٹھکلیاں کی بورڈ پر ہنر مندی کے جوہر دکھانے لگیں تو مجھے چونکا پڑا۔ ایل ای ڈی کی پر ایک مانوس چہرے کو دیکھ کر میرے ذہن کو جھٹکا سا لگا تھا۔

"یہی تمہاری دوست شاردو ہے نا؟" ڈیلفینیا نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

"بالکل! شاردو ہی ہے۔" میں نے بے ساختہ کہا۔

"مگر اس کی پک تمہارے پاس کیسے آئی اور..... شاردو اس وقت ہے کہاں؟"

شارو کی تصویر کو ڈیلفینیا کے لیپ ٹاپ میں دیکھ کر میں حیران رہ گیا تھا۔ اس کا اثر و سوج ایک اور کہانی بنا رہا تھا۔

اس نے میرے سوال کے جواب میں کہا۔

"میرے اپنے ذرائع ہیں جن کو استعمال کر کے میں اپنے کام کو آسان بناتی ہوں۔ میرے ساتھ کچھ وقت گزارو گے تو رفتہ رفتہ تمہیں میری طاقت کا اندازہ ہو جائے گا۔"

میں نے اس کی بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا تو وہ سلسلہ

کلام کو جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ”البتہ میں تمہارے سوال کا جواب ضرور دوں گی۔ تمہاری دوست شارد اس وقت (Casa Blanca) کا سا بلانا کاٹ رہی ہے۔“

”کا سا بلانا.....“ میں ایسے اچھا جیسے میں نے بجلی کے نیچے تار کو چھو لیا ہو۔ ”یہ تو مراکش کا ایک شہر ہے۔ کیا شارد کو مراکش کے ساحلی شہر کا سا بلانا پتہ چلا گیا ہے؟“

”نہیں۔“ وہ پوری قطعیت سے بولی۔ ”یہ مراکش والا کا سا بلانا نہیں ہے۔“

”پھر کون سا سا بلانا ہے؟“ میں نے تیز لہجے میں پوچھا۔

”یہ کا سا بلانا کیریبین کی میں واقع جزیرہ نما ملک کیوبا کا ایک شہر ہے۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔

”کا سا بلانا کیپٹل ہوائی کے ساتھ لگا ہوا ہے اور تمہاری دوست فی الحال کا سا بلانا کے نزدیک ایک علاقے ماریانو میں ہے۔“

پھر اس نے مجھے بتایا کہ کیوبا میں چونٹھ فی صد آبادی کو روڈ کی اور دس فی صد سیاہ فام کی ہے جبکہ باقی چھبیس فی صد افراد مولیو کہلاتے ہیں۔ گورے اور کالے والدین کے ملاپ سے پیدا ہونے والی مخلوط نسل مولیو کہلاتی ہے۔ سیاہ فام اور مولیو میں سے اکثر کا تعلق افریقہ خصوصاً مراکش سے ہے لہذا ایک کا سا بلانا کیوبا کے اندر بھی آباد ہے۔

مجھے کا سا بلانا سے زیادہ دلچسپی شارد سے تھی لہذا میں نے اسی سے متعلق سوال کیا۔ ”تم یہ کیوں کہہ رہی ہو کہ شارد فی الحال ماریانو یعنی کا سا بلانا میں ہے۔ کیا اسے وہاں سے بھی کہیں اور شفٹ کیا جانے والا ہے؟“

”تم بالکل درست خطوط پر سوچ رہے ہو۔“ وہ اثبات میں کروں ہلاتے ہوئے بولی۔ ”میری اطلاعات کے مطابق چند روز میں شارد کو کا سا بلانا سے ناسو منتقل کر دیا جائے گا۔“

”ناسو! میں چونک اٹھا۔“ یہ تو بہا ماز کا کیپٹل ہے۔

کیوبا اور بہا ماز بہت قریب واقع ہیں۔

”دی بہا ماز نامی ملک بحرا و قیاقوس میں میانہ ای اور کیوبا کے درمیان گہرا دریا بہت کمرشل میں واقع ہے۔“ اس نے کہا۔ ”اس کے تین شہر بہت زیادہ اہمیت کے حامل ہیں جن میں فری پورٹ، لوکا یا اور ناسو شامل ہیں۔ یہ دیکھو.....“

پھر وہ ایل ای ڈی پر مجھے دنیا کے نقشے کا وہ حصہ دکھانے لگی جہاں کیریبین کی اور بحرا و قیاقوس کے سنگم پر کیوبا، بہا ماز اور غورینڈ کا شہر میانہ واقع تھا۔

میں نے پوچھا۔ ”مجھے اس بات سے کوئی دلچسپی نہیں

کہ تمہاری اطلاعات کے ذرائع کیا ہیں کیونکہ میرے پاس ان باتوں کو چیک کرنے کا کوئی پتہ نہیں ہے۔ میں تمہاری کہنی اور پٹائی بات پر یقین کرنے کے لیے مجبور ہوں۔ کیا میں جان سکتا ہوں کہ میری دوست کو بے سنی سے اٹھا کر کا سا بلانا تک کس نے پہنچایا ہے؟“

”تم اس شخص کو اچھی طرح جانتے ہو۔“ وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔

”تمہارا اشارہ لیو نارڈو کی طرف تو نہیں؟“

”بالکل ضحیک سمجھ۔“

”کیا لیو نارڈو اس وقت بھی شارد کے پاس کا سا بلانا

ہی میں ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں۔ وہ اسے وہاں پہنچا کر واپس آ گیا تھا۔“

ڈیلفینا نے بتایا۔ ”لیکن اس کی واپسی سے پہلے تم نے اس

کے ساتھ چیلو کو کھانے لگا دیا ہے۔“

”اوہ.....“ میں نے ایک گہری سانس خارج کی۔

”اس کا مطلب ہے اب ایل بے پی ڈی کے علاوہ کارلوس

اور لیو نارڈو بھی مجھے تلاش کر رہے ہوں گے.....؟“

”کر رہے ہوں گے نہیں..... بلکہ کر رہے تھے۔“ وہ

ہونٹوں پر مسیخہ خیر مسکراہٹ سمجھاتے ہوئے بولی۔ ”لیک

جیکس پولیس ڈیپارٹمنٹ کی کارروائی نے کارلوس اور

لیو نارڈو کے بڑے بڑے جذبات پر متون برف ڈال دی

ہے..... ان کا دھیان تمہاری طرف سے ہٹ چکا ہے۔“

”کیا مطلب؟“ میرے ذہن کو ایک جھٹکا لگا۔

”میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا..... تم کہنا کیا چاہ رہی ہو؟“

اس نے میرے سنسناتے ہوئے سوال کا جواب

دینے سے پہلے اپنی رست واپج پر نظر ڈالی پھر غصے

ہوئے لہجے میں بولی۔ ”چند منٹ مبر کرلو پھر سب کچھ

تمہارے سامنے آ جائے گا۔“

”تم نے بات ہی ایسی کی ہے کہ میرا دماغ بل کر رہ

گیا ہے۔“ میں نے اضطرابی لہجے میں کہا۔ ”مبر کرنا

میرے اختیار میں نہیں رہا۔“

”جو چیز اختیار میں نہیں، پہلے اسے قابو میں کرنے کی

کوشش کرو۔“ وہ بدستور مسیخہ خیر لہجے میں بولی۔ ”تا کہ تم

اپنے دشمن کے سامنے کرور نہ پڑ سکو۔“ یہ کام تمہارے لیے

مشکل ثابت نہیں ہونا چاہیے کیونکہ تم سائیکالوجی کے

اسٹوڈنٹ ہو، انسانی سوچ کے مختلف زاویوں اور رویوں

سے جنہیں عمل آکا ہی ہوگی۔“

”یہ بات تمہیں کس نے بتائی کہ میں سائیکالوجی کا

وقت

ا نوڈنٹ ہوں؟“ میں نے حیرت میں ڈوبے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

”میں تمہارے بارے میں کیا، کیا جانتی ہوں اور

ایا، کیا نہیں جانتی، اس پر بعد میں سلی سے غور و فکر کرتے

رہتا۔“ وہ لپ ٹاپ کے کی بورڈ سے کھینچتے ہوئے بولی۔

”پہلے یہ ویڈیو کلپ دیکھ لو۔ یقیناً تمہیں پسند آئے گا۔“

ادھر ڈیلفینا کی بات ختم ہوئی، ادھر ایل ای ڈی

اکرین پر چرچ چکن ریسٹورنٹ کے مگن کا منظر ابھر آیا۔

اس وقت چکن میں صرف میں اور چیلو تھے اور ہمارے

درمیان زبردست مارا ماری کا سلسلہ جاری تھا۔ یہ چونکہ

میری خود بخود تھی لہذا اس پھڑکے کا ایک ایک سین میری

یادداشت میں نقش تھا۔ ہمارے درمیان ہونے والے اس

خون ریز صحنے کے کسی نے بڑی مہارت سے ریکارڈ کیا تھا۔

یہ ایک بے آواز ویڈیو کلپ تھا جو میرے اور چیلو کے بیچ

ہونے والی لڑائی کی عکاسی کرتا تھا۔ اس ہنگامہ خیز واقعے کا

ایڈیٹر ہولناک تھا۔ چیلو مجھ سے بری طرح پٹنے کے بعد

نڈھال ہو کر فرش پر گر گیا تھا۔ اس کے چہرے کے مختلف

حصوں سے خون نکل رہا تھا اور فرش پر پڑا ہوا اس کا جسم بے

حس و حرکت دکھائی دیتا تھا۔ چیلو کوفٹ پر پڑے دیکھ کر کبھی

اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اب اس دنیا میں باقی نہیں رہا۔

ڈیلفینا نے مجھ سے پوچھا۔ ”علی! یہ ویڈیو کلپ پسند آیا؟“

”اس میں پسند اور ناپسند کا کیا سوال۔“ میں نے

سرسری لہجے میں کہا۔ ”اس رات چرچ چکن ریسٹورنٹ میں

میرے اور چیلو کے بیچ جو دنگ فساد ہوا تھا، یہ اس کی

ریکارڈنگ ہے۔ کیا یہ ریسٹورنٹ کے سی سی ٹی وی کیمرے کا

کمال ہے؟“

”نہیں!“ وہ اٹل لہجے میں بولی۔ ”اگر ایک جیکسن

کے چرچ چکن ریسٹورنٹ کے مگن میں کوئی سی سی ٹی وی

کیمرہ نصب ہوتا تو پھر یہ ریکارڈنگ یقیناً ایل بے پی ڈی

کے ہتھے چڑھتی اور اس صورت میں تمہارا پتہ ناممکن تھا۔ اس

ویڈیو کلپ میں صاف نظر آ رہا ہے کہ چیلو کی موت تمہارے

ہاتھوں ہوئی ہے..... کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟“

”تم غلط نہیں کہہ رہیں۔“ میں نے تائیدی انداز میں

گردن ہلائی۔ ”لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ پولیس میری

تلاش میں ہے ورنہ میں ایک جیکسن سے پولس اور پھر پولس

سے ڈپس کیسے پہنچتا!“

”تم ایک اہم بات کو نظر انداز کر رہے ہو علی!“ وہ

رست واپج پر نگاہ ڈالتے ہوئے بولی۔ ”ایل بے پی ڈی کی

پلیٹفرم رو کی ویڈیو سے پرانی دھمکی تھی۔ دونوں ہسپانوی تھے

ہر تک جانا چاہیے تاکہ پتا چلے وہ ہے کیا چیز اور وہ کون ہے جس کے اشاروں پر یہ ناچ رہی ہے۔ بے پناہ تجسس نے اس حوالے سے میرے دل و دماغ کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جما کر مضبوط لہجے میں پوچھا۔

”ڈیلینا! تم مجھ سے کس قسم کا تعاون چاہتی ہو؟“
”یہ تعاون قسط دار ہوگا۔“ وہ سنجیدگی سے بولی۔
”قسط دار؟“ میں نے اس کے الفاظ دہرائے۔

”کیا یہ کوئی ڈراما سیریل ہے یا..... کوئی سوپ؟“
”نہیں..... ایسی کوئی بات نہیں۔“ وہ قطعی لہجے میں بولی۔ ”یہ چند سطروں پر مبنی ایک مٹی ایکٹ ہوگا۔“

”اوکے.....“ میں نے اپنی رضا مندی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ”پہلی قسط کا آغاز کیا جائے میڈم ڈیلینا۔ میں آپ سے تعاون کے لیے تیار ہوں۔“

”تمہیں پہلے مرٹے میں بہتر گنتوں تک میرے ساتھ رہنا ہوگا۔“ اس نے کہا۔
”بہتر گنتے.....“ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ”یعنی پورے تین دن اور تین راتیں؟“

”غالب ہے۔“ وہ ایک شان بے نیازی سے بولی۔
”ایک دن اور رات کو پورا ہونے میں چوبیس گنتے ہی گلتے ہیں۔ اس حساب سے بہتر گنتے کے تین دن اور تین راتیں ہی نہیں گے۔“

”ڈن!“ بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔
ڈیلینا کی پر اسرار اور دلچسپ باتوں نے مجھے حیرت زدہ سا کر دیا تھا اور میں اس طمسائی و گشتائی کہانی کے انجام تک پہنچنے کے لیے بے چین ہو رہا تھا۔

”گنڈ!“ اس نے سراپے والی نظر سے مجھے دیکھا۔
”اور ان بہتر گنتوں کے دوران میں تم کسی سے رابطہ نہیں کرو گے۔ جہاں ایل فون آف رہے گا۔“

”یہ کڑی شرط ہے۔“ میں نے نکرور سے لہجے میں کہا۔
”اگر یہ مشکل لگ رہا ہے تو تم اپنا فیصلہ بدل سکتے ہو۔“ وہ عام سے لہجے میں بولی۔ ”میری طرف سے تم پر کوئی دباؤ نہیں ہے۔“

میں نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور کہا۔ ”منظور ہے لیکن میں سیل فون آف کرنے سے پہلے ایک کال کرنا چاہوں گا۔“

اس نے چونک کر میری جانب دیکھا۔ ”کسے فون کرنا چاہتے ہو؟“

”ماتے گردن نہیں جھکائے گی تو اس کا سر قلم کر دیا جائے۔“ ہم دن رات جو کچھ دیکھتے ہیں اس میں نہیں تر حقیقت ہوتی اور جو حقیقت ہے وہ آسانی سے آشکار نہیں ہوتی۔ اس تک مکمل رسائی کے لیے بڑی قربانیاں دینا پڑتی ہیں سبزی!“

”کیا میں اس طاقت کے بارے میں سوال کر سکتا ہوں جس نے چلو مرڈر کیس میں سے مجھے نکالنے کے لیے پولیس کو پینڈل کیا ہے؟“ میں نے سرسراہٹ ہوئی آواز میں پوچھا۔

”غالب ہے وہی طاقت جسے تم نے مدد کے لیے پکارا تھا۔“ وہ سرسری انداز میں بولی۔

”تم..... میں نے تو تم سے مدد مانگی تھی۔“ میں نے حیرت میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”کیا یہ سب کچھ تمہارا کیا دھرا ہے..... مطلب یہ سب تمہارا کمال ہے؟“

”نہیں.....“ وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ”میرے اوپر بھی کوئی بیضا ہے۔“

”اوہ.....“ میں نے دلچسپی بھری نظر سے اسے دیکھا اور پوچھا۔ ”کیا میں اس طاقت کے بارے میں جان سکتا ہوں جس کے اشاروں پر تم ناچتی ہو؟“

”تمہیں اس عظیم طاقت سے روشناس کرانے کے لیے ہی یہاں بلایا گیا ہے۔“ وہ غصہ سے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”ورنہ تمہارا یہ معمولی سا کام تو تمہارے یوشن میں رہتے ہوئے بھی چکی بجائے میں کیا جاسکتا تھا۔“

ڈیلینا اس راہ کی تہوں سے مٹی ہوئی تھی۔ ہر بار اپنی ایک پرت اتار کر نئے انداز میں میرے سامنے آجاتی تھی اور مجھے حیران کر دیتی تھی۔ میں نے اضطرابی لہجے میں اس سے دریافت کیا۔

”آخروہ ہے کون جس سے تحارف کرانے کے لیے مجھے یہاں لایا گیا ہے؟“

”سب پتا چل جائے گا اگر تم نے مجھ سے تعاون کیا تو۔“ وہ معنی خیز انداز میں بولی۔ ”اور عدم تعاون کی صورت میں خالی ہاتھ خالی دامن اور خالی ذہن یہاں سے جاؤ گے۔ پھر زندگی بھر تک تمہارے ذہن کو دست پر رہے گی اور پچھتاوا تمہاری روح کو ہلکان کر تارے گا۔ کیا کرنا ہے اب یہ فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔!“

ڈیلینا کی انکشاف انگیز باتوں نے میرے دماغ میں ایک طرف طوفان سا برپا کر دیا تھا۔ میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ مجھے اس مجسم اسرار ہسپانوی دو شیڑہ کی آخری

”سفید جھوٹ..... بہت خوب!“ وہ قہقہہ لگا۔
”معلیٰ! جب کوئی سفید فام جھوٹ بولے گا تو وہ سفید جھوٹ اور جب کوئی سیاہ فام جھوٹ بولے گا تو وہ سیاہ جھوٹ ہی کہلائے گا لیکن سفید جھوٹ تو ہسپانوی ہے۔ اس کا جھوٹ کس کھاتے میں ڈالیں؟.....“

”تمہائی توقف کر کے اس نے گہری نظر سے مجھے دیکھا پھر سنجیدگی سے بولی۔
”میں تمہاری اس بات سے مکمل اتفاق کرتی ہوں کہ کوئی نادیدہ طاقت اہل بے پی ڈی کو اپنی اگلیوں پر چارہ پی رہی ہے اور اس کائنات کی سب سے بڑی حقیقت یہی ہے کہ بڑی طاقت چھوٹی طاقت کو چھپاتی ہے۔ گویا بڑی طاقت کوئی مداری ہے اور چھوٹی طاقت اس کے اشاروں پر ناچنے والا بندر۔“

”تم بات کو قلفے کے پنکڑے میں بٹھا کر کھماؤ نہیں۔“ میں نے ابھرنے زدہ انداز میں کہا۔ ”میرا ذہن یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ اہل بے پی ڈی کس طرح کسی طاقت کے ماتحت کام کھاتے ہیں؟“

”کیا تم کسی علاقے کے پولیس ڈیپارٹمنٹ کو اس کائنات کی سب سے بڑی طاقت سمجھتے ہو؟“

”نہیں!“ میں نے دو ٹوک انداز میں کہا۔ ”لیکن پولیس ڈیپارٹمنٹ کی اپنی ایک رہ جو ہے۔ وہ قانون کے دائرے کے اندر رہ کر کام کرتی ہے۔ عوام اس ڈیپارٹمنٹ پر اندھا اعتماد کرتے ہیں۔ پولیس نے اپنی جانوں کو خطروں میں ڈال کر عوام کا اعتماد حاصل کیا ہے۔ وہ اپنی ساکھ کا سواستیاناس مارنے کے لیے اس قسم کا ٹوپی ڈراما کیوں رچا پئے گی؟“

”بات ٹوپی ڈراما چانے کی نہیں ہے۔“ وہ سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولی۔

”پھر کیا بات ہے ڈیلینا؟“ میں نے کہا۔ ”پلیز ایکسپلین اٹ۔“

”اوکے!“ وہ سر کو اثباتی جنبش دینے کے بعد وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ”تم نے میری بات پر غور نہیں کیا۔ میں نے کہا تھا اس کائنات میں بڑی طاقت چھوٹی طاقت کو اپنے اشاروں پر چھپاتی ہے اور یہ آفاقی اصول ہے۔ تم نے پولیس ڈیپارٹمنٹ کے جن قوانین اور قواعد و ضوابط کا ذکر کیا، وہ سب انسان کے بنائے ہوئے ہیں اور جب آفاقی اصول اور انسان کے بنائے ہوئے اصول آٹنے سامنے آن کھڑے ہوں تو پھر جیت آفاقی ہی کی ہوتی ہے اور انسان کو اس کی بات ماننا پڑتی ہے۔ اگر چھوٹی طاقت بڑی طاقت

اور ایک ہی دنیا سے تعلق رکھتے تھے یعنی جرائم کی دنیا..... پچھلے دنوں چیلو نے کسی معاملے میں سفید رو کو کالی نقصان پہنچایا تھا اور وہ چیلو کو تلاش کرتا پھر رہا تھا۔ تو وہ کے روز وہ سفید رو کو پتلا بنی ڈرامیو پر نظر آگیا۔ اس نے چیلو کا تعاقب کیا اور وہ دونوں آگے پیچھے چرچ چکر رہے ٹورنٹ کے کچن میں پہنچ گئے جہاں ان کے سچ خونی معرکہ ہوا جس میں چیلو جان کی بازی ہار گیا تھا۔ سفید رو نے اپنے بیان میں پولیس کو بتایا تھا کہ چیلو کی موت کے بعد اسے جانے دو دے فرار ہونا تھا تاہم اس نے وہی لاؤنچ ٹائٹ کلب کی پارکنگ سے ایک سرخ کار چرائی اور وہاں سے غائب ہو گیا۔ پولیس نے سفید رو کی نشان دہی پر وہ سرخ اسپورٹ منڈائے کار بھی برآمد کر لی تھی۔ پولیس کی تحقیق کے مطابق مذکورہ گاڑی اسد علی نامی کسی شخص کی ملکیت تھی۔ اسد علی براز اسپورٹ کالج کا اسٹوڈنٹ تھا اور ”دی گیت وے“ اپارٹمنٹس میں رہتا تھا۔ اسد علی ان دنوں میرپانے کے لیے یوشن گیا ہوا تھا۔

اس نتیجے کے ساتھ ہی سفید رو کی گرفتاری کے فوج بھی دکھائے گئے تھے اور اس کا وہ ابتدائی بیان بھی نشر کیا گیا تھا جو گرفتاری کے موقع پر اس نے پولیس کو دیا تھا۔ اس نتیجے کی رو سے مجھے یقین چٹل گئی تھی۔ میں نے سمجھ چھڑوں کی گہرائی سے ایک اطمینان بخش سانس لی اور سوالیہ نظر سے ڈیلینا کو دیکھنے لگا۔

وہ بھی لب ٹاپ کو چھوڑ کر میری طرف متوجہ ہو گئی۔
اس نے میری آنکھوں سے جھلکتے سوال کو پڑھ لیا تھا لیکن جواب دینے کے بجائے وہ معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ مجھ سے مستغفر ہوئی۔

”یہ نیز نتیجے تو تمہیں یقیناً پسند آیا ہوگا..... ہوں؟“
”بہت زیادہ پسند آیا ہے۔“ میں نے کہا۔

”سمارک ہو..... تم چلو مرڈر کیس سے صاف بچ نکلے۔“ وہ بدستور معنی خیز لہجے میں بولی۔ ”اہل بے پی ڈی نے تو کمال کر دکھایا۔“

”اس میں لیک جیکسن پولیس ڈیپارٹمنٹ کا کوئی کمال نہیں۔“ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”حقیقت وہی ہے جو تھوڑی دیر پہلے تم نے مجھے وید یو کلب میں دکھائی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کوئی نادیدہ طاقت اہل بے پی ڈی کو اپنی اگلیوں پر چارہ پی رہی ہے اور..... یہ سفید رو کی زندگی اور اس کا اقبالی بیان سب فیک ہے..... ایک دم جھوٹ سفید جھوٹ!“

مسئلہ تو حل ہو گیا۔ چلو مرڈر کیس سے تمہارا نام خارج ہو چکا ہے۔ تم جب جاہوداہس جا کر ایک ٹارنل انسان کی طرح زندگی گزار سکتے ہو۔ تمہاری اسپورٹ کار پولیس کی تحویل میں ہے۔ تم جب ایک جیکسن جاگے تو ان سے وصول کر لینا۔

”ایک مسئلہ یقیناً منٹ چکا ہے مگر دوسرا مسئلہ ابھی باقی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”جو کہ پہلے مسئلے سے زیادہ اہم اور سنگین ہے۔“

”وہ بھی منٹ جائے گا، فکر نہ کرو۔“ وہ بے پروائی سے بولی۔ ”اور ہاں یہ سل فون اپنے بیگ ہی میں رکھو۔ میرے نزدیک زبان کی بہت اہمیت ہے۔ تم نے کہہ دیا ہے کہ تین دن تک کسی سے رابطہ نہیں کرو گے تو میں نے تمہاری بات پر یقین کر لیا ہے۔“

”میں زبان کا مدنی ہوں۔“ میں نے سینہ بھلاتے ہوئے کہا۔

”مجھے معلوم ہے۔“ وہ قائلانہ انداز میں مسکرائی۔ ”میرا ایک ایک سینڈ بہت قیمتی ہے۔ میں تم پر خواہ مخواہ وقت صرف نہیں کر رہی۔ کچھ سوچ کر ہی تمہارا انتخاب کیا گیا ہے۔“ ایک مرتبہ پھر ڈیٹیفائی نے مجھے گہری سوچ میں ڈال دیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ میں سائیکالوجی کا اسٹوڈنٹ ہوں۔ اسے پتا تھا کہ میں زبان کا مدنی اور معاملات کا کھڑا تھا۔ اس نے کسی خاص مقصد کی خاطر میرا انتخاب کیا تھا اور تین دن مجھے اپنے پاس رکھ کر اپنا قیمتی وقت مجھ پر صرف کرنا چاہتی تھی۔ میں اس کے اثر و سحر اور طاقت کے مظاہرے کو اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا۔ وہ میرے حوالے سے اچھا خاصا ہوم ورک کیے بیٹھی تھی مگر سوال یہ پیدا ہوتا تھا..... کیوں؟

اس کیوں کا جواب ڈیٹیفائی دے سکتی تھی اور میں نے جب بھی جواب لینے کی کوشش کی تھی تو اس نے گفتگو کا انٹیرنگ کسی اور سمت گھمادیا تھا۔ اس باریکی کچھ ایسا ہی ہوا۔ ”کیا میں اپنے منتخب کیے جانے کی وجوہات معلوم کر سکتا ہوں؟“ میں نے پوچھا۔

”تمہیں بہت جلد بتا دیا جائے گا..... سب کچھ تمہارے سامنے آشکار ہو جائے گا۔“ وہ گردن کو بڑی ادا کے ساتھ حرکت دیتے ہوئے بولی۔ ”فی الحال ہم اس سے بھی زیادہ ضروری باتیں کریں گے۔“

”اوکے.....!“ میں نے صہلکت آہیز انداز میں کہا۔ ”آج ٹھیک گیارہ بجے تم اس جگہ میں داخل ہوئے تھے۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ ”آج دس جون اور انگل

اس کے بعد ہمارے بیچ ٹیلی فونک رابطہ موقوف رہا۔ میں نے اپنے سل فون کو آف کیا اور ڈیٹیفائی کی جانب اشارت ہوئے کہا۔

”میں نے انگل سلطان سے بات کر لی ہے۔ اب انگل کے لیے تم اسے اپنے پاس رکھ لو۔“

”وہ کیوں؟“ وہ حیرت سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”میں اس کا کیا کروں گی؟“

”تم نے مجھے تین دن تک کسی کو بھی فون کرنے سے باز رکھا ہے۔“ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”اسل فون تمہارے پاس رہے گا تو تمہیں اس بات کی اطلاع ملے گی کہ میں نے کسی سے رابطہ نہیں کیا۔“

”افسوس منطقی ہے۔“ وہ زیر لب مسکراتے ہوئے بولی۔ ”کیا دنیا میں رابطہ کرنے کا ذریعہ تمہارے لیے صرف ایک سل فون ہی ہے؟“

اس کی مسکراہٹ میں بڑی دل کشی اور تازگی تھی۔ اس نے ایک جھکے انداز میں مجھ سے سوال کیا تھا، میں نے بھی اس سوال میں جواب دیا۔

”نہیں! ایسی بات نہیں۔ رابطہ کرنے کے ہزاروں ذرائع موجود ہیں لیکن میں نے تین دن تمہاری صحبت میں گزارا نہیں اس لیے کہہ رہا تھا.....!“

میرے آخری جملے کی معنی آفرینی سے معذور ہوتے ہوئے اس نے مصنوعی لہجے میں سوال کیا۔ ”میری صحبت میں وقت گزارنے کا کسی سے رابطہ کرنے یا نہ کرنے سے کیا تعلق؟“

”بہت گہرا تعلق ہے!“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں سمجھی نہیں؟“ وہ پلکیں جھپکاتے ہوئے بولی۔ ”دیری سہل! میں نے یہ دستور چھیڑ چھا ڈالا۔“

انداز میں کہا۔ ”تم اتنی دل کش اور دل فریب ہو کہ تمہاری قربت میں وقت گزرنے کا احساس نہیں ہوتا کسی اور سے رابطہ کرنے کا خیال کس کا فز کو آئے گا!“

”رنگی!“ وہ بے چینی سے مجھے تنگے لگی۔ ”آف کورس۔“ میں نے غصے انداز میں کہا۔

”تمہاری شخصیت میں ایک جادو سا ہے۔ تم اپنی باتوں سے اپنے والے پر سحر چھوڑتی ہو۔ انسان کے ہوش ٹھکانے پر نہیں رہتے۔ تم بڑی زبردست ہو.....“

میرے ان تحریکی کلمات پر جرجز ہونے یا کسمانے لے جائے اس نے بنیاد لہجے میں کیا۔ ”علی! تمہارا ایک

ہوئے ہوا در کیا کرتے پھر رہے ہو؟“

”میں اپنے ایک دوست کے پاس ٹھہرا ہوا ہوں۔“

”انگل۔“ میں نے بتایا۔ ”وہ بہت ہی پاکمال شخص ہے۔ اس کی کوشش سے میں چلو مرڈر کیس سے آزاد ہوا ہوں۔ اس نے دعویٰ کیا ہے کہ بہت جلد وہ شارد کو بھی باز یا کر دے گا۔“

”شارد کا کچھ پتا تو چلے کہ وہ کہاں۔ اس کے ہاں ہی باز یا کی کے بارے میں سوچا جا سکتا ہے۔“ انگل نے قدرے مایوسی سے کہا۔

”میرے دوست نے شارد کو ڈھونڈ نکالا ہے۔“

”انگل۔“ میں نے انہیں خوش خبری سنائی۔ ”کہاں ہے وہ؟“ وہ بے تابی سے بولے۔

”کیو بائیں۔“ میں نے بتایا۔

”کیو با..... وہ وہاں کیسے پہنچ گئی؟“

”لیونارڈو اسے انوار کے وہاں لے گیا تھا۔“ میں نے بتایا۔ ”میرے دوست نے یقین دلایا ہے کہ وہ بہت جلد شارد کو واپس لے آئے گا۔“

”تمہارا یہ دوست میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔“ وہ ابھمن زدہ لہجے میں بولے۔ ”کسی نئی مصیبت میں نہیں پھنسنے جانا۔ تم میرے لیے بہت اہم ہو گئی۔“

”میں جانتا ہوں انگل۔“ میں نے جلدی سے کہا۔ ”آپ فکر نہ کریں۔ میں آپ کے لیے کوئی مشکل کمزری نہیں کروں گا۔“

”جیتے رہو۔“ وہ دعائیہ انداز میں بولے پھر پوچھا۔ ”واپسی کب تک ہے؟“

”میں تین چار دن میں واپس آ جاؤں گا۔“ میں نے جواب دیا۔ ”اگر میرا فون آف لے لو آپ پریشان نہیں ہوں۔“

”وہ تو ٹھیک ہے مگر تمہارا فون آف کیوں لے گا؟“

اسی لمحے ڈیٹیفائی لیونگ روم میں داخل ہوئی۔ میں نے بات ختم کرنے والے انداز میں کہا۔

”انگل! کوئی خاص بات نہیں ہے۔ بس احتیاطاً کہہ رہا ہوں۔ بہت سی باتیں فون پر نہیں ہو سکتیں۔ میں واپس آ کر آپ کو تفصیل سے آگاہ کروں گا۔ اوکے.....!“

”اوکے!“ دوسری طرف سے انگل نے کہا۔ ”اٹا خیال رکھنا میرے بچے۔“

”شیو را!“ میں نے کہا۔

”اللہ تمہاری حفاظت کرے۔“

”آمین.....!“

”اپنے انگل کو۔“ میں نے بتایا۔ ”جب میں ڈیلی ملاز سے ریٹائر ہوا تو ان کی کال آئی تھی لیکن میں نے دوسرے لائن کال نہ دی تھی۔ وہ یقیناً میرے لیے خنث پریشان ہوں گے۔“

”شیو را..... تم انہیں کال کر سکتے ہو۔“ وہ اٹھ کر کمرے سے ہوتے ہوئے بولی۔ ”میں تھوڑی دیر بعد آتی ہوں۔ ویسے مجھے امید ہے کہ تمہاری ذات کے حوالے سے ان کی پریشانی دور ہو چکی ہوگی..... اس نیوز لیٹن کو دیکھنے کے بعد۔“

”اوہ..... تم ٹھیک کہتی ہو۔“ میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا اور سل فون کی جانب ہاتھ بڑھا دیا۔

ڈیٹیفائی نے تین قدموں کے ساتھ لیونگ روم سے نکل گئی۔

میں نے پریسلٹن ہالو پہنچ کر اپنے سل فون کو سائلٹ موڈ پر سیٹ کر کے بیگ میں ڈال لیا تھا۔ اب جو نکال کر دیکھا تو وہاں درجن بھر کالیں لگی ہوئی تھیں جن میں زیادہ تر انگل سلطان کی تھیں۔ ایک کال جیک خواجہ کی بھی تھی۔ میں آج کل خبروں کی زینت بنا ہوا تھا۔ لیکن ہے ڈو الفکار خواجہ نے ٹی وی اسکرین پر مجھے یعنی میری خبر کو ٹی وی اسکرین پر دکھایا ہوا۔ اپنی ہاؤس میں ہر طرف سے دھیان ہٹا کر انگل سلطان کو فون کیا۔

پہلی ٹھنی پر انہوں نے کال ریسیو کر لی اور بے چینی سے بولے۔ ”بچے! تم خیریت سے تو ہو۔ میں نے کتنی بار تمہیں فون کیا مگر تم نے کال تک نہیں کی۔ تمہارے بارے میں ٹی وی عجیب و غریب کہانیاں سن رہا ہے۔ اس میں کتنی حقیقت اور کتنا فساد ہے؟“

پھر انہوں نے مجھے گل والے نیوز قالو پ اور آج والے بیکنج کے بارے میں بتایا اور اپنی بات کے ختام پر کہا۔

”میرے بچے! میں تمہارے لیے بہت پریشان ہوں۔“

”انگل! آپ کو میرے لیے فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔“ میں نے نسلی آمیز انداز میں کہا۔ ”میں اس وقت ڈیس میں ہوں اور یہ خیر و عافیت ہوں مگر آپ سب کو بھی بتائیں گے کہ میں سیر و تفریح کے لیے پوسٹن گیا ہوا ہوں۔“

”وہ تو ٹھیک ہے، میں سب کو بھی بتاؤں گا کیونکہ تھوڑی دیر پہلے نیوز میں بھی تمہارے بارے میں یہی بتایا گیا ہے۔“ وہ بدستور ابھمن زدہ لہجے میں بولے۔

”لیکن کچھ پتا تو چلے کہ تم ڈیس میں کس کے پاس ٹھہرے

کا دن ہے۔ تیرہ جون جسے کے دن گیارہ بجے بہتر گھنٹے کی مہلت پوری ہو جائے گی۔ اس کے بعد تم کہیں بھی جاسکتے ہو۔ ہمارے بیچ میں یہی طے پایا ہے؟“

”بالکل یہی طے پایا ہے۔“ میں نے اثبات میں جواب دیا۔ ”لیکن ابھی تک تم نے مجھے یہ نہیں بتایا کہ ان بہتر گھنٹوں میں تم میرے ساتھ کیا کرنے والی ہو؟“

”یہ جانتا تمہارے لیے ضروری نہیں ہے۔“ وہ سمجھ گیا۔ ”اطمینان رکھو کہ میری صحبت میں تمہاری جان کو کسی قسم کا کوئی خطرہ نہیں۔“

”اس بات کا تو مجھے صدیقین ہے جسے تو میں نے ڈن کیا ہے۔“ میں نے اس پر اپنے احماد کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ”تم مجھے بچانے والی ہو، مارنے والی نہیں۔ میں تمہیں اپنی جگہ دوست، جتنی خیر خواہ سمجھتا ہوں اور تم پر مکمل بھروسہ کرتا ہوں۔“

”میں تمہارے بھروسے کو کبھی پس نہیں گئے دوں گی۔“ وہ مضبوط لہجے میں بولی۔ ”اور یہ بھی درست ہے کہ میں تمہاری خیر خواہ ہوں لیکن دوسری بات پر میرا یقین نہیں ہے۔“

”دوسری بات؟“ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ”مطلب..... کچھ دوست؟“

”ہاں۔“ اس نے سر کو اٹھاتی جنبش دی۔ ”میرے نزدیک دوستی اور محبت نام کی کوئی شے اس دنیا میں نہیں ہوتی۔“

”پھر کیا ہوتا ہے؟“

”ضرورت!“ وہ اٹھ لیجے میں بولی۔ ”سب سے زیادہ اہم چیز انسان کی ضرورت ہے۔ انسان اپنی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے ہی محبت بھی کرتا ہے اور دوستی بھی۔“

”تم کائنات کے دو عظیم انسانی جذبول کی نفی کر رہی ہو۔“ میں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ”یعنی دوستی اور محبت۔“

”میں اپنا تجربہ بیان کر رہی ہوں۔“ وہ سادگی سے بولی۔ ”ضروری نہیں کہ تم میری بات سے اتفاق بھی کرو۔ ہو سکتا ہے تمہارا تجربہ مجھ سے مختلف ہو..... باقی دی وے تم نے اس کائنات کا کتنا حصہ دیکھ رکھا ہے جو یہ بات کر رہے ہو؟“

”میں تو آج ہی پیدا ہوا ہوں۔“ میں نے قدرے بیزار سی کہا۔ ”ابھی تو اس کائنات میں میں نے صرف ڈیڑھ گھنٹہ ہی دیکھا ہے.....!“

”گڈ شائ!“ وہ میرے جملے سے محظوظ ہوتے

ہوئے بولی۔ ”ڈیڑھ گھنٹہ کو دیکھ لیا۔ بس یہی کافی ہے۔ باقی سب کچھ ڈیڑھ گھنٹہ میں خود دکھا دے گی۔“

”فوری طور پر تو میں شاد کو دیکھنا چاہتا ہوں۔“ میں نے شکایتی انداز میں کہا۔ ”تم نے اس کے قصے کو بالکل گول ہی کر دیا ہے۔“

”شاد کو قصہ اگر گول ہو گیا ہے تو شام میں اسے لہا کر دیں گے..... ڈونٹ وری۔“ وہ قحطی آمیز انداز میں بولی۔ ”تم ہماری ضرورت ہو لہذا تمہاری ضرورت پوری کرنا میرا فرض بنتا ہے۔ چاہے یہ ضرورت شاد کو کا حصول ہی کیوں نہ ہو۔“

”تو شاد پر بات شام میں ہو گی؟“ میں نے تصدیق طلب انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

”شاید۔“ وہ حتمی لہجے میں بولی۔ ”اب تم ادھر موقوفوں پر ہی اپنی پہلی کھانسی خیر لے لو۔ میں بعد میں تمہارے لیے بیڈروم کا بندہ دست کر دوں گی۔“

”مجھے نیند نہیں آ رہی۔“ میں نے کہا۔

”اٹھیں بندہ کر کے لیٹو نیند آ جائے گی۔“ وہ بڑے وقوف سے بولی۔

”میں کبھی کیسے مطمئن؟“ میں نے پوچھا۔

”اٹھ کر دیکھ لو۔“ وہ چیخ کرنے والے انداز میں بولی۔ ”میں بھی آرام کرنے جا رہی ہوں۔ آفترون میں ہم آؤنگ کے لیے جا رہے ہیں اور کپ شپ بھی کریں گے..... اوکے!“

”اوکے.....“ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ لیوینگ روم سے نکلی تو میں ایک کنگ سائز آرام دہ صوفے پر دراز ہو گیا پھر میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ کسی بھی وقت سونا میرے لیے کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ میں اپنے ذہن کو ہدایات دے کر اپنی مرضی سے سوار جاگ سکتا تھا۔ اس حوالے سے میری ابھی خاصی پریکٹس تھی لیکن جتنی بات یہ ہے کہ اس وقت مجھے نیند نہیں آ رہی تھی اور ظاہر ہے میں سونے کی خواہش بھی نہیں رکھتا تھا۔ یہ سب کچھ میں ڈیڑھ گھنٹہ کی فرمائش پر کر رہا تھا۔

میں نے آنکھیں بند کر کے اس پر اسرار دھیزہ کے بارے میں سوچنا شروع کیا تو اس کا دلکش ہسٹوئری سراپا میرے تصور میں روشن ہو گیا۔ بس مجھے اتنا یاد ہے کہ وہ مجھے دیکھ کر بڑے دل آویز انداز میں مسکرا رہی تھی۔

اس کے بعد مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔ کچھ پتا نہیں چلا کہ کب میری آنکھ لگ گئی تھی۔ میں ڈیڑھ گھنٹہ سے نظریں چار

مورت آتی دکھائی دی۔ ڈیلفینیا نے اس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔
 ”مٹی! اسے جانتے ہو؟“
 مذکورہ مورت کا چہرہ مجھے شاسا سا لگا۔ میں نے کہا۔
 ”میں نے اسے کہیں دیکھا تو ہے۔ کہاں..... یہ یاد نہیں آ رہا۔“
 ”اگر تم اس سے کبھی ملے نہیں تو پھر تم نے اسے یا توٹی دی اسکرین پر دیکھا ہوگا یا پھر کسی سوکر گراؤنڈ میں۔“ اس نے بتایا۔ ”یہ اس وقت کی سب سے زیادہ معاوضہ لینے والی دین سوکر پلیر ہے۔“
 فٹ بال کے کھیل کو امریکا میں سوکر کہا جاتا ہے۔ میں نے کہا۔
 ”میں نے اسے شاید ٹی وی اسکرین پر دیکھا ہو۔ نام کیا ہے اس کا؟“
 ”مارٹا سلوا دیرا۔“ اس نے بتایا۔ ”اس کا معاوضہ چار سو ہزار ڈالر ہے۔“
 ”یعنی چار لاکھ ڈالر.....!“
 ”بالکل ڈھونڈ لیا۔“ اور مارٹا اس وقت دنیا میں سب سے زیادہ معاوضہ لینے والی سوکر کی کھلاڑی ہے۔ اس کا تعلق برازیل سے ہے۔ یہ اپنی ٹیم میں فارورڈ پوزیشن پر کھیلتی ہے۔“
 ”بہت خوب!“ میں نے سانس لی انداز میں کہا۔
 اس دوران میں مارٹا ہمارے قریب پہنچ چکی تھی۔ اس نے ڈیلفینیا کی طرف دیکھتے ہوئے بے تکلفی سے ہاتھ ہلایا اور بولی۔
 ”ہیلو ڈیلفینی! کیسی ہو؟“
 ”ایک دم فٹ۔“ ڈیلفینیا نے جواب دیا پھر میری جانب اشارہ کرتے ہوئے تعارف کرانے والے انداز میں کہا۔ ”اس سے ملو۔ یہ میرا دوست ہے اسد مٹی۔“
 ”ویری گڈ!“ مارٹا دیرا نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا پھر میری طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے دوستانہ انداز میں بولی۔ ”ہیلو ونڈم..... کیسے ہو؟“
 میں نے اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو گرم جوش سے قلم لیا پھر کہا۔ ”ٹانک کا کرم ہے۔ آپ کی ڈیلفینی نے میرا بہت خیال رکھا ہوا ہے۔“
 ”بس..... یہ ایسی ہی ہے۔“ وہ مٹی خیر انداز میں بولی۔ ”انجوائے کر رہی۔“
 پھر وہ ڈیلفینیا کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”میں مٹی

مورت آتی دکھائی دی۔ ڈیلفینیا نے اس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔
 ”مٹی! اسے جانتے ہو؟“
 مذکورہ مورت کا چہرہ مجھے شاسا سا لگا۔ میں نے کہا۔
 ”میں نے اسے کہیں دیکھا تو ہے۔ کہاں..... یہ یاد نہیں آ رہا۔“
 ”اگر تم اس سے کبھی ملے نہیں تو پھر تم نے اسے یا توٹی دی اسکرین پر دیکھا ہوگا یا پھر کسی سوکر گراؤنڈ میں۔“ اس نے بتایا۔ ”یہ اس وقت کی سب سے زیادہ معاوضہ لینے والی دین سوکر پلیر ہے۔“
 فٹ بال کے کھیل کو امریکا میں سوکر کہا جاتا ہے۔ میں نے کہا۔
 ”میں نے اسے شاید ٹی وی اسکرین پر دیکھا ہو۔ نام کیا ہے اس کا؟“
 ”مارٹا سلوا دیرا۔“ اس نے بتایا۔ ”اس کا معاوضہ چار سو ہزار ڈالر ہے۔“
 ”یعنی چار لاکھ ڈالر.....!“
 ”بالکل ڈھونڈ لیا۔“ اور مارٹا اس وقت دنیا میں سب سے زیادہ معاوضہ لینے والی سوکر کی کھلاڑی ہے۔ اس کا تعلق برازیل سے ہے۔ یہ اپنی ٹیم میں فارورڈ پوزیشن پر کھیلتی ہے۔“
 ”بہت خوب!“ میں نے سانس لی انداز میں کہا۔
 اس دوران میں مارٹا ہمارے قریب پہنچ چکی تھی۔ اس نے ڈیلفینیا کی طرف دیکھتے ہوئے بے تکلفی سے ہاتھ ہلایا اور بولی۔
 ”ہیلو ڈیلفینی! کیسی ہو؟“
 ”ایک دم فٹ۔“ ڈیلفینیا نے جواب دیا پھر میری جانب اشارہ کرتے ہوئے تعارف کرانے والے انداز میں کہا۔ ”اس سے ملو۔ یہ میرا دوست ہے اسد مٹی۔“
 ”ویری گڈ!“ مارٹا دیرا نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا پھر میری طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے دوستانہ انداز میں بولی۔ ”ہیلو ونڈم..... کیسے ہو؟“
 میں نے اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو گرم جوش سے قلم لیا پھر کہا۔ ”ٹانک کا کرم ہے۔ آپ کی ڈیلفینی نے میرا بہت خیال رکھا ہوا ہے۔“
 ”بس..... یہ ایسی ہی ہے۔“ وہ مٹی خیر انداز میں بولی۔ ”انجوائے کر رہی۔“
 پھر وہ ڈیلفینیا کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”میں مٹی

جاتا تھا لیکن اس حکم سے فرعونیت نہیں جھلکتی تھی بلکہ ایک خاص قسم کی شبیہ نری کا احساس ہوتا تھا جیسے کوئی دھوکا دہاندہ لی سے پیار کو مٹی شکل دے رہا ہو۔ اگرچہ ڈیلفینیا کا پیار محبت پر ایمان نہیں تھا لیکن اس کی آوازوں سے بسا اوقات یہ چیزیں جھلکتی تھیں۔
 ”اگر ساتھ دینے کی بات ہے تو مجھے انکار نہیں۔“
 میں نے اس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ”مگر مجھے اس کھیل کا کوئی تجربہ نہیں۔“
 ”تجربہ تو کھیلنے کے بعد حاصل ہوتا ہے مٹی۔“ وہ معنی خیز انداز میں بولی۔ ”جو کھیلتے ہیں، وہ ہی ایک دن تجربہ کار کہلاتے ہیں۔“
 ”یہ تو تم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو۔“ میں نے تائیدی انداز میں کہا۔
 ”میں نے غلط کب کہا ہے.....؟“ وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے متغیر ہوئی۔
 ”میرا یہ مطلب نہیں تھا۔“ میں نے جلدی سے کہا۔
 ”ہم نہیں کورٹ جا رہے ہیں۔“ اس نے بتایا۔
 ”میں کچھ دیر تک ٹینس کھیلوں گی پھر آرام سے کہیں بیچ کرکٹ شپ کریں گے۔“
 ”ٹھیک ہے جیسے تم مناسب سمجھو۔“ میں نے معتدل انداز میں کہا۔
 پریسٹن ہالو کی روڈ فورڈی کے دوران میں ہمارے سچ بات چیت کا سلسلہ جاری رہا۔ جیسا کہ میں نے بتایا پریسٹن ہالو کا علاقہ اپنی خوب صورتی اور سکون دامن میں بے مثال ہے۔ یہاں پر زیت کرنے کا ایک اپنا ہی مزہ ہے۔
 ڈیلفینیا نے گاڑی پر پریسٹن ہالو پارک کی جانب موڑی تو میں نے کہا۔ ”کیا پارک میں چہل قدمی کا ارادہ ہے؟“
 ”چہل قدمی بھی کر لیں گے لیکن میں پہلے ٹینس کھیلوں گی۔“ وہ بڑے عزم سے بولی۔ ”اوپر تم نے میرا ساتھ دینا ہے..... اوکے!“
 ”اوکے..... ٹھیک ہے۔“ میں نے ہائی بھری۔
 پریسٹن ہالو پارک میں داخل ہوتے ہوئے ڈیلفینیا نے مجھے بتایا کہ یہاں کا سب سے بڑا پارک ہے جو سات اعشاریہ دو ایکڑ ریت پر پھیلا ہوا ہے۔ اس پارک میں دو ٹینس بال کورٹس، دو ٹینس کورٹس، ایک بانسٹ بال کورٹ، ایک سوکر گراؤنڈ اور ایک مٹی کھیل کا میدان ہے۔ پریسٹن ہالو پارک کے بعد دوسرا بڑا پارک ”نیدرلینڈ پارک“ ہے۔
 ہم ٹینس کورٹ کی طرف بڑھے تو سامنے سے ایک

کرتے کرتے نیندی کی دادی کی طرف نکل گیا تھا۔

☆☆☆

شمالی علاقہ جات تو تقریباً ہر ملک کے قابل دیدی ہوا کرتے ہیں۔ ٹیکساس امریکا کا جنوبی حصہ ہے لیکن ڈیلس ٹیکساس کے شمال میں واقع ہے اور پریسٹن ہالو، ڈیلس کا انتہائی شمالی حصہ سو اس شمالی نسبت کے باعث یہ علاقہ بہت خوب صورت اور نظیر فریب بھی ہے۔ یہاں کی زندگی میں فطرت جھلکتی ہے۔ اگرچہ یہ زندگی سادہ نہیں مگر پھر بھی بہت پرسکون ہے۔
 ہم دونوں سہ پہر میں گھر سے نکل آئے تھے اور یہ سب ڈیلفینیا کے پروگرام کا حصہ تھا۔ میں تو تین دن کے لیے اس کے گرم و گرم پر تھا۔ وہ جہاں بھی لے جاتی، مجھے جاتا تھا۔ اس بات کا مجھے اطمینان تھا کہ میں اس کے ساتھ ہر زاویے سے محفوظ ہوں۔ وہ ان لحاظ میں میری نجات و ہندہ بنی ہوئی تھی اور نجات و ہندہ بھی کسی ضرور رساں نہیں ہوتا۔
 ”جسٹین اسپورٹس وغیرہ کا شوق ہے؟“ اس نے مجھ سے پوچھا۔
 ”مجھے خود کو تن درست رکھنے کا شوق ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”اور اس کے لیے میں باقاعدہ جیم جاتا ہوں۔“
 ”گڈ!“ وہ سراہنے والے انداز میں بولی۔ ”یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ تن درستی ہزار فیت ہے۔ ویسے میرا اشارہ کسی خاص قسم کی طرف تھا جیسے ٹینس، سوکر، سونٹنگ یا اور کچھ.....؟“
 اس وقت ہم دونوں ایک شان دار گاڑی میں تھے اور ڈیلفینیا ڈرائیو کر رہی تھی۔ میں اس کے برابر ہیئر سیٹ پر تھا۔ یہ گاڑی نہ تو ایکس والی تھی اور نہ ہی سلور اوڈی جس میں ڈیلفینیا کو میں نے پہلی مرتبہ دیکھا تھا تاہم اس گاڑی کی شان بھی دیکھنے کے لائق تھی۔
 ”سوکر اور ٹینس تو نہیں البتہ میں سونٹنگ شوق سے کرتا ہوں۔“
 ”ٹھیک ہے۔“ وہ ایک سائڈ اسٹریٹ پر گاڑی کو موڑتے ہوئے بولی۔ ”بٹکے میں سونٹنگ پول بھی موجود ہے۔ اگر تم جاؤ تو اپنا سونٹنگ کا شوق پورا کر سکتے ہو۔“ لکائی توقف کر کے اس نے بڑی لگاوت سے میری طرف دیکھا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولی۔
 ”ویسے اس وقت تو میرا ٹینس کھیلنے کا موڈ ہے۔ کیا تم میرا ساتھ دو گے؟“
 ڈیلفینیا کے اعزاز میں ایک خاص نوعیت کا حکم پایا

”کون سی بات؟“ میں پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔
”میں ضرورت پڑنے پر کھال کے بال بھی نکال لیتی ہوں۔“

یہ جملہ اس نے اتنی سنجیدگی سے ادا کیا تھا کہ مجھے اپنے وجود میں ایک سرولہری دوڑتی محسوس ہوئی۔ اگرچہ اس نے میری ایک خوبی.... ”بال کی کھال نکالنا“ کا جواب دیا تھا لیکن اس کے انداز بیاں سے سفاکی جھلکتی تھی۔ ان لمحات میں وہ مجھے ایک مختلف ڈیٹیفیکشن نظر آئی تھی۔

ہم نے لباس تبدیل کیا اور نیشنل کورٹ میں اتر آئے۔ یہ ڈیٹیفیکشن کی فرمائش تھی ورنہ میں نیشنل کی بجائے بھی واقف نہیں تھا۔ بس اس کا دل رکھنے کے لیے میں نے نیشنل کا ریکٹ اٹھا لیا تھا۔ نو جوانی میں توڑا بہت پیڈمنٹن کھیلا تھا۔ میں اسی لوے لٹلے تجربے کو کام میں لا کر ڈیٹیفیکشن کی خواہش پوری کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ کسی ماہر کھلاڑی کے مانند ٹھیل رہی تھی۔ ٹھوڑی سی دیر میں اس نے مجھے ہانپنے پر مجبور کر دیا۔

اسی لمحے ایک اور کھلاڑی کورٹ میں داخل ہوئی تو ڈیٹیفیکشن نے مجھ سے کہا۔ ”علی! تم ٹھوڑا ریٹ کرلو۔ میں ایک آدھ گیم اب ایشیے کے ساتھ لگاؤں گی۔“

ایشیے کا حلقہ امریکا سے تھا اور وہ ایک معروف نیشنل پلیئر تھی۔ دوسری جانب ڈیٹیفیکشن بھی کسی سے کم نہیں تھی۔ میں ایک شیخ پر چڑھ کر ان دونوں کا ٹھیل دیکھنے لگا۔ نیشنل کی مظلوم اور معصوم بال ان دونوں کے نیشنل کے طوفانی چھینڑے کھا کر نیشنل کے آ رہی تھی۔ چکر لگنے میں مصروف ہوئی۔ مجھے درحقیقت نیشنل کے ٹھیل سے کوئی خاص لگاؤ نہیں تھا لیکن لیٹ ٹائٹ نی وی چینلز سمجھاتے ہوئے اگر کسی اسپورٹس چینل پر وہ نیشنل کا کوئی شیخ آ رہا ہوتا تو میں ٹھوڑی دیر رک کر دیکھ لیا کرتا تھا۔

رقص کو اعضا کی شاعری کہا جاتا ہے۔ نیشنل کا ٹھیل بھی کسی رقص سے کم نہیں ہوتا۔ بڑے بڑے تلے انداز میں اچھل کود کرنا پڑتی ہے۔ ہر شاٹ پر جسمانی طاقت کو توازن کے ساتھ ایک خاص زاویے پر استعمال کرنا ہوتا ہے۔ ذہن ہمہ وقت چاق و چوبند اور نگاہ کسی عقاب کے مانند بال پر لگی ہوئی.....!

ڈیٹیفیکشن جسم و جان کی پوری توانائی کے ساتھ شاٹ لگاتی تو اس کے بدن کے مختلف اعضاء رقص کرنے لگتے۔ مخصوص جاذب نظر سلسلے کی معنی خیز جنبش بڑی دل خوش کن اور حیات آفریں تھی۔ اس کے بدن میں بلا کالج تھا۔ یوں

محسوس ہوتا تھا اس کے جسم کے ایک ایک انچ پر اسپرنگ لگے ہوئے ہوں جو اسے مسلسل متحرک رکھتے ہوئے تھے۔ میں کافی دیر تک اس کے ہسٹون کی ریتا میں اور زرخیز بدن کی شادابیوں میں گھوبا رہا۔ پورے ٹھیل کے دوران میں وہ میرے حواس پر چھا رہی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ ایشیے کے ساتھ نہیں بلکہ میرے جذبات کے ساتھ ٹھیل رہی ہو.....!

ہم نے نیشنل کورٹ سے فارغ ہونے کے بعد اورنگ جوس پیا اور ایک ریسٹورنٹ میں چپہ کر ٹھوڑی گپ شپ بھی کی۔ میرے ذہن میں شارو کے معاملے نے بہت اچھل پھل چار بھی تھی لہذا میں نے اس سے پوچھ لیا۔

”ڈیٹیفیکشن! تم نے بتایا تھا کہ شارو کو چند روز کے بعد کاسا بلانکا سے ٹاسو شفٹ کر دیا جائے گا۔ میں یہ تو نہیں پوچھو گا کہ تمہاری معلومات کا ذریعہ کیا ہے کیونکہ میں تمہارے اثر و رسوخ کے چند محلی نمونے ملاحظہ کر چکا ہوں لیکن میں یہ ضرور جانتا جاہوں گا کہ اس کے مقصد کے لیے انہوں نے کیا کیا پانچا پانچا کیا ہے اور پھر کیوں باسے بہا باز کیوں شفٹ کیا جائے گا؟“

وہ جوس کا ایک گھونٹ لینے کے بعد بولی۔ ”یہ سب اسکن بزنس کا شاخسانہ ہے۔“

”اسکن بزنس یعنی عصمت فروشی۔“ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ”یہ تو بہت غلط ہے.....!“

”غلط اور بچ کا فیصلہ ہر شخص اپنے معروضی حالات کے پیش نظر کرتا ہے علی۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ ”جن لوگوں کو اس بزنس میں مالی فائدہ ہوتا ہے، ان کے لیے تو اس سے زیادہ نیک کام دنیا میں اور کوئی ہو نہیں سکتا۔“

”نیک کام.....“ میں نے زہر خند لہجے میں کہا۔ ”مجھے تو اس کے تصور ہی سے من محسوس ہو رہی ہے..... چچی بھی۔“

اس نے میرے تجربے پر کوئی رد عمل ظاہر نہیں کیا اور اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔

”کاسا بلانکا میں رہتے ہوئے شارو کو مخصوص قسم کی ٹریننگ دی جائے گی تاکہ وہ اس شعبے میں طاق ہو جائے۔ اس کے بعد اسے بہا باز کے کیشل ٹاسو شفٹ کر دیا جائے گا جو کہ ایک الگ ٹھیک جزیرہ ہے۔ ٹاسو کو عیاش مال دار سیاحوں کی جنت بھی کہا جاتا ہے۔ اس ”مفت“ میں ٹاسو کا شمار ہوائی کے آس پاس ہی ہوتا ہے خاص طور پر ہوائی کے شہر ہونولولو کے نزدیک اسے مقام عیاشی سمجھا جاتا ہے۔ ہونولولو کی طرح ٹاسو میں بھی عیاشی بہت بھگی ہے۔“

وقت

اگر تم نے ہمارے ساتھ تعاون جاری رکھا تو تمہاری دوست کاسا بلانکا سے ٹاسو نہیں بلکہ سیدھی بے ٹی پہنچا دی جائے گی یا..... تم جہاں کہو گے وہاں پہنچا دیں گے۔“

”سب..... تم یہ نیک کام کب کرو گی؟“ میں نے بے ساختہ پوچھا۔

”جب ہمارے درمیان انگریز منٹ سائن ہو جائے گا۔“ اس نے جواب دیا۔

”کیسا انگریز منٹ؟“ میں نے استفسار کیا۔

”تعاون یا بھی کانسٹرکٹ“ اس نے جواب دیا۔

”جس کی رو سے ہم ایک دوسرے سے تعاون کرنے کے پابند ہوں گے۔“

”میں تو ہر قسم کے تعاون کا یقین دلاتا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”پھر کسی انگریز منٹ یا کانسٹرکٹ کی کیا ضرورت ہے؟“

”لکھی ہوئی چیز کی اپنی ایک وجہ، ایک اہمیت ہوتی ہے۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ”اس لیے یہ انگریز منٹ سائن ہونا ضروری ہے۔“

”اوکے، میں سائن کرنے کے لیے تیار ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”کہاں ہے وہ انگریز منٹ؟“

”ایک آدھ دن میں یہ کام بھی ہو جائے گا۔ تمہیں اگر میں نے یہاں روکا ہے تو اس کا ایک خاص مقصد ہے۔“ وہ نرم لہجے میں بولی۔ ”انگریز منٹ سائن ہونے سے پہلے کے چند اسٹیپ ہیں۔ پہلے تم ان سے گزرو گے پھر انگریز منٹ بھی سائن ہو جائے گا اور تم اس انگریز منٹ یا کانسٹرکٹ پر دستخط..... کرنے یا نہ کرنے کے لیے مکمل طور پر آزاد ہو گے۔ تم پر کسی قسم کا دباؤ نہیں ڈالا جائے گا۔“

”اوکے..... تم مجھے مختلف اسٹیپ سے گزراؤ یا زندگی سے گزراؤ مگر میری شارو کو کچھ نہیں ہونا چاہیے۔“

”ڈونٹ لی سو ایمووشل۔“ وہ میرا کندھا تھپتھپاتے ہوئے بولی۔ ”سب ٹھیک ہو جائے گا۔ مجھ پر بھروسہ رکھو..... آں!“

”تم پر مکمل بھروسہ ڈیٹیفیکشن۔“ میں نے کہا۔

مجھے خود محسوس ہوا کہ ان لمحات میں میں خاصا جذباتی ہو گیا تھا۔ شارو کے حوالے سے جب سے میرے علم میں یہ بات آئی تھی کہ اسے عصمت فروشی کے مذموم کاروبار میں دھکیلا جائے والا ہے، میں کچھ زیادہ ہی فکر مند ہو گیا تھا اور یہی پریشانی میرے اعصاب کو متاثر کر رہی تھی جس کی وجہ سے اپنے جذبات پر کنٹرول نہیں رہا تھا۔ بالفاظ دیگر شارو

”لیونارڈو میری دوست کو پیشہ کرانے کے لیے وہاں لے گیا ہے۔“ میں نے دانت کچکاتے ہوئے کہا۔ ”میں اس کی گردن توڑ دوں گا۔“

”کیوں یا کو کوئی پلیٹ یعنی تنہائی کا مارا ہوا سیارہ کہا جاتا ہے۔“ وہ جوس کے گلاس کو خالی کرتے ہوئے بولی۔

”جرائم کی دنیا کے بے تاج بادشاہوں کی وہاں بہتات ہے۔ تم کسی کی گردن توڑو گے؟“

”جو بھی گردن میرے اور شارو کے راستے میں آئے گی، اسے ٹوٹا ہی ہوگا۔“ میں نے نیم چارحانہ انداز میں کہا۔

”تو پھر تم ابھی کاسا بلانکا کے لیے پرواز کر جاؤ۔“ وہ سادگی سے بولی۔ ”ڈیٹیس سے ہونا ایک ہزار سات سو پونڈ فی گھنٹہ ضرور ہے۔ سوا دو گھنٹے کی ٹان اسٹاپ فلائٹ کے بعد تم ہونا پہنچ جاؤ گے اور اس کے بعد.....“ اس نے لمحاتی توقف کر کے عجیب سے انداز سے مجھے دیکھا پھر ان الفاظ میں اپنی بات مکمل کر دی۔

”اس کے بعد مجھے یہ نیز سننے کو ملے گی کہ ہونا میں درجنوں افراد کو گردنیں توڑ کر موت کے گھاٹ اتار دیا گیا ہے.....“

”تم میرا مذاق اڑا رہی ہو؟“ میں نے شاکی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

”نہیں۔“ وہ غصہ سے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”میں تمہیں یہ سمجھانے کی کوشش کر رہی ہوں کہ جذبات کو قابو میں رکھو۔“

”جذبات کیا خاک قابو میں رہیں گے۔“ میں نے شپٹائے ہوئے انداز میں کہا۔ ”میری دوست کو بدکاری کے دھندے پر ڈالنے کی تیاری کی جارہی ہے اور تم کتنی ہوش رابیکس رہو؟“

”تم میری بات کا غلط مطلب نکال رہے ہو علی۔“ وہ بہ دستور غصہ سے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”آج دوپہر تک ایک جینکس پولیس ڈیپارٹمنٹ چیلورڈر کیس میں قاتل کی حیثیت سے تمہیں تلاش کر رہا تھا..... تلاش کر رہا تھا یا نہیں؟“ اس نے زور سے کر پوچھا۔

”کر رہا تھا۔“ میں نے تصدیق کی۔

”پھر منظر تبدیل ہوا اور ہم نے اس کیس میں سے تمہیں ایسے باہر نکال لیا جیسے تمہیں سے بال کو کھینچ کر باہر نکالا جاتا ہے۔“ وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی پھر میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اضافہ کیا۔ ”فکر نہ کرو۔“

نے وقتی طور پر مجھے اندر سے کزور کر دیا تھا۔
 ”بھروسہ بھی کرتے ہو اور پریشان بھی ہوتے ہو۔“ وہ محبت آمیز انداز میں مجھے آنکھیں دکھاتے ہوئے بولی۔ ”بھروسہ کبھی اور چلتے ہیں۔“
 ڈیپٹی نے جس کاٹل بے کیا اور ہم ریسٹورنٹ سے نکل آئے۔ مل کی ادا نیکی پر بھی ہمارے پیچ تھوڑی کھینچا تانی ہوئی تھی۔ میں نے اپنا کریڈٹ کارڈ نکالا تو وہ جلدی سے بولی۔
 ”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تم میرے مہمان ہو۔“
 اس نے ”مہمان“ کا لفظ اتنی اہمیت سے ادا کیا تھا کہ مجھے اپنا ہاتھ روکا پڑ گیا تھا۔
 واہی کی سز میں وہ مجھے خاصی چپ چاپ نظر آئی تو میں نے پوچھا۔ ”خاموش کیوں ہو ڈیپٹی۔ کیا مجھ سے کھانا ہو؟“
 ”خانا۔ وہ کیوں؟“
 ”شاید تمہیں میری کوئی بات بری لگ گئی ہو۔“
 ”جس کی بات مجھے بری لگے، وہ میرے برابر میں نہیں بیٹھ سکتا۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ ”اگر تم میرے ہم نشین ہو تو اس کا ایک ہی مطلب ہے کہ تمہارا کوئی بھی چیز مجھے بری نہیں لگ رہی۔“
 ”تھیک ہو۔“ میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور پوچھا۔ ”پھر خاموش کیوں ہو؟ ایسا محسوس ہو رہا ہے ریسٹورنٹ سے اٹھنے کے بعد تم کچھ بچھ کی گئی ہو؟“
 ”ایسی کوئی بات نہیں علی!“ وہ ٹالنے والے انداز میں بولی۔
 ”پھر کیسی بات ہے ڈیپٹی؟“
 ”اصل میں میں تمہارے بارے میں سوچ رہی ہوں۔“ وہ ڈرائیونگ جاری رکھتے ہوئے وضاحت کرنے لگی۔ ”تم کافی اکتاہٹ ہوئے لگ رہے ہو۔ تمہاری ہوریت دور کرنے کے لیے تفریح کا کوئی سامان ہونا چاہیے۔“
 ”میں اکتاہٹ کا شکار نہیں ہوں ڈرائیونگ دباؤ ہے شادو کے حوالے سے۔“ میں نے صاف گوئی سے کام لینے ہوئے کہا پھر سوال کیا۔ ”بانی دی دے تم نے میری تفریح طبع کے لیے کیا سوچا ہے؟“
 ”ایک آئیڈیا تو آیا ہے ذہن میں۔“
 ”کیا آئیڈیا؟“
 ”اسٹریپ کلب!“ وہ معنی خیز انداز میں بولی۔
 میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ”کیا مطلب ہے تمہارا؟“

”کیا تم اسٹریپ کلب جانا ناپسند کرتے ہو؟“ اس نے پوچھا۔ ”اکثر مرد دل بہلانے کے لیے ادھر کا رخ کرتے ہیں۔“
 ”نہیں۔۔۔۔۔ مجھے ایسا کوئی شوق نہیں۔“ میں نے کہا۔
 ”میں مصنوعی زندگی کو پسند نہیں کرتا۔“
 ”پر سین ہالوں میں دنیا کے ٹاپ آف دی لائن سات اسٹریپ کلبس ہیں۔“ وہ بتاتے لگی۔ ”اسپرنٹ رائٹو، کبیرے رائٹ، بے ٹی ڈول سیلون، پلائٹیم لی کلب، پینڈورا میس کلب، دی کلب ہاؤس اور ڈیٹس کبیرے۔“
 میں نے ایک بات خاص طور پر محسوس کی کہ یہ تفصیل بیان کرتے ہوئے اس کے انداز میں ایک شرارت چھپی ہوئی تھی جیسے وہ مجھے چھیڑ رہی ہو یا میرے طبی میلان کو چیک کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔ اس کے ذہن میں کیا تھا یہ تو وہی جانتی تھی۔ میں اس حوالے سے کوئی حتمی رائے نہیں دے سکتا تھا کیونکہ میں نے اس مختصر مدت میں ڈیپٹیا کو بہت گہرا پایا تھا لہذا یہ بات میں پورے وثوق سے کہہ سکتا تھا کہ اس نے اسٹریپ کلب کا تذکرہ بلاوجہ نہیں کیا تھا۔ وہ مجھے جانچنا چاہتی تھی۔
 اسٹریپ کلب دراصل کلبس کی ایک مخلوط قسم ہے۔ آپ اسے ٹائٹ کلب اور بار کے عزم سے تیار ہونے والا ایک چھیڑ سمجھ لیں جہاں پر پینے پلانے کی تمام سہولتوں کے علاوہ کبیرے ڈانس اور دیگر تفریحات کا بھی بندوبست ہوتا ہے۔ اس پر ”اسٹریپ“ کی مہر اس لیے ثبت کی گئی ہے کہ یہاں تفریح فراہم کرنے والی لڑکیاں اپنی لیجر (زیر جامہ) سے اٹھیلیاں کرتی ہیں۔ آسان الفاظ میں اس آئٹم کو آپ بھرے کی ایک ترقی یافتہ ماوراءِ آداب قسم کہہ سکتے ہیں۔
 ”میں نے کہا تھا مجھے مصنوعی زندگی بالکل پسند نہیں۔“ ڈیپٹیا کی بیان کردہ تفصیل کے جواب میں میں نے قلمی لہجے میں کہا۔
 ”کیا تم مولوی صاحب ہو؟“ اس نے اچانک پوچھا۔
 ”کیا مطلب؟“ میں الجھ کر کہہ گیا۔
 ”تم مسلم ہو؟“
 ”الحمد للہ!“ میں نے جواب دیا۔ ”مگر تم یہ مسلم اور مولوی صاحب کا کیا ذکر نکال بیٹھی ہو؟“
 ”ارے یار! میں تو مذاق کر رہی تھی۔“ وہ ہلکا سا قہقہہ لگاتے ہوئے بولی۔ ”دراصل جو لوگ عابد و زاہد ہوتے ہیں اور خود کو مولوی صاحب کہلاتے ہیں، وہ ان

وقت

چیزوں سے دور رہنے کی کوشش کرتے ہیں اس لیے تمہارے کلمے انکار پر میں نے پوچھ لیا کہ کہیں تم کوئی مولوی صاحب تو نہیں ہو۔“
 ”ڈیپٹی! تم نے اس موضوع کو چھیڑا ہے تو میری بھی سن لو۔“
 میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”پہلی بات تو یہ کہ میں ایک سیدھا سادہ مسلمان ہوں۔ دوسری بات یہ کہ جہاں تک زہد و تقویٰ کا معاملہ ہے تو دنیا کا بربذیب اس کی تلقین کرتا ہے۔ دیش آل۔“
 ”اوکے پر فیسر صاحب! مجھے معاف کر دو۔“ وہ زربل مسکراتے ہوئے شرارت بھرے انداز میں بولی۔ ”مجھے سے غلط نہیں دیکھا تھا۔ ویری سوری۔“
 ”اٹس اوکے!“ میں نے جلدی سے کہا۔ ”ڈیپٹیا! میں ان حساس موضوعات پر گفتگو کرنے سے پرہیز کرتا ہوں جن کے حوالے سے میری معلومات مکمل نہ ہوں اور یہ بھی ایک ایسا ہی ٹاپک ہے۔“
 ”تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔“ وہ تائیدی انداز میں بولی۔ ”میں آئندہ اس بات کا خیال رکھوں گی لیکن میری خاطر تمہیں ایک کام تو کرنا ہی پڑے گا۔۔۔۔۔“ آخری جملہ اس نے بڑی گاٹ سے ادا کیا تھا۔
 ”کیا کام؟“ میں نے بے حد محتاط لہجے میں پوچھا۔
 ”کل میرے بیٹکے پر ایک جید قسم کے مولوی صاحب آرہے ہیں۔“ وہ دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ بتاتے لگی۔ ”تمہیں ان کے ساتھ ایک مختصر سی سٹنگ کرنا ہے۔“
 ”ٹھیک ہے“ میں سٹنگ کرلوں گا مگر میں کسی بحث مباحثے یا مناظرے کے چکر میں نہیں پڑوں گا۔“ میں نے دونوں انداز میں اس پر واضح کر دیا۔
 ”بے فکر رہو۔“ وہ غصہ سے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”بحث مباحثے کا کوئی پروگرام نہیں۔ تو وہ ہمارے تعلق کو منبہ ذکر کرنے میں جوڑنے کے لیے آرہے ہیں۔“
 ”میں کچھ سمجھا نہیں!“ میری زبان اور آنکھوں میں الجھن ابھرتی۔
 ”سب سمجھ میں آجائے گا۔“ وہ پھر سرت انداز میں بولی۔ ”بس ایک رات ہی کی تو بات ہے۔۔۔۔۔ لپٹس دیتا اینڈی۔“
 وہ مولوی صاحب کا ذکر کرتے ہوئے ایسے خوش ہورہی تھی جیسے وہ ہمارا نکاح پڑھانے آرہا ہو۔۔۔۔۔! ☆☆☆

رات آدمی سے زیادہ بیت چکی تھی اور میں ابھی تک جاگ رہا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہی کہ میں نے آج یعنی گزشتہ روز لٹج کے بعد قیلولہ کر لیا تھا۔ اگر انسان دن کے کھانے کے بعد نپ یعنی مختصر سی نیند لے لے تو پھر رات کو دیر تک جاگتا آسان ہو جاتا ہے۔ میں جاگ رہا تھا اور مسلسل ڈیپٹیا کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس کی بہت سی باتیں اور بہت سی اداسی میری سمجھ سے بالاتر تھیں۔ اس نے ابھی تک کوئی بھی معاملہ کھول کر میرے سامنے نہیں رکھا تھا۔ وہ ہر معاملے کا اغلب حصہ چھپا کر مجھ سے بات کرتی تھی۔
 آدھا چھ ہوا آدھا جھوٹ، یہ انسان کے ذہن کو الجھاتا ہے اور ان لحاظات میں ڈیپٹیا کے حوالے سے میرا ذہن بھی الجھن کا شکار تھا اور شاید یہی میرے جاننے کا سبب بھی تھا۔ میں پریسٹن ہالو پیچنے کے بعد اب تک بیٹھ آئے والے واقعات پر غور کرنے لگا۔
 ڈیپٹیا نے مجھے وہ ویڈیو کلب دکھایا تھا جس میں میں نے چرچ چکن ریسٹورنٹ کے کچن میں مارمار کو پیٹل کا حشر کر دیا تھا اور وہ میری کناس کی تاب نہ لاتے ہوئے دارفانی سے کوچ کر گیا تھا۔ میں نے ڈیپٹیا سے جب پوچھا کہ یہ ویڈیو اس کے ہاتھ کیسے لگی تو وہ بڑی خوب صورتی سے ٹال گئی تھی۔
 یہی انداز اس نے نیوز لینڈ کے سلیس میں بھی اپنایا تھا۔ اس نے اس کمال کا سہرا اپنے کسی اوپر والے کے سر باندھ دیا تھا لیکن یہ نہیں بتایا تھا کہ اس کے اوپر کون بیٹھا ہے جس نے مجھے پیٹل مرڈر کیس سے صاف نکال لیا تھا۔ بس اس نے یہ کہا تھا کہ اس کے اوپر جو بھی ہے وہ بڑا طاقت والا ہے۔ اس کا یہ جملہ میرے ذہن میں چکرار ہا تھا۔ کیا تم نے زینتی خدا کے بارے میں سنا ہے؟
 وہ یہ بھی جانتی تھی کہ میں زبان کا مدنی معاملات کا کھرا اور سائیکالوجی کا اسٹوڈنٹ ہوں اور انہی صفات کی بنا پر وہ میرے ساتھ کسی قسم کا ایگری منٹ کرنا چاہتی تھی جس کی رو سے ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ بھرپور تعاون کرنا تھا لیکن اس ایگری منٹ کے مندرجات کیا ہوں گے یہ بتانے سے وہ کئی کاٹ گئی تھی۔ بس یہ کہہ کر مجھے بہلا دیا تھا کہ میں ان کی ضرورت ہوں اور وہ میری ضرورت ہیں۔ اسی مقصد کی خاطر میرا انتخاب کیا گیا تھا۔
 اس نے لٹج کے بعد مجھے سونے کی ہدایت کی تھی۔ مجھے اس وقت بالکل نیند نہیں آ رہی تھی لیکن اس کا دعویٰ تھا کہ

نبوت

جھوٹ کا حال خدا جانے۔ لیکن ایک دوست اپنا تجربہ بیان کرتے ہیں کہ وہ اہل ان کے گھر میں خراش ہوئی، جو ان کے نزدیک بدعہ کھانے اور کھروالوں کے خیال میں گریٹ کی زیادتی کا نتیجہ تھی۔ شروع میں تو انہیں اپنی بیٹی ہوئی آواز بہت جلی معلوم ہوئی اور کہیں نہ ہوئی؟ سننے چلے آئے ہیں کہ بیٹی ہوئی (HUSKY) آواز میں بے پناہ جھنجھلاہٹ ہوئی ہے۔ خدا کی دین کی کھر بیٹھے آواز بیٹھے گی۔ ورنہ اس میں تو لوگ کھلا کی طرح ڈار بہاتے ہیں جب کہیں آواز میں یہ مستقل زکام کی کیفیت پیدا ہوئی ہے۔ لہذا جب ذرا فاقہ کھوس ہوا تو انہوں نے راتوں کو گڑ گڑا کر اکر، بلکہ خن خن کر دماغ میں ناخوشی "ہارلمی اتیری شان کریمی کے مددے، یہ سوزش بھلے ہی کم ہو جائے، مگر بھراہٹ ہوئی قائم رہے۔"

لیکن چند دن بعد جب ان کا گلا خالی کی طرح جھنجھلنے پر کرنے لگا تو انہیں بھی تنہا ہوئی۔ کسی نے کہا "لقمان کا قول ہے کہ پانی پیئے وقت ایک باہر سے ناک بند کر لینے سے گلا بھی خراب نہیں ہوتا۔"

ایک صاحب نے ارشاد فرمایا۔ "سارا شور پھل نہ کھانے کے سبب ہے۔ میں تو روزانہ نہار نہ پندرہ گنا کھاتا ہوں۔ مددہ اور دانت دونوں صاف رہتے ہیں۔"

اور نبوت میں انہوں نے اپنے معنوی دانت لہانے جو واقعی بہت صاف تھے۔

کنٹرول کر رہا تھا۔ اس پر جس سفر میں میں کافی آگے نکل آیا اور پھر وہ مجھے دکھائی دے گیا۔

وہ سونٹنگ پول کے اندر تھا۔ میں ایک تناور درخت کی آڑے لے کر کھڑا ہو گیا اور اس شخص پر نگہ گاڑ دی۔ میں اس وقت ایک محفوظ مقام پر کھڑا تھا۔ کوئی وہاں میری موجودگی کا نوٹس نہیں لے سکتا تھا۔

وہ جو کوئی بھی تھا سونٹنگ پول میں سونٹنگ کر رہا تھا۔ اس کے بازوؤں کی مخصوص حرکات اور سینے کے اسٹروکس سے سونٹنگ پول کے پانی میں پیدا ہونے والی آوازیں میری سماعت تک پہنچ رہی تھیں۔ میں حیرت زدہ تھا کہ اتنی رات گئے کسی کو سونٹنگ کا شوق چڑھا ہے۔ میں بڑی شدت سے اس کا چہرہ دیکھنے کا سعی کرتا تھا۔

پھر میری مراد برآئی۔ جب وہ سونٹنگ کرتے ہوئے میری جانب بڑھا تو مجھے یہ سمجھنے میں کسی دشواری کا سامنا نہیں ہوا کہ وہ کوئی مرد نہیں بلکہ ایک عورت تھی۔ میرا دھیان آپوں آپ ڈیٹھیا کی طرف چلا گیا۔ یہ اس کے سوا اور کوئی

ان میں مصروف تھی.....!

فعلی تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں نے فیصلہ کیا کہ ان انسانی قدموں کا تعاقب کرنا چاہیے جن کی وحشی باپ تھوڑی دیر پہلے میری سماعت تک پہنچی تھی۔ اس خیال کے ساتھ ہی میں نے بے انتہائی پیش قدمی کر دیا اور بار بار وہاں داری میں نکل آیا۔

چاروں جانب خاموشی سنانے اور تاریکی کا راج تھا۔ میں نے ابھی تک اس جھنگ کا سروے نہیں کیا تھا۔ جب ایکس نے مجھے یہاں پہنچایا تو لیونگ روم میں ڈیٹھیا سے میری تفصیلی ملاقات ہوئی تھی اور سہ پہر تک میں اسی لیونگ روم تک محدود ہو کر رہ گیا تھا۔ پھر ڈیٹھیا کے ساتھ باہر نکلا تو رات گئے ہی وہاں آیا تھا اور جب ڈیٹھیا مجھے مختلف راہ داریوں میں سے گزرا کر اس بیڈ روم میں لے آئی تھی اور مجھے بچکے کے اندرونی حصوں کو دیکھنے کا موقع نہیں ملا تھا البتہ مجھے اتنا معلوم تھا کہ اس بیڈ روم کا دروازہ بچکے کے عقبی حصے کی جانب کھلتا تھا جہاں ایک وسیع و عریض گراہی لان تھا جس کے بیچ میں ایک پڑھو سونٹنگ پول بنا ہوا تھا۔ یہ مختصر معلومات مجھ تک ڈیٹھیا عرف ڈیٹھی کے توسط ہی سے پہنچی تھیں۔

میں بڑی احتیاط کے ساتھ دے قدموں راہ داری میں کچھ آگے بڑھا آیا۔ یہاں سے لان اور سونٹنگ پول کو دیکھا جاسکتا تھا لیکن دبیز تاریکی کے باعث وہاں کا منظر واضح دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ لان کے چاروں جانب بچکے کی بازوؤں والے کے ساتھ سایہ دار درخت لگے ہوئے تھے جن کے بیچ تھوڑے تھوڑے فاصلے سے پھول دار پودوں کی مختلف کیاریاں تھیں۔ اس لان میں کسی خوب صورت باغ کا کس دیکھا جاسکتا تھا لیکن اگر وہاں اندھیرا نہیں ہوتا تو.....!

میں آنکھیں میاڑ میاڑ کر تاریکی میں گھومنے لگا۔ میری تجسس بھری نگاہ کو کسی خاص منظر کی تلاش تھی اور پھر مجھے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہو گئی۔ میں نے سونٹنگ پول کی طرف کسی چیز کو متحرک دیکھا تھا۔

"کہیں یہ وہی شخص تو نہیں جو چند لمبے پہلے میرے بیڈ روم کے باہر موجود تھا؟"

ذہن میں ابھرنے والے اس سنسنی خیز سوال نے مجھے آگے بڑھنے پر مجبور کر دیا۔ میں خود کو تاریکی کی آڑ میں رکھتے ہوئے بے آواز قدموں سے پیش قدمی کرنے لگا۔ ان لمحات میں میرے دل کی دھڑکن میں اچھا خاصا اضافہ ہو گیا تھا۔ میں وقفے وقفے سے سانس روک کر اپنی ذہنی کیفیت کو

کیا کیا ہوگا۔ اس کے ساتھ ہی میرے ذہن میں وہ ویڈیو کلب محووم کیا جس میں ہرچ جگہ ریسٹورنٹ کے کچن کی ریکارڈنگ کی گئی تھی۔ ڈیٹھیا ایسی شاطر حسینہ سے کچھ بھی بچھڑ نہیں تھا۔ وہ مجھ پر نگاہ رکھنے کے لیے کوئی بھی جھنجھلاہٹ استعمال کر سکتی تھی۔

میں غیر ارادی طور پر سی سی ٹی وی کمرے کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ اس "نکل کھڑا ہونے" سے میری مراد بیڈ روم سے باہر جانا ہرگز نہیں تھی۔ میں بیڈ روم کے مختلف حصوں اور باہر روم میں مذکورہ کمرے تلاش کر رہا تھا اور اس تلاش میں مجھے مکمل ناکامی کا سامنا دیکنا پڑا۔ ڈیٹھیا نے اگر واقعی اس بیڈ روم میں کوئی سی سی ٹی وی کمرہ نصب کر دیا تھا تو وہ میری نگاہ میں نہیں آسکتا تھا۔

کسی چال باز کا مقابلہ چال بازی ہی سے کیا جاسکتا تھا۔ میں یہ نہیں سمجھ رہا کہ ڈیٹھیا میری دشمن تھی لیکن یہ طے تھا کہ مجھے اس کے بارے میں مددہ معلومات حاصل نہیں تھیں۔ اس نے اپنی زبان سے مجھے جتنا بتایا تھا، میں اسی پر یقین کرنے پر مجبور تھا۔

آنکھ انسان کی ہوا یا کمرے کی، اسے دیکھنے کے لیے روشنی کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں نے پہلی فرمت میں بیڈ روم میں نصب متوقع سی سی ٹی وی کمرے کو اندھا کرنے کا فیصلہ کیا اور وہاں کی تمام لائٹس آف کر دیں۔ بیڈ روم گہری تاریکی میں ڈوب گیا۔ اگلے ہی لمحے مجھے ایک وحشی آواز سنائی دی۔

وہ کسی کے قدموں کی مخصوص چاپ تھی۔ بے ساختہ میری نگاہ نغذ گلاس وال کی جانب اٹھ گئی۔ اگلے ہی لمحے مجھے یاد آگیا کہ وہ آواز بیڈ روم کے باہر کوریڈر میں ابھری تھی۔ تھوڑی دیر پہلے میں چونک کر اس نغذ گلاس وال کے بارے میں سوچ رہا تھا لہذا الاشوری طور پر میری نظر اسی سمت اٹھی تھی۔

بیڈ روم کے باہر سنائی دینے والی انسانی قدموں کی مخصوص آواز نے مجھے چونکے پر مجبور کر دیا۔ اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ اس وقت بیڈ روم کے باہر کوئی موجود تھا اور میں نے جیسے ہی تمام لائٹس آف کیں وہ وہاں سے کھسک گیا تھا۔

میری معلومات کے مطابق اس وقت سوائے میرے اور ڈیٹھیا کے اس بچکے میں اور کوئی ذی روح موجود نہیں تھا۔ میں تو اپنے بیڈ روم کے اندر تھا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ڈیٹھیا میرے بیڈ روم کے باہر کسی خاص

اگر میں آنکھیں بند کر کے لیٹوں تو مجھے نیند آجائے گی اور پھر اس کا کھانچ ثابت ہوا تھا۔ کیا وہ ایسی ہی "کرنی والی" کوئی باجی اللہ والی تھی یا اس کھانے میں کوئی خراب آور دواملائی گئی تھی؟

میرے جذباتی رجحان اور طبی میلان کو چیک کرنے کے لیے اس نے بڑے شوق و خشک انداز میں اسٹریپ کلب کا ذکر بھی کیا تھا اور آخر میں وہ کسی مولوی صاحب کو لے آئی تھی۔ اور کچھ ہو یا نہ ہو لیکن یہ بات طے تھی کہ اس نے میرے حوالے سے اچھا خاصا ہوم ورک کر رکھا تھا۔ اب یہ اس کی ذاتی تحقیق تھی یا کوئی اور شخص اسے یہ معلومات فراہم کر رہا تھا، اس پر بات ہو سکتی تھی۔

ڈیٹھیا نے میرے لیے جس بیڈ روم کا انتظام کیا تھا، وہ بھی مجھے کافی عجیب لگا تھا۔ خصوصاً اس کی ایک دیوار۔ وہ بیڈ روم عام بیڈ روم ہی کی طرح کا تھا، سوائے ایک دیوار کے کیونکہ وہ دیوار پتھر و خشت کی بنی ہوئی تھیں جسے بلکہ مذکورہ دیوار کو رنگین شیشے کی مدد سے تیار کیا گیا تھا۔ اس دیوار کے شیشے میں پہلے اور سرخ رنگ کی آمیزش تھی۔ یہ دونوں رنگ آپس میں مل کر ڈارک براؤن لکڑ کا تاثر دیتے تھے جیسا کہ عام طور پر نغذ گلاس ہوتے ہیں۔

نغذ گلاس کے تصور نے مجھے بے چین کر دیا۔ گاڑیوں میں ایسے شیشے ایک خاص مقصد سے لگائے جاتے ہیں تاکہ گاڑی کے اندر موجود افراد کو باہر سے دیکھنا نہ جاسکے لیکن اندر بیٹھے ہوئے لوگ باہر والوں کو آسانی سے دیکھ لیں۔ کیا اس بیڈ روم کی یہ نغذ دیوار اسی لیے بنائی گئی تھی کہ بیڈ روم میں موجود شخص کو بے آسانی دوسری جانب دیکھا جاسکے؟

اس خیال نے میری بے چینی میں کمی گنا اضافہ کر دیا کہ کوئی مجھے دیکھ رہا ہے اور "یہ کوئی" ڈیٹھیا کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ اس بچکے میں ہم دونوں کے سوا اور کوئی بندہ بشر موجود نہیں تھا۔ کم از کم میں نے تو پچھلے بارہ چودہ گھنٹوں میں یہاں کسی اور کو نہیں دیکھا تھا۔

بے پردگی کے احساس نے مجھے اٹھ کر بیٹھنے پر مجبور کر دیا۔ میں بیڈ سے نیچے اتر آیا اور چاروں جانب نگاہ دوڑا کر وہاں موجود ہر شے کا تختیدی جائزہ لینے لگا۔

بیڈ روم میں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ میں نے فریج میں سے ٹھنڈے پانی کی بوتل نکال کر ایک گلاس پانی حلق سے نیچے اتارا اور سوچنے لگا کہ اگر بیڈ روم میں موجود شخص کو داغ کرنے کے لیے یہ نغذ گلاس وال بنائی گئی تھی تو پھر یقیناً کسی خفیہ مقام پر کوئی سی سی ٹی وی کمرہ بھی نصب

خطرناک دہ شدہ ہے۔ اس کے سامنے ایک ایک قدم چھوٹ کر رہتا ہوگا اور ایک ایک سانس احتیاط کے ساتھ لینا ہوگی ورنہ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ کچھ بھی!

جب ڈیلفینا پر میری پہلی نظر پڑی تھی تو وہ میری ہی جانب گردش کر رہی تھی۔ اس کا جسم ساکت تھا لیکن سینے کا اتار چڑھاؤ سانس کی آمد و شد کا پتا دیتا تھا۔ وہ زندہ تھی اور گہری نیند میں ڈوبی ہوئی تھی۔

اجانک اس کے وجود میں حرکت ہوئی اور وہ تھوڑا کسرانے کے بعد چاروں خانے چت سیڑھی ہو گئی۔ اس کے ہاتھ پاؤں میں بڑی دل کش بے ترتیبی پائی جاتی تھی۔ دودھ اور شہد میں گندھا ہوا اس کا کندہ بدن رنگی نائی سے بغاوت کرتا دکھائی دیتا تھا۔ مختلف اعضا نکلیں پناہ سے نکل کر پوری آن بان اور شان کے ساتھ سرخ بستر پر جلوہ افروز ہو چکے تھے اور دیکھنے والی آنکھ کو چنچ کر رہے تھے کہ بہت ہے تو آؤ اور مجھے سیٹ لو۔

میری کن پٹیاں سننا انھیں۔ رگوں میں خون کی گردش اتنی تیز تھی کہ اپنی رفتار میں روشنی کو شرمایا تھی۔ خون کے سرکش طوفانی ریلے داغ پر شوگریں رسید کر رہے تھے۔ میرے بازوؤں میں اتنی قوت اور ہمت تھی کہ میں ڈیلفینا کے خاموش چنچ کو قبول کروں اور اس کی بکھری ہوئی خوابیدہ شخصیت کو اپنی آغوش میں سیٹ لوں لیکن میں نے اس مہم جوئی کا ارادہ نہیں کیا اور انواع و اقسام کے لذیذ کھانوں سے بچے دسترخوان سے بھوکا ہی اٹھ آیا۔

میں نے بستر پر دراز ہو کر انھیں بند کر دیں اور بدن کو ڈھلا چھوڑ دیا پھر گہری سانسیں لے کر خون کی حدت اور ماحول کی شدت کو کم کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ ڈیلفینا نے میرے جذبات اور احساسات کو آزمائش کی سولی پر چڑھا دیا تھا۔ ان لمحات میں مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ایک تیز نوک دار آبی سلاخ میرے دل و دماغ کو چھید رہی ہو۔ اس بیانی کیفیت سے نکلنے کے لیے مجھے چند منٹ کے اور میں مارل ہو گیا۔

آنکھوں کو یہ دستور بند رکھتے ہوئے میں نے اپنے دماغ کو ہدایت دی۔ ”میں چرسکون اور گہری نیند سوؤں گا اور جب تک میری نیند پوری نہیں ہو جاتی میں سو تاروں گا۔ اس دوران میں اس نکلے کے اندر اگر کوئی ایسا واقعہ رونما ہونے کے امکانات پیدا ہوئے جو کسی بھی حوالے سے میرے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہو تو میری آنکھ اس ضرر رساں واقعے کے ظہور سے پہلے ہی کھل جائے گی۔“

میں جیسے ہی بستر پر دراز ہوا میرا پہلو جل اٹھا یعنی.....

”اوپر روشن ہو گئی جس میں ننڈ گھاس لگا ہوا تھا اور حیرت کی بات یہ تھی کہ اس ڈارک براؤن ٹکڑے ننڈ گھاس کی دوسری جانب کا منظر مجھے پوری آب و تاب کے ساتھ نظر آ رہا تھا۔ دوسری جانب بھی ایک بیڑوم ہی تھا اور رنگ سا تر سرخ رنگ نے نکلیں بیڑے پر ڈیلفینا جو استراحت میں تھی۔“

میرا دماغ محوم کر رہ گیا۔ جب میں رات کے ابتدائی حصے میں اپنے بیڑوم میں سوئے کے لیے آیا تھا تو ڈارک براؤن ٹکڑے گھاس سے بنی ہوئی یہ دیوار مجھے بے حس و حرکت دکھائی دیتی تھی اور میں یہی سمجھا تھا کہ یہ باہر سے پڑی چوری اندر دیکھنے کے لیے بنائی گئی ہے لیکن یہ تو معاملہ ہی الٹا نکلتا تھا۔ میں اپنے بیڑوم کی تاریکی میں ڈیلفینا کی نگاہ سے اوجھل تھا اور وہ روز روشن کی طرح ننڈ گھاس کی دوسری طرف اپنے بیڑے پر عیاں تھی۔ میں نے تھوڑی دیر پہلے اپنی آنکھوں سے اسے اوجھل سوئنگ پول پر سوئم سوٹ میں دیکھا تھا اور اب یہ سرخ رنگی نائی میں بیڑے پر دراز تھی اور یہی نظر آتا تھا کہ وہ گہری نیند میں ہے۔ اس کے سینے کے زیر و بم میں ایک دھماکا اور توازن دکھائی دیتا تھا۔ میرے ذہن نے کچھ کرپا چھا۔

”اگر برابر والے بیڑوم میں ڈیلفینا گہری نیند کے مزے لوٹ رہی ہے تو پھر چند لمبے پہلے سوئنگ پول میں سوئنگ کون کر رہا تھا اور اگر سوئنگ کرنے والی ڈیلفینا تھی تو پھر سرخ نائی میں کون جو خواب ہے؟ کیونکہ اس دوران میں اتنا وقت نہیں گزرا تھا کہ قہقہے کرنے والی ڈیلفینا لباس تبدیل کر کے یوں بیڑے پر لیٹ کر گہری نیند کی وادیوں کی سیر کو نکل جائے۔ اور یہ ایک ہی شخصیت کے دو پرت تھے تو پھر یہ بہت ہی سنگین اور خطرناک معاملہ تھا۔

اسی وقت ڈیلفینا کے کہے ہوئے الفاظ میری ساعت پر ہتھوڑے برسائے گئے۔ میرے اس سوال کے جواب میں کہ تم کہاں رہتی ہو؟ اس نے کہا تھا..... میں کہیں نہیں رہتی اور میں ہر جگہ رہتی ہوں!

یہ میری نظر کا دھوکا تھا یا ڈیلفینا فوراً ڈیلفینا کی سانس پر قدرت رکھتی تھی اور یہ ایک وقت ایک سے زیادہ مقامات پر دیکھی جاسکتی تھی.....؟

سرخ بیڑے پر سرخ نکلیں نائی میں خوابیدہ ہسپانوی حسن اپنی تمام تر اسراریت کے ساتھ میرے ذہن کو تھوڑا بالا کر رہا تھا۔ جو کچھ پیش آ رہا تھا اس کے تناظر میں میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بج اٹھی کہ یہ ڈیلفینا بہت ہی

خطرناک قسم کی سرخ روشنی خارج ہو رہی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا ”آنکھوں کی جگہ دو دیکھتے ہوئے سرخ انگارے رک دے گئے ہوں۔ ان لمحات میں وہ مجھے کسی اور ہی دنیا کی مخلوق نظر آ رہی تھی۔

اس کو دیکھ کر مجھے عجیب ہی دہشت اور خوف کا احساس ہوا۔ میری جگہ اگر کوئی کمزور دل شخص اس سانسے دار تارک ماحول میں اسے دیکھ لیتا تو اسے دل کا دورہ بھی پڑ سکتا تھا۔

وہ ایک سوا یک فیصد آسیب زدہ دکھائی دیتی تھی۔ وہ ممکنہ انداز میں میرے قریب سے گزری اور نکلے کے اندر دنی سے کی جانب بڑھ گئی اور..... میرے ذہن میں سوالات کا ایک آوارانہ رنگا گئی۔

یہ بات تو طے تھی کہ تھوڑی دیر پہلے جو محسوس ہوا تھا کہ میرے بیڑوم کے باہر کوئی کن سونیاں لے رہا ہے وہ ڈیلفینا ہرگز نہیں تھی کیونکہ عین اسی وقت پر ڈیلفینا سوئنگ پول کے اندر سوئنگ کر رہی تھی لیکن رات کے اس پھر سوئنگ کی کوئی تک سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ اس کے بدن میں کون سی ایسی آگ لگی ہوئی تھی جسے ٹھنڈا کرنے کے لیے وہ نصف شب کے بعد سوئنگ پول میں اترنے پر مجبور ہوئی تھی؟

یہ سوال اور اس سے ملتے جلتے کئی اور سوال سوچ کے نئے نئے دروازے کھول رہے تھے لیکن اس کے ساتھ ہی ڈیلفینا کی دیکھی ہوئی انگاریاں آنکھیں بھی کوئی روکنے کھڑے کرنے والی کہانی ستا رہی تھیں۔ میرے ذہن میں سوال اٹھا۔

”کیا ڈیلفینا کوئی انسان ہے یا جن زادی یا..... کوئی آسیب زدہ خیم دو شیزہ.....؟“

وہ جو کوئی بھی تھی کسی فلسفاتی معنی سے کم نہیں تھی۔ میں اس معنی کو عمل کرنے کی جتنی کوشش کرتا تھا، یہ پزل..... برتنا کئی اتنا ہی الجھتی جاتی تھی۔ میں نے اس خیال کے ساتھ اس کے تصور کو ذہن سے جھکا اور اپنے بیڑوم کی طرف چل پڑا کہ..... صبح میں ڈیلفینا سے اس ”مکمل نصف شب“ کا راز جاننے کی کوشش کروں گا۔

میں دے دے دھمکیوں جیسے اپنے بیڑوم سے نکلتا تھا ویسے ہی بے آسٹگی واپس آ گیا۔ میں نے بڑی احتیاط کے ساتھ دروازہ بند کیا اور لائٹ جلائے بغیر بیڑے پر آکر لیٹ گیا۔ ارادہ یہی تھا کہ دماغ کو خصوصی ہدایت دینے کے بعد کبھی تان کر سوؤں گا لیکن بیڑوم کی تاریکی میں ایک اور مصیبت میری منتظر تھی۔

نہیں ہو سکتی تھی۔

میں گہری توجہ سے اس کی سوئنگ کا نظارہ کرنے لگا۔ میں اسے سہ پہر میں نہیں دیکھ چکا تھا۔ اس کے بدن کے مختلف اعضا اپنی مخصوص حرکات و سکنات سے بڑی دل نشین شاعری کرتے تھے اور سوئنگ کے دوران میں تو سنبول بدن کی شادابی جنبشوں والی یہ شاعری باہر مروج کو چھوری تھی۔ میں سرزد ہو کر یک نیک اس جل پری کو دیکھتا چلا گیا۔

پھر اس نے سوئنگ روک دی۔ پتا نہیں وہ تھک گئی تھی یا اس کا شوق پورا ہو گیا تھا۔ اب کی بار جو وہ پول کے اس کنارے کی طرف آئی تو پھر پلٹ کر واپس نہیں گئی۔ اس نے میزبوں کی ریگ پکڑ لی جو سوئنگ پول کے اندر اترنے کے لیے استعمال ہوتی تھیں۔ پھر وہ میزبوں پر قدم قدم اوپر اٹھتے ہوئے سوئنگ پول سے باہر نکل آئی۔

اب وہ مجھے واضح طور پر دکھائی دے رہی تھی۔ وہ ڈیلفینا ہی تھی۔ اگرچہ تاریکی کے باعث میں اس کے چہرے کے خال و خط نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن اس کا قد کاٹھ اور باڈی فریم میری یادداشت میں محفوظ ہو کر رہ گیا تھا۔ میں اس کے سراپا کو تاریکی کے باوجود بھی بے آسانی پہچان سکتا تھا۔ ڈیلفینا پانی سے باہر آئی تو کسی مندر و سرندر کی سیلے کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ مخصوص سوئم سوٹ میں اس کے بدن کی دل کشی پوری آب و تاب کے ساتھ نمایاں ہو رہی تھی۔ قریب ہی ایک چوٹی تنچے پر جہاز کی سائز ہتھک ٹاول پڑا تھا۔ وہ سوئنگ کا سٹیم میں ایک شان بے نیازی سے چلتے ہوئے تنچے تک گئی پھر ٹاول کو اٹھا کر اپنے پیچھے ہونے والوں کو خشک کرنے لگی۔ ان لمحات میں اس کی پشت میری جانب تھی۔

میں جس درخت کی آڑ میں سانس روکے دیکھا کھڑا تھا وہ سوئنگ پول کے بہت قریب تھا لیکن میرا ذہن ایسا تھا کہ وہ مجھے نہیں دیکھ سکتی تھی مگر میں اسے خاصی وضاحت کے ساتھ واضح کر سکتا تھا اور..... واضح کر بھی رہا تھا!

بالوں کو ٹاول سے خشک کرنے کے بعد اس نے ٹاول کو اوپر تنچے پر ہی چھوڑ دیا اور واپس جانے کے لیے مڑی اور اسی وقت اس کا چہرہ میری بصارت کی حدود میں آ گیا۔ وہ تو مجھے دیکھ نہیں پائی مگر میں اس کی آنکھوں کو دیکھنے میں کامیاب ہو گیا تھا اور اس کا سیاہی نے مجھے اندر باہر سے لرزا کر رکھ دیا تھا۔

میں نے دیکھا ڈیلفینا کی آنکھوں میں سے بڑی

دینے سے معلوم کرنے کی کوشش کروں گا۔ میں نے اپنے دل سے پراسے اچھل کر گرنے کی گمان لی تھی۔ ہم ناٹھتے سے فارغ ہو کر لیونگ روم میں آ بیٹھے۔ اسی وقت ڈیلفینا کے سب فون کی کھنٹی بج گئی۔ اس نے مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کرنے کے بعد کال ریسیو کر لی۔ کھڑی ہو گئی اور اطلاع دینے والے انداز میں بولی۔

”علی! آ رہی آگئے ہیں۔ میں انہیں لے کر آ رہی ہوں۔ تم ذہنی طور پر تیار رہنا۔“

”میں تیار بیٹھا ہوں۔“ میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ”لے آؤ جس کو بھی لانا ہے۔“ وہ لیونگ روم سے نکل گئی۔ گزشتہ رات نہیں کوڑت سے واپس گھر کی طرف آتے ہوئے اس نے مجھے بتایا تھا کہ آج وہ کسی مولوی صاحب سے مجھے ملوانے کی پھر ابھی مجھے بیدار کرتے وقت اس نے وضاحت کر دی تھی کہ وہ مولوی صاحب دراصل ان کے رتی ہیں جن کا وہ بہت احترام کرتے ہیں۔ میری معلومات کے مطابق رتی یہودیوں کا مذہبی پیشوا اور روحانی راہ نما ہوتا ہے۔ مسلمانوں میں جو حیثیت عالم دین کی ہے یہودیوں میں اسی حیثیت کا حامل رہتی ہوتا ہے۔ اس سے ایک بات واضح ہو گئی تھی کہ ڈیلفینا مذہبی اعتبار سے ایک یہودیوں کی یا کم از کم یہودیت کو ماننے والوں میں سے تھی جیسی وہ ایک رتی کو قائل احترام گردان رہی تھی۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ وہ مجھے کسی رتی سے کیوں ملوانا چاہتی تھی؟

مذہب کوئی بھی ہو آپ اس کی تقلید کریں یا نہ کریں مگر اس کا احترام لازم ہے کیونکہ ہر مذہب کو ماننے والوں کی تعداد لاکھوں، کروڑوں اور اربوں میں ہوتی ہے۔ جب آپ کسی مذہب کی بے حرمتی کرتے ہیں تو گویا لاکھوں یا کروڑوں یا اربوں انسانوں کے جذبات کا خون کر رہے ہوتے ہیں۔ احترام آدمیت کا تقاضا یہ ہے کہ آپ ہر عالم کی عزت کریں، چاہے اس کے نظریات سے آپ کو کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو۔ علم ہمیشہ واجب الاحترام ہوتا ہے چاہے وہ آپ کے پاس ہو یا آپ کے دشمن کے پاس۔ ابھی پانچ منٹ بھی نہیں گزرے ہوں گے کہ ڈیلفینا واپس لوٹ آئی۔ اس کے ہمراہ ایک شخص تھا۔ اس شخص پر نگاہ پڑتے ہی میں چونک اٹھا۔ میں نے چند گھنٹے پہلے ہی اسے اپنے خواب میں دیکھا تھا۔

سیاہوٹ میں لمبوں اس شخص نے اپنی گرین آنکھوں

دیکھ کر کہا۔ ”تاہم دیکھ چکا ہوں۔ گیارہ بجتے والے ہیں اور.....“ لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس لی پھر یہ دستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”ڈیلفینی جی! مجھے گدھے اور گھوڑے پالنے کا کوئی ہنر ہے اور نہ ہی ان کی خرید و فروخت سے کوئی دلچسپی۔ میں جن حالات سے گزر رہا ہوں اس میں تو مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ خود کو بی بیٹا پڑ گئے۔“

”تمہاری یہ خواہش ضرور پوری کی جائے گی۔“ وہ بھی جواب میری آنکھوں میں بہت دور تک دیکھتے ہوئے بولی۔ ”لیکن فی الحال تم جلدی سے فریض ہو کر لیونگ روم میں آ جاؤ۔ بس تھوڑی سی دیر میں رتی بنگلے پر پہنچنے والے ہیں۔“ ”کون رتی؟“ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ”ارے یا ارادت! میں نے تمہیں بتایا نہیں تھا کہ ایک مولوی صاحب سے تمہاری ملاقات کراؤں گی۔“ وہ غصے سے لہجے میں وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ”رتی ہمارے لیے بہت محترم شخصیت ہیں۔“

”اوکے..... میں تیار ہو کر آ رہا ہوں۔“ میں نے سرسری انداز میں کہا۔ وہ واپس جانے کے لیے پلٹ گئی۔ میں داش روم میں محسوس کیا۔

اس وقت میں نے ڈیلفینا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کی تھی اور اس کی آنکھوں میں مجھے وہ شعلہ باری دکھائی نہیں دی تھی جو گزشتہ شب سوئنگ پول پر نظر آئی تھی۔ اس وقت اس کی آنکھیں دیکھتے ہوئے انگارے بن گئی تھی لیکن ابھی وہ بالکل نارمل تھی جیسا کہ عموماً ہوا کرتی تھی۔ میں نے ڈیلفینا کے تصورات سے کھیلنے ہوئے ایک بھرپور شاور لیا اور تیار ہو کر لیونگ روم میں پہنچ گیا۔ ڈیلفینا پہلے سے ڈائننگ ٹیبل پر موجود تھی۔ ڈائننگ والا پورشن لیونگ روم سے ملحق تھا۔ بیچ میں بیڈروم والی لڑیاں لٹک رہی تھیں۔ یہ رنگ بے رنگ بیڈروم والی لڑیاں ڈائننگ والے پورشن کو مکمل پرائیویسی فراہم کرتی تھیں۔

ناٹھتے کے دوران میں ڈیلفینا خاموش رہی تاہم تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد وہ کن آنکھیں سے بڑے مختصر انداز میں مجھے دیکھ لیتی تھی۔ اس کی اس اپنی ہوئی نظر میں یہ سوال جھلک تھا کہ میں اس سے کچھ پوچھ کیوں نہیں رہا ہوں۔ وہ مجھ سے متحد و استغفارات کی توقع کر رہی تھی لیکن میں نے بھی یہ طے کر لیا تھا کہ اب اس سے کوئی سوال نہیں کروں گا۔ اس کی ذات کے حوالے سے مجھے جو کچھ بھی جانا ہوگا، وہ اپنے

بڑے احترام کے ساتھ اس شخص کے ہاتھ چومے۔ اس نے ڈیلفینا کی پیشانی پر بوسہ دیا اور شفقت بھرا ہاتھ اس کے سر پر بھیرا بھیرا تقریب کا باقاعدہ آغاز ہو گیا۔

میں نے دیکھا کہ اس محترم شخصیت نے اپنے ہاتھوں سے ڈیلفینا کو ایک تاج پہنا یا جس پر وہاں موجود تمام افراد نے ڈیلفینا کو مبارک باد دی۔ یہ تاج پوشی نائب کی کوئی تقریب تھی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ ڈیلفینا کوئی اہم شخصیت ہے اور اس تقریب میں اس کے کسی عظیم کارنامے کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے اسے اعزاز سے نوازا گیا تھا۔

میں اگر یہ خواب نہیں بھی دیکھتا تو ڈیلفینا کی اہمیت پچھلے چوبیس گھنٹوں میں متعدد بار مجھ پر آشکار ہو چکی تھی اور اس خواب میں جانے سے پہلے تو اپنی خواب گاہ میں رہے ہوئے حالت نیند میں وہ بہ نفس نفیس نہ بدن دبیز میری آنکھوں کو خیرہ کر چکی تھی.....!

☆☆☆

آئندہ روز میری آنکھ تیز دنگ کی آواز پر کھلی۔ کوئی بے دردی دروازے کو پیٹ رہا تھا۔ میں بڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور دروازے کی طرف نکلے گا۔ اگلے ہی لمحے ڈیلفینا کی محترم آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

”علی! کیا تم ابھی تک سو رہے ہو؟“

میں نے نگاہ اٹھا کر دیوار گیر کلاک کی طرف دیکھا۔ کلاک گیارہ سے چند منٹ پہلے کا وقت بتا رہا تھا اور ظاہر ہے کہ یہ دن کے گیارہ تھے۔ میں نے بستر سے اٹھتے ہوئے کہا۔

”نہیں..... میں جاگ گیا ہوں۔ تم نے بیڈروم کے دروازے پر اپنی نازک تصیلیوں کی طوفانی ضربات سے جو صور پھونکا ہے اس کی ہیئت ناک آواز تو مجھے تاریک قبر کی نیند سے بھی بیدار کر سکتی تھی! یہاں تو میں ننگ لگاں والے والے آرام دہ بیڈروم میں سو رہا تھا۔“

بات ختم کرتے ہی میں بستر سے اتر آیا اور دروازے کی سمت قدم بڑھا دیے۔ میرے ”ننگ لگاں وال“ والے الفاظ نے اس کی بولی بند کر دی تھی لیکن یہ خاموشی لمحاتی تھی۔ اگلے ہی لمحے اس کی تسلی ہوئی آواز سنائی دی۔

”شکر ہے تم اٹھ گئے۔ میں تو سمجھ رہی تھی تمام گدھے گھوڑے بیچ کر بڑی فراغت سے سو رہے ہو۔ دیکھو تو تاہم کیا ہوا ہے.....!“

ادھر اس کی بات ختم ہوئی اور میں نے اس کے سامنے بیڈروم کا دروازہ کھول دیا پھر اس کی آنکھوں میں

انسانی دماغ اس دنیا کا پہلا اور آخری مجوبہ ہے۔ اس کے میکائزم کو ابھی تک مکمل طور پر سمجھا نہیں جاسکا۔ جو چیز مکمل طور پر مجھ میں آجائے وہ پھر مجوبہ کہاں رہتی ہے! انسان دن بھر جس نوعیت کے حالات سے گزرتا رہتا ہے، خصوصاً رات کو سونے سے پہلے اس کے دماغ میں جو سوچ ہوتی ہے، اتنی ہی صد خواب وہ اسی سے متعلق دیکتا ہے۔ اس وقت ڈیلفینا اور اس کی کرشمہ کاریاں میرے دل و دماغ پر چھائی ہوئی تھیں لہذا میں نے خواب میں بھی اسی کو دیکھا اور یہ بڑا سنی خیر خواب تھا۔

میں نے دیکھا کہ ایک بہت بڑا ہال ہے جہاں کم و بیش دو درجن افراد جمع ہیں جن میں خواتین و حضرات سب شامل ہیں۔ اس ہال کا ماحول قدیم زمانے کا ہے۔ بڑے بڑے پتھروں سے بنی ہوئی دیواریں اور اونچی منقش چھت جیسا کہ رومن اور یونانی تہذیب میں نظر آتی ہیں۔ وہاں پر موجود تمام افراد جبہ نما یعنی لباس زیب تن کیے ہوئے تھے۔ وہ بہت ہی محترم اور معزز دکھائی دیتے تھے اور ایک دوسرے کے ساتھ بھی بڑے احترام کے ساتھ پیش آ رہے تھے۔ ان میں دو درجن کے بیچ مجھے ڈیلفینا بھی نظر آ گئی۔

ڈیلفینا کا بناؤ سنگار اور تیاری دیکھنے کے لائق تھی۔ وہ اس طرح بنی سنوری تھی جیسے تقریب اسی کے نام ہو..... اس کی سالگرہ یا عکسی یا شادی یا کسی نوعیت کی کوئی اہم اور یادگار تقریب۔

پھر اس پر شہو ہال میں میں نے ایک ایسے شخص کو داخل ہوتے دیکھا جس کی حیثیت وہاں مہمان خصوصی ایسی تھی۔ اسے دیکھ کر سب باادب ہالماحتہ ہوشیار ہو گئے تھے۔ اس بار محترم شخصیت نے سیاہ پیٹ کوٹ سوٹ پہن رکھا تھا اور اس کے جوتے بھی سیاہ ہی تھے البتہ شرٹ سفید تھی اور اس نے گہرے ڈائس والی ٹائی بھی لگا رکھی تھی۔ اس کے سر پر اونچی ٹاپ والا سیاہ ٹال فیڈر اوبیٹ نظر آ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں سبز تھیں اور اس نے فریم لیس چشمہ لگا رکھا تھا۔ اس کے چہرے پر میڈیم سائز کی ڈاڑھی بھی تھی جس میں سفید اور بھورے بالوں کا تناسب ایک جیسا تھا۔ میرے مقامی اندازے کے مطابق اس کی عمر پچاس کے ارد گرد ہے۔ وہاں پر موجود افراد میں سے بعض اس سے عمر میں زیادہ بڑے تھے لیکن سب اس کے سامنے ادب سے جھک رہے تھے اور وہ سب کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا۔

ڈیلفینا کے قریب پہنچ کر وہ رک گیا۔ ڈیلفینا نے

پر فریم لیس چشمہ لگا رکھا تھا۔ سفید شرٹ پر چمک دار گرے ڈاؤس والی ٹائی اور سر پر سیاہ ٹال فیڈ وراہیٹ بھی نظر آ رہا تھا۔
 ”ٹال فیڈ وراہیٹ“ ”در اصل“ ”ٹاپ ہیٹ“ کی ایک شکل ہے جس میں ٹاپ کافی اونچائی پر ہوتی ہے۔ ڈیٹھیٹ کے ساتھ لیونگ روم میں داخل ہونے والے اس شخص کی ڈاڑھی میں سفید اور بھورے بالوں کی کچھڑی سی بنی ہوئی تھی اور اس کی عمر لگ بھگ پچاس سال نظر آتی تھی۔ یہ وہی شخص تھا جس نے میرے خواب میں ڈیٹھیٹ کی تاج پوشی کی تھی۔ وہاں پر موجود ہر شخص اس کا بے حد ادب کر رہا تھا اور اب..... ڈیٹھیٹ ایک ربی کی حیثیت سے اسے مجھ سے ملو رہی تھی۔

اس ربی کو دیکھتے ہی میں بے ساختہ اٹھ کھڑا ہو گیا۔ میری اس بے اختیار حرکت میں ایک خاص قسم کا احترام پایا جاتا تھا۔ ربی ڈیٹھیٹ کی معیت میں چلتے ہوئے مجھ تک پہنچا پھر زیر لب مسکراتے ہوئے اس نے میرے سر پر شفقت بھرا ہاتھ پھیرا اور بڑی نرمی سے بولا۔
 ”بیٹے جاؤ مانی سن!“

میں نے اس کی بات مان لی۔ وہ بھی میرے سامنے ایک صوفے پر براجمان ہو گیا۔ ڈیٹھیٹ ہم دونوں کے بیچ مل کا کردار ادا کرتے ہوئے سائڈ کے ایک صوفے پر بیٹھ گئی پھر ربی کا تعارف کراتے ہوئے بولی۔

”علی! یہ ہمارے محترم ربی آئزک باروخ لاؤ ہیں۔“
 علی ایسی سے تعریف لائے ہیں۔ ہماری یہ خوش قسمتی ہے کہ انہوں نے ہمیں کچھ وقت دینے کا فیصلہ کیا ورنہ ان کی اپنی اتنی زیادہ مصروفیات ہیں کہ انہیں اسرائیل سے باہر نکلنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ اسرائیل کے تمام مذہبی اور روحانی معاملات کو دیکھنے کے لیے دوری کا انتخاب کیا جاتا ہے جن میں سے ایک اٹلے نازی ربی کہلاتے ہیں اور دوسرے سیفاورڈی ربی کہلاتے ہیں۔ ان ربی کا چنانچہ دس سال کے لیے ہوتا ہے۔ آئزک باروخ لاؤ اٹلے نازی ربی ہیں جبکہ ان کے سامنے سیفاورڈی ربی کا نام بیٹ زاک سامن ہے۔ یہ دونوں چیف ربی کہلاتے ہیں۔ ان کا چنانچہ ہزار تیرہ میں کیا گیا تھا۔ مطلب یہ کہ دو ہزار تیس تک یہی دونوں افراد تمام تر مذہبی اور روحانی امور کنٹرول کریں گے۔“

مجھے اس تفصیل سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ آئزک باروخ لاؤ کس پائے کا ربی تھا تاہم اس کی ذات کے حوالے سے میرے ذہن میں ایک خاص نوعیت کا تجسس جاگ اٹھا تھا کیونکہ گزشتہ رات میں نے اسے خواب میں دیکھا تھا۔ بہر حال میں نے معتدل انداز میں کہا۔

”آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔“

”سدا خوش رہو مانی سن۔“ وہ ہنزون پر نرم مسکراہٹ سمجھتے ہوئے بولا۔ ”میں ایک ضروری کام سے کھینچا ہوا تھا۔ ڈیٹھیٹ نے تعریفی انداز میں تمہارا تذکرہ کیا تو میرے دل میں تم سے ملاقات کا اشتیاق پیدا ہو گیا اور میں یہاں چلا آیا تاکہ تمہارے ہاتھوں کو دیکھ سکوں۔“

”میرے ہاتھوں کو.....؟“ میں نے چونک کر حیرت بھرے انداز میں ربی کی طرف دیکھا۔ ”محض! میں کچھ سمجھا نہیں۔“

”ڈیٹھیٹ نے مجھے بتایا ہے کہ تمہاری پھیلی پر دو انتہائی اہم نشان ہیں۔“ ربی آئزک باروخ لاؤ ٹھہرے ہوئے انداز میں بولا۔ ”اس نے مجھے تمہارے ہاتھوں کا پرنٹ بھی بھیجا تھا۔ میں ہاتھ کی لکیروں کا مطالعہ جانتا ہوں۔“
 اب کی بار میں نے سوالیہ نظر سے ڈیٹھیٹ کی طرف دیکھا۔ وہ میری نگاہ میں چپے ہوئے استفسار کو فوراً سمجھ گئی جلدی سے جوابا بولی۔

”علی! کل دن میں بیچ کے بعد تم یہاں لیونگ روم کے ایک صوفے پر سونے تھے تو میں نے تمہاری پھیلیوں کو اسٹین کر کے ربی کو بیچ دیا تھا۔“

”اوہ.....!“ میں ایک گہری سانس خارج کر کے رہ گیا۔
 پرستمن ہالو کے اس بیٹکے پر میرے ساتھ سب کچھ غیر معمولی اور ناقابل فہم پیش آ رہا تھا۔ اب مجھے یقین ہو چلا تھا کہ گزشتہ روز والے بیچ میں کوئی ایسی شے موجود تھی جس نے مجھے اٹھائیل کر دیا تھا اور مجھے کمر احساس نہیں ہو سکا تھا کہ کب غفلت بھری نیند کے دوران میں ڈیٹھیٹ نے میرے ہاتھوں کی پھیلیوں کو اسٹین کر کے ان کے پرنٹس ربی کو بیچ دیے تھے۔

”میں نے اتفاق سے تمہاری پھیلی پر وہ اہم نشانات دیکھ لیے تھے۔“ ڈیٹھیٹ اٹھ کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔
 ”اس لیے میں نے ربی کو آگاہ کرنا ضروری سمجھا تھا۔ خیر..... تم لوگ باتیں کرو۔ میں ابھی آتی ہوں۔“

اپنی بات ختم کر کے وہ لیونگ روم سے نکل گئی۔ مجھے یہ سمجھنے میں کوئی وقت محسوس نہیں ہوئی کہ وہ دانستہ وہاں سے ہٹ گئی تھی تاکہ ہم تسلی سے بات کر سکیں۔ یہ الفاظ دیکر ربی پورے اطمینان سے میرا انٹرویو کر سکے۔

”مانی سن! میرے قریب آ جاؤ۔“ ربی نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

اس کی آنکھوں میں بے پناہ متلاطمی قوت پائی جاتی تھی۔ میں کسی محرزہ شخص کی طرح اٹھا اور ربی کے پہلو میں جا بیٹھا۔ وہ میرے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر پڑھنے

لگا۔ میرے دائیں ہاتھ کی انگشت شہادت کی جڑ پر اپنی انگلی رکھتے ہوئے اس نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔
 ”مانی سن! انڈیکس فنکٹر یعنی پہلی انگلی کے نیچے حصے میں تمہیں یہ نصف دائرہ سا بنا ہوا نظر آ رہا ہے نا۔ یہ رنگ آف سولن یعنی سلیمانی انگشتی کہلاتا ہے اور جس مقام پر یہ واقع ہے، اسے ماؤنٹ آف جیو پٹرن یعنی مشتری کا ابھار کہا جاتا ہے۔ کسی ہاتھ میں رنگ آف سولن کی موجودگی اس شخص کے بلند اقبال اور برفن مولا ہونے کو ظاہر کرتی ہے۔ ایسے شخص کے اندر بے پناہ روحانی قوت پائی جاتی ہے اور اس کی چھٹی حس بہت تیز ہوتی ہے۔ وہ زندگی بھر پیسے میں کیلتا ہے اور اکثر اوقات یہ پیسا کسی اور کا ہوتا ہے۔ مطلب یہ کہ اسے پیسا کمانے کے لیے جدوجہد کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس کی کفالت اور مالی معاونت کے لیے کوئی نہ کوئی کھڑا ہوتا ہے۔ یعنی اس شخص کے معاملات ”کمائے کی دنیا“ کمائیں گے ہم“ جیسے ہوتے ہیں۔“

ربی سانس ہموار کرنے کے لیے رکا تو میں سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ وہ بالکل بیچ کہہ رہا تھا۔ میرے ساتھ تمام تر وہی معاملات تھے جو اس نے بیان کیے تھے۔ مجھے آج

وقت تک کسی قسم کی حاشیائی کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا اور یہی گزر بسر انکل سلطان کے پیسے پر ہو رہی تھی۔ میں نے تعریفی نظر سے اس کی طرف دیکھا تو وہ اپنے ملے جوبے کو آگے بڑھاتے ہوئے بتانے لگا۔
 ”یہ دوسری انگلی یعنی منڈل فنکٹر دیکھ رہے ہو..... اس انگلی کی جڑ میں تمہیں چھ شاخوں والا ایک ستارہ سا بنا دکھائی دے گا جیسے تین لائنوں کو ایک دوسرے کے اوپر ڈرا کر دیا گیا ہو۔ یہ ڈیوڈ اسٹار یعنی ستارہ داؤدی کہلاتا ہے اور جس مقام پر یہ نظر آ رہا ہے، اسے ماؤنٹ آف سینٹرن یعنی زحل کا ابھار کہا جاتا ہے۔ ماؤنٹ آف سینٹرن پر ڈیوڈ اسٹار کی موجودگی حامل بندہ کو بہت زیادہ کامیاب اور کارمان ظاہر کرتی ہے۔ اس شخص کے ہاتھ پارس ہتھ کے مانند ہوتے ہیں۔ اگر وہ مٹی کو کبھی چھو لے تو وہ سونا ہو جاتی ہے لیکن زحل کے ابھار پر ستارہ داؤدی چند خرابیاں بھی لاتا ہے جن میں لاتعداد دشمن، والدین کی محبت اور شفقت سے محرومی اور بے اولادی سرفہرست ہیں۔“ میری ابھی شادی نہیں ہوئی تھی لہذا اولاد کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ جہاں تک لاتعداد دشمنوں والی بات تھی تو اس سلسلے کا آغاز ہو چکا تھا۔ والدین کی

محبت اور شفقت سے محرومی والی بات بھی صد فی صد درست تھی۔ میں آج تک اپنے والدین کے سامنے سے محروم تھاتی کہ ان کا نام تک نہیں جانتا تھا۔ رونی آئزک کاظم مجھے سنا کر رہا تھا۔ وہ اپنے سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے بولا۔
 ”اور یہ دیکھو ماڈرن آف مون یعنی جانکا امارا“

اس کے ساتھ ہی اس نے میری پھلی کی اس حصے کی جانب اشارہ کیا جو انگوٹھے کی پمفلت میں مس کائی کے اوپر اور پمفلت کی انتہائی نیچے واقع تھا۔ ”چاند کے اجبار پر انیٹیشن کی لائن بھی بہت واضح ہے جو ماؤنٹ آف مون سے اٹھ کر پمفلت کی سمت یعنی ماؤنٹ آف مرکری کی طرف بڑھ رہی ہے۔ یہ لائن خط وجدان یعنی انیٹیشن لائن کہلاتی ہے۔ جس شخص کے ہاتھ میں خط وجدان ہو، وہ وجدانی قوتوں کا مالک اور مستقبل بین ہوتا ہے۔ اس کے اندر کہانت کی صلاحیت ہوتی ہے۔ بعض اوقات اس پر الہامی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور وہ مستقبل میں پیش آنے والے واقعات سے باخبر ہو جاتا ہے۔“

”قبلاً! آپ کا علم چاہیے۔“ میں نے صدقِ دل سے اس کے کمالِ فن کا اعتراف کیا۔ ”میں پاسنری کی ایجنسی سے بھی واقف نہیں ہوں مگر آپ جو کچھ فرما رہے ہیں، وہ ساری باتیں سچی کھری اور وزن دار ہیں۔“

”اب تم میرے سامنے جا کر بیٹھو۔“ اس نے نرمی سے کہا۔

میں نے اس کی بات کی تقلید کی۔
 ”جی اس کائنات کی سب سے بڑی حقیقت ہے مائی
 سن۔“ وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔ ”انسان کو
 ہمیشہ جی بولنا چاہیے اور اسد جگ کا ساتھ دینا چاہیے۔“
 ”میں بھی جی کو پسند کرتا ہوں۔“ میں نے مضبوط لہجے
 میں کہا۔

”صرف پسند کرتے ہو یا چاہتے بھی ہو؟“ وہ بہ دستور میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے عجیب سے لہجے میں مستفسر ہوا۔

”بالکل یوں بھی ہوں اور ڈکے کی چوٹ پر یوں ہوں۔“ میں نے بڑے فخر سے کہا۔

”مائی سن! اگر میں تم سے کوئی ذاتی نوعیت کا سوال پوچھوں تو اس کا سچ سچ جواب دو گے؟“ اس نے کبھیر انداز میں کہا۔

”جی ہاں۔“ میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ”آپ پوچھیں۔“

گھری سنجیدگی سے سوال کیا۔
 ”میں نہیں جانتا۔“ میں نے راست گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

”ہوں.....“ وہ گہری سوچ میں ڈوب گیا پھر پوچھا۔
 ”کسی غریبہ نامی خاتون کو جانتے ہو؟“
 ”کون غریبہ؟“ میں نے پوچھا۔

”میں میڈم غریبہ کی بات کر ہوں۔۔۔“
 خاتون کہتے ہوئے بولا۔ ”خاتون پاکستان کے ایک
 اثر بیورو کرینٹ خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ جتنی تمہاری
 اس وقت عمر ہے یا اس سے ایک دو سال زیادہ عمر ہے پہلے
 میڈم غریبہ پاکستان سے امریکا آئی تھی۔ اس نے کئی نو فرما
 کے شہر سان ڈیاگو کو اپنے لیے چاروالفریڈی نامی ایک عیسائی
 مرد سے شادی کر لی پھر ان کا ایک بیٹا پیدا ہوا جس کی عمر دو
 میں تمہارے برابر ہوگی۔ میڈم غریبہ سان ڈیاگو کے
 ملاتے پام ایونیو پر واقع کنٹیننٹس اسٹور ”سیون
 یون“ کی فرنیچر سنبجی رہی تھی اور پھر ایک دن اچانک
 تینوں افراد غائب ہو گئے اور آج تک مفقود و گمراہ ہیں۔۔۔۔۔“
 میں نے واضح طور پر غصوں کیا کہ ربی آئزک نے
 اپنی گفتگو کا اسٹیزنگ پاسٹری سے اچانک میری ذات کی
 صرف سوڈیا تھا جیسے اسے میرے حوالے سے کسی قسم کی
 کوئی خاص کمون ہو۔ میں نے قدرے ہزار ہا سے کہا۔

”میں ایسی کسی میڈم غریبہ کو نہیں جانتا میرے محترم۔“
 ”وہ بہت مسلم اینڈ اساتذہ تھی۔“ وہ ٹھہرے ہوئے
 لہجے میں بولا۔ ”اس کی رنگت سانولی اور بال کالے تھے۔
 زیادہ نہیں تھا اس لیے وہ عموماً جنرل کیل والی سیڈلز پہنتی
 تھی۔“ جیز اور فریڈ نے اس کا پسندیدہ پیدا دیا۔
 ”ایسا بے ہوگا۔“ میں نے اس کا تے ہوئے لہجے میں
 ”لیکن انہیں اس بات پر کبھی شک تھا؟“

”اگر کوئی تعلق فی الحال نظر نہیں آ رہا تو ممکن ہے،
کے چل کر کوئی گہرا تعلق نکل آئے۔“ وہ پُر معنی انداز میں
”میں نے تو بس ایسے ہی تم سے پوچھ لیا۔“

سین میں جانتا تھا کہ اس نے کچھ ایسے ہی نہیں ہو چکا۔ وہ میرے حوالے سے کسی خصوصی تحقیقاتی مشن پر دھماکا نہیں کیا۔ مجھے یہ محسوس کرنے میں کسی دشواری کا سامنا نہیں ہوا۔ اگر وہ مجھے اس نامعلوم میڈم فریڈ کا بیٹا سمجھ رہا تھا تو لازم وہ یہ بات میرے دماغ میں بٹھانے کی کوشش رہا تھا اور کچھ بات یہ ہے کہ میں نے ربی آنزک باروخ کی اس بات کو ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال

وقت

محسوس کر رہا ہوں کہ ہم دونوں بھی سول میٹ ہیں۔“
 ”ہاں، ایسا ہو سکتا ہے۔“ میں نے سرسری انداز میں
 کہا مچھر پر چما۔ ”کیا آپ جانتا جاتے گے کہ آپ میرے
 خواب میں کیا کر رہے تھے؟“
 ”بتاؤ کسی نئی۔ میں ضرور جانتا جاتا ہوں گا۔“ وہ بہتر
 گوش ہو گیا۔

میں نے جواباً اسے ڈیلھینا کی تاج پوتی والا قصہ
سنادیا۔

اس نے پوری توجہ سے میری بات سنی اور میرے خاموش ہونے پر کہا۔ ”نانی! میں نہیں جانتا کہ تمہارے ہاتھ میں جادو کے اجمار پر خداوندان موجود ہے۔ اس خدا کا حامل شخص منتقل میں جہان کے مصلحت رکھتا ہے لہذا تمہیں بھی خواب کے ذریعے بشارت مل گئی کہ آنے والے دنوں میں ویٹلینا کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔“

”تو کیا میرا یہ خواب سچا تھا؟“ میں نے اضطرابی لہجے میں دریافت کیا۔ ”مستقبل قریب میں کیا واقعی ڈیفینڈا کی تاج پوشی ہونے والی ہے۔“

”ایک سوا ایک فی صد مالی سن!“ وہ پروتوق
اعزاز میں بولا۔ ”وہ ایک خاص مرحلے کے لیے کو ایفا کی
کر چکی ہے۔ اس کا ایک پروٹوشن ڈیو ہے جس کے سلسلے میں
اس کی تاج پوشی ہونا ہے لیکن.....“

اس نے جملہ ادھورا چھوڑا تو میں نے سوال کیا۔
 ”لیکن کیا محترم ربی؟“

”مالی بن! ابرائمان کے اندر رشت اور ملتی قوت کے حامل دو بچے میچے ہوئے ہیں۔“ وہ بتانے لگا۔ ”آپ جس بچے کو اپنے جس قسم کے اعمال کا فیئر ملنا چاہیں گے، وہ روزِ بروز روزِ زیادہ طاقت ور ہوتا چلا جائے گا۔ اگر ختی قوت کا حامل بچہ لاغر ہونے کے بعد جسمِ بدر ہو جائے تو انسانِ خدا کی صفات کو چھو لیتا ہے اور اگر رشتِ قوت کا حامل بچہ کرور پڑنے کے بعد جسمِ بدر ہو جائے تو انسانِ شیطانی صفات کا شاہکار بن جاتا ہے لیکن کسی بھی بچے کی ”جلادِ ختی“ کا مرحلہ بہت ہی نازک ہوتا ہے کیونکہ جلاوطن ہونے والے بچے کو مکمل ڈال کر رکنا پڑتی ہے تاکہ وہ آپ کا مینا عذاب نہ کر دے۔ اس موقع پر ذرا سی غفلت بھی کوئی بہت بڑی خرابی پیدا کر سکتی ہے اور ڈیٹلفینا کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔“

اس لیے ان نفساتی باتوں کو سمجھنے کے لیے مجھے ذہن پرز بادہ

ہر نہیں کیا تھا۔ یہ نکتہ میرے ذہن میں ایک خاص جگہ بنانے میں کامیاب رہا تھا اور اس کا بھی ایک خاص ہی سبب تھا۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا تھا اپنی نگاہ کے سامنے اٹکل سلطان ہی کو دیکھا تھا۔ وہی میرے مربی میرے سرپرست میرے خیر خواہ اور میرا سب کچھ تھے۔ وہ جانتے تھے کہ میرے والدین کون ہیں۔ انہوں نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وقت آنے پر وہ مجھے میرے والدین کے بارے میں سب کچھ بتادیں گے لیکن میں نہیں جانتا تھا کہ وہ خاص وقت کب آئے گا۔ میں نے چونکہ اپنے ماں باپ کو کبھی نہیں دیکھا تھا اور ان کے حوالے سے میری معلومات بھی صفر کے برابر تھیں لہذا لی آئزک نے میڈم غریہ کا ذکر کیا تو میرے اندام کھلبلی ہی مچ گئی تھی۔ فوری طور پر بے ساختہ میرے ذہن میں اس سوال نے سر اٹھایا تھا..... کہیں میں میڈم غریہ کا جانا تو نہیں.....؟

ربی کے یہ الفاظ بھی میرے ذہن کو پراگندہ کر رہے تھے کہ..... اگر کوئی تعلق فی الحال نظر نہیں آ رہا تو ممکن ہے، آج کل کر کوئی سہرا تعلق نکل آئے.....!

میں نے اپنے حویان کو ہانے کے لیے رٹی سے کہا۔
 ”حضرت! گزشتہ رات میں نے آپ کو خواب میں دیکھا ہے۔“
 ”اوہ..... بہت خوب۔“ وہ سانس کی نافر سے مجھے تکتے لگا۔
 ”لیکن یہ کیسے ممکن ہے؟“ میں نے الجھن زدہ
 انداز میں کہا۔

”تم تو آپ کو جانتا تک نہیں۔ آج ہماری پہلی ملاقات ہے پھر میں نے آپ کو خواب میں کیسے دیکھ لیا؟“

”یہ کوئی ایسا نامکن یا عجیب نہیں ہے۔“ وہ غصے ہوئے لیجے میں سمجھانے لگا۔ ”ہم سب ایک آدم کی اولاد ہیں اور ہمارے بیچ ”برادر بڑ“ یعنی بھائی چارے کا رشتہ قائم ہے۔ ہم سب ایک خالق کی مخلوق ہیں ایک مسند کے قطرے ہیں ایک درخت کے پتے ہیں ایک گھڑیال کے کانٹے ہیں ایک فیملی کے کمبرز ہیں اور جہاں تک روحانی سیلان کی بات ہے تو.....“ اس نے لمبائی توقف کر کے ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”.....تو تمام اردواح کو ایک ہی وقت پر پیدا کروایا گیا تھا۔ کارخانہ قدرت میں یہ سب عمر ہیں اور ایک دوسرے کو اچھی طرح پہچانتی ہیں اور جو لوگ روحانی سامعہ یعنی سول میٹ ہوتے ہیں، وہ چاہے زندگی میں بھی ایک دوسرے سے نہ ملے ہوں لیکن انہیں یقین ہوتا ہے کہ وہ اک دوسرے کو اچھی طرح جاننے اور پہچاننے ہیں۔ میں

زور نہیں دیتا پڑا۔ وہ اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے بولا۔
 ”ڈیلفینیا نے ایک طویل جدوجہد کے بعد منی قوت کے حامل بچے کو لات مار کر اپنے اندر سے باہر تو پھینک دیا تھا لیکن وہ اسے مناسب انداز میں ڈسپوز آف نہیں کر سکی تھی اور اب یہی منی قوت اس کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ بنی ہوئی ہے اور اس کے بنے بنائے کاموں کو مبین وقت پر پکا کر رکھ دیتی ہے۔“

رہی آنک نے ڈیلفینیا کی جگزی ہوئی منی قوت کا ذکر کیا تو میرا دھیان آپوں آپ رات والے پراسرار واقعے کی طرف چلا گیا جب نصف شب کے بعد میں نے ڈیلفینیا کو سوئنگ پول کے اندر سوئنگ کرتے دیکھا تھا اور جب وہ سوئنگ سے فارغ ہونے کے بعد کھلی تھی تو مجھے اس کی آنکھوں کی جگہ دیکھتے ہوئے دوسرا رخ انکارے رکھے دکھائی دیے تھے جنہیں دیکھ کر میرے رو جگنے کو بے ہو گئے تھے۔ وہ ڈیلفینیا شیطانی صفات کی حامل نظر آتی تھی۔ میں نے رہی آنک کو اس واقعے کے بارے میں بتایا تو وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔

”مائی سن! تم نے ڈیلفی کے اسی منی روپ کو دیکھا ہے جو ڈیلفی کے لیے کرائے پر پانی پھرنے کی کوشش میں مصروف ہے اسی لیے اس کی تاج پوشی کی رسم میں ہر بار کوئی نہ کوئی گڑبڑ ہو جاتی ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ میں بہت جلد اس منی ڈیلفینیا کو قابو کر لوں گا پھر وہ بھی ڈیلفی کے راستے کی دیوار نہیں بن سکے گی۔“

”کیا انسان کی شخصیت کا یہ منی پہلو اس کے مثبت پہلو کا ہم شکل ہوتا ہے؟“ میں نے سوال کیا۔

”بالکل ٹھیک کہا تم نے۔“ وہ تصدیقی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”دلوں دیکھنے میں ایک ہی شکل و شبابت کے حامل ہوتے ہیں جیسے کہ جڑواں انسان لیکن ان میں فرق صرف پولیرینی یعنی چارن کا ہوتا ہے۔ ایک منی چارج اور دوسرا مثبت چارج ہوتا ہے۔ دیکھنے میں ایک جیسے مگر عمل میں ایک دوسرے کے برعکس۔“

”پھر تو ڈیلفینیا ان دونوں بڑے مشکل حالات سے گزر رہی ہے۔“ میں نے توشش بھرے لہجے میں کہا۔

”بہت زیادہ۔“ وہ متاثرانہ انداز میں ہونٹ کھینچتے ہوئے بولا۔ ”اور تم نے خواب میں اسے اسی شکل کے سوئنگ پول میں سوئنگ کرتے دیکھا ہے تو یہ اور بھی توشش والی بات ہے۔“

”میں نے سرخ آنکھوں والی ڈیلفینیا کو خواب

میں نہیں بلکہ کھلی آنکھوں سے سوئنگ پول میں سوئنگ کرتے دیکھا ہے۔“ میں نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔
 ”خواب والا واقعہ تو اس کی تاج پوشی کا تھا۔“
 ”ہوں۔۔۔۔۔“ وہ گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ چہرہ لمحات کے بعد اس نے ایک مرتبہ پھر گنگو کا اسٹریٹنگ میری ذات کی طرف گھما دیا اور میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”تو کیا تم واقعی اپنے ماں باپ کے بارے میں کچھ نہیں جانتے؟“

”اگر جانتا ہوتا تو ضرور آپ کو بتا دیتا۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے غلط بیانی کرنے کا کوئی شوق نہیں۔“
 ”ڈیلفی نے مجھے بتایا تھا کہ تم اپنے کسی انکل سلطان کے پاس رہتے ہو اور یہی شخص تمہارا سرپرست ہے۔“ وہ یہ دستور میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ ”یہ سلطان تو یقیناً تمہارے والدین کے بارے میں سب کچھ جانتا ہوگا!“
 ”ہاں۔۔۔۔۔ انکل کو اس حقیقت کا علم ہے۔“ میں نے مختصر سا جواب دیا۔

رہی آنک نے پوچھا۔ ”سلطان نے کبھی تمہیں بتایا نہیں؟“

”نہیں!“ میں نے کہا۔
 ”اور تم نے کبھی پوچھا بھی نہیں؟“
 ”متحدہ پار پوچھا ہے۔“
 ”پھر۔۔۔۔۔؟“

”وہ کہتے ہیں مناسب وقت آنے پر سب بتا دوں گا۔“ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

”مناسب وقت۔۔۔۔۔“ اس نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے میرے الفاظ کو دہرایا پھر اپنی ہی دھن میں بول چلا گیا۔ ”غریبہ کا تعلق پاکستان کے علاقے راول پنڈی سے تھا۔ وہ راول پنڈی پاکستان سے‘ سان ڈیاگو امریکا پہنچی تھی تو اس کی آمد کے پیچھے کوئی خاص مقصد چھپا ہوا تھا پھر یہاں امریکا میں اس نے ایک عیسائی مرد الغریب سے شادی کی حالانکہ وہ خود مسلمان تھی یہ بھی ایک خلاف معمول اور چونکا دینے والی بات ہے۔ جب ان کا بیٹا پیدا ہوا تو پھر یہ تینوں افراد کہیں غائب ہو گئے۔ ان کا بیٹا تمہارا ہم عمر تھا۔“

بات ختم کر کے وہ کوجبی ہوئی نظر سے مجھے ٹٹولنے لگا تو میں پوچھے بیٹا نہ رہا۔ ”محترم رہی! آپ مجھے بار بار میڈم غریبہ کا قصہ سنا رہے ہیں۔ اس کا کوئی خاص سبب ہے؟“
 ”بہت ہی خاص الخاص سبب ہے مائی سن۔“ وہ

وقت

گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”میری معلومات کے مطابق‘ غریبہ اور الغریب کا وہ بیٹا ایک غیر معمولی انسان ہے اور ہمیں غیر معمولی انسانوں ہی کی تلاش رہتی ہے۔“
 ”آپ غیر معمولی انسانوں سے کیا کام لیتے ہیں؟“
 میں نے استفسار کیا۔

”ہماری ایک سوسائٹی ہے۔“ وہ گہیر انداز میں بولا۔ ”جو دنیا بھر سے ذہین اور غیر معمولی انسانوں کو تلاش کر کے اپنے پاس لاتی ہے۔ ان کی مخصوص ذہنی، جسمانی اور روحانی تربیت کرتی ہے۔ پھر وہ قابل کسٹ ہو جاتے ہیں۔“

”میں نے پوچھا تھا کہ آپ ایسے افراد سے کیا کام لیتے ہیں؟“ میں نے سوال کیا۔

”میں اسی طرف آ رہا ہوں مائی سن!“ وہ معتدل انداز میں بولا۔ ”میں نے ابھی جس تربیت کا ذکر کیا ہے اس دوران میں ان افراد کو مختلف آزمائشی مراحل سے گزرا جاتا ہے تاکہ وہ حاکمیت کا ہنر سیکھ جائیں کیونکہ آگے چل کر انہیں اس دنیا کی باگ ڈور سنبھالنا ہوتی ہے۔ اس دنیا کے معاملات انہی کے اشاروں پر چلنا ہوتے ہیں جیسا کہ ابھی چل رہے ہیں۔“ اس نے لمبائی توقف کر کے نئی ہوئی نظر سے مجھے دیکھا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”اگر تم یہ سمجھ رہے ہو کہ اس دنیا کے مختلف ملکوں کا نظام وہاں کے بادشاہ، صدر، وزیر اعظم وغیرہ چلا رہے ہیں یا ان تمام ممالک کو امریکا چلا رہا ہے تو یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔ امریکا سب سے پوری دنیا کے تمام ممالک کے نظام کو ہماری سوسائٹی کے نمبرز چلاتے ہیں جنہیں ہر شے پر قدرت حاصل ہوتی ہے۔ وہ اپنی ذات اور اختیار میں زمینی خدا ہوتے ہیں۔“

رہی آنک بارود خ لاؤ کے آخری جیلے نے مجھے چونکا دیا اور اسی لمحے ڈیلفینیا کی زبان سے ادا ہونے والے الفاظ میرے دماغ میں جکڑا گئے۔ اس نے مجھ سے گنگو کے دوران میں ایک مرحلے پر۔۔۔۔۔ پوچھا تھا۔ ”کیا تم نے زمینی خدا کے بارے میں سنا ہے؟“

اب رہی بھی ایسی ہی بات کر رہا تھا لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ وہ یہ تمام باتیں مجھے کیوں بتا رہا تھا؟ تھوڑی دیر پہلے اس نے میرا ہاتھ دیکھا تھا اور اپنے پاس مٹری کے علم کی بنیاد پر میرے بارے میں چند باتیں بتائی تھیں جو کہ بالکل درست تھیں۔ میری اب تک کی زندگی ایسی ہی گزری تھی۔ آئندہ کسی گزرنے والی تھی یہ صرف میرا مالک جانتا تھا جو میرا خالق اور اراذل تھا۔ میں صرف اسی پر بھروسہ کرتا تھا لیکن یہ بات بھی ملے ہے کہ میں ایک انسان تھا لہذا انسانی

نفیات کی نئی نہیں کر سکتا تھا اور میری نفیات اس بات کا تقاضا کر رہی تھی کہ میں رہی ہے پوچھوں وہ میری ذات میں اس قدر دلچسپی کیوں لے رہا ہے؟ اس جیسا اہم اور مصروف شخص جس ایب کو چھوڑ کر میرے پاس بیٹھا اپنا وقت کیوں برباد کر رہا ہے؟
 ”محترم رہی!“ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ”میں آپ سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔“
 ”ضرور مائی سن۔“ وہ بڑی رمان بولا۔ ”تم جو کچھ پوچھو گے، میں بتاؤں گا اور صد فی صد صحیح بتاؤں گا۔“
 ”میں نے محسوس کیا ہے کہ آپ میری ذات میں بہت زیادہ دلچسپی لے رہے ہیں۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہنا شروع کیا۔ ”اس کے ساتھ ہی آپ میڈم غریبہ کے بیٹے پر بھی تحقیق کر رہے ہیں۔ کیا آپ مجھ میں اور غریبہ کے بیٹے میں کوئی کشش تلاش کرنے کی کوشش کر رہے ہیں؟“
 ”میں نے کہا ہے نا‘ تم سے خالص‘ گہری اور کبھی بات کروں گا۔“ وہ محسوس انداز میں بولا۔ ”اور یہی بات یہ ہے کہ میں میڈم غریبہ کے بطن سے الغریب کی ولدیت کے ساتھ پیدا ہونے والے شخص کی تلاش ہے۔ اس کے غیر معمولی انسان ہونے میں ہمیں کوئی شک و شبہ نہیں ہے۔ اسی تلاش کے دوران میں تم ڈیلفی سے عکرا گئے پھر تمہاری کوئی مجبوری تمہیں ڈیلفی کے قریب لے آئی۔ ڈیلفی بھی ہماری سوسائٹی کی تربیت یافتہ ہے لہذا اس کے غیر معمولی ہونے میں بھی کسی شک و شبہ کی گنجائش تلاش نہیں کی جاسکتی۔ ڈیلفی نے جب مجھے تمہارے بارے میں بتایا تو میرا دھیان غریبہ کے بیٹے کی طرف چلا گیا۔ اگرچہ تمہارا تو یہی دعویٰ ہے کہ تم غریبہ اور الغریب کی اولاد نہیں ہو لیکن تم اپنے اس دعوے کو ثابت نہیں کر سکتے۔ کیونکہ تم اپنے والدین کے بارے میں کچھ جانتے ہی نہیں ہو لیکن۔۔۔۔۔“ اس نے ڈرامائی انداز میں توقف کیا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

”لیکن۔۔۔۔۔ تم بھی ویسے ہی غیر معمولی انسان ہو جیسے افراد کی ہمیں تلاش رہتی ہے۔ تمہارے ہاتھ کی لکیریں بتاتی ہیں کہ تم ہمارے کام کے ہو۔ اگر تم ہماری سوسائٹی کے ممبر بن جاتے ہو تو یہ تمہارے لیے بڑے اعزاز کی بات ہوگی۔ اس کے بارے میں تم ضرور سوچنا۔“

”مئی۔۔۔۔۔ میں سوچوں گا۔“ میں نے اس کا دل رکھنے کے لیے کہا۔ ”میرے تو آپ نے ہاتھ دیکھے اور کہہ دیا کہ میں ایک غیر معمولی انسان ہوں لیکن غریبہ کے بیٹے کی تو کوئی بھی شے آپ کے پاس نہیں پھر آپ اس کے

قصا

نشان اسحاق

محبت میں انسان فرشتہ بھی بن سکتا ہے اور سر سے پیر تک انتقام بھی۔ جانے یہ کیسا جذبہ ہے کبھی جان دیتا ہے اور کبھی جان لیتا ہے۔ وہ بھی جو سر سے پیر تک اس کی محبت کے سمندر میں ڈوبی ہوئی تھی کہ وہ میں جانے کیا نظر آیا کہ سراپا انتقام بن گئی...

بھولی بھری یادوں کو مال سے ملائی ایک چمٹائی کہانی



یوں ہی جب اسے فرمت میر آئی تو وہ گاہکوں کے لیے بنائی گئی نشستوں پر بیٹھ گیا۔ خالی ذہن نظریں جھکائے بیٹھا رہا اور کسی ایسے ہی ہلے نظریں انہیں اور سامنے گئے قدام آئے میں اپنے عکس پر ساکن ہو گئیں۔ سر پر جالی والی ٹوپی، آنکھوں پر مونے شیشوں کی عینک کا چشمہ، مونچھوں کے تراشیدہ بال گھاس کے ٹکڑوں جتنی بڑی ہوئی شیو اور چہرے پر ابھرتی جھریوں کے راز۔ وہ راز جو تجسس ابھارتے ہیں، مگر رے دقت کی کہانی سناتے ہیں اور کہانی سننے کی لگن پیدا کرتے ہیں۔

عبدل کی ساری زندگی بھی ایسے ہی گاہکوں کے بال کاٹنے اور شیو بناتے گزری تھی۔ جتنے سال گزر گئے۔ زمانے کے انداز بدلتے رہے مگر اس کی زندگی کا ذہب نہ

بارے میں اتنے پُر وثوق کیوں ہیں؟
”بہت اچھا سوال ہے۔ جتنی پُر ذہانت۔“ وہ سناٹائی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”مگر میں فی الحال تجھیں اس سوال کا مکمل جواب نہیں دے سکتا۔“
”کیوں۔۔۔۔۔ اس کی کوئی خاص وجہ؟“ میں نے سرسراتے ہوئے لہجے میں کہا۔

”ہاں اس کا خاص سبب ہے۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”مکمل جواب دینے کے لیے مجھے اپنی معلومات کے ذرائع تم سے شیئر کرنا پڑیں گے اور بہت سی ایسی باتیں بتانا ہوں گی جن کی بنا پر تم ان معاملات کو سمجھ سکو لیکن۔۔۔۔۔ آئی ایم ویری سوری مائی سن! تم ابھی ہماری سوسائٹی کے ممبر نہیں بنے اور۔۔۔۔۔ غیر متعلقہ افراد سے اس نوعیت کے راز ڈسکس نہیں کیے جاسکتے۔ امید ہے تم میری بات کا برا نہیں منائو گے۔“

”نہیں۔۔۔۔۔ میں نے ہرگز برا نہیں منایا کیونکہ آپ نے ایک اصولی بات کی ہے۔“ میں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ”لیکن آپ کی اس اصولی بات نے میرے اندر تجسس جگا دیا ہے۔“

”تجسس! اس کی نظر میں استفسار تھا۔“ ہماری سوسائٹی کے بارے میں؟“

”جی ہاں۔۔۔۔۔ میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔“ آپ نے ایک راز یعنی ایک سیکرٹ کا تذکرہ کیا۔ اس تناظر میں آپ کی سوسائٹی ایک ”سیکرٹ سوسائٹی“ ہوئی نا۔۔۔۔۔ میرا تجسس ہونا تو جتنا ہے نا!۔۔۔۔۔“

”مائی سن! تم اپنی جگہ ٹھیک کہہ رہے ہو اور میں بھی اپنی جگہ درست ہوں۔“ وہ مدبرانہ انداز میں بولا۔ ”تاہم تمہاری نشئی کے لیے چند باتیں بتا دیتا ہوں۔“ وہ بولتے بولتے رکاوٹیں ہمہ تن گوش ہو گیا۔

”ہماری سوسائٹی اخوت اور بھائی چارے کا درس دیتی ہے اور اس کے تمام ممبرز آپس میں ایک دوسرے کے بھائی کہلاتے ہیں۔ ہر شخص اپنے دیگر بھائیوں کے دکھ درد کو سمجھتا ہے ان کے مفاد کا تحفظ کرتا ہے اور ضرورت پڑنے پر اپنے بھائیوں کی خاطر جان قربان کر دیتا ہے اور۔۔۔۔۔ ان کے دشمنوں کی جان لے بھی لیتا ہے۔“

رہی آنرک نہایت ہی سنجیدہ انداز میں میری معلومات میں اضافہ کر رہا تھا۔ اس نے مزید بتایا۔

”میڈم غریبہ پاکستان کے شہر راولپنڈی میں پیدا ہوئی تھی جو کہ قمری قمری نارتھ کے بہت قریب واقع

”میڈم غریبہ نے جب الغریز سے شادی کی تو اس وقت الغریز کی عمر تینتیس سال تھی یعنی قمری قمری اور غریبہ نے پورے تینتیس ماہ تک سیون الیون اسٹور میں کام کیا تھا۔ میرے نزدیک یہ سب اتفاق نہیں ہو سکتا مائی سن!“

رہی آنرک نے مجھے غور کرنے کے لیے کہا تھا اور رہی کی بات مان لینے میں کوئی حرج بھی نہیں تھا لیکن اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ اور رہی کی بات ختم ہوئی اور نقصان میں ایک کرب تک پہنچ سائی دی۔ یہ درد میں ڈوبی ہوئی ایک نسوانی چیخ تھی۔ ہم نے یک بہ یک چونک کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

رہی کا چہرہ متحیر ہو گیا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں کئی رنگوں کو ابھرتے ڈوبتے دیکھا جن میں غم، تشویش اور پریشانی کے رنگ غالب تھے۔ اس نسوانی چیخ نے اسے مضطرب کر دیا تھا۔

وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا پھر سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔ ”تم ایک منٹ اور ہری رکو۔ میں آتا ہوں۔۔۔۔۔“

بات ختم کرتے ہی وہ تیز قدموں سے چلتے ہوئے لیونگ روم سے نکل گیا۔ اس نے مجھے ایک منٹ وہیں رکھنے کو کہا تھا لیکن میں ایسا بھی فرماں بردار نہیں تھا۔ ان لمحات میں ایک منٹ کیا! میں تو ایک سیکنڈ بھی رکھنے کا روادار نہیں تھا۔

میں نے رہی آنرک کے پیچھے دوڑ لگا دی!۔۔۔۔۔

امنگوں حوصلوں اور اہوں کے بیچ رلائی کبھی محبتوں اور چاہتوں کے مدھم گیت سنائی اس ناقابل فراموش داستان کے مزید واقعات اگلے ماہ ملاحظہ کریں

بدلا۔ جب وہ جہان تھا، یہی کوئی چھبیس سال کا، تب اس نے کرائے کی دکان میں اپنا کاروبار سجا یا تھا اور بڑے خوشحال الفاظ میں پورے لکھو اکرا دیے۔

عبدل گرم حمام..... بال کاٹنے، شیشہ بنانے کے علاوہ اس نے دکان کے ایک کونے میں پانی کی چلائی لے کر ٹوٹی لکوائی، عارضی دیواریں کھڑی کیں اور لکڑی کا سینڈ وینڈ دروازہ لے کر حمام بھی تیار کر لیا۔ بازار سے پہلے اس کی دکان آتی تھی۔ آس پاس کے گھلوں کے بیچ بال کٹوانے آتے اور فوجی کنگ کی فرمائش کرتے۔ تو بے کی دہائی میں فوجی کنگ کا عروج تھا۔ عام شہری بھی سائڈز سے باریک کنگ کروا کر خوش ہوتے اور خود کو فوجیوں سے تشبیہ دیتے۔ شام ڈھلے دیگر دکاندار بھی آتے اور شیوہ بناتے۔ کھٹی مونچھوں والے مونچھوں کی تراش پر اہمیت دیتے اور چٹنی چلاتے عبدل کو ہدایات دیتے رہتے۔ باریک مونچھوں اور کٹن شیوہ حضرات کی جانب سے ان ہدایات کی چٹنی ہوتی اور عبدل شیوہ بناتا۔ ڈاڑھی کا کٹھ بنوانے مولوی صاحبان بھی آتے۔ قریب کی مسجد کے امام صاحب ابتدا ہی سے عبدل کے پاس آتے۔ حجامت سے فارغ ہو کر سامنے لگے آئینے میں بھر پور نظروں سے اپنا جائزہ لینے کے بعد ان کا ہاتھ جیب کی طرف ریتکتا۔ پیسے عبدل کی پھیلی پر رکھتے اور محبت سے کہتے۔

”بنا شیوہ مت بنایا کرو۔ حرام ہے اور اس کی کمائی استغفر اللہ حرام کی کمائی۔“

اور عبدل سرکرا دیتا۔ حلال حرام کے قصبے کبھی اسے خدا سے قریب نہ کر سکے اور وہ وہیں پر کھڑا ہوا اور پھر وقت گزرتا گیا۔ نئی صدی، نئے طور طریقے لائی اور پتا بھی نہ چلتا صدی کا پہلا عشرہ بھی گزر گیا۔

عبدل گرم حمام کی جگہ بورڈ پر عبدل ہیر ڈیر لکھا نظر آنے لگا اور آج کل لکھا تھا..... عبدل مین سیلون۔ کنگ، شیوہ، فیش، مساج..... اور نیچے نیچا چھوٹے نوٹ میں لکھا تھا..... یہاں پر دو لہجے بھی تیار کیے جاتے ہیں۔“

امام صاحب ماشاء اللہ ساری زندگی بیروں پر چل کر آتے رہے۔ حرام کمائی سے ڈراتے رہے۔ عبدل کا دل کھلا بھی اور اسے خدا سے ڈر بھی لگنے لگا مگر شہر کے گاؤں کو واپس بھیجنے کی ہمت نہ ہوئی۔ کوئی دوسرا روزگار اپنانے کی ہمت نہ کی کوئی دوسرا ہنر نہ تھا اور یہ دکان جو کبھی کرائے کی ہوا کرتی تھی، بچوں کو جوان کرنا اور پڑھانے کے علاوہ اس کی ساری زندگی کی کمائی یہ دکان ہی تھی۔ کوئی دس سال پہلے

وہ یہ دکان خرید چکا تھا۔ من میں تو آیا چھوڑے اس روزگار کو دکان میں کوئی کر یا نہ کر سامان ہی ڈلوادیتا ہوں۔ وہ کون سا گھر ہوگا جہاں کر یا نہ کر سامان کی ضرورت نہ ہوگی۔ دوستوں سے مشورہ کیا تو سب نے مخالفت کی۔

”لے عبدل! کیا ضرورت ہے۔ چلتا ہوا تیرا روزگار ہے۔ یوں رزق کے بدلے بدلنا تیرا نفع ہے۔“

”نہ عبدل تیری ہڈیاں اب کر یا نہ کر دکان کا بوجھ نہ اٹھایا بھیگی۔“

”کر یا نہ کر دکان چلانا تجربے کا کام ہے۔ اب تو کیا تجربہ حاصل کرے گا۔ اللہ غفور ہے۔ تجھے بھی بخش دے گا اور تو کون سا لوگوں کو بچہ بچہ کر زبردستی ان کی شیشہ بناتا ہے۔ خود ہی تیری دکان کی میز چھایا چڑھتے ہیں۔“ جتنے منہ اتنے مشورے مگر کسی ایک سامانی نے بھی بیوی سیلون کو کر یا نہ اسٹور میں بدلنے کا مشورہ نہ دیا۔ کوئی ایک سامانی تو ہمت افزائی کرتا۔ تو شاید آج یہ بیوی سیلون نہ ہوتا، کر یا نہ اسٹور ہوتا۔

مولوی صاحب کے انتقال کی خبر مسجد کے اسپیکر پر ہی نشر ہوئی تھی اور وہ سکتے میں آگیا۔ یوں اچانک ہارٹ ایک انہیں اس دنیا سے اس دنیا میں لے گیا اور عبدل دل گرفتہ رہ گیا۔ اس نے ہمیشہ نماز و معادان کے پیچھے ادا کی۔ عیدیں بھی ان کے پیچھے پڑھیں اور آج.....

اس کی آنکھیں نم ہوئی رہیں اور ان کی تدفین پر اس نے خود سے عزم بھی کیا۔

”ڈاڑھی رکھوں گا۔ ورنہ مرنے کے بعد اللہ کو کیسے منہ دکھاؤں گا۔“ مگر یہ عزم بھی فقط لفظوں تک ہی محدود رہا اور اس بات کو بھی سال گزرنے کو آن پہنچا۔ ہاں البتہ سر پر جالی والی ٹوپی مستقل طور پر جم گئی۔

چھبیس سال ہوئے کو آئے یہ کاروبار کرتے مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ کسی بے حد متبول حجام نہ رہا۔ خیر اب تو لوگ لفظ حجام کو بھولتے جا رہے ہیں۔ جوان تو ہیر ڈیر اور بار بار کہتے نظر آتے ہیں۔ ہر سال دو سال کے بعد کوئی نہ کوئی حجام مشہور ہوا نہ ہوا تو عبدل ہی نہ ہوا مگر شاید یہ اس کا زمانہ تھا۔

ایک روز کچھ ایسی دھن میں تھا کہ اس نے منہ طرز پر بال کاٹنے اور بالوں کی وہ کنگ جوانوں میں کچھ ایسی مقبول ہوئی کہ دور کے محلے کے جوان بھی عبدل بیوی سیلون کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے بالآخر اس کی دکان کی میز چھایا چڑھتے نظر آتے اور جب رائج شہری اصولوں کے مطابق جوان بال کٹوانے آتے تو مساج بھی کرواتے۔ رزق کی

ایں فراوانی ہوئی جو پہلے کبھی نہ ہوئی تھی۔ اور یوں آج بڑے دنوں بعد شام کے پھر فرمت نصیب ہوئی تھی۔ خالی ذہن بیٹھے اپنے عکس کو دیکھتے دیکھتے وہ جھٹکنے لگا تھا کہ ایک نوجوان دکان میں داخل ہوا۔

”بڑی مشکلوں سے آپ کی دکان ملی ہے۔“ احسن لہر ہاتھ لوجوانی کا زخم اس کے چہرے کی کہانی تھی۔

”اس طرح نہیں اس طرح اور اس طرح.....“ وہ اپنے بالوں کی سینک کے حلق بتاتا رہا اور عبدل اس نوجوان کو کتار رہا۔ جانے کیوں اس کا چہرہ جانا پچھا محسوس ہوتا تھا۔

”پہلی بار آیا ہوں آج آپ کے پاس۔ مجھے اپنا گاہک بنانے کا سنہری موقع ہے۔“ احسن چمب زبان محسوس ہوتا تھا۔

ذہن کو جھٹکنے ہوئے وہ بال کاٹنے لگا مگر کچھ ہی پس پس کر اس کے چہرے پر جانیں اور بال کٹوانے ہوئے احسن غیر مطمئن محسوس ہوتا۔ عبدل کیسے بے ڈھنگے پن سے بال کاٹ رہا تھا۔ کہیں وہ غلط پار پر کے پاس تو نہیں آگیا تھا؟ فیضی اور راج تو ہاں بار کی قریف کرتے تھے۔

چٹنی چلاتے ہوئے عبدل نوجوان کا چہرہ دیکھتا رہا اور پھر اس کے ذہن میں یکدم جھماکا ہوا اور اسے جیسے سب کچھ یاد آگیا۔

”فردوس..... کیا تم فردوس کے بیٹے ہو؟“ الفاظ بے ارادہ ہی اس کے من سے نکلے تھے۔ عبدل ایسا نہ جانتا تھا مگر من سے نکلے الفاظ کہاں واپس لوٹ سکتے تھے۔ نوجوان مڑ کر عبدل کا منہ دیکھنے لگا۔

یہ بار بار اس کی ماں کا نام کیسے جانتا تھا؟ کہیں یہ..... ☆☆☆

وہ صرف حمام ہی تو نہ تھا کہ ابن اسحق صرف اس کی حجامت کا قصہ جھپٹتا۔ وہ ایک انسان بھی تھا۔ گھر بار والا۔ بیوی بچوں والا۔

شیمیا..... اس کی بیوی جس کا اصل نام شیم تھا۔ شادی سے پہلے شیم کہلاتی، مگر عبدل کو کبھی شیم نام پسند نہ آیا اور شیم ہر وقت پکارا نہ جاتا۔ چنانچہ ایک دن اس نے شیم پکارا۔ شیم نیا نام سن کر مسکرا دی۔ جانے یوں مسکراتا دل کو بھایا تھا یا پھر نام ہی عزیز ہوا کہ اس نے شیم پکارنا شروع کر دیا اور وہ شیمو سے شیمابن گئی۔ اور اب یا تو وہ لوگ مر چکے تھے جو شوپکار تے یا نئے لوگ اس نام سے واقف ہی نہ تھے۔

کیسی اچھی زندگی گزاری تھی دونوں نے۔ عبدل لوگوں کے بال کاٹنا اور شیوہ بنانا رہا۔ شیم گھر سنبھالتی رہی۔

زاق و مالک

حضرت ابراہیم مہمان کے بغیر کھانا نہ کھاتے تھے۔ ایک مرتبہ تین روز تک کوئی مہمان نہ آیا پھر ایک پورے آتش پرست کا کفر کا آپ کے دروازے سے گزر ہوا۔ آپ نے اس سے پوچھا۔ ”تو کون ہے؟“ اس نے بتایا کہ آتش پرست ہوں۔ حضرت ابراہیم نے فرمایا۔ ”تو میرا مہمان بننے کے لائق نہیں ہے۔“ اللہ تعالیٰ کو یہ بات ناگوار لگی اور ارشاد الہی نازل ہوا۔

”اے ابراہیم! میں تو ستر برس سے اس کی پرورش کر رہا ہوں اور تجھ سے اتنا بھی نہ ہو سکا کہ ایک دقت کی روٹی کا ٹکڑا اسے دے دیتا۔“

مرسلہ: دزدیر محمد خان، محل جزارہ

عمر رفتہ گزر گئی۔ اب بیٹا قریبی گاؤں کے سرکاری اسکول میں گریڈ نو کا امتحان جس کی شادی کا ارادہ اس سال بہار میں تھا اور بیٹی کی تو وہ پہلے ہی شادی کر چکے تھے۔ اپنے گھر میں خوش و خرم تھی۔

”آپ کچھ کم مہم ہیں۔“ شیمانٹے کے برتن اٹھانے آئی تو عبدل کا یوں خاموش خاموش انداز محسوس کرتے ہوئے بولی۔

”ہاں..... کیا کہا؟“ ایسے جیسے سکتا ٹوٹا ہو۔ عبدل چونک کر شیماکو دیکھنے لگا اور شیمانتے دیکھ کر رہ گئی۔

”کچھ خاموش خاموش سے محسوس ہوتے ہیں۔ طبیعت تو خشک ہے؟“

”طبیعت..... ہاں تو ہواؤں میں درد ہے۔“ بردت بہانہ بن گیا۔ ورنہ شیماکہاں بات چند فقرہوں میں نہاتی۔

”اوہ تو پھر آج چٹنی کریں۔ ایک دن آپ کا کام نہیں کھلے گا تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔“

”گھر بیٹھ کر کیا کروں گا۔ چلتا ہوں۔“ عبدل اٹھ کھڑا ہوا۔

”چلیں سرور کی گولی لاتی ہوں وہی کھالیں۔“

”نہیں، کچھ اتنا زیادہ درد بھی نہیں کہ گولی کھائی جائے۔“ عبدل چلا آیا۔

دکان کا شتر اٹھایا۔ کچھ منٹاں اور جھانپو چھوٹی۔ عموماً صبح کم ہی گاہک آتے اور آج تو عبدل کی خود کشاکی کر گاہک

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی

ضیائے بکرا

شاہوں سے دور بھاگنے اور منی سے خوش رہنے والے یہ منکسر المزاج لوگ... جن کا اوڑھنا اور بچھونا فقط مخلوق کی خدمت اور خالق کی رضا کے سوا کچھ نہ ہو تو ایسے ہی لوگوں کے قدموں تلے بادشاہت منی بن کر رہ جاتی ہے۔ اللہ نے ایسے برگزیدہ بندوں کا ظرف بنایا ہی اتنا اعلیٰ اور مضبوط ہے کہ کائنات کے تمام خزانے ان کی نظروں سے پوشیدہ بھی نہیں اور ان کے دلوں میں ان کی طمع بھی نہیں... یہ سب کرامات ہر انسان کے حصے میں نہیں آتیں... اور جن کے حصے میں آجائیں وہ عام انسان نہیں ہوتے۔ آپ کا شمار بھی ایسی ہی مضبوط اور اعلیٰ مقام ہستیوں میں ہوتا ہے۔

دنیا داری کو کھڑکے دل سے لے کر آوازوں میں غرض رہنے والے

ایک دلی کا قصہ



حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے گھر میں جب پہلی اولاد ہوئی تو انہوں نے اپنے بیٹے کے دو نام رکھے تاریخی نام غلام حلیم رکھا گیا جس سے بچے کے سن پیدائش کا پتا چل جاتا تھا۔ یہ رمضان کی 25 اور سن ہجری کا 1159 و اس سال تھا۔ بچے کا دوسرا نام عبدالعزیز رکھا گیا اور یہ وہ نام ہے جس نے برصغیر کی تاریخ میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ بچے کی کشادہ پیشانی دیکھنے والوں کو بتا رہی تھی کہ ایک نہ ایک دن یہ بچہ تاریخ ہند کا غیر معمولی اور عظیم انسان ثابت ہوگا۔ پورے گھر میں جوش و خروش نے

نہ کر پائی۔ لہذا تے وجود کے ساتھ بس عبد کو دیکھتی رہی۔
”کیسی ہو فردوس!“

عبد کے منہ سے اپنا نام سننے کی دیر تھی... فردوس پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ زندگی گزرنی، زندگی بدل گئی مگر وہ بھی اس کردار کے سحر سے نہ نکل پائی۔ چھپاتی رہی اور بچھپاتی رہی۔

”یوں رو مت۔“

”میں تمہیں قتل کرنے آئی ہوں۔“ روتے روتے فردوس نے اپنا پرس کھولا اور چاقو نکال کر دکھایا کہ وہ واقعی اسی ارادے سے آئی ہے۔

عبد کی نگاہیں اس چاقو پر جم گئیں۔ وہ ایسا تیز دھار ہرگز محسوس نہ ہوتا تھا۔ یہ چاقو اسے دیکھی تو رسکا تھا مگر جان نہیں لے سکا تھا۔ عبد کا چہرہ عداوت سے جھک گیا۔

”کیا معاف نہیں کر سکتیں؟“

”معاف...!“ فردوس چلا اٹھی۔ ”زمانے گزر گئے اور میں خود کو آج بھی اس گناہ سے آلودہ محسوس کرتی ہوں۔“ فردوس روتی رہی اور عبد سر ہچکاکے کھڑا رہا۔

دوڑ کے قہقہے لگاتے ہوئے آئے۔ فلی اس کے کردہ سیلون کا دروازہ پار کرتے، اندر کا منظر دیکھ کر ہم گئے۔ فردوس نے دروازے کے پار اپنے بیٹوں کی عمر کے لڑکوں کو کھڑا دیکھا۔ آنکھیں بونچھیں، ایک غلامت بھری نظر عبد پر ڈالی اور چاقو پیچک کر جیسے آئی تھی ویسے ہی سیلون سے چلی گئی۔

”بڑی دور سے کنگ کروانے آئے ہیں۔ آپ کی کنگ کاچ چاقو کہاں کہاں تک جا پہنچا ہے۔“ لڑکے دروازہ پار کر کے اندر آ گئے تھے۔

”میری طبیعت خراب ہے۔ بال کانٹے سے قاصر ہوں۔“ سوچ بورد پر اگلے سیدھے ہاتھ مار کر عبد نے ہنکا اور لائش بند کیں۔ خود باہر آیا اور لڑکوں کو بھی باہر آنے کا اشارہ کیا۔ لڑکے باہر آئے تو اس نے شکر گرا دیا اور پوچھل دل کے ساتھ گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

گو کہ زندگی ختم نہ ہوئی تھی مگر بعد از قضا کی کہانی میں صرف ملال کے رنگ تھے۔ وہ اس ایک لمحے کی گرفت سے تو شاید کبھی آزاد نہ ہو سکے۔... مگر وہ اذیت جو فردوس کے حصے میں آئی تھی، اب وہ بھی اس میں شریک ہو گیا تھا۔... اور جب تک زندگی تھی، یہ اذیت یوں ہی رہنے والی تھی۔

نہ آئیں اور یہ چٹا پوری ہوئی۔
گھٹنا بھر کوئی گاہک نہ آیا اور دل گرفتہ سا عبد ماضی میں بہکتے لگا۔ دل گرفتگی اس کی طبیعت کا حصہ نہ تھی اور نہ ہی وہ ماضی میں کھوئے رہتا پسند کرتا تھا مگر کل یوں اچانک فردوس کے سینے کو بچھانا اور پچھان کر سگین غلطی، بلا ارادہ ہی سہی مگر سگین غلطی، اس سے پوچھ لینا کہ وہ فردوس کا بیٹا ہے اور اس لڑکے کا اچھے سے اسے دیکھنا۔

عبد نے آنکھیں میچ لیں اور سر پٹ کی دیوار سے لگایا۔ ماضی کی فلم آنکھوں کے سامنے چلنے لگی۔ ایسے جیسے کل کی بات ہو۔

”میرے قریب مت آؤ۔“

”کیوں؟ کیا تمہیں میری محبت پہ یقین نہیں؟“ عبد کے لیے میں خدار تھا۔

”نہیں، یقین ہے اور یہ ہے مگر یہ سب شادی سے پہلے۔“
”تو کیا فردوس تمہیں لگتا ہے میں تمہیں دھوکا دے رہا ہوں۔ وقت گزاری، محبت کے نام پر کھلو اور تم سے شادی نہیں کروں گا؟“ عبد بگڑنے لگا۔

”ایسی بات نہیں۔“

”تو پھر...“ عبد قریب آنے لگا۔

”لیکن...“

”کوئی لیکن نہیں۔ تم مجھے دیکھو۔ کیا تمہیں میری آنکھوں میں محبت نظر نہیں آتی؟“ اور فردوس چاہ کر بھی مزاحمت نہ کر پائی اور محبت کے نام پر وہ سب گنوا بیٹھی جس کے بارے میں کہا جاتا ہے... جان جائے تو جانے مگر مان نہ جائے۔ قدموں کی چاپ نے اسے آنکھیں کھولنے پر مجبور کیا اور جیسے وہ ماضی سے حال میں لوٹ آیا۔

دکان میں کنگ اور شیو کی غرض سے آنے والا کوئی مرد نہ تھا۔ کوئی نقاب پوش عورت تھی۔

میں بیوی سیلون میں عورت کا کیا کام؟ اس سے قبل کہ عبد پوچھتا عورت نے اپنا نقاب ڈھکا کیا۔

چہرے کے نقوش واضح ہوئے تو عبد ساکن سا ہو گیا۔ آنے والی کوئی اور نہ تھی۔ فردوس تھی۔ وہ فردوس جو جوانی کے دنوں میں اس کی محبوبہ تھی اور جو ہمیشہ غار رہی۔ بیوی کے درجے پر فائز نہ ہوئی تو یہ عبد کی ہی منشا تھی۔

اور وہ فردوس جو یہ سوچ کر آئی تھی کہ عبد کو گریبان سے پکڑے گی، چلا چلا کر لوگ اکٹھے کرے گی، اس کا منہ فوج لے گی اور آخر میں اپنے بغل میں دبے برس سے چاقو نکالے گی اور عبد کے پیٹ میں گھونپ دے گی... ایسا کچھ

خوشیوں کے ڈوگرے برسا دیے۔

بچہ ماہ بہ ماہ اور سال بہ سال بڑھنے لگا۔ شاہ ولی اللہ کو یہ فکر پریشان کرنے لگی کہ اسے تعلیم و تربیت کی خاطر کس کے حوالے کیا جائے۔ آخر کار شاہ صاحب کی نظر انتخاب اپنے غلیظہ پر پڑی۔ غلیظہ مولانا محمد عاشق حسین اور غلیظہ مولانا خواجہ امین اللہ صاحب۔ بچے کے دو نام تو رکھ دیے گئے تھے مگر تاریخ شاہد ہے کہ تاریخی نام غلام علیہ صل تاریخ کا ایک حصہ بن کر رہ گیا اور دور انام عبدالعزیز زبان زد عام و خاص ہو گیا۔

پانچ سال کے ہوئے تو انہیں مذکورہ دونوں خلفاء کے سپرد کر دیا گیا۔ دونوں استادوں نے عبدالعزیز کو بڑی دلجمعی اور نیکوئی سے تعلیم دی اور دو سال کے اندر انہوں نے عربی کے مختلف فنون میں حیرت انگیز ترقی حاصل کر لی۔

جامع مسجد دہلی کی بیڑیوں پر نماز عشا کے بعد فارسی قصہ گوئی لگا کر بیٹھا جاتے تھے۔ اس مجمع میں عوام اور اعلیٰ طبقات کے لوگ ایک ساتھ بیٹھتے تھے۔ فارسی دانی کے لیے ان جمعوں میں شریک ہونا بہت ضروری تھا۔ شاہ عبدالعزیز نے بھی ان فارسی قصہ خوانوں سے فائدہ اٹھایا۔ اتفاق کی بات کہ شاہ ولی اللہ کے مریدوں میں لاڈلی خانم نامی ایک عورت کو قصہ خوانی میں کمال حاصل تھا۔ شاہ عبدالعزیز لاڈلی خانم کے گھر چلے جاتے اور اس سے قصہ گوئی کی فرمائش کرتے۔ لاڈلی خانم فارسی داستان گوئی شروع کر دیتی اور شاہ عبدالعزیز اس میں محو ہو جاتے۔ اس عورت نے آپ کی فارسی زبان کی تدریس اور تحصیل میں بڑی مدد کی۔

یہ اس دور کی بات ہے، جب اردو کے مشہور شاعر آرزو، سودا، میر تقی میر، مظہر جان جاناں اور میر درد کی کمال شاعری کا ذکاوت رہا تھا اور اس زبان کی تحصیل کو ضروری اور لازمی تصور کر لیا گیا تھا۔ شاہ عبدالعزیز نے بھی میر درد کا سہارا لیا اور ان کی خدمت میں حاضر یاں دینے لگے۔ یہاں محاورات کی مدد سے اردو کو حسین سے حسین تر بنایا جا رہا تھا۔ شاہ عبدالعزیز نے ایک دن اپنے والد بزرگوار سے پوچھا۔ ”بادا جان! کیا میر درد کے علاوہ ایک بھی ایسا شخص نہیں ہے جو ہمیں اردو زبان سکھائے؟“

شاہ ولی اللہ نے جواب دیا۔ ”بے! اترا سوال اپنی جگہ اس کا جواب یہ ہے کہ خواجہ میر درد اور دو کے سوا اور مجتہد ہیں۔ آپ کی صحبت کے بغیر اس زبان کی دستاویز مشکل ہے اور خواجہ میر درد چراغ محری ہیں، معلوم نہیں کب یہ چراغ بجھ جائے۔“

آپ نے عبرانی زبان بھی حاصل کی تھی۔ یہ زبان آپ نے کس سے حاصل کی تھی؟ اس سوال کا جواب تاحال نہیں مل سکا ہے۔ آپ کی یادداشت اور حافظے کا یہ حال تھا کہ جب آپ کی عمر پانچ یا چھ سال کی تھی اور آپ نے اپنے والد بزرگوار کو اس حال میں دیکھا کہ وہ کسی مسئلے کی وضاحت اور اس کا جواب مرحمت فرما رہے ہیں۔ آپ نے اس کو سن کر اپنے حافظے میں بٹھالیا اور سالہا سال کے بعد جب اس مسئلے پر گفتگو شروع ہوئی تو آپ نے اپنے والد کی ساری گفتگو بیان فرمادی۔

آپ نے تیرہ سال کی عمر میں صرف نحو، فقہ، منطق، کلام، عقائد، ہندسہ، ہیئت اور ریاضی میں مہارت حاصل کر لی تھی۔ آپ ابھی سترہ سال کے تھے کہ والد حضرت شاہ ولی اللہ وصال فرما گئے۔ آخری لمحات میں والد بزرگوار نے عبدالعزیز کے برابر خود شاہ رفیع الدین کا ہاتھ ان کے ہاتھ میں دے دیا اور کہا۔ ”عبدالعزیز! یہ رفیع الدین تیرا چھوٹا بھائی نہیں تیرا بیٹا ہے، چنانچہ اس کی ساری ذمہ داری تیرے سر ہے۔“

آپ نے باپ کی وصیت کا پوری زندگی احترام اور پاس کیا اور اپنے چھوٹے بھائی رفیع الدین کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دے کر انہیں ہندوستان کی تادیر روزگار نصیب بنادیا۔

آپ نے اپنے والد کی تحریک کو جاری رکھا۔ ان دنوں اسلام اور مسلمانوں کی زبوں حالی کا یہ عالم تھا کہ تمام مذاہب اور فرقہ وارانہ مسلمانوں کے ہاتھ میں تھا مگر مسلمان ہی سب سے مظلوم تھے۔ مرے سیکھ، انگریز اور مسلمانوں کا ایک فرقہ جو اپنے عقائد کی رو سے شاہ عبدالعزیز اور فرقہ اختلاف کا یہ صرف مخالف بلکہ دشمن تھا یہ لوگ مسلمانوں پر انگ، انگ اور بھیجی بھیج کر ظلم و ستم ڈھانے میں مشغول رہتے تھے۔ ملک کا بادشاہ مغل تھا مگر اس کی حیثیت شاہِ ظلم سے زیادہ نہیں تھی۔ بازی گرد اور شاطر اپنی اپنی جالیں چلتے اور بادشاہ بے جاں مہرے کی طرح ان کی جال اور کھٹکھٹلی کا پاندرا معمول ہوتا۔ ان حالات میں پہلے تو شاہ ولی اللہ نے جہاد کیا اور مسلمانوں کی زندگی میں کھل نظام (یعنی سیاسی اور سماجی زندگی کے ہر شعبے میں انقلاب۔ ہمہ جہت اور ہمہ گیر انقلاب) کا تصور پیش کیا۔ چونکہ اس دور میں برصغیر پر یس سے محروم تھا اس لیے کھل نظام کا منصوبہ پروان نہیں چڑھ سکا۔ شاہ ولی اللہ کے بعد شاہ عبدالعزیز نے اس مشن کو جاری رکھا اور مسلمان ان سے راہنمائی حاصل کرنے لگے۔

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی

کہتے ہیں، اس دور میں پورے ملک کے نامی گرامی علما نے کرام میں سے ایک شخص بھی ایسا نہیں تھا جس نے شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز کے در سے فیض نہ حاصل کیا ہو۔

شاہ عبدالعزیز کو اپنے خاندان کا مختلف محاذوں پر مقابلہ کرنا پڑتا تھا۔ ان کی تربیت ہی کچھ اس طرح ہوئی تھی کہ وہ بیک وقت دین اور دنیا میں شامل اور داخل رہتے تھے۔ شاعری دربار، امر، انوین اور عہدے داران شاعری سے ہمیشہ دور دور رہے اور ان سے بھی بکلی مانی ہند نہ چاہی اور نہ ہی قبول کی۔ ان کے اوقات کار میں سے کچھ تو مراعات اور عیادتوں میں صرف ہو جاتا اور کچھ مسلمانوں کی راہنمائی اور تعلیم و تدریس میں صرف ہو جاتا۔

خدا نے شاہ عبدالعزیز کو تفریح اور تحریر کی بے مثال صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ وہ ایک طرف تعریف و تالیف کی شکل میں گراں مایہ خدمات انجام دے رہے تھے۔ دوسری طرف مشکل اور جتنے کو کچھ چیلان کے در سے میں خواص اور عوام سے خطاب فرمایا کرتے تھے۔ ان دونوں کے اجتماع میں آپ کے دوست اور دشمن یکساں شرکت کرتے تھے۔ خاندان اس لیے شریک ہوتے تھے کہ وہ اگر آپ کی تقریر یا خطابت میں کوئی قابل اعتراض بات پا لیں تو اسے آپ کے خلاف استعمال کریں اور خوب خوب اچھالیں مگر انہیں ہمیشہ مایوس ہونا پڑا اور خاندان کی اکثریت آپ کے مریدوں اور ارادت مندوں میں داخل ہو گئی۔

ایک دن آپ کہیں تشریف لے جا رہے تھے آپ نے راستے میں ہونچو کی آوازیں سنیں تو ایک طرف ہو گئے اور رواں دواں ہجوم کی طرف دیکھ کر کسی سے پوچھا۔ ”کیوں بھائی! یہ کس کی سواری جاری ہے؟“

جواب ملا۔ ”شہزادہ ولی مہدی۔“

اس دوران سواری رک گئی اور اس میں سے شہزادہ ولی مہد نمودار ہوا اور ہماگ کر آپ کے قریب آ گیا آپ کے دونوں ہاتھ پکڑ کر بوسے دیے اور عرض کیا۔ ”اس غلام کی ہمیشہ یہ خواہش رہی ہے کہ کسی دن آپ میرے کاٹانے میں قدم رنجہ فرمائیں تاکہ میں بھی اپنی قسمت پر ناز کروں۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”اب فقیر میں اتنا دم نہیں ہے کہ وہ آپ لوگوں کی دعاؤں میں الجھ کر رہ جائے۔“

شہزادہ ولی مہد نے عرض کیا۔ ”بس حضرت! صرف ایک بار۔“

آپ نے فرمایا۔ ”لوگو! اس شہزادے کی باتیں سن رہے ہو؟ مجھے اپنے گھر بلارہا ہے جبکہ میں غربا کے گھر تو اکثر چلا جاتا ہوں لیکن خدا کا شکر ہے کہ میں نے امراء سے پرہیز کیا ہے۔“

شہزادہ ولی مہد کے ساتھ ایک نواب بھی جو سفر تھا، اس نے شہزادہ ولی مہد کی اجازت سے آپ سے ملاقات کی اور مجرہ انکسار سے عرض کیا۔ ”حضرت! میرے غریب خانے تشریف لے چلیں اور مجھ کو فخر اور تحسین و آفرین کا موقع مرحمت فرمائیں۔“

آپ نے فرمایا۔ ”ابھی کچھ دیر پہلے شہزادہ ولی مہد نے بھی اسی قسم کی دعوت دی تھی لیکن میں نے اس کو قبول نہیں کیا۔ پھر تیری دعوت کیے مگر قبول کیوں؟“

نواب شرمندہ ہو کر پیچھے ہٹ گیا۔ کچھ دیر بعد شہزادہ ولی مہد اور نواب کی سواریاں گزر گئیں۔ ان کے چلے جانے کے بعد آپ بھی روانہ ہو گئے۔

اس زمانے میں جیسا کہ مشن بڑی گن اور محنت سے تبلیغی فرائض انجام دے رہی تھیں۔ یادریوں نے آپ کا بڑا شہرہ سن رکھا تھا اور ان میں سے بیشتر کی یہ خواہش تھی کہ وہ کسی طرح شاہ عبدالعزیز سے باتیں کر کے اپنی تبلیغی ذمہ داریاں انجام دیں۔ دہلی کے انگریز ایجنٹ گورنر مختلف سے ایک پادری نے کہا۔ ”جناب والا! میں کافی دنوں سے دہلی اور اس کے مضافات و نواح میں تبلیغی خدمات انجام دے رہا ہوں اور میں نے ہندی اچھوتوں میں خاصی کامیابیاں بھی حاصل کی ہیں مگر مجھ کو مسلمانوں پر سخت خدشہ آتا ہے کہ ان پر میری تقریر اور تبلیغ کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ آپ مشورہ دیں کہ مجھے کیا کرنا چاہیے؟“

مکلف نے جواب دیا۔ ”قادر! اس شہر میں ایک ایسا خاندان بھی ہے جس کا مسلمانوں پر کبہ اثر ہے۔ شاہ ولی اللہ کا خاندان۔ اس خاندان کے ایک بزرگ شاہ عبدالعزیز ہر مشکل اور جتنے کو خواص و عوام سے خطاب کیا کرتے ہیں۔ بس ان کی یہی خطابت و محال اور سپر کا کام کرتی ہیں اور ان کی تبلیغی سامی بار آور ہوتی ہیں۔“

پادری نے کہا۔ ”جناب والا! میں اس شاہ سے بھی ملنا چاہتا ہوں۔ میں اس سے مناظرے کروں گا اور دیکھوں گا کہ

مندانوں نے زعمہ باد کے نعرے لگائے اور گورنر بہادر نے اپنی جگہ چھوڑ دی اور چند قدم چل کر شاہ صاحب کا استقبال کیا۔
شاہ صاحب کو پادری کے سامنے بٹھا دیا گیا۔ کچھ دیر تو دونوں طرف سکوت طاری رہا۔ سامعین اور ناظرین نے خاموشی اختیار کر لی تھی۔

آخر کچھ دیر بعد پادری نے کہا۔ ”شاہ صاحب! میں اس وقت جس موضوع پر بات کرنے والا ہوں، میری خواہش ہے کہ بات اسی موضوع پر ہو اور اس کے ہوتے ہوئے کسی اور موضوع کو زبردستی نہ لایا جائے۔“
آپ نے فرمایا۔ ”میں بھی یہی چاہتا ہوں۔“

کچھ دیر بعد پادری نے کہا۔ ”شاہ صاحب! میں آپ سے سوال کروں گا اور آپ اس کا جواب دیں گے لیکن جواب کے سلسلے میں آپ پر یہ پابندی عائد ہوگی کہ میرے سوال کا جواب مقبول ہو مقبول نہ ہو۔“
آپ نے فرمایا۔ ”میں اس کی پابندی کروں گا۔“

پادری نے ٹھٹھکا کر کہا۔ ”شاہ صاحب! میں جانتا چاہتا ہوں کہ آپ کے پیغمبر کیا ہیں؟“
شاہ صاحب نے جواب دیا۔ ”رحمت اللعالمین یہی ہیں اور حبیب اللہ بھی۔“

پادری نے کہا۔ ”میں آپ سے شرمندہ ہوں شاہ صاحب! میں نے آپ سے دوبارہ ملاقات کی تو اس طرح، خوب!“
شاہ صاحب نے فرمایا۔ ”یہ وقت فضول باتوں کا نہیں ہے۔“

پادری نے پھر شاہ صاحب سے کہا۔ ”جناب والا! میں اس محفل میں آپ سے مناظرے کی عرض سے آپ سے باتیں کرنے آیا ہوں، تو میں نے آپ سے کیا پوچھا تھا ابھی ابھی؟“

شاہ صاحب نے جواب دیا۔ ”یہ کہ میرے پیغمبر زمان کی تعریف میں اللہ نے کیا فرمایا ہے؟“

پادری نے کہا۔ ”ہاں تو میرے علم میں ابھی ابھی یہ بات آئی ہے کہ آپ کے پیغمبر کو خدا نے حبیب اللہ کہا ہے۔“

آپ نے فرمایا۔ ”ہاں، میرا اتنا ہی جواب تھا آج۔“

پھر مزید یہ سوال ہوئے اور آپ نے ہر سوال کا بڑا باہمی جواب دیا لہذا۔۔۔ بالآخر پادری شرمندہ ہو گیا اور دو ہزار روپے آپ کے سامنے رکھ دیے۔ آپ نے فرمایا۔ ”محترم بزرگ! آپ اپنے روپے اٹھائیں، ہاں اگر آپ کے دل پر شرط کی جیت اور میری بات کا کوئی اثر ہو تو آپ اسلام قبول فرمائیں، میرے لیے یہ بہت کافی انجام ہوگا۔“
لیکن پادری نے آپ کی بات نہیں مانی اور اپنے روپے لے کر چلا گیا۔

مکلف نے پادری سے کہا۔ ”کیا آپ کو یہ نہیں بتا دیا تھا کہ شاہ صاحب سے جیتنا بہت مشکل ہے۔“

پادری نے جواب دیا۔ ”میرے بچے! میں تجھ سے متفق ہوں۔ شاہ صاحب کی ذہانت اور فطانت کا کوئی جواب نہیں۔“
آپ کے اس مختصر سے مناظرے کا دہلی میں بڑا چاہوا۔ مسلمان بہت خوش تھے اور عیسائیوں کو اس سے بڑا دکھ پہنچا۔

انگریز ریڈینٹ کے دل پر اس کا بڑا اثر پڑا۔ وہ بیٹوں بیچ و تاب کھاتا رہا۔ آخر ایک دن آپ کی خدمت میں حاضری دی اور عرض کیا۔ ”شاہ صاحب! اس وقت میں آپ کی خدمت میں ایک عجیبہ مسئلہ لے کر حاضر ہوا ہوں۔ آپ کی ذہانت، فراست اور طبیعت سے مجھے توقع رکھتا ہوں کہ بہت مقبول جواب ہائوں گا۔“

شاہ صاحب نے فرمایا۔ ”ارشاد فرمائیں، اگر خدا کی توفیق شامل حال رہی تو میں آپ کو ضرور مطمئن کر سکوں گا۔“
ریڈینٹ نے کہا۔ ”شاہ صاحب! میں نے اپنا یہ سوال کئی جگہ دہرایا مگر کسی نے بھی اس کا جواب نہیں دیا مگر امید ہے کہ آپ مجھے ہائوں نہیں کریں گے۔“

شاہ صاحب نے فرمایا۔ ”آپ سوال تو کریں، اللہ نے چاہا تو اس کا جواب بھی مل جائے گا۔“

ریڈینٹ نے کہا۔ ”ایک مسافر کو سفر سے لکین راہ چلتے چلتے اچانک اسے احساس ہوا کہ وہ راستہ بھول چکا ہے۔ اس نے اپنے آس پاس دیکھا تو اسے ایک شخص بیٹھا دکھائی دیا اور دوسرا سو ہوا نظر آیا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مسافر راستہ کس سے پوچھے؟“

شاہ صاحب نے جواب دیا۔ ”مسافر کو چاہیے کہ وہ وہاں بیٹھ جائے اور انتظار کرے کہ جب سو ہوا ہوا شخص بیدار ہو تو اس سے راستہ دریافت کرے۔ رہ گیا وہ شخص جو بیدار ہے اور بیٹھا ہوا ہے، وہ خود راستے سے خبر ہے کیونکہ راستے کا تعقل چلنے سے ہے، بیٹھنے سے نہیں ہے۔ یہ بیٹھا ہوا شخص کو یا خود کسی کا شہر رہا نہیں ہے۔“

کون مجھ سے جیتتا ہے۔ آپ میری اتنی مدد کریں کہ اس شاہ کو مناظرے پر آمادہ کر لیں، جہیہ کام میں خود کر لوں گا۔“
مکلف نے جواب دیا۔ ”قادر! کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ میں آپ کی شاہ صاحب سے ملاقات کر ادوں گا کیونکہ شاہ عبدالعزیز بہت ہی متکبر المنہج انسان ہیں لیکن اس ملاقات کے بعد جو مناظرہ ہوگا اور جب مناظرے میں ہار جیت کا فیصلہ ہوگا تو اس میں یہ شرط رکھی جائے کہ جو جیتے گا، ہارنے والا اس کو دو ہزار روپے ادا کرے گا۔“
مکلف کی تجویز پادری کو بہت پسند آئی، بولا۔ ”مجھے تمہاری بات منظور ہے۔ خدا نے چاہا تو میں شاہ صاحب کو قائل کر لوں گا اور وہ خود بھی۔“

مکلف نے کہا۔ ”قادر! میری ایک بات سن لیجیے۔ شاہ صاحب ایک درویش صفت انسان ہیں۔ اول تو وہ شرط پر آمادہ ہی نہیں ہوں گے اور جب وہ آمادہ ہی نہیں ہوں گے تو یہ شرط لگا کر مناظرہ نہ کرنا تب پسند آئے گا۔“

پادری نے کہا۔ ”تمہیں جو کچھ کہتا ہے، صاف صاف کہہ دو۔ میں ذرا بھی پریشان نہیں ہوں۔“

مکلف نے کہا۔ ”میں شاہ صاحب کے کردار اور عظمت سے اچھی طرح واقف ہوں۔ اگر وہ ہار گئے تو ان کی رقم میں دوں گا، آپ ان سے نہیں مانگیں گے۔“

پادری نے حیرت سے پوچھا۔ ”شرط کی رقم تم کیوں دو گے؟“

مکلف نے کہا۔ ”میں نے کہہ جو دیا، شاہ صاحب شرط پر آمادہ ہی نہ ہوں گے۔“

پادری نے پوچھا۔ ”پھر یہ مناظرہ کب اور کہاں ہوگا؟“

مکلف کو فخر آ رہا تھا مگر اس نے بڑے ضبط اور تحمل سے کام لیا۔ پادری نے کہا۔ ”گورنر بہادر! تم شاہ صاحب کو مناظرے پر آمادہ کرلو۔ میں اس کا انتظار کر رہا ہوں۔“

مکلف نے اسی دن شاہ صاحب سے رابطہ کیا اور عرض کیا۔ ”حضرت! مجھے آپ کی عہدیت کا اعزاز ہے لیکن پادری صاحب کو اس سے انکار ہے۔ وہ آپ سے مناظرہ کرنا چاہتے ہیں۔“

آپ نے تبسم ہو کر پوچھا۔ ”درمیان میں کوئی شرط بھی رکھی جا رہی ہے؟“

مکلف نے جواب دیا۔ ”ہاں، ایک شرط رکھی جا رہی ہے۔“

آپ نے فرمایا۔ ”میں شرط کو پسند کرتا ہوں بشرطیکہ اس میں روپوں کے لین دین کا ذکر نہ ہو۔ شرط یہ ہونی چاہیے کہ مناظرے میں جو جیت جائے، ہارنے والا جیتنے والے کا دین اختیار کر لے۔“

مکلف نے جواب دیا۔ ”اس شرط کو قادر نہیں پسند کریں گے۔ ان کا تو خیال ہے کہ ہارنے والا جیتنے والے کو دو ہزار روپے ادا کرے۔ میں نے ان سے یہ وعدہ کر لیا ہے کہ اگر آپ ہار گئے تو شرط کی رقم آپ کی طرف سے قادر کو میں ادا کروں گا۔“

شاہ صاحب نے فرمایا۔ ”نہیں، ایسا نہیں ہوگا۔ اگر مناظرے میں میری شکست ہوگی تو یہ رقم بھی میں ہی ادا کروں گا۔“
مکلف نے پوچھا۔ ”تو قادر کو میں مطلع کر دوں کہ آپ مناظرے پر آمادہ ہیں؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”میں تیار ہوں۔“

مکلف نے پوچھا۔ ”کس دن اور کہاں؟“

آپ نے فرمایا۔ ”دن اور جگہ کا انتخاب بھی آپ کے قادر ہی پر چھوڑتا ہوں۔“

مکلف نے کہا۔ ”چھا پھر میں جانتا ہوں اور دن اور جگہ کا مسئلہ بھی حل کرتا ہوں۔“

مکلف اسی وقت پادری کے پاس چلا گیا اور اس کو یہ خوش خبری سنائی۔ ”قادر! شاہ صاحب مناظرے پر آمادہ ہیں اور مجھ کو یہ اجازت دے دی ہے کہ میں جب اور جہاں چاہوں فیصلہ کر دوں، وہیں اور اسی دن مناظرہ ہو جائے گا۔“

پادری نے کہا۔ ”بھریہ کیوں؟ کل ہی مناظرہ ہو جانا چاہیے۔“

مکلف نے آپ کو مطلع کر دیا کہ قادر مناظرے کے لیے ہر وقت تیار ہیں۔

جس دن مناظرہ تھا، پورے شہر کو بتا دیا گیا تھا کہ مسیحیت اور اسلام میں ایک زبردست مناظرہ ہونے والا ہے۔ جو لوگ اس مناظرے میں شریک ہونا چاہیں شریک ہو جائیں، ان کا خوشی سے استقبال کیا جائے گا۔

اس دن شہر کے بہت سارے لوگوں نے پادری کی قیام گاہ کا رخ کیا۔ پادری اور مکلف کی طرف سے شاہ عبدالعزیز کا بڑی بے چینی سے انتظار کیا جا رہا تھا۔ اسی عالم میں شاہ صاحب کی سواری جھوم کچھیرتی ہوئی پادری کے دروازے پر رکی۔ عقیدت

امان کر دیا کہ میں کل فجر کے بعد بادشاہ کے پاس جاؤں گا۔ جس جس کو میرے ساتھ چلنا ہو، اس وقت تک تیار ہو جائے۔ دوسرے دن فجر کی نماز کے بعد آپ نے اپنے ساتھ چھوٹے بھائی رفیع الدین کو لے لیا اور ان دونوں کے ساتھ ان کے مریدوں اور اراکات مندوں کا ہجوم چلا۔ بادشاہ کے حکم سے جامع مسجد کے سامنے انسانوں کا ایک سندر تھا جس میں مار رہا تھا۔ بادشاہ آپ سے پہلے ہی پہنچ چکا تھا اور وہ شاہ صاحب کی آمد کا خیر تھا۔ بادشاہ نے آپ کی آمد کا اندازہ دور سے دیکھ کر ہی لگا لگا تھا۔ اپنے وزراء اور مصاحبین سے کہا۔ ”صحابان! شاہ عبدالعزیز صاحب تشریف لے آئے ہیں۔“ حاضرین آپ کی طرف دوڑ پڑے مگر آپ نے صبر و تحمل سے کام لیا۔

بادشاہ مسجد کی یزیدوں پر کھڑا آپ کا انتظار کر رہا تھا۔ آپ نے بادشاہ کے احساسات کا اندازہ لگا لیا تھا چنانچہ آپ بھی مسجد کی یزیدوں سے ملے کرتے ہوئے آگے بڑھے۔ ایک جگہ بادشاہ اور شاہ صاحب کا آستانا سامنا ہو گیا۔ جامع مسجد کی یزیدوں پر، اس طرح کہ اوپر زینوں پر بادشاہ اپنے مصاحبین کے ساتھ کھڑا تھا۔ دونوں کا آستانا سامنا ہوا تو بادشاہ نے ہاتھ بڑھا کر آپ سے مصافحہ کیا۔ بادشاہ نے بڑی عقیدت سے عرض کیا۔

”شاہ صاحب! میں نے آپ کو بڑی زحمت دی۔ خدا را اس کو محسوس نہ فرمائیے گا۔“

آپ نے فرمایا۔ ”اے شخص! اے بادشاہ! میں یہاں اس لیے نہیں آیا ہوں کہ میں نے آپ کی دعوت اور طلبی کا احترام کیا ہے بلکہ میں یہاں اس لیے آیا ہوں کہ خلق خدا کے کام آؤں۔“

بادشاہ نے کہا۔ ”بھان! بھارشا فرمایا آپ نے۔“ پھر کچھ توقف کے بعد کہا۔ ”شاہ صاحب! آگے بڑھیے اور نماز پڑھائیے۔“

آپ نے فرمایا۔ ”مجھ کو زحمت نہ دیجیے۔“

بادشاہ نے کچھ سوچ کر کہا۔ ”شاہ صاحب! اگر آپ کسی وجہ سے نماز نہیں پڑھنا چاہتے تو پھر اپنے بھائی رفیع الدین کو حکم دیجیے کہ وہ آگے بڑھیں اور ان سب کو نماز پڑھائیں۔“

شاہ عبدالعزیز نے فرمایا۔ ”اس کی بھی کوئی ضرورت نہیں۔ جامع مسجد کا امام موجود ہے، آپ اس کو حکم دیجیے وہی نماز پڑھائے گا۔“

بادشاہ نے جامع مسجد کے امام کو حکم دیا کہ وہ نماز دو گنا پڑھائے۔

امام جامع مسجد مستعد ہو کر کھڑا ہو گیا۔ بادشاہ جہاں کھڑا تھا وہیں کھڑا ہو گیا۔ شاہ صاحب نے موقع غنیمت دیکھا اور فوراً جگہ بدل دی اور ایک ایسی جگہ پہنچ گئے کہ وہاں ایک شخص بھی ایسا نہیں تھا جو بادشاہ کے مقررین اور متوسلین میں سمجھا جاتا ہو۔ امام نے نماز دو گنا پڑھائی اور دعا کے لیے ہاتھ اٹھ گئے۔ بادشاہ کی نظر میں شاہ صاحب کو تلاش کرنے لگیں۔ بادشاہ کا مصاحب سمجھ گیا کہ بادشاہ کسی کو بے چینی سے تلاش کر رہا ہے۔ اس نے بادشاہ کے پاس جا کر عرض کیا۔ ”کیا حضور والا شاہ صاحب کو تلاش فرما رہے ہیں؟“

بادشاہ نے جواب دیا۔ ”معلوم نہیں کیوں شاہ صاحب مجھ سے اجتناب و احتراز فرما رہے ہیں۔ آخر کیوں؟ اس کی کوئی خاص وجہ؟“

مصاحب نے برا سامنے بتایا۔ ”یہ تاچر کوئی وجہ کیا بتائے گا لیکن میں خیال سے یہ بتا سکتا ہوں کہ ایسا کیوں ہے۔“

بادشاہ نے کہا۔ ”اچھا وجہ بیان کر۔“

مصاحب نے کہنا شروع کیا۔ ”حضور والا! شاہ صاحب اور ان کے اسلاف نے کبھی بھی کسی بادشاہ سے کوئی مدد نہیں لی۔ بس یہی تکبر اور غرور انسانوں کی برادریوں کا سبب بن جاتا ہے۔“

بادشاہ نے مصاحب کو حکم کیا کہ ایسی بات نہ کر ورنہ اگر یہ بات برسر عام ہوئی تو نقص امن کا اندیشہ پیدا ہو جائے گا۔ بادشاہ نے اپنا ایک آدمی شاہ صاحب کی خدمت میں بھیجا کہ آجائے، میں آپ کا بے چینی سے انتظار کر رہا ہوں۔ بادشاہ کا آدمی آپ کے پاس پہنچا اور بادشاہ کا پیغام پہنچا دیا۔ آپ طوعاً و کرہاً بادشاہ کے پاس پہنچے اور کہا۔ ”بادشاہ سلامت کو فقیر کے قرب پر اصرار نہیں کرنا چاہیے کیونکہ شاعی اور فقیری یک جہت ہیں۔“

بادشاہ نے کہا۔ ”شاہ صاحب قبلہ! لیکن میں یہ عجیب و غریب منکر دنیا کو دکھانا چاہتا ہوں۔ آپ میرے پاس ہی بیٹھیں۔“ آپ بہ جبر واکراہ بادشاہ سے ایک بالشت دوڑ بیٹھے۔

ریڈیٹنٹ اپنا سامنے لے کر وہ گیا کیونکہ مسافر سے اس کی مراد عام انسانوں سے تھی۔ بیٹھے ہوئے شخص سے اس کی مراد حضرت مسیحؑ سے تھی اور سوئے ہوئے سے اس کا اشارہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے تھا۔

اس واقعے نے بڑی شہرت حاصل کی۔ مسلمانوں کا آپ پر اعتقاد اور امتداد بہت زیادہ بڑھ گیا تھا مگر عیسائیوں اور ہندوؤں کو ان سے بڑی تکلیف پہنچی رہی تھی اور پادریوں کو آپ پر ورہ کر بڑا غصہ آ رہا تھا۔

آپ جامع مسجد دہلی میں درس قرآن فرما رہے تھے۔ دور تک آدمی ہی آدمی نظر آرہے تھے۔ ان میں ایک پادری بھی موجود تھا۔ دورانِ درس وہ اپنی جگہ پر کھڑا ہوا گیا اور شاہ صاحب سے کہا۔ ”حضرت! آپ کی حالت لسانی کا کوئی جواب نہیں، امید ہے کہ آپ مجھے مایوس نہیں کریں گے۔“

آپ نے فرمایا۔ ”آپ سوال کر کے تو دیکھیے، اللہ نے چاہا تو میں اس کا شافی و کافی جواب دوں گا۔“

پادری نے کہا۔ ”حضرت شاہ! ذرا اپنے سوال کا کوئی معقول اسلوب تو اختیار کریں۔“

آپ نے فرمایا۔ ”اس کی کوئی ضرورت نہیں، آپ اپنا اپنی تعمیر بیان فرمادیں، میرے لیے وہی کافی ہے۔“

پادری نے کہا۔ ”شاہ صاحب! آپ کے پیغمبر زمین کے اندر دفن ہیں اور ہمارے پیغمبر چوتھے آسمان پر تشریف فرما ہیں۔ اب میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ مرتبے و مقام میں کون بڑا ہے؟“

شاہ صاحب نے تبسم فرمایا اور جواب دیا۔

کے گفت کے عین ہی کہ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم است کہ ایں بزرگ زمین، ادبہ اوج سماست بگفتش کہ نہ ایں حجت قوی است حجاب بر سر دوا، گھر نہ دریا است (کسی نے کہا۔ حضرت عیسیٰ کا مقام رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اعلیٰ ہے کیونکہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم زیر زمین دفن ہیں اور حضرت مسیح چوتھے آسمان پر تشریف فرما ہیں۔ سننے والے نے اس کا جواب یوں دیا کہ پانی کے ٹیلے ہمیشہ سطح آب پر رہتے ہیں اور گھر ہمیشہ دریا کی سطح پر رہتا ہے)

پادری کا سر پھرا گیا اور سامعین و ناظرین نے غرہ تکبیر بلند کیا۔

آپ نے پادری کو بالکل لا جواب کر دیا تھا۔ اس مناظرے کی بھی دہلی اور اس کے نواح میں بڑی دھوم مچ گئی اور ہر طرف سے آپ کو مبارکبادیں وصول ہونے لگیں۔

اس سال بارش نہیں ہوئی تھی۔ خشک سالی نے ہر شخص کو پریشان کر دیا تھا۔ اسی عالم میں بادشاہ کے ایک مصاحب نے خواب میں دیکھا کہ ایک بزرگ جبہ و دستار پہنے سامنے کھڑے تھے۔ ان کے پاؤں میں گزری کی کھڑاؤں تھیں اور ہاتھ میں لاٹھی پکڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے بادشاہ کے مصاحب سے پوچھا۔ ”اے شخص! تو بادشاہ کا مصاحب ہے نا؟“

مصاحب نے جواب دیا۔ ”ہاں، میں بادشاہ کا مصاحب ہوں مگر اس سوال سے تیرا مقصد؟ تیرا مطلب؟“

بزرگ نے فرمایا۔ ”کل بادشاہ کو بتا دے کہ خشک سالی کی وجہ سے لوگ ادھر ادھر بھاگ رہے ہیں۔ اگر بادشاہ کو اپنی ذات اور رعایا سے بھردری ہے تو وہ شاہ عبدالعزیز کی خدمت میں جائے اور ان سے کہے کہ آپ کو بادشاہ نے یا فرمایا ہے اور جب شاہ صاحب تشریف لے آئیں تو ان سے فرمائیں کہ شہر کے دروازے پر ایک نقش لکھ کر آویزاں فرمادیں۔ اس نقش کی برکت سے خدا بارش بھی فرمادے گا اور شہر سے وبا کو بھی دفع کر دے گا۔“

بادشاہ کے مصاحب کی آنکھ کھلی تو علی الصبح بادشاہ کے پاس چلا گیا اور ملاقات ہوئے ہی اپنا خواب سنا دیا۔ بادشاہ سے عرض کیا۔ ”آقاے ما! میں نے سنا ہے کہ بارش نہ ہونے کی وجہ سے شہر کے بعض حصوں میں وبا پھوٹ پڑی ہے۔ اگر یہ خبر درست ہے تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ وہ دن دور نہیں جب پورا شہر اس وبا کی لپیٹ میں آجائے گا۔“

بادشاہ نے پوچھا۔ ”پھر مجھے کیا کرنا چاہیے؟“

مصاحب نے جواب دیا۔ ”آپ اسی وقت ایک اچھی شاہ عبدالعزیز کی خدمت میں روانہ فرمادیجیے۔ وہ شاہ صاحب کو میرے خواب کی تفصیل بتا کر نماز استسقاء کے لیے انہیں طلب کر لے گا۔“

بادشاہ نے مصاحب کی اس تجویز پر عمل کیا۔ ایک شخص کو بلا کر اسے اپنا اچھی بتایا۔ واقعات اور خواب کی تفصیل لکھوا کر اچھی کے حوالے کر دی اور کہا۔ ”شاہ صاحب کو بہر قیمت جامع مسجد کی یزیدوں تک لانا ہے۔“

جب شاہ عبدالعزیز کی خدمت میں بادشاہ کا اچھی پہنچا اور آپ نے غایتِ طلبی جان لی تو اپنے مریدوں کے سامنے

خوبصورت باتیں

☆ خلوص اور عزت بہت نایاب تھے ہیں، اس لیے ہر کسی سے ان کی امید نہ رکھو کیونکہ بہت کم لوگ دل کے امیر ہوتے ہیں۔
☆ اگر دوست نہ ہوتے تو کبھی یقین ہی نہ ہوتا کہ اجنبی لوگ بھی اپنوں سے زیادہ پیار کر سکتے ہیں۔
☆ زندگی جینے کے دوسرے انداز۔ بھول جاؤ انہیں جنہیں معاف نہیں کر سکتے اور معاف کر دو انہیں جنہیں بھلا نہیں سکتے۔
☆ بھیجی کسی کے چہرے کو مت دیکھو بلکہ اس کے دل کو دیکھو کیونکہ اگر سفید رنگ میں وفا ہوتی تو تک زخموں کی دوا ہوتا۔
☆ ندامت کے آنسو زندگی میں چرخوں کا کام کرتے ہیں کیونکہ ان سے دل روشن ہو جاتا ہے۔
(مرسلہ: عبد الجبار ردی انصاری۔ چوبنگ سٹی لاہور)

قابل توجہ

☆ انسان اپنے دانتوں اور زبان سے اپنی تیر کھودتا ہے۔ (نعمان حکیم)
☆ انسانی ذہن کی مثال تالاب کی سی ہے اور آپ کے لفظ وہ پتھر ہیں جو اسے گدلا یا پاکیزہ کر سکتے ہیں۔ (ارسلو)
☆ کسی بھی اونچے پہاڑ پر چڑھنے کے لیے آہستہ آہستہ چلنا پڑتا ہے۔ (جی پیٹر)
☆ میں نے تجربہ کیا کہ مہوہ توڑا ہے جس پر لکھا ہے، کامیابی ان کے لیے ہے جو کوشش کرتے ہیں۔ (ڈومنیٹیلی)
☆ سب سے بڑا علم نیکی ہے اور سب سے بڑی جہالت بدی ہے۔ (سقراط)
☆ لاپٹی اور قیوں کو سکون نہیں مل سکتا۔ (رابرٹ بیری)
☆ موت گھٹت سے بہتر ہے۔ (طارق بن زیاد)
(مرسلہ: ریاض بٹ۔ حسن ابدال)

نواب صاحب غصے سے دانت چیں کر رہ گئے۔

جب نماز استسقاء کے بعد لوگ اپنے اپنے گھروں کو جا رہے تھے تو انہوں نے آسمان پر آوارہ بادلوں کا ایک کھڑا بھی نہیں دیکھا۔

آسمان بالکل صاف ہو چکا تھا۔ نواب صاحب اپنا گھوڑا دوڑاتے ہوئے شاہ صاحب کے پاس پہنچے اور طنزیہ سلام کے بعد پوچھا۔ ”حضرت! اگر اجازت دیں تو ایک بات پوچھوں؟“

آپ نے اجازت دے دی۔ ”بھوق..... کیا پوچھنا چاہتے ہو؟“
نواب صاحب نے کہا۔ ”شاہ صاحب! آپ عید گاہ میدان ابرو بارش طلب کرنے کے لیے تشریف لے گئے تھے یا بادلوں کو دفع کرنے کے لیے؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”نواب صاحب! اللہ کے بندوں کی دل آزاری سے باز آئیں کیا میں نے اسی وقت یہ بات نہیں بتادی تھی کہ آسمان پر موجود بادل جو نے ہیں اور بارش ان سے نہیں ہوگی بلکہ جب یہ دفع ہو جائیں گے تو ان کی جگہ دوسرے بادل آجائیں گے اور ان سے بارش ہوگی۔“

نواب صاحب نے مسکرا کر کہا۔ ”میں کرسی ڈال کر بیٹھ جاتا ہوں اور آپ کے بتائے ہوئے سچے بادلوں کا انتظار کرتا ہوں۔“

آپ ناراض اور دل برداشتہ گھر واپس چلے آئے۔
بارش دوسرے دن بھی نہیں ہوئی مگر تیسرے دن واقعی گہرے سرمئی بادلوں نے آسمان کی تلاٹھ پر پردہ ڈال دیا اور زور شور سے بارش ہونے لگی۔

شاہ صاحب کو نواب صاحب کی زہریلی سبیلی باتیں یاد رہی تھیں۔ آپ سمجھتے ہوئے نواب صاحب کے گھر تشریف لے گئے۔ نواب کو اس کے ملازمین نے بتلادیا کہ شاہ صاحب سمجھتے ہوئے تشریف لارہے ہیں۔ اس نے کھڑکی میں سے مہانگ کر شاہ صاحب کو آتے دیکھا اور گھر کے دروازے بند کر کے بیٹھ گیا۔

بادشاہ نے کہا۔ ”حضرت! کچھ ارشاد فرما لیں۔“

آپ نے تو یہ نکتہ اور دعا پر کھٹکھٹ شروع کر دی اور کچھ دیر بولنے کے بعد فرمایا۔ ”دہلی میں شاہ غلام علی نامی بزرگ کی ذات ایسی ہے کہ اگر کسی نے ان کو نہیں دیکھا اور ان کی باتیں نہیں سیں تو گویا وہ بہت بڑی عظمت اور بزرگی کے قرب سے محروم رہا۔“

بادشاہ نے پوچھا۔ ”کیا یہاں شاہ غلام علی موجود ہیں؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”ہاں وہ موجود ہیں۔ اگر بادشاہ سلامت مناسب سمجھیں تو انہیں بھی یہیں بلوایا جائے۔“

بادشاہ نے فوراً اجازت دے دی کہہ کر۔ ”حضرت! اس میں تکلیف کیوں؟ فوراً بلوایے اور ملاقات کرائیے۔“

آپ نے ایک آدمی بھیج کر شاہ غلام علی کو بلوایا۔ شاہ غلام علی نے آتے ہی ازراہ احترام آپ کے ہاتھوں کو بوسہ دیا۔ بادشاہ ان کے احترام میں کھڑا ہو گیا۔ شاہ صاحب نے فرمایا۔ ”تو یہ ہیں شاہ غلام علی..... یہ جہاں موجود ہوں گے، شرف اور نیکی وہیں پر سایہ لگن ہو جائے گی۔“

بادشاہ شاہ غلام علی سے باتیں کرنے لگا اور آپ خاموشی سے ہٹ گئے۔ کچھ دیر بعد جب بادشاہ کو آپ کی عدم موجودگی کا خیال آیا تو کسی سے پوچھا۔ ”یہ شاہ صاحب کہاں چلے گئے؟“

بادشاہ کو جواب ملا۔ ”شاہ صاحب بادشاہ کے قرب سے پریشان تھے چنانچہ پتہ نہ پڑا کہ شاہ غلام علی کو بادشاہ سے ملو کے خود چلے گئے۔“

بادشاہ نے آپ سے کہلایا کہ آپ ایک فضل لکھ کر شہر کے کسی دروازے پر چسپاں کرادیں۔ آپ نے حقوق کی ملاح کی خاطر سولہ فٹس تیار کیے اور شہر کے سولہ دروازوں پر چسپاں کرادے۔
ان کارروائیوں کی برکت سے شہر میں بارش بھی ہوئی اور دبا بھی جاتی رہی۔

☆☆☆

بادشاہ اکبر شاہ ثانی کئی سال بعد پھر بارش نہ ہونے کی مصیبت کا شکار ہو گیا۔ پورا شہر پریشان تھا۔ اکبر شاہ ثانی نے آپ کے پاس پتیا بھیجا۔ ”قبلہ شاہ صاحب! میں عید گاہ پہنچ رہا ہوں، براہ کرم! خدا کی مخلوق کے لیے آپ بھی وہاں پہنچ جائیں اور نماز استسقاء پڑھائیں۔“

آپ اسی وقت عید گاہ روانہ ہو گئے۔ اس وقت آسمان ابر آلود تھا۔ کہیں کہیں بادلوں کے آوارہ کھڑے تیر رہے تھے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ نماز استسقاء کے بعد بھی بادل برس پڑیں گے۔

جب آپ عید گاہ پہنچے تو وہاں بادشاہ کے پاس ایک نواب کو بیٹھ دیکھا۔ یہ نواب اپنے عقیدے کی رو سے تصوف اور صوفی پر یقین نہیں رکھتے تھے اور ان نواب صاحب کو جب بھی کوئی موقع ملتا تھا، بزرگان دین اور تصوف کو برا بھلا کہتا شروع کر دیتے تھے۔ شاہ صاحب نے ان نواب صاحب کو دیکھا تو طبیعت میں ٹکدر پیدا ہو گیا۔ نواب صاحب بھی شاہ صاحب کو دیکھ کر مسکرائے۔

شاہ صاحب نے نماز استسقاء پڑھائی اور بارش کے لیے دعا مانگی۔

نواب صاحب نے آہستہ سے پوچھا۔ ”شاہ صاحب! بادل تو فضا میں پہلے ہی موجود ہیں، اگر بارش ہوگئی تو اس میں آپ کا کیا آپ کی نماز استسقاء کا کیا کمال ہوگا؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”بات تو اعتقاد اور یقین کی ہے نہ کہ بادل تو یہ جموئے ہیں، ان سے بارش نہیں ہوگی۔“
نواب صاحب نے حیرت سے پوچھا۔ ”شاہ صاحب! جموئے بادل کی اصطلاح بھی خوب گھڑی ہے آپ نے۔ اصل اور سچے بادل کب آئیں گے جن سے بارش ہوگی؟“

شاہ صاحب نے فرمایا۔ ”جب فضا ان جموئے بادلوں سے پاک ہو جائے گی۔“

نواب صاحب طنزیہ مسکرا رہے تھے۔ کہنے لگے۔ ”شاہ صاحب! آپ کی دکانداری بھی خوب ہے، کبھی میرا بس چلا تو میں آپ کو نوکوں کو درست کر دوں گا۔“

شاہ صاحب نے جواب دیا۔ ”نواب صاحب! ایسی باتیں نہ کریں! اصلاح اور درستی اللہ کے اختیار کی چیزیں ہیں۔ وہی جہ کبھی ٹھیک کر سکتا ہے اور اسی نے فرعون کو بھی ٹھیک کر دیا تھا۔“

حاجتِ روائی اللہ سے طلب کرنی چاہیے

ایک مرد درویش انسانی آبادیوں سے دور جنگل میں جا کر گوشہ نشین ہوا۔ ایک روز اس ملک کے بادشاہ کا احقر سے گزر ہوا۔ درویش نے بادشاہ کی طرف توجہ نہ دی۔ بادشاہ بڑا حیران ہوا کہ لوگ اس کے رعب اور دبے سے مرعوب ہوجاتے ہیں۔ ایک یہ درویش ہے کہ جس نے مجھے نظر اٹھا کر دیکھا تک نہیں۔ بادشاہ نے غصے میں آکر زمرے کہا۔

”یہ درویش اور گداؤں پرش تو جانوروں کے مانند ہوتے ہیں۔ شان میں محفل ہوتی ہے نہ انسانیت۔ اس فقیر کو دیکھو اسے خیر نہیں کہ یہاں سے اس ملک کا بادشاہ گزر رہا ہے۔“

زمرے اس درویش کے پاس آیا اور اس سے اس بے نیازی کی وجہ پوچھی اور یہ بھی کہا کہ وہ بادشاہ کو دیکھ کر آداب کیوں نہ سمایا۔ درویش نے جواب دیا۔ ”اے بادشاہ سے جا کر کہو کہ وہ خدمت اور آداب سمجھنے کی توقع اس سے کرے جس کو اس نے انعام و اکرام سے نوازا ہو۔ اے بے نیازی بادشاہ کے ذمے رعایا کی نگہبانی ہوتی ہے اور رعایا بادشاہ کی اطاعت گزاری کے لیے نہیں ہوتی۔ بیخبریں چڑھنے کے لیے نہیں ہوتیں بلکہ چڑھا ہوا بیخبروں کی رکھوالی کے لیے ہوتا ہے۔“

زمرے بادشاہ کی طرف جانے کے لیے مڑا ہی تھا کہ درویش نے پیچھے سے آواز دے کر کہا۔

”بادشاہ سے کہنا اس دنیا کی زندگی مختصر ہے۔ صرف چند روزہ۔ تو دیکھ لے گا کہ ظالم کی کھوپڑی کے پیچھے کوئی کھاجاتی ہے۔ نقدیر ایسا دار کرتی ہے کہ بادشاہی اور غلامی کی تیز مرٹ جاتی ہے۔ قبر کے اندر بالدار اور فقیر میں سب فرقت جاتا ہے۔“

بادشاہ نے اس درویش کی باتیں دیر کی زبانی سنیں تو قہر کے ساتھ ساتھ اسے خوشی بھی ہوئی اور یہ باتیں اسے اچھی لگیں۔ وہ خود درویش کے پاس گیا اور بولا۔ ”اے مرد درویش! ایک کھانا کھا۔“

درویش نے بڑی بے نیازی سے کہا۔ ”میں آپ سے صرف دو بار ہوں گا کہ آپ دوبارہ میرے پاس آنے کی زحمت نہ کریں۔“

بادشاہ جواب ہو گیا تو درویش سے درخواست کی۔ ”اے مرد بزرگ! مجھے کوئی نصیحت کر۔“

فقیر بولا۔ ”اے بادشاہ! اس وقت تیرے ہاتھ میں اللہ کی نعمتیں ہیں، ان سے فائدہ اٹھالے۔ یہ مال دولت اور اقتدار دائمی نہیں ہوتے۔ یہ ہاتھ بدلتے رہتے ہیں۔“

مرسلہ: ایسا ہدایت، مہمان (ممتاز آباد)

ہو چکا ہے۔

آپ نے لاڈلی خانم سے پوچھا۔ ”وہ بزرگ جنہوں نے تجھ کو دیکھا، بیجا ہے، ان کی شکل صورت کیسی تھی؟“

لاڈلی خانم نے عرض کیا۔ ”شاہ صاحب! کیا عرض کروں، میرا حافظہ کام ہی نہیں کر رہا۔“

آپ نے لاڈلی خانم سے پوچھا۔ ”اچھا پھر ان لوگوں کا حلیہ بتا جو تجھ کو اس دنیا سے لے گئے تھے؟“

لاڈلی خانم نے جواب دیا۔ ”شاہ صاحب! جیسا کہ میں عرض کر رہی ہوں، میرا حافظہ کام نہیں کر رہا۔“

آپ نے پوچھا۔ ”اچھا ان کی آوازیں کیسی تھیں اور وہ کس زبان میں باتیں کر رہے تھے؟“

لاڈلی خانم نے جواب دیا۔ ”میں نے کبہ جو دیا کہ میرا حافظہ بالکل کام نہیں کر رہا۔“

آپ نے لاڈلی خانم کو کھانا کھلا دیا۔ کھانے میں گوشت تھا۔ ترکاریاں تھیں۔ ملو تھا اور چٹنی تھی۔

لاڈلی خانم نے سب کچھ کھا دیا اور آخر میں بتا کر بولی۔ ”شاہ صاحب! کھانے میں حلوہ نہیں آیا، عجیب سنسنی کھانا ہے۔“

اس کے بعد اس نے کھانا کھا کر اور خوب کھائی بولی۔ ”شاہ صاحب! یہ چیزوں کو ہو کیا گیا ہے کہ کسی چیز میں اس کی اصل لذت باقی ہی نہیں رہی۔“

شاہ صاحب کے ایک مرید نے کھانا کو چمکا تو اس میں زبردست ترشی موجود تھی بولا۔ ”بی بی! اس میں تو بڑی ترشی پائی جاتی ہے۔“

شاہ صاحب نے مرید کا ہاتھ دبا کر خاموش کر دیا۔

لاڈلی خانم سے کسی مرید نے کہا۔ ”خانم! کوئی قصہ سنائیے۔“

لاڈلی خانم نے ذہن پر بڑا زور دیا مگر کچھ یاد نہ آیا۔ بولیں۔ ”کون سی داستان؟ کون سا قصہ؟“

مرید نے جواب دیا۔ ”وہ جو آپ سنایا کرتی تھیں۔“

لاڈلی خانم نے ایک بار پھر حافظہ پر زور دیا۔ ”میں سنایا کرتی تھی؟ کب سنایا کرتی تھی؟ مجھے تو کچھ یاد نہیں پڑتا۔“

مرید نے کہا۔ ”بی بی! آپ کے حافظے کو یہ کیا ہو گیا ہے؟“

آپ نے اس کے در پر دستک دی اور کہا۔ ”لو اب صاحب! دروازہ کھولے۔ پھر میں آپ کو شرمندہ کرنے نہیں آیا ہوں بلکہ میں یہ بتانے آیا ہوں کہ سچے بادل کیسے ہوتے ہیں۔“

لو اب نے اندر سے جواب دیا۔ ”شاہ صاحب! میں بہت شرمندہ ہوں اور اس گھڑی کو برا بھلا کہہ رہا ہوں جب میں نے آپ کا مذاق اڑایا تھا۔“

شاہ صاحب نے مزید تسلی دی۔ ”لو اب صاحب! میں نے کبہ جو دیا کہ میں آپ کو شرمندہ کرنے نہیں آیا ہوں، آپ دروازہ تو کھولے۔“

لو اب صاحب نے دروازہ کھول دیا۔ شاہ صاحب! اندر داخل ہوئے تو لو اب صاحب! شاہ صاحب سے بے تکلیف ہو گئے، کہا۔ ”شاہ صاحب! انی الوافعی خراب بادل چلے گئے اور اچھے بادل آئے اور برس گئے۔ میں اپنی جگہ بے حد پشیمان ہوں۔“

☆☆☆

آپ بچپن میں جس مظاہر لاڈلی بیگم سے قاری تھے سنا کرتے تھے، اس کے بارے میں اچانک اطلاع ملی کہ وہ قطب صاحب کی زیارت کو گئی تھی کہ بے ہوش ہو کر گر گئی اور اس کا دم نکل گیا۔ آپ اس کو دیکھنے اس کے کمر چلے گئے۔ اس وقت لاڈلی خانم کے عزیز و اقارب رو دھورے تھے اور کچھ تختہ و تختین میں مشغول تھے۔ گھر والوں کو آپ کی تشریف آوری کا پیسے ہی علم ہوا، آپ کو چاروں طرف سے گھیر کر دنا شروع کر دیا۔ آپ نے پوچھا۔ ”لاڈلی خانم کی صحت کہاں ہے؟“

مرحوم کے رشتے داروں نے آپ کو صحت کے سامنے پہنچا دیا۔ اس وقت آپ کو کھٹنی پہنائی جا رہی تھی۔ آپ نے لاڈلی خانم کے چہرے پر نظریں جمادیں اور لوگوں سے پوچھا۔ ”کیا یہ واقعی مر چکی ہے؟“

انہیں جواب دیا گیا۔ ”کیا آپ کو اس کی موت کے بارے میں اب بھی کسی قسم کا شبہ ہے؟“

آپ نے فرمایا۔ ”اس کو ابھی دن نہ کرنا، انتظار کرو۔ یہ ابھی زندہ ہے۔“

لوگوں کو آپ کی باتوں پر یقین نہیں آیا مگر آپ کی صحت پر اعتقاد تھا۔ وہ لوگ رک گئے، کچھ دیر تک آپ لاڈلی خانم کو گھورتے رہے، آخر اس کی آنکھوں کو جنبش ہوئی اور پلکیں حرکت میں آئیں، پھر آنکھیں کھل گئیں۔ لاڈلی خانم نے اپنے اس پاس لوگوں کا ہجوم دیکھا تو مہربان کر دینے کی اور حیرت سے پوچھا۔ ”لوگو! یہ کیا ہو رہا ہے؟ میں کہاں ہوں؟ تم سب کون ہو؟“

ایک شخص نے جواب دیا۔ ”لاڈلی خانم! تم مر چکی تھیں۔ یہ سارے لوگ تمہاری آخری رسوم ادا کرنے آئے تھے۔“

لاڈلی خانم نے گھبرا کر جواب دیا۔ ”لوگو! میں ابھی زندہ ہوں۔ میں مردہ نہیں زندہ ہوں۔“

لاڈلی خانم کی زندگی نے سبھی کو حیران اور پریشان کر دیا تھا۔ آپ اسی وقت یہ کہہ کر واپس چلے آئے۔ ”میں دو دن بعد لاڈلی خانم سے دوبارہ ملوں گا۔“

چنانچہ تین دن بعد آپ نے لاڈلی خانم کو اپنے گھر بلوایا۔ جب وہ آگئی تو آپ نے اس سے پوچھا۔ ”ہاں لاڈلی خانم! اب بتاؤ یہ کیا معاملہ تھا؟“

لاڈلی خانم نے جواب دیا۔ ”شاہ صاحب! میں کیا عرض کروں؟ جب میں قطب صاحب کی زیارت کر رہی تھی تو مجھے اپنے پاؤں کے انگوٹھے میں سرسری سی معلوم ہوئی اور ایسا لگا، گویا میرا دم نکچا جا رہا ہے۔ میرے جسم کی طاقت سلب ہونے لگی اور میں بے ہوش ہو گئی پھر میرے دوسرے حواس کام کرنے لگے اور میں نے دیکھا کہ میں ایک بزرگ کے سامنے پیش کر دی گئی ہوں۔ جو لوگ مجھے لے گئے تھے، میرے موجودہ حواس ان کی نشاندہی نہیں کر سکتے۔ میرا حافظہ جواب دے چکا ہے اور میں چشم تصور سے انہیں دیکھ تو رہی ہوں مگر اسے لفظوں میں نہیں بیان کر سکتی۔ میں نے سنا، بزرگ نے میرے لے جانے والوں سے پوچھا۔ ”یہ تم لوگ کس لاڈلی خانم کو لے آئے؟“

ان لوگوں نے جواب دیا۔ ”جس کو آپ نے طلب فرمایا تھا۔“

بزرگ نے ڈانٹ کر فرمایا۔ ”میں نے تو لاڈلی خانم بہتر رمضان خان کو طلب کیا تھا، وہ سنہری مسجد کے قریب رہتی ہے۔“

”اس کے بعد مجھے راکر دیا گیا اور جب میں نے آنکھ کھولی تو میں نے آپ کو اپنے سامنے کھڑا دیکھا۔“

شاہ صاحب نے اسی وقت ایک مرید کو سنہری مسجد کی طرف یہ کہہ کر روانہ کر دیا کہ وہ وہاں یہ معلوم کر کے آئے کہ آج سے تین دن پہلے وہاں کسی لاڈلی خانم نامی عورت کا انتقال ہوا ہے۔

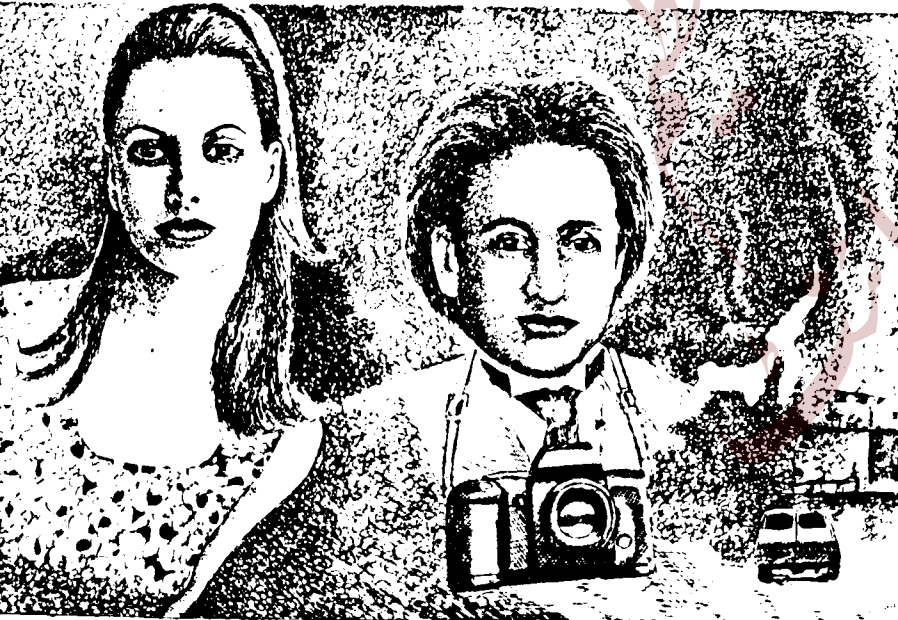
آپ کے مرید نے چند گھنٹوں بعد بتایا کہ حضرت وہاں جا کر معلوم ہوا کہ تین دن پہلے ایک عورت لاڈلی خانم کا انتقال

مقصدِ حیات

ایم اے راحت

اللہ تعالیٰ نے وقت کی بہترین شکل انسان میں ڈھال دی ہے۔ وقت کا آغاز ہوا اختتام... وقت کی خوبصورتی ہوا بدصورتی... حتیٰ کہ وقت کی گردش ہوا وقت کا انجام... یہ سب انسان کے حالات و واقعات سے ہی ظاہر ہوتا ہے۔ زیر نظر کہانی میں وہ جو خود کو قانون کے رکھوالے کہتے تھے مگر درحقیقت قانون کو ہاتھوں میں رکھنے والے بہت طاقتور اور عقل کل سمجھتے تھے... اس کہانی کے مصنف ایم اے راحت جنہوں نے ایک عرصے تک اپنے قلم کے ذریعے ادارہ جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشن سے رابطہ برقرار رکھا بالآخر وقت کے اختتام پر رختِ سفر باندھ بیٹھے... لہذا ثابت ہوا کہ مقصد بھی جب تک ساتھ دیتا ہے جب تک حیات باقی رہتی ہے... تاہم فکشن میں ان کا مفرد اسلوب تھا۔

اپنی تحریروں میں ہمیشہ دو سبب دے دے مصنف کی



دو دنوں ایک دوسرے کو دیکھ کر سکرانے تھے۔
”بچیلے دو اترو دیو میں تو آپ سے ملاقات نہیں
فریجیر بچ دیا اور پنڈی چلا گیا۔ وہاں سے پٹاور، سوات،
مری اور ہنزہ۔ پیسے ختم ہو گئے تو واپس آ گیا... لیکن پھر بھی
آرام کار تار کا کیونکہ کچھ پیسے بچ گئے تھے۔ اب تیری سہیلی کا
”یہ بات نہیں ہے۔ میں نے تین ماہ کی چھٹی لی ہوئی“

سپینس ڈائجسٹ 243 جون 2017ء

۸۔ وہ شاہانہ نظامِ زندگی جس میں چند اشخاص یا چند خاندانوں کی پیش و پشت کے سبب سے دولت کی صحیح تقسیم میں غفل واقع ہوا اس کا مستحق ہے کہ اسے جلد از جلد ختم کر کے عوام کی معیشت ختم کی جائے اور انہیں مساویانہ نظامِ زندگی کا موقع دیا جائے۔

آپ یہ ساری باتیں تحریر اور تقریر کے ذریعے عوام اور خواص تک پہنچا رہے تھے۔ امراء اور ڈے وارکار پر داناوان حکومت نے آپ کو مشتبیہ کیا کہ اگر تم ان سے باز نہ آئے تو تمہیں شہر بدر کر دیا جائے گا۔
آپ نے انہیں جواب دیا۔ ”میں اپنی کوششوں سے ہرگز باز نہ آؤں گا اور اس سلسلے میں برصوبت برداشت کرنے کو تیار ہوں۔“
چنانچہ آپ کو جلاوطن کر دیا گیا اور حکم ملا کہ جو پور چلے جاؤ۔
اس حکم کے بعد آپ نے دہلی کو چھوڑ دیا۔ سواری کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے تھے کہ انہیں دوسرا حکم ملا کہ انہیں اپنے بھائی رفیع الدین کے ساتھ یہ سفر پیدل کرنا ہے۔ چنانچہ آپ نے اپنے بھائی کے ساتھ یہ سفر پیدل ہی طے کیا۔ اس دشوار اور المناک سفر نے آپ کو پینائی سے محروم کر دیا۔
آپ کی عدم موجودگی میں آپ کا مکان ضبط کر لیا گیا۔

ایک عرصے بعد آپ کو دوبارہ دہلی ملا لیا گیا۔ یہ وہ دور تھا جب دہلی کا تاج و تخت تو مغل فرمانروا کے قبضے میں تھا مگر اقتدار اور حکومت انگریزوں کے ہاتھ میں تھی۔ ریڈیڈنٹ جو چاہتا تھا ہو جاتا تھا۔ بادشاہ کا چاہا مشکلوں سے ہوتا تھا۔
ان حالات میں شاہ عبدالعزیز کا روحانی اور مادی دنیاؤں میں جنگ و جہاد کرنا بہت ہی دشوار کام تھا۔
جن دنوں آپ دہلی واپس آ چکے تھے، آپ کو بعض عجیب و غریب واقعات کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک شب ایک شخص حواس باختہ، مضطرب و بے قرار آپ کے پاس آیا۔ اس وقت بھی آپ کے آس پاس مرید موجود تھے۔ یہ شخص چپ چاپ کھڑا ہو گیا۔ کچھ دیر بعد آپ نے اس سے پوچھا۔ ”بھائی! تیرا کیا کام آ پڑا ہے مجھ سے؟“
وہ شخص رو ہانسا ہو رہا تھا۔ بولا۔ ”میں آپ سے تخلیق میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ براہ کرم یا تو تجزیہ فرمادیں یا پھر کچھ دیر کے لیے ہم دونوں یہاں سے ہٹ چلیں۔ جیسا مزاج عالی میں ہو، مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں، اس کو بھی نہایت سحر سے سامع فرمائیں۔“

آپ اس شخص کو تخلیق میں گئے اور فرمایا۔ ”ہاں، اب سب کچھ سچ بتا دے مجھے۔“
اس شخص نے کہنا شروع کیا۔ ”حضرت! میں ایک شادی شدہ شخص ہوں۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو بے حد چاہتے تھے اور رنگ اور حسد کی نظروں سے دیکھے جاتے تھے۔ کل رات وہ بیت الخلاء جانے کے لیے اٹھی اور مجھ سے کہا... میں پیشاب کی حاجت محسوس کر رہی ہوں۔ اگر آپ میرے ساتھ چلیں تو تو ازشِ فکر یہ۔ چنانچہ میں اس کو بیت الخلاء لے گیا۔ وہ اندر چلی گئی اور میں باہر کھڑے ہو کر اس کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔ کافی دیر کی واپسی کے بعد میں نے اپنی بیوی کو آواز دی کہ میں تیرا کہاں تک انتظار کروں، تو آ کیوں نہیں جاتی۔

”دوسری طرف سے جواب نہاں درہا۔ میں نے ایک بار پھر آواز دی کہ نیک بخت! آخر بات کیا ہے؟ اس کے بعد میں ہمت کر کے اندر چلا گیا اور یہ دیکھ کر حیران اور حاس باختہ ہو گیا کہ اندر کوئی بھی نہیں تھا۔ میری بیوی کا کہیں کوئی پتہ نہ تھا۔“
”میں نے باہر نکل کر جس سے بھی اپنا حال بیان کیا، اس نے میرا مذاق اڑایا۔ آخر میں آپ کے پاس آ گیا۔ آپ میری مدد فرمائیں۔“

آپ نے فرمایا۔ ”میں کل رات تیرا کام کروں گا، تو اگر ممبر کر سکے تو کر۔ صرف آج کی رات۔ اللہ نے چاہا تو میں کل رات تیرا کام کروں گا۔“

جاری ہے

ماخذات

علمائے ہند کا شاندار ماضی۔ مولانا سید محمد میاں۔ ملفوظاتِ شاہ عبدالعزیز۔ مترجمین:
مولوی محمد علی لطفی، مولوی انتظام اللہ شہابی، انفاس العارفین، شاہ ولی اللہ دہلوی
... تذکرہ علمائے ہند۔ مولوی رحمت علی، رود کوثر، شیعہ محمد اکرم

سپینس ڈائجسٹ 243 جون 2017ء

آغاز ہے۔“

”اب کیا ارادہ ہے؟“ شاہ میر نے پوچھا۔
”وہی تین ماہ۔ اس کے بعد بانک بچ دوں گا،
پاسپورٹ بنوالیا ہے اس بار سری لنکا جانے کا ارادہ ہے۔“
”سری لنکا ہی کیوں؟“

”بچپن سے ذہن پر سوار ہے، غالباً اس خٹلے سے میرا
کوئی روحانی رشتہ ہے۔“
دونوں بلند گنگ سے نکل آئے۔ انٹرویو ہو چکا تھا، وہی
مجھے بے سوالات۔ وہی آخری جملہ۔ بہتر ہے، آپ کو
بذریعہ ڈاک اطلاع دے دی جائے گی۔

”جائے کہاں لپی جائے؟“ منصور نے پوچھا۔
”کھڑائی ہاؤس میں مگر پیسے تو ہیں؟“ شاہ میر نے

بے دھڑک پوچھا۔
”ہاں..... کیا تمہارے پاس نہیں ہیں؟“
”نہیں کل شام کو جو تے میں غاسول لگوایا تھا۔ باقی
واپس کے لیے کرائے کے پیسے بچا لیے ہیں۔ اصل میں اب
بس کنڈیکٹر بھی سمجھدار ہو گئے ہیں، کانج کارڈ پیش کرو تو
بھٹ کرتے ہیں کہ صاحب آپ اسٹوڈنٹ تو نہیں لگتے
چنانچہ یہ آسانی ختم ہو گئی ہے۔“

”اس کا مطلب ہے کہ تم مسلسل انٹرویو دے رہے
ہو۔“ بانک ایک مناسب جگہ پر کھڑی کر کے دونوں کی
ہاؤس میں آئیٹھے اور میٹر کو چالنے لانے کو کہا۔ منصور نے
پوچھا۔ ”انٹرویو کیا رہا؟“

شاہ میر نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”بہت اچھا، ویسے آج
میں نے اس ٹیپسٹ والے بندر کو بہت پریشان کیا۔ بڑا
لفظ آیا۔ بے گتے سوالات پوچھ رہا تھا۔“
”تم کہاں رہتے ہو؟“ منصور کے پوچھنے پر شاہ میر

نے اپنی رہائش کا پتہ دہرایا اور پھر یولا۔
اس دن کے بعد سے دونوں دوست بن گئے۔
دونوں کے حالات یکساں تھے۔ شاہ میر اپنی ماں کے ساتھ
تین کمروں کے ایک گھر میں رہتا تھا جن میں سے اوپر کے
دو کمرے کرائے پر دیے ہوئے تھے۔ اس کرائے سے شاہ
میر کی تعلیم کا خرچہ برداشت کیا جا رہا تھا۔ پتا نہیں رضیہ
سلطانہ پر شاہ میر کو تسلیم دلانے کا جنون کیوں سوار تھا۔ شوہر
کے انتقال کے بعد دونوں بالکل تنہا رہتے تھے۔ شوہر نے نہ
جانے کس طرح یہ تین کمروں کا گھر خریدا تھا اور یہی ان کی
نکل کائنات تھی۔ پھر لی اے کے بعد اس نے نوکری کی
تلاش شروع کر دی۔ کوئی آمدنی نہ ہو تو گھر کے حالات کیا

بہتری اختیار کر سکتے ہیں۔ تعلیم معمولی چیز نہیں ہوتی اور پھر
اس کے اپنے اخراجات بھی ہوتے ہیں۔
رضیہ سلطانہ سلائی کا جو کام کرتی تھیں، اس سے
اخراجات پورے نہیں ہوتے تھے۔ مجبوراً ایک ایک کر کے اوپر
کے دونوں کمرے کرائے پر اٹھانا پڑتے تھے۔ ماں بیٹے کے لیے
پچھو موجود یا کرایہ کافی تھا۔ رضیہ سلطانہ کا خیال تھا کہ شاہ میر
ملازم ہو جائے گا تو سارے دلدرد دور ہو جائیں گے۔ اب تو سال
سوا سال ہو چکا تھا نوکری بھی کھلنے کا نام ہی نہیں لگتی تھی۔
دوسری طرف منصور کی حالت بھی کچھ ایسی ہی
تھی۔ اس کے ماں باپ نہیں تھے۔ مرنے وقت کچھ روپیہ
بنک میں چھوڑ گئے تھے۔ ایک بانک بھی جو باپ نے اپنے
لیے خریدی تھی، البتہ پاکستان کو اتر میں ان کے ایک دوست
کا گوارہ تھا جو اس نے مستقل طور پر ان لوگوں کو دے رکھا تھا
اور اب بھی وہ گھر منصور ہی کے کپنے میں تھا مگر وہ تنہا رہتا
تھا۔ اس نے بھی کبجویشن کر کے نوکری کی تلاش شروع کر
رہی تھی۔ دفتر میں انٹرویو دینے کے سلسلے میں دونوں کی
ملاقات اسی طرح ہوئی اور وہ دونوں ایک دوسرے کے
ایسے دوست بن گئے۔ منصور اقوام کے روز شاہ میر کے گھر
پہنچ گیا اور رضیہ سلطانہ اسے دیکھتے ہی پہچان لگیں۔ منصور
نے اپنا نام ہی دہرایا تھا۔

”آ جاؤ منصور بیٹے..... شاہ میر مجھے تمہارے بارے
میں سب کچھ بتا چکا ہے۔“ دوپہر کو دال بھری روٹیاں
پوینے کی چٹنی کے ساتھ کھائیں تو منصور کا منہ قہقہوں کرتے
نہ تھا۔ اس نے کہا کہ نہ جانے کتنے عرصے بعد اسے ماں
کے ہاتھوں کی خوشبو محسوس ہوئی ہے۔ ان کے درمیان بے
روزگاری کا رشتہ قائم ہو گیا اور دونوں کی دوستی خاصی مستحکم
ہوئی چلی گئی۔ اب اگر بھی انٹرویو دینا ہوتا تو منصور شاہ میر کو
اپنی موٹر سائیکل پر بٹھا کر لے جاتا تھا۔ یہ معاملہ چلا رہا۔
ایک دن منصور، شاہ میر کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے کہا۔
”تمہاری سہ ماہی پوری ہونے والی ہے، اس کے
بعد کیا ارادہ ہے؟“

”اب ان میں تبدیلیاں کرنی پڑیں گی۔ شاہ میر!
پہلے تو جیسا کہ میں نے تمہیں بتایا ہے، یہی سوچا تھا کہ موٹر
سائیکل بچوں گا اور سری لنکا چلا جاؤں گا۔ جتنے دن گزر سکے
گزار دوں گا اس کے بعد پھر واپس ہوگی مگر اب تمہیں اکیلا
چھوڑ کر نہیں جاسکتا۔“

”تو تمہیں جانے کون دے گا۔ خیر چھوڑ دو آج کا اخبار
دیکھ لیا؟ ملازمتوں کے بے شمار اشتہارات ہیں۔“

”یار! ان دنوں میں ملازمتوں کے اشتہار نہیں دیکھ
رہا بلکہ اخبار کے فرنٹ پیج پر غور کر رہا ہوں۔“
”کیا مطلب؟“

”تم شاید اشتہارات کے علاوہ کچھ نہیں پڑھتے۔“
”پڑھتا ہوں لیکن اخبارات میں اور ہوتا ہی کیا
ہے، صرف سیاسی خبریں.....“
منصور شخصتی سانس لے کر پُر خیال اعزاز میں گردن
ہلانے لگا۔ پھر سر کوئی سا اعزاز میں بولا۔
”ایک بات بتاؤں شاہ میر..... کیا ہم نئی نسل کے
نمائندے نہیں ہیں؟“

”اس بات سے تمہارا کیا مطلب ہے؟“
”کیا ہمارے ہاتھ پاؤں بے جان ہیں؟ ہم لوگ
منسب ملازمت باز نہیں رکھتے؟“

”یار! جو کہہ رہا ہے صاف الفاظ میں کہو۔“
”بڑے اطمینان سے لوگ بینکوں میں گھس جاتے
ہیں، مگر مین سے بندوق چھین لیتے ہیں، وہاں موجود تمام
لوگوں کے ہاتھ بلند کر دیتے ہیں اور کیشیر جو جیل سے دم
تیار کیے ہوئے بیٹھا ہوتا ہے خاموشی سے ان کا قرض انہیں
واپس کر دیتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ بینک کے اندر موجود سٹریز
بھی قرض ادا کرنے پر مجبور ہوتے ہیں کیونکہ بہر حال انہیں
بھی زعمہ رہتا ہے۔ میں بھی یہی سوچتا ہوں کہ ہمارا بھی تو
اس دنیا پر بہت قرض ہے۔“

”تج..... تو تمہارا مطلب ہے کہ.....“
”بالکل صحیح سمجھو تم..... بالکل صحیح۔ ہمیں
دیکھو، کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہے۔ بد قسمتی سے ہمارے ملک
میں بہت سی چیزوں کی کمی ہے۔ نہ تو یہاں آرٹس اسکول
ہیں، نہ ہی جرم کھانے کے انشٹی ٹیوٹ، آدمی اگر تجربہ کاری
سے کوئی جرم بھی کرتا چاہے تو اس کی تربیت کا کوئی معقول
بندوبست نہیں ہے۔“ دونوں ہنسنے لگے۔ منصور نے کہا۔
”دوست..... واقعی بد قسمتی ہے مگر وہ جو کہتے ہیں
ناکہ ضرورت ایجاد کی ماں ہوتی ہے۔ ہم لوگ خود اس سلسلے
میں اپنی تربیت کیوں نہیں کرتے؟“

”تمہارا مطلب ہے کہ ہم اس کام کو باقاعدہ کاروبار
کی حیثیت سے کریں اور اس سلسلے میں اپنی مناسب تربیت
بھی کریں؟“

”میں بھی کہنا چاہتا ہوں کہ اگر یہ نہیں کرو گے تو پھر
کیا کرو گے؟ اگر گہری نظر سے دیکھا جائے تو پچھلے
ماہوں میں جن لوگوں کے ساتھ ہمارے انٹرویو ہوئے ہیں،

ان میں سے بیشتر نوجوان اب جمہیں اچھے لمبوسات میں کسی
اچھی ہی کار میں گھومتے نظر آئیں گے کیونکہ انہوں نے اپنے
لیے منزل تلاش کر لی ہے۔“

”نہیں میری جان..... یہ غلط سوچ ہے۔ اپنے بہتر
حالات کے لیے اپنے ہی جیسے کسی انسان کی زندگی لینا ہم
دونوں میں سے کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔ ویسے بھی
کار چھیننے کا معاملہ جو ہے نا وہ ذرا زیادہ منیکینل ہے۔“
”تو پھر ڈاکوں کا پروگرام کیا رہا؟ گاہے پلو مصروف
ترین شاہراہوں پر ڈاکے نہیں ڈال سکتے، کسی اکیلے گھر میں
دروازے پر دستک دے کر یہ کہہ کر کہہ دیتی سے سامان آیا
ہے، یا ہم میٹر بلیک کرنے آئے ہیں۔ اہل خانہ کو کسی طرح
دھمکایا جائے اور اس طرح کام چلایا جائے۔“
دونوں چند لمحوں تک سنجیدی سے غور کرتے رہے پھر

شاہ میر نے کانپتے ہوئے کہا۔
”اور اخبارات میں بھی کبھی خبریں بھی تو آ جاتی ہیں
کہ اہل خانہ نے ڈاکو کو پکڑ لیا اور اہل محلہ نے اس کے بدن
کی کھال اتار کر اس کا بقیہ حصہ پولیس کے حوالے کر دیا۔
نہیں بھائی، یہ اپنے بس کی بات نہیں ہے۔“
”پلو یہ بھی کیا، خفیات کے دھندے کے بارے
میں کیا خیال ہے؟“

”خبر اب یہ اتنا آسان بھی نہیں ہے۔ خفیات کا
کاروبار بے شک اس وقت زور پکڑے ہوئے ہے، بلکہ کچی
بات یہ ہے کہ اس سنگ، ڈاکا زنی یہ سارے دھندے پیچھے
رہ گئے ہیں لیکن مجھے ایک بات بتاؤ میری جان..... سڑکوں
پر جانوروں کی طرح گھسٹتے ہوئے لوگ، وہ بے بس گھرانے
جن میں معصوم بچے ماؤں کی آغوش میں سمبھوئے، بھوکے
بیٹے بیٹھے ہوئے نظر آئیں اور ان کے گھروں کے مردنے
میں ڈوبے ہوئے کسی نالی کے کنارے مندر گزرتے ہوئے
دھکائی دیں تو کیا دل کو دکھ نہیں ہوتا؟ تم بتاؤ جب ہم اپنی
شاعرکار میں بیٹھ کر اپنے بچنے بچنے سے باہر نکلیں گے اور ہم سے
کچھ قافلے پر کوئی مظالم خاندان فریاد کرتا ہو نظر آئے گا کہ
اس کا سر براہ، اس کا سر پرست نئے کا عادی ہے، مگر کا سارا
سامان بچ چکا ہے اور اس کے پاس سر چھپانے کا ٹھکانا بھی
نہیں ہے تو کیا وہ کارا بھی لگے گی نہیں؟“

”یار! تم تو جذباتی ہو گئے۔“
”دوست! ایک بات بتاؤں، زندگی کا سارا تعلق
جذبات سے ہی تو ہے۔ ہم اگر اپنے جذبات کا سراپا یہ بھی کھو
بیٹھیں تو پھر کیسے جنیں گے؟ ہماری تمہاری دوستی میں کوئی چیز

مشترک ہے؟ محبت کے جذبات ہی ہیں نا، اب تم بتاؤ کہ ہم جذبات کے سوداگر کیسے بن جائیں؟“
منصور گردن جھکا کر کچھ سوچنے لگا پھر اس نے آہستہ سے کہا۔

”ایک اور کاروبار ہے جو میرے خیال میں ان تمام برے دھندوں سے ذرا بہتر ہے۔“
”وہ کیا؟“

”بلیک میلنگ۔“ منصور نے جواب دیا اور شاہ میرسر جھکا کر کچھ سوچنے لگا، پھر پگھلا ہونٹ دانتوں میں دبا کر گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

”یہ ذرا بہتر ہے، اس میں بہت سے خطرات نکل جاتے ہیں۔ بلیک میل انہی لوگوں کو کیا جاتا ہے جو اپنی زندگی میں کوئی برائی کر بیٹھے ہوں اور یہ لوگ معمولی نہیں ہوتے۔ ظاہر ہے کہ خریب کو بلیک میل کیا ہی نہیں جاسکتا۔ اگر اس نے کوئی جرم کیا بھی ہے تو زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ اسے پولیس کے حوالے کر دو۔ اس کے جرم کو طشت ازہام کر دو۔ وہ سرعام رسوا ہو جائے گا۔ لینے دینے کے لیے اس کے پاس کیا ہوگا لیکن اگر کوئی کر دہی جرم کر لے اور دنیا سے پھیلنے رکے اور ہمیں اس بارے میں علم ہو جائے تو اس سے کچھ رقم وصول کرنا کم از کم دل کو انداز نہیں کرے گا۔ دیے بچ تو یہ ہے کہ وہ کمزور لوگ ہی ہوتے ہیں جو بلیک میل ہوتے ہیں۔ ہم اس کام کو بہت ہی اعلیٰ پیمانے پر نہ کریں بلکہ ذرا کچھ دیمانہ ہیں تو مناسب رہے گا۔“
”گو یا تم اس بات سے متفق ہو؟“

”ہاں، میں سمجھتا ہوں کہ اگر اس کے لیے کوشش کر لی جائے تو زیادہ برائی نہیں ہے، حالانکہ یہ بھی ایک اخلاقی جرم ہے۔“

”اخلاقی جرم وہ لوگ نہیں کرتے جو پہلے سے طے شدہ ملازمتوں کے استہدات دیتے ہیں؟ شناساؤں کو کرکے لیتے ہیں؟ سمیرٹ کا کوئی خیال نہیں رکھتے؟ کوئی مقرر کر دے گئے ہیں، آپ اگر ملازمت کے لیے نا اہل بھی ہیں، اچھی رشوت یا سفارش رکھتے ہیں تو ملازمت آپ کی ملکیت، اخلاقی جرم وہ نہیں ہے؟“

”ارے بھی تم نے تو تقریر شروع کر دی۔ کام کی بات یہ ہے کہ اپنے طور پر زندگی گزارنے کے لیے اپنے بہتر مستقبل کا تعین ہمارا بنیادی حق ہے اور ہم اس پر بحث کر رہے ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بلیک میلنگ کے لیے بلیک میلنگ اسٹیف بھی درکار ہوتا ہے، اس کے بارے

میں بھی تو سوچو۔“

”سوچو سوچو، یہ بات ذرا دل کو گھتی ہے۔“ شاہ میر نے کہا اور دونوں پر خیال انداز میں گردن ہلانے لگے، پھر منصور نے کہا۔

”اس کے لیے ہمیں شہر گردی کرنا پڑے گی۔ ویسے اس شہر میں بھی اخلاقی اور معاشرتی جرائم کی بھر مار ہے۔ دوسرے قسم کے جرائم بھی ہوتے ہیں لیکن ہمیں یہ خیال رکھنا ہوگا کہ ہم زیادہ تر اخلاقی جرائم پر توجہ دیں۔ کیونکہ معصوم لوگ کسی کو لینے دینے میں کوئی عار نہیں محسوس کرتے۔ وہ سوچتے ہیں کہ چلو میں دو بد معاشرہ کو تاکہ جان چھوٹے۔ یعنی کام چلنے رہتا چاہیے، ذرا مجھے پٹانے پر ہوئے شک، بس جاری رہے۔“

”تو پھر اس کے لیے ہمیں کل سے اپنے کام کا آغاز کر دینا چاہیے۔ میں ایک کیرا حاصل کر لوں گا۔ یہ میرے لیے مشکل نہیں ہوگا بلکہ میں سمجھ لو کہ کسی زمانے میں اپنا کئی کیرا کسی شناسا کو دیتا تھا، وہاں ناگاہکی نہیں کیونکہ اس وقت وہ میرے کسی مصرف میں نہیں تھا لیکن اب تو اس کی اشد ضرورت ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ کیرا میرے پاس اچھی حالت میں واپس آجائے گا۔ اور پھر بات رہی سواری کی تو بانک میرے پاس موجود ہے، چنانچہ اس کے لیے کارروائی کرتے ہیں۔“

”تو پھر ملاؤ ہاتھ، اپنا کاروبار بہر طور نوکری سے زیادہ اچھا ہوتا ہے، دونوں نے پر جوش انداز میں ہاتھ ملایا۔

☆☆☆

فاروق بیگ ایک کامیاب ترین بیزنس تھے۔ عدالت میں ان کا طوطی بولتا تھا۔ وہ ہر طرح کے کیس لے لیا کرتے تھے اور انہیں کامیاب بنانا ان کی ذمہ داری تھی۔ پچھلے چند برسوں میں ان کا نام جس طرح ابھر کر سامنے آیا تھا، وہ بے مثال تھا۔ وکالت تو وہ طویل عرصے سے کر رہے تھے لیکن بس بعض اوقات انسان کی اپنی کوششیں اس کے لیے زیادہ کارآمد نہیں ہوتیں۔ وقت خود فیصلہ کرتا ہے اور یہ بتا دیتا ہے کہ تقدیر بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ پچھلے چند سالوں نے ان کی مالی حالت بھی کافی بہتر بنا دی تھی۔ لے دے کہ ایک ہی بیٹی تھی۔ بیوی اور بیٹی کے ساتھ ایک پرانے مکان میں رہتے تھے۔ مکان اپنا تھا اور ان سالوں میں اس مکان میں زندگی کی تمام سہولیات مہیا ہو چکی تھیں۔ یہی نہیں بلکہ وہ اپنے فرض واحد سے بھی خاصی حد تک آزاد ہو چکے تھے اور انہوں نے بیٹی کی شادی بھی بڑی دھوم دھام سے کر دی تھی۔

لڑکا ڈاکٹر تھا، ہاؤس جاب کر رہا تھا لیکن ایک اچھا مستقبل سامنے تھا اور پھر چند پیشے ایسے ہوتے ہیں جن میں مستقبل میں دارے بنارے ہو جاتے ہیں۔ ڈاکٹر کا پیشہ بھی انہی میں سے ایک ہے۔ بس انسان ذرا غیر جذباتی ہو اور مرہٹن کو خوفزدہ کرنا جانتا ہو، بہر حال یہ گر کی باتیں میں جو ابھی وہ اپنے داماد کو بتا سکتے تھے۔ سوچا تھا بعد میں اس کی تربیت کر دیں گے۔ ویسے بھی وہ غیر مطمئن نہیں تھے۔ اطمینان بخش زندگی چل رہی تھی۔ طرح طرح کے لوگوں سے شناسائی تھی۔ بہت سے ان کے مستقبل کلائنٹ بھی تھے جن کے مفادات کی قانونی نگرانی فاروق بیگ کیا کرتے تھے۔ انہی میں اکبر حسین بھی شامل تھے جو بیزنس فاروق بیگ کی نگاہوں میں ایک انوکھے کردار کی حیثیت رکھتے تھے۔ اکبر حسین کو جاندادیں بنانے کا شوق تھا۔ شہر میں بہت سے مکانات خریدے ہوئے تھے۔ پہلے کاروبار بھی کرتے تھے۔ اسپورٹ انیکسپورٹ کی ایک ٹرم کھولی ہوئی تھی لیکن کچھ عرصے قبل یہ فرم انہوں نے بند کر دی تھی۔ بس حواج عجیب تھا۔ بہت ہی تجسس قسم کے انسان تھے۔ غالباً ملازمین کو تنخواہ دینا انہیں ناپسند تھا۔ کئی بار فاروق بیگ سے ان کی برائیاں ملتا تھیں بھی ہوتی تھیں اور فاروق بیگ نے ان سے بہت سارے سوالات کر ڈالے تھے۔ ایک بہت بڑی کوشی میں تیار رہے تھے۔ اس کوشی میں صرف دو ملازم تھے جن کے سپرد تمام ذمے داریاں تھیں۔ ایک ملازم گھر کا کھانا پکا تھا، صفائی کرتا تھا۔ ایک طرح سے ہاؤس کیپر تھا۔ دوسرا مالی کام بھی کرتا تھا، ڈرائیور بھی تھا اور اکبر حسین کا پرائیویٹ سیکرٹری بھی کیونکہ کچھ پڑھا لکھا آدمی تھا۔ فرم ختم کرنے کے سلسلے میں فاروق بیگ نے اکبر حسین صاحب سے پوچھا تھا کہ ایک ایسی خاصی چلتی ہوئی فرم کو وہ کیوں فروخت کر رہے ہیں تو انہوں نے کہا وہ بہت زیادہ محنت نہیں کرنا چاہتے۔ پچھلے کچھ عرصے سے جسائی ممکن محسوس کر رہے ہیں اور پھر راتے بڑے کاروبار کو پھیلانے سے قانع ہو چکی کیا۔ ان کا کون ہے جس کے لیے وہ یہ سب کچھ چھوڑ جائیں۔ اکبر حسین صاحب نے شادی بھی نہیں کی تھی۔ کچھ عرصے پہلے ہی فاروق بیگ کو پتا چلا کہ اکبر حسین صاحب اسپتال میں داخل ہیں۔ وہ امراض قلب کے اسپتال میں داخل تھے، بہر طور رابطہ کیا تھا چنانچہ فاروق بیگ نے ان سے ملاقات کی۔ پتا چلا کہ اکبر حسین صاحب کو دل کا عارضہ لاحق ہو چکا ہے۔ گوان پر کوئی الیکٹرونیس ہوا تھا لیکن ڈاکٹر دن کا خیال تھا کہ کسی بھی وقت ایک ہو سکتا ہے

چنانچہ مزید احتیاط ضروری ہے۔ اکبر حسین صاحب گھر واپس آچکے تھے لیکن گھر آنے کے بعد وہ مسلسل بیمار تھے۔ دولت کی فراوانی تھی۔ کوشیوں کا کرایہ ہی اتنا آتا تھا کہ اس سے وہ ایک نسل کو پال سکتے تھے لیکن بیمارے ملازمین بھی مظلوم الحال ہی نظر آتے تھے۔ اس دن اپنے آفس ہی میں فاروق بیگ کو اکبر حسین صاحب کا فون موصول ہوا۔ انہوں نے فاروق بیگ سے کہا تھا کہ جونہی انہیں فرصت ملے وہ اکبر حسین صاحب سے مل لیں۔ شام کو ساڑھے چار بجے فاروق بیگ اپنے معمولات سے فارغ ہونے کے بعد اکبر حسین صاحب کی کوشی پر پہنچ گئے۔

اکبر حسین صاحب اپنی کوشی میں کیاریوں کی دیکھ بھال کر رہے تھے۔ غالباً مالی کام کرنے والے ڈرائیور ہاؤس سیکرٹری کو ڈانٹ بھی رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر اس کی جان چھوٹ گئی ڈرائیور سے کہا کہ کرسیاں باہر لاکر ڈال دے۔

قدیم طرز کی کرسیاں ایک میز کے ساتھ باہر آگئیں اور کرسیوں پر فاروق بیگ، اکبر حسین کے سامنے بیٹھ گئے۔ ”آپ کی صحت کیسی ہے؟“ فاروق بیگ نے سوال کیا۔ ”کچھ اچھی نہیں ہے بیزنس صاحب۔ ان دنوں میں خاصی تشویش کا شکار ہو چکا ہوں اپنے بارے میں۔“

”میری ماہیے تو ملک سے باہر چلے جائیے اور باقاعدگی سے اپنا علاج کرائیے۔“ اکبر حسین صاحب نے نگاہیں اٹھا کر انہیں دیکھا اور پھر ہنسی مٹھکراہٹ کے ساتھ بولے۔

”جتنے کا کوئی نظریہ نہیں ہے میرے سامنے۔ بس جب تک زندگی ہے ہی رہا ہوں۔ جب جانا ہوگا چلا جاؤں گا۔ پھر زندگی کی ذمہ داری کے لیے بھاگ دوڑ کیا حیثیت رکھتی ہے فاروق صاحب۔“

”معاف کیجیے گا اکبر حسین صاحب! آپ یقین کریں جب بھی آپ کے بارے میں سوچتا ہوں، بڑی حیرت کا شکار ہو جاتا ہوں۔“

”کیوں؟“ اکبر حسین صاحب نے بھوئی اٹھا کر پوچھا۔ ”آپ نے اپنی زندگی کو اتنا خشک بنالیا ہے کہ مجھے آپ کے جینے پر حیرت ہوتی ہے۔ نہ آپ کے زیادہ ملاقاتی، نہ دوست ہیں۔ بس کوئی، کوئی اور کوئی..... کیسے جی رہے ہیں آپ؟“

”ہر شخصیت کے پیچھے ایک ہی منظر ہوتا ہے ہر سطر صاحب..... میری زندگی کا ایک حصہ ایسا نہیں تھا لیکن دوسرے حصے میں یہ تبدیلیاں رونما ہو گئیں اور ان کا کچھ ہی منظر تھا۔ انسان اپنے حالات اپنے خیالات کو بعض اوقات خود تک ہی محدود رکھنا پسند کرتا ہے لیکن کچھ لمحات ایسے آجاتے ہیں جب اپنے بارے میں کسی کو کچھ بتانا انتہائی ضروری محسوس ہونے لگتا ہے۔“

”اگر آپ مجھے اس قابل سمجھتے ہیں تو میں اپنے آپ کو خوش قسمت قرار دیتا ہوں۔“

”نہیں میاں، ظاہر ہے میرے حالات جاننے سے تمہاری تقدیر پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ نہ تمہیں میری کہانی سننے کا کوئی محاذ ملے گا۔ ہمارے تمہارے درمیان جو کچھ جس انداز میں چل رہا ہے اسی انداز میں چلا رہے گا۔ صاف کرنا یہ صاف کوئی نہیں پسند نہیں آئے گی لیکن بہر حال.....“ فاروق بیک کو واقعی یہ صاف کوئی پسند نہیں آئی تھی کیونکہ اس میں ان کے کسی مالی مفاد کا تذکرہ نہیں تھا لیکن بن لیوا ضروری تھا۔ اکبر حسین بولے۔

”اصل میں جوانی سب پر ہی آتی ہے، مجھ پر بھی آئی تھی۔ میرا ایک بھائی تھا ساجد حسین۔ والدین کا انتقال ہو چکا تھا۔ خاندان میں کچھ افراد ابھی تھے۔ دوردراز کے خاندان میں ایک خاتون تھیں جو مجھے پسند تھیں اور ساجد کو بھی۔ ہم ان کے گھر آتے جاتے رہتے تھے۔ میں نے ان سے کہا میں ان سے شادی کا خواہش مند ہوں تو ان کے چہرے پر عجیب سے تاثرات پھیل گئے۔ بعد میں مجھے علم ہوا کہ وہ تو ساجد کو چاہتی ہیں اور ان سے شادی کرنے کی خواہش مند بھی ہیں۔ بے شک ساجد میرا بھائی تھا لیکن میرے دل میں رقابت کے جذبے نمودار ہو گئے تھے۔ اپنے بھائی کو کوئی نقصان تو نہیں پہنچا سکتا تھا۔ لیکن بس دل میں ایک کھوٹ پیدا ہو گیا تھا۔ وہ مجھ پر فوقیت حاصل کر گیا تھا۔ مجھے اپنی محبوب شخصیت کی اس کی جانب رشتہ طبعی پسند نہیں آئی اور میں سوچتا ہوں کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ بالآخر میں نے فیصلہ کیا کہ ملک سے باہر نکل جاؤں، دولت کمادوں اور پھر دولت کے بل پر اپنی مطلوب کو حاصل کروں۔ میں نے ان سے کہہ دیا کہ ساجد انہیں زندگی میں وہ تمام خوشیاں نہیں دے سکے گا جو میں دے سکتا ہوں۔ وہ میرا انتظار کریں۔ زندگی صرف محبت ہی کا نام نہیں ہے۔ اس کی کچھ اور ضرورت بات بھی ہوتی ہیں۔ ان خاتون نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور میں ملک سے باہر چلا گیا۔ کافی عرصے

تک مارا مارا پھرتا رہا اور بالآخر اپنا مقصد حیات حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔“

”وہ ایک الگ اور طویل داستان ہے لیکن اس سے یہ نتیجہ اخذ کر لیں آپ کہ میری مالی حالت بہتر سے بہتر ہو چکی تھی۔ میں نے خوب دولت کمائی اور اس کے بعد بڑے غرور اور بڑی شان سے واپس لوٹا۔ میں جانتا تھا کہ ساجد ایک معمولی ملازم ہے۔ وہ بھلا اپنی زندگی کے لیے کیا کر سکے گا۔ یہ تصور بھی تھا میرے ذہن میں کہ ہو سکتا ہے میری محبوبہ کی شادی ہو گئی ہو۔ میں وطن واپس آیا اور اس کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ میری محبوبہ کی شادی ہو گئی ہے اور میرے ہی بھائی کے ساتھ۔ یہ سن کر مجھ پر غم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ مجھے زبردست ذہنی دھچکا برداشت کرنا پڑا تھا، اس حادثے نے میرے ہوش و حواس معطل کر دیے تھے۔ کچھ

میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں۔“

”بہر طور اس کے بعد میرے دل میں اشتیاقی جذبے پیدا ہو گئے۔ ساجد سے میں نے کوئی باقاعدہ ملاقات نہیں کی لیکن اس کے بارے میں مجھے تمام معلومات حاصل تھیں۔ وہ معمولی سی نوکری کرتا تھا۔ شہر کے ایک گندے علاقے کے گھر میں رہتا تھا۔ ایک بچے کا باپ بن چکا تھا۔ تاہم وہ لوگ میری نسبت خوشیوں سے بھرپور زندگی گزار رہے تھے۔ میں نے یہاں اپنی حیثیت بنانا شروع کر دی۔ باقی دولت سے جائیدادیں خریدیں۔ میں اب ایک ایسی شکل میں ان لوگوں کے سامنے جانا چاہتا تھا جو بہت بڑی حیثیت کی مالک ہو۔ چنانچہ میں نے پہلے اپنے آپ کو چاروں طرف سے مضبوط کیا اور اس کے بعد ساجد کو اپنی آمد کی اطلاع دی۔ میاں ہوئی بچے سمیت دوڑے چلے آئے تھے۔“

”بظاہر وہ محبت کا اظہار کرنے آئے تھے لیکن میں جانتا تھا کہ وہ میرے دل پر جے کے لگنے لگے تھے۔ میں نے بھی اسی انداز میں ان کا استقبال کیا بلکہ صبح بات یہ ہے کہ میں نے ان کی کافی تذلیل کی اور اس کے بعد ساجد سے کہا کہ میرے اور اس کے معیار زندگی میں بہت فرق ہے۔ چنانچہ وہ مجھ سے زیادہ ملاقاتوں کی کوشش نہ کرے۔ ہاں جب بھی مجھے ضرورت ہوگی، میں اس سے مل لوں گا۔ ساجد کو بڑی مایوسی ہوئی تھی لیکن یہ بات وہ بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ میں دل میں کیا تصور رکھتا ہوں۔ آدمی فیور تھا، اس کے بعد وہ مجھ سے نہیں ملا اور یوں زندگی کا سفر طے ہوتا رہا۔ میں نے لاکھ کوشش کی کہ اپنے آپ کو یہاں کے ماحول میں ڈھال لوں۔ شادی کروں اور زندگی گزاروں لیکن دل پر ایسی...

بہرہ ریزی چھائی ہوئی تھی کہ میں کافی..... کوشش کے باوجود وہ سب کچھ نہیں کر سکا جو میرے دل میں تھا۔ ایک عجیب سا حراج بن گیا تھا اور اسی حراج کے تحت ہر سطر صاحب، میں نے زندگی کا ایک طویل ترین سفر طے کر ڈالا۔ اس دوران مختلف حادثات ہوئے۔ ساجد کا انتقال ہو گیا۔ وہ لوگ بھی زندگی میں سکون نہیں حاصل کر سکے۔ کچھ تبدیلیاں ہوئیں لیکن اب میں ان سے بھی ایک طرح سے لاپرواہ ہو گیا تھا اور میں نے ان کی خبر گیری کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ بس یوں کچھ لپیٹے کہ یہ حراج بننے کی ایک وجہ بھی اور وہ وجہ میں نے آپ کو بتا دی۔“

”بہت عجیب واقعات ہیں، بعد میں آپ نے ان خاتون سے رجوع کرنے کی کوشش نہیں کی؟“

”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے بعد میں ان کنڈرات کا کیا کرتا جو آج ہو چکے تھے لیکن میری دلی خواہش تھی کہ انہیں ایسے ذہنی جرح سے پہنچاؤں جس سے وہ تڑپ تڑپ اٹھیں۔ یہ بات وہ لوگ بھی جانتے ہیں کہ میں یہاں ایک صاحب حیثیت انسان کی زندگی گزار رہا ہوں۔ لیکن انہوں نے بھی اپنی انا کو زندہ رکھا، کبھی مجھ سے ملاقات نہیں کی۔ البتہ یہ دل کی بات میں آپ کو ضرورتاً بتا رہا ہوں میری خواہش تھی کہ کسی وقت بھی نہ کبھی وہ مجھ سے مدد مانگتے آئیں۔ اپنے مشکل حالات کا تذکرہ کریں مگر انہوں نے کبھی ایسا نہیں کیا۔ ساجد کی موت پر بھی میں ان کے پاس نہیں پہنچا۔ بس یہ خبر میرے کانوں تک پہنچ گئی کہ میرا بھائی اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ اصل میں یہ کہتے ہوئے مجھے کوئی شرم نہیں محسوس ہوتی کہ اس واقعے کے بعد بھائی سے میرا خون کا رشتہ بھی ختم ہو گیا تھا۔ یہ ہیں وہ عوامل جن کے تحت آپ مجھے زندگی گزارتے ہوئے دیکھ رہے ہیں۔ سب کچھ ہے میرے پاس لیکن سچی بات ہے کہ زندگی سے بھی لطف اندوز نہیں ہو سکا۔ بس دل کا کوئی ایسا خاندنڈی ہو گیا تھا کہ وہ زخم بھی ٹھیک ہی نہیں ہو سکا۔ یہاں تک کہ اس زخم نے مجھے دل کے روگ میں مبتلا کر دیا اور فاروق بیک صاحب، اب میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ میری زندگی میں زیادہ وسعت نہیں رہی ہے۔ شاید شام ہونے والی ہے اور میں اسی شام کا انتظار کر رہا ہوں۔“

”آپ نے اپنے آپ کو یہ سارے روگ خود لگائے ہیں اکبر صاحب..... یہ بڑی عجیب بات ہے کہ کسی سے محبت بھی کی جائے اور اسے اس طرح نظر انداز بھی کر دیا جائے۔ اگر آپ ملک سے باہر گئے بھی تھے تو آپ کو کم از کم فحش

بنیادوں پر یہ طے کر کے جانا چاہیے تھا کہ آپ کی واپسی تک وہ خاتون شادی نہ کر سکیں آپ ایسے ہی چلے گئے اور اس کے بعد ظاہر ہے اتنی دولت حاصل کرنے کے لیے آپ نے ایک طویل عرصہ باہر گزارا ہوگا۔“

”ہاں، بہت سی باتیں ہیں لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ اگر میں یہاں ملک میں ہوتا تب بھی میں اس سنگدل عورت کو متاثر نہیں کر سکتا تھا۔ میرے بھائی کا جادو اس پر پوری طرح چل چکا تھا۔ اس نے ساری زندگی کے کسی اور بے بسی میں گزار دی اور اب بھی اپنے بیٹے کے ساتھ ایک حسرت زدہ زندگی گزار رہی ہے۔“

”کیا حالیہ طور پر آپ نے ان کی خبر گیری کی؟“

”بالکل نہیں۔“

”کیوں؟“

”مجھے اس کی ضرورت ہی کیا تھی۔ میں اپنی دنیا کا انسان بن کر رہ گیا تھا۔ جب کسی سے کچھ لینا دینا ہی نہ ہوتا پھر اس کی خبر گیری سے کیا فائدہ۔ گویا ایک طرح سے میری زندگی ضائع ہی ہو گئی لیکن اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ سب کچھ ہوا انہی لوگوں کی وجہ سے۔ بہتر ہی ہوگا اس تہرے سے آپ کو کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔ البتہ جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں اس بات کو ذرا آپ غور سے سن لیجیے۔ میں نے اس لیے آپ کو زحمت دی ہے کہ میں اپنا وصیت نامہ تیار کرانا چاہتا ہوں۔“

”جی..... لیکن اس کی ضرورت؟“

”میری جو محنت ہے اس سے مجھے یہ خوف لاحق ہو گیا ہے، اب میں زیادہ عرصے زندہ نہیں رہ سکوں گا۔ اب آپ دیکھیے تاہم کروڑوں روپے کی جائیداد اور دولت وغیرہ ہے، اس کا کوئی مصرف تو ہونا چاہیے۔ آپ اس بات کا اندازہ لگا سکتے ہیں فاروق بیک صاحب کہ میری موت کے بعد میرا وارث کون ہو سکتا ہے۔“

فاروق بیک کچھ دیر سوچتے رہے پھر بولے۔

”قانونی طور پر ساجد حسین کا بیٹا۔“

”بالکل درست خیال ہے آپ کا۔ لیکن کیا ایسا ہو سکے گا؟ کیا ایسا ہونا چاہیے، کیا میں ایسا ہونے دوں گا؟“ اکبر حسین صاحب شدت جوش میں سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ ان کے چہرے پر سرفی نظر آ رہی تھی، پھر انہوں نے کہا۔

”میں اپنی دولت کو کوئی میں ملا دینا پسند کروں گا لیکن میں ساجد کے بیٹے کو یہ سب کچھ نہیں دوں گا۔ اس لیے میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ میں اپنا وصیت نامہ تیار کرالوں۔“

”وہمت نامے میں آپ یہ دولت کس کے نام کرنا چاہتے ہیں؟“

”میں اپنی اس دولت کو وقف کر دینا چاہتا ہوں، کسی بھی نیک کام میں صرف ہو جائے لیکن اس میں سے ایک پیسہ بھی ان لوگوں کو نہ ملے۔ میں نے کیا ہے ان کے لیے نہیں اپنے لیے..... ضائع ہوتا ہے تو ہو جائے۔ میں نے اپنی ساری زندگی اس طرح ضائع کر دی اور اب میں اپنی دولت ان کے نام چھوڑ جاؤں..... نہیں قطعی نہیں۔“

قانونی بیک سر کھانے لگے۔ چند لمحوں تک سوچتے رہے پھر انہوں نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔
”اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ کو شہید ہونی صدمے سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ بہر طور آپ اس کے حق دار ہیں کہ اپنی محنت سے کمائی ہوئی دولت جو آپ کے پاس موجود ہے، کسی بھی شخص کو دے جائیں یا اس کا کوئی بھی مصرف کر جائیں۔ آپ اگر اسے ٹرسٹ کرنا چاہتے ہیں تو ٹھیک ہے۔ کوئی ایک ادارہ بنایا جائے یا کسی ایک ادارے سے منسوب کر دیا جائے اسے۔“

”اس کا فیصلہ آپ کو کرنا ہے۔ میرے نام پر ایک ٹرسٹ قائم کر دیا جائے اور اس دولت سے ضرورت مندوں کی مدد کی جائے لیکن ان ضرورت مندوں میں ساجد کا بیٹا یا اس کی بیوہ شامل نہ ہو۔“

”خیر اس کے لیے ہم کوئی تعین نہیں کر سکتے۔ میں بھی سوچتا ہوں اور آپ خود بھی غور کر دیجیے کہ اس سلسلے میں کیا کرنا ہے؟“

”غور کرنے کے بعد ہی میں نے آپ کو زحمت دی ہے۔ میرا صاحب! آپ میری وصیت تیار کیجیے اور میرے نام پر ایک ٹرسٹ بنادیں جو کچھ امور کے لیے کام کرے گا اور ان امور کی تفصیلات میں آپ کو فراہم کر دوں گا۔“

”میں آپ کی پسند کے مطابق تمام کام کرتا ہوں۔“
”بس تو آغاز کر دیجیے اس کا زیادہ انتظار نہ کریں۔ وصیت نامے پر مجھے دستخط کرائیں اور اس کی جو کچھ بھی قانونی نوعیت ہو وہ آپ کر لیں۔ مجھے آپ پر مکمل اعتماد ہے۔“

میرا شرفادق بیک نے اس بات کی ہائی بھری لیکن واپسی میں راستے میں وہ سوچتا رہا کہ یہ کچھ عجیب سی وصیت ہوگی اور یہی طور پر اس کی پیشہ ورانہ زندگی میں یہ کہانی بہت ہی دلچسپ نوعیت کی ہے۔ ایسی کہانیاں مل تو بہت جاتی ہیں لیکن کم از کم میرا شرفادق بیک کو پہلی بار ایسی کہانی کا سامنا

کرنا پڑا تھا۔

☆☆☆

منصور اور شاہ میر مختلف انداز میں زندگی کا رخ اختیار کیے ہوئے تھے۔ بلیک مینٹک کے لیے مواد کا حصول آسان بات نہیں تھی۔ آخر کسی طرح وہ ان رازوں کو حاصل کر کے جس جن کے تحت کسی کو بلیک میل کیا جائے۔ ہو طور میں، بارکوں میں کبھی کبھی گھروں پر، یا سڑکوں کے کنارے کسی چلیا پر بیٹھ کر بھی منصوبہ بندی کی جاتی تھی کہ آخر وہ کب طریقہ کار ہو جس کے تحت کوئی شکار ان کے جال میں پھنسے۔ اس دوران میں انٹرویوز کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ جہاں جہاں درخواستیں دی گئی تھیں وہاں سے اگر کال آتی تو جاتے ضرور تھے لیکن اب ان کا ایمان یہ پختہ اختیار کر گیا تھا کہ شاید ان کی تقدیر میں ملازمت سے ہی نہیں۔

اس دن بھی جمیل کے کنارے بیٹھ کر واپسی سے ایک دوسرے کی صورت دیکھ رہے تھے۔ چاروں طرف سنائے کا راج تھا کہ چاکلی میں منصور کی نظر سفید رنگ کی ایک کار پر پڑی جو پارکنگ میں آکر رکی تھی۔ ایک لڑکی کار ڈرائیو کر رہی تھی، پھر وہ نیچے اتر گئی۔ اس نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی میں وقت دیکھا اور پھر فیملی کے انداز میں آگے بڑھ گئی۔ منصور کی نگاہیں اس کا جائزہ لے رہی تھیں۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

”شاہ میر! اس لڑکی کو دیکھ رہے ہو۔ یہ تہا بوٹ میسن کی سیر کرنے آئی ہے۔“

”میں بھی یہی جائزہ لے رہا تھا، کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی میں بار بار وقت دیکھتا رہا ظاہر کرتا ہے کہ اس لڑکی کو کسی کا انتظار ہے۔“ دفعتاً ہی منصور اچھل پڑا۔

”کیا کسی محبوب کا انتظار..... آہ یہ جتنی ہوئی دوپہر، بوٹ میسن کی دیرانی اور سناٹا اور ایک تہا لڑکی جو اپنی کار ڈرائیو کرتی ہوئی آئی ہے اور یہاں کسی کی منتظر ہے۔ یار کہیں ہماری تقدیر تو نہیں جاگ رہی۔“

”مطلب؟“
”جس کا انتظار کیا جا رہا ہے، وہ محبوب بھی ہو سکتا ہے۔“
”نت۔ تو پھر۔“ شاہ میر نے تنوک ٹپکتے ہوئے کہا۔
”اور یہ تہا ملاقات سنائے گا یہ منظر، ادھ مائی گاؤ..... اگر ہمارا اندازہ درست ہے تو پھر تو کچھ کام بن جائے گا۔“

لڑکی جلیبی ہوئی دور نکل گئی تھی اور اس کے انداز سے بے چینی واضح تھی۔

”کیمرالاؤ، ہو سکتا ہے آج کچھ کام ہی بن جائے۔“
”ٹھیک ہے، میں لاتا ہوں۔“ منصور انتظار کرنے لگا۔ شاہ میر نہ صرف کیمرالے آیا بلکہ اس نے کار کا نمبر بھی نوٹ کر لیا تھا۔ دونوں بلیک میل ذہنات سے اپنا کام کر رہے تھے۔ شاہ میر نے منصور کو بتایا کہ اس نے کار کا نمبر بھی نوٹ کر لیا ہے تاکہ اس کے ذریعے کار کے مالک کا پتا چلا یا جاسکے۔ دونوں کی تقدیر واقعی یادری کر رہی تھی کیونکہ ٹھوڑی ہی دیر کے بعد وہاں ایک اور گاڑی آکر رکی تھی اور اس سے ایک خوبصورت نوجوان باہر نکل آیا تھا۔ اس نے مخصوص کار کو دیکھا اور پھر گردن اٹھا کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ لڑکی ایک درخت کے سائے میں اسے ہاتھ ہلا کر اشارہ کر رہی تھی اور کچھ دیر کے بعد دونوں نکلا ہو گئے۔ انہوں نے غالباً کسی سنان گونشے کی تلاش شروع کر دی تھی۔

پھر پھولوں کے ایک بیج میں انہیں موقع مل گیا اور دونوں کے دل بے اختیار دھڑکنے لگے۔ منصور اور شاہ میر آہستہ آہستہ اپنی پوزیشن تبدیل کرنے لگے۔ کیمر منصور ہی آپریٹ کرتا تھا اور وہ پوری طرح تیار تھا۔ پھر انہیں ایک ایسا زاویہ مل گیا جہاں سے وہ ان دونوں کی مشترکہ تصاویر لے سکتے تھے اور اس کے بعد منصور نے دھڑا دھڑکی تصویریں بنا ڈالیں۔ فلیش کے کھمکے ہوئے تھے حالانکہ دن کا وقت تھا لیکن پھر بھی منصور کو یہ اندازہ تھا کہ ان لوگوں کو اس فوٹو گرافی کی خبر ہوگئی ہوگی۔ دونوں ہی بے اختیار کھڑے ہو گئے تھے۔ ہانک کے پاس پہنچ کر منصور نے کیمر شاہ میر کے حوالے کیا اور خود میٹ پر بیٹھ کر ہانک اشارت کر دی۔ پھر دونوں وہاں سے ہوا ہو گئے۔ حالانکہ شاہ میر مسلسل اس خوف کا شکار رہا تھا کہ ابھی مقب سے گولی چلے گی اور اس کی پشت میں سوراخ ہو جائے گا لیکن شاید وہ لوگ غیر مسلح تھے۔ دونوں کے دل بری طرح دھڑک رہے تھے۔ کافی دور پہنچنے کے بعد انہوں نے سانس لی۔ ہانک ایک جگہ کھڑی کر دی گئی اور دونوں ایک ہوٹل میں آ بیٹھے۔ سنبھرا مستقبل نگاہوں کے سامنے آ گیا تھا۔ یعنی طور پر کار ڈرائیو کرنے والی لڑکی..... اچھی حیثیت کی مالک ہوگی۔ منصور نے چائے کے کھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

”میں جنہیں اپنے کام کے اس افتتاح کی مبارک باد دیتا ہوں شاہ میر..... لیکن اب ہمیں نہایت احتیاط سے کام کرنا ہوگا۔“

”لڑکی چہرے سے عام سی نظر آتی تھی۔ اس کا مطلب ہے کہ قابو میں آجائے گی لیکن ہم اس سے پہلی بار

تکلی رقم کا مطالبہ کریں گے؟“

”بچاس ہزار..... میں نے فیصلہ کر لیا ہے..... لیکن دوست کام بہت اچلی بنانے پر کرتا ہے۔ اب سب سے پہلے ہمیں رجسٹریشن آفس سے اس کار کے مالک کا نام اور پتا حاصل کرنا ہے۔“

”کچھ دینا لینا پڑے گا؟“

”تم گھومت کرو، ظاہر ہے ابتدا میں اخراجات تو ہوتے ہی ہیں۔ کار دہار میں انویسٹمنٹ تو بہر حال کرنا پڑتی ہے نا۔“

دونوں خوش تھے۔ دوسرے دن رجسٹریشن آفس سے کار کے مالک کا نام اور پتا معلوم کر لیا گیا۔ اس کے بعد ایڈریس کے ذریعے فون نمبر بھی ٹریس کر لیا گیا۔ آج کی یہ کارکردگی انتہائی شاندار تھی۔ ویسے بھی انہیں امید نہیں تھی کہ لڑکی واقعی طور پر تیار ہوگی اور اس کا سامنی مرد بھی۔ منصور نے کہا۔

”اس شخص کو لطف دینا تو بالکل بیکاری ہوگا، نہ تو ہم نے اس کی کار کا نمبر وغیرہ نوٹ کیا ہے۔ پھر مرد زیادہ پاور فل ہوتے ہیں اور کسی بھی طرح پیش آ سکتے ہیں لیکن لگتا ہے لڑکی قابو میں آجائے گی۔“

”کیا اس کے بارے میں مزید تفصیلات کی ضرورت ہے؟“
”مل جائیں تو اچھا تھا کیونکہ کام خطرناک ہے اور خاص طور سے اس شغل میں جب لڑکی کو یہ احساس ہو گیا تھا کہ اس کی تصاویر بنائی گئی ہیں۔“

”بہر حال اب کیا خیال ہے، ٹیلی فون کہاں سے کیا جائے؟“

”آج کا دن انتظار کرو، ذرا ایک آدھ دن گزر جائے گا تو اس کے دل میں خوف بڑھ جائے گا کہ فون کہاں سے کیا جائے؟“

”کسی بھی فون بوتھ سے؟“

”مگ..... شاعر آئیڈیا ہے۔“

پھر پروگرام کے مطابق ایک ٹیلی فون بوتھ سے حاصل شدہ نمبر ڈائل کیا گیا۔ دوسری طرف سے کسی کی آواز سنائی دی، آواز نسوانی تھی۔

”کون بول رہا ہے؟“

”آپ کو کس سے بات کرنی ہے؟“

”ایک خاتون یہاں رہتی ہیں، ان کا تعلق بوٹ میسن پر پھولوں کے بیج میں کسی دھتے سے ہے۔ اگر وہ آپ ہیں تو براہ کرم بات کریں اور اگر آپ نہیں ہیں تو پھر اس گھر میں

علاقہ دوپہر کو دو بجے اتنا سناں ہوتا ہے، اس سے پہلے

☆☆☆

اتفاقہ طور پر مجھے اس لڑکے کی تصویر حاصل ہوئی ہے۔ وہ اس طرح کہ اس لڑکے نے ایک فرم میں ملازمت کی کوشش

”ہاں رومانہ یہی مجھ کو لیکن اس باریس بہت اچھا ہوا ہے اور تمہیں بہت غور و خوض کہہ کے میرے اس کیس میں میری

مدد کرنی ہے۔ ویسے ڈیٹان کیا ہے۔۔۔۔۔ کب سے ملاقات نہیں ہوئی اس سے تمہاری؟“ فاروق بیک نے اپنے ہونے والے داماد کے بارے میں پوچھا۔

”ڈیٹان ٹھیک ہیں ڈیڑی، اکثر ملاقات ہوتی رہتی ہے۔ ہاؤس چاہ کر ملنے والے کے بعد کی اچھے اسپتال میں ایڈجسٹ ہونا چاہتے ہیں۔ ویسے ان کے دل میں اس بات کی بھی شدید آرزو ہے کہ اپنا کوئی ٹھکانہ کھولیں۔ ظاہر ہے ابھی یہ ممکن نہیں ہے۔“

”ممکن ہو سکتا ہے بشرطیکہ تم اس کی مدد کرنا چاہو۔“ فاروق بیک نے پُر اسرار انداز میں کہا تو رومانہ چونک کر انہیں دیکھنے لگی۔

”میں بھی نہیں۔“

”دیکھو بھئی، میں خود بھی چاہتا ہوں کہ تم لوگوں کا مستقبل شاندار ہو۔ جو کہ میرے پاس ہے وہ تمہاری ہے یعنی لیکن وہ اتنا نہیں ہے کہ وہ ڈیٹان کے خوابوں کی تعبیر بن سکے۔ ہاں اس کے لیے میرا ذہن اور تمہاری کارکردگی کا آدھ ہو سکتی ہے۔ اصل میں ذرا سی گڑبڑ ہوگئی اگر ڈیٹان سے تمہاری منگنی نہ ہوتی تو میں ایک اور ہی مکمل مکمل تین اب تو یہ سوچنا بھی حماقت ہے۔ اصل میں میرے ذہن میں ایک منصوبہ ہے، اس پر تم سے گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔“

رومانہ کو باپ کی بات بڑی عجیب لگی ڈیٹان سے اگر منگنی نہ ہوئی ہوتی تو وہ کوئی اور مکمل کھینچے۔ بہر طور وہ سوالیہ نگاہوں سے فاروق بیک کو دیکھنے لگی، فاروق بیک پُر خیال انداز میں بولے۔

”اس دنیا میں ایسے ایسے سیدھے لوگ ہوتے ہیں کہ بعض اوقات یقین نہیں آتا کہ ان کا تعلق اس دنیا سے ہے۔ میرے ایک کلائنٹ ہیں اکبر حسین صاحب، بہت بڑے آدمی ہیں۔ کروڑوں روپے کی دولت ہے ان کے پاس اور یہ دولت اس شخص نے اپنے قوتِ بازو سے حاصل کی ہے۔ یہاں بڑی جائیدادیں ہیں اور بینک بیلنس بھی بہت بڑا ہے لیکن جاتی ہوں اس شخص کا اس دنیا میں کوئی بھی نہیں ہے۔ نہ بیوی، نہ بچے، نہ کوئی اور۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ لوگ اس قدر تنہا ہونے کے باوجود اتنی دولت کیوں کما لیتے ہیں اور پھر طرہ یہ کہ انتہائی تجسس آدمی ہے، پانی پاکی بچا کر رکھتا ہے۔“

”بھئی تو اس کی دولت کا راز ہے ڈیڑی۔“

”ہاں، یہ بھی کہہ سکتی ہوں۔ بہر طور اس دولت کا

وارث کوئی نہیں ہے اور وہ شخص اس دولت کو ٹرسٹ کر دینا چاہتا ہے۔ وہ چاہتا ہے اپنے نام سے ایک ٹرسٹ بنائے اور اپنی تمام دولت کا یہ مصرف کرے۔“

”دیری گڈ، بہر حال ایک اچھا ارادہ ہے اس کا۔ ڈیڑی آپ کا کیا خیال ہے اس بارے میں؟“

”اس کا ایک اور پہلو بھی ہے۔ اس داستان کا ایک اور حصہ بھی ہے اور وہ حصہ ہے اس کی ایک محبوبہ جس نے اس سے شادی کرنے کے بجائے اس کے غریب بھائی سے شادی کر لی اور اسے ٹھکرا دیا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس وقت وہ اتنا دولت مند نہیں تھا بلکہ دولت کے حصول کی کوششوں میں مصروف تھا۔ اس عورت نے اس کے بھائی سے شادی کر لی اور جب اکبر حسین کو یہ علم ہوا تو اس کے دماغ میں آگ لگ گئی۔ بہر حال کوئی انتہائی کارروائی تو اس نے نہیں کی کیونکہ اس ذہن کا آدمی نہیں تھا لیکن اس نے یہ فیصلہ کر لیا کہ اپنی دولت میں سے اپنے بھائی اور اپنی محبوبہ یعنی عورت کو اب اس کی بھادریج میں بھیجی کہ ایک پیسا بھی نہیں دے گا۔ وہ لوگ نہایت کسمپرسی کی زندگی بسر کرتے رہے۔ یہاں تک کہ اس کے بھائی ساجد حسین کا انتقال ہو گیا۔ اس کا ایک بیٹا ہے جو اب نوجوان ہو چکا ہے، وہی غربت کی زندگی ہے اس کی اور وہ بے بسی سے اپنا مستقبل تلاش کرتا پھر رہا ہے۔ اکبر حسین بیمار آدمی ہے، عارضہ ذل کا شکار۔ وہ یہ چاہتا ہے کہ اس کی دولت سے ایک ٹرسٹ بن جائے تاکہ اس کی موت کے بعد اس کے واحد حق دار یعنی اس کے بچے کو کچھ نہ مل سکے۔“

”اوہ۔۔۔۔۔ بہر حال اس کی اپنی دولت ہے ڈیڑی۔ وہ اس کا جو کچھ بھی کرنا چاہے کرے۔“

”یہ تو تم نے بالکل ٹھیک کہا لیکن اتنی بڑی دولت اس طرح ضائع ہو جائے تو کیا یہ مناسب ہے؟“

”میں بھی نہیں۔“

”وہ میرا کلائنٹ ہے اور ابھی وصیت نامہ تیار ہی ہوا ہے۔ میں چاہوں تو اس وصیت نامے کو بہت عرصے ملتوی کیے رکھ سکتا ہوں اور اس عرصے میں رومانہ میری آرزو ہے کہ ایسا ذریعہ پیدا ہو جائے جس سے ہم اس دولت پر قبضہ کر سکیں۔ ٹرسٹ میں جانے سے روکنے کے لیے ہمارا اس دولت پر قابض ہونا ضروری ہے اور اس کے لیے ہمیں کوئی ایسی چال چلانا ہوگی جس سے ہمارا یہ کام بن جائے۔ اصل میں، میں نے ڈیٹان کے ٹھیک کی بات اس لیے بھی کرنا کہ تم چاہو اور اس دولت کے حصول میں میری مدد کرو تو ڈیٹان

کے لیے ٹھیک بن جانا کوئی مشکل کام نہیں ہوگا۔“ رومانہ بھٹی بھٹی نگاہوں سے اپنے باپ کو دیکھنے لگی، اس نے کہا۔

”ڈیڑی! کیا یہ بھرمانہ حرکت نہیں ہوگی؟“

”اس سلسلے میں اگر مجھ سے کوئی تقریر مننا چاہتی ہو تو دوسری بات ہے ورنہ اتنی سنجیدگی سے نہ سوچو۔“

”آپ نے کہا تھا کہ اگر میری منگنی ڈیٹان سے نہ ہوئی ہوتی تو؟“

”ہاں تو اس وقت بڑی آسانی سے میں تم سے یہ کہہ سکتا تھا کہ اس نوجوان کو تلاش کرو اور اسے اپنے جال میں گرفتار کرو اور میں اس سے تمہاری شادی کروں۔ اس دولت کے حصول سے پہلے اور اس کے بعد باقی کام میرا رہ جاتا ہے پھر مجال بھی کہ یہ کہیں باہر نکل سکتی تھی، لیکن میں ڈیٹان سے بھی قطع ہوں اور اس کی اس احتیاط حرکت کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔“

”نہیں ڈیڑی! ڈیٹان۔۔۔۔۔ ڈیٹان۔۔۔۔۔“ رومانہ شرم کی وجہ سے اپنا جملہ پورا نہ کر سکی۔

”جانتا ہوں، بہت غور کیا ہے میں نے۔ تمہاری وہ سر بھری دوست اب کس حال میں ہے؟“

”کون۔۔۔۔۔ مہوش کی بات کر رہے ہیں آپ؟“

”ہائل۔۔۔۔۔ ہائل۔۔۔۔۔ اس لڑکی کے خیالات بڑے

باغیانہ ہیں۔ معاشرے سے اتنا پی ہوئی ہے وہ میں نے تمہاری اور اس کی گفتگو سنی ہے۔ بلکہ اس دن اس نے میرے سامنے جو گفتگو کی تھی اس نے میرے ذہن میں یہ تاثر قائم کیا تھا کہ یہ لڑکی اگر ایسی انداز میں سوچتی رہی تو کبھی نہ کبھی کوئی جرم کر بنے گی۔“

رومانہ کی ان تین خیالات میں ڈوب گئیں۔ مہوش اس کی گہری دوست تھی، ایک نوجوان خوبصورت لڑکی۔ لیکن مفلس اور بے بسی کا شکار اس دنیا میں ماں کے علاوہ اس کا کوئی نہ تھا۔ بھائی بھی چل بسا اور اب مہوش اس دنیا میں تنہا رہ گئی تھی۔ بہت تیز فطرت کی لڑکی تھی اور کبھی بھی کہ دنیا میں اگر انسان دولت مند نہ ہو تو اسے خود کشی کر لینا چاہیے، وہ بس ایسی ہی باتیں کرتی رہتی تھی، رویانہ سے اکثر اس کی ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں اور رومانہ بھی کبھی اس کی مالی امداد بھی کر دیتی تھی۔ بہت ہی گہری دوستی تھی ان دونوں کے درمیان۔ فاروق بیک نے کہا۔

”کیا خیال ہے تمہارا رومانہ وہ لڑکی صرف زبانی گفتگو کر سکتی ہے یا عملی طور پر بھی کوئی کام سر انجام دے سکتی ہے؟“

رومانہ نے پُر خیال انداز میں گردن ہلاتے ہوئے

کہا۔ ”ڈیڑی! اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ وہ جنون کی حد تک اس بات کی قائل ہے کہ انسان جیسے تو دولت مند ہو کر جیسے ورنہ اسے جینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ مجھ سے بہت سی باتیں کرتی رہتی ہے، وہ کہتی ہے کہ کوئی قبرزدہ بوڑھا، لیکن دولت مند ہوا اس سے خوش شادی کی چاہتی ہے۔“

”کیا وہ لڑکی اس سلسلے میں کار آمد ہو سکتی ہے؟“ فاروق بیک نے پُر خیال نگاہوں سے بیٹی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”مگر ڈیڑی منصوبہ کیا ہے۔۔۔۔۔ یہ تو بتائیے رومانہ نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔ یہ بات اس کے لیے بہت خوش کن تھی کہ کوئی ایسا ذریعہ نکل سکتا ہے کہ ڈیٹان کو اپنا ٹھیک بنانے کا موقع مل جائے۔

”منصوبہ یہ ہے کہ ہم اس لڑکے کو روپ کر دیں گے جو مستقبل میں اکبر حسین کی دولت کا مالک بننے والا ہے۔ اکبر حسین اگر طبیعتاً موت مر جاتا ہے تو ٹھیک ہے، اس کے لیے ایک پیر یا مقرر کر لیا جائے اور اگر اسے مرنے میں دیر لگے تو پھر اسے راستے سے ہٹا دیا ہوگا۔ اس وصیت نامے کی تکمیل سے پہلے، اگر وصیت نامہ باقاعدہ رجسٹر ہو گیا تو پھر صورت حال ہمارے ہاتھ میں نہیں رہے گی۔“ رومانہ نے ایک جھرجھری سہمی، پھر آہستہ سے بولی۔

”مگر ڈیڑی یہ۔۔۔۔۔“

”رومانہ! احتیاطاً تمہیں مت سوچو۔ میں نے بڑے احتیاط کے ساتھ تم سے اس گفتگو کا آغاز کیا ہے۔ ایک قریب المرگ آدمی اگر دقت سے کچھ پہلے اس دنیا سے چلا جاتا ہے تو کون سی قیامت آجائے گی۔ جانا تو ہے ہی اسے اور پھر ہم تو یہ کہتے ہیں کہ وہ خود چلا جائے۔ اور اس کے لیے کچھ طریقہ کار در پافٹ کیے جاسکتے ہیں۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ خیر مطلب یہ ہے کہ مہوش کو کوئی ایسے جال میں چانس لو جس سے وہ ہمارے چنگل میں رہے۔ اس سے سیدھی سیدھی بات کر لو۔ اسے حاصل شدہ دولت میں سے اتنا حصہ مل جائے گا کہ وہ بھی میٹ وراثت کی زندگی بسر کر سکے گی لیکن اسے مکمل طور پر اپنے آپ کو ہمارے ہاتھوں فروخت کرنا ہوگا۔ اتنا زیادہ کہ وہ کبھی ہم سے مخرب نہ ہو سکے۔ اس کے بعد بقیہ کام میرا ہے۔ وصیت نامہ اس انداز میں تیار ہوگا کہ اکبر حسین صاحب یہ آرزو کریں گے کہ ان کی دولت ان کے بچے کے نام منتقل کر دی جائے اور یہ کام میں کر لوں گا۔ اس کے لیے تم بالکل بے فکر رہو۔ ویسے بھی قانونی طور پر وہی دولت کا جائز حق دار قرار پائے گا اور اس کا یہ حق کوئی بھی

نہیں جبین سکتا۔

”مہوش سے بات کرنی پڑے گی ڈیڑی..... ویسے منصوبہ بہت شاندار ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ اس طرح ہمارا کام پُر آسانی بن جائے گا۔“

”اب ہمیں نہایت ہوشیاری سے دو کام کرنے ہیں۔ پہلی بات تو ہے اس نو جوان کی تلاش۔ دوسری بات یہ کہ مہوش کو بہت عجیب کی سے اس بات پر آمادہ کر کہ اس کام کو وہ راز داراری سے سرانجام دے سکے گی یا نہیں۔“

”میرا خیال ہے ڈیڑی مہوش بہت کام کی لڑکی ہے۔ شرطیں یہی ہے کہ وہ ہمارے چنگل میں رہے۔“

”اس کے لیے بھی متعدد منصوبے ذہن میں ہیں جن کی تفصیل ہمیں بعد میں بتاؤں گا۔“

”او کے ڈیڑی! آپ بالکل مطمئن رہیں۔ میں اس کام کو پوری خوش اسلوبی سے سرانجام دینے کی کوشش کروں گی۔“ رومانے نے کہا اور قاروق بیک پر خیال اعزاز میں گردن ہلانے لگا۔

☆☆☆

دونوں کے چہروں کے رنگ پہلے پڑے ہوئے تھے، دن کے بارہ بجے ہی بوٹ میں برقی بجے گئے تھے۔ نہ کھانے کو دل چاہ رہا تھا نہ پینے کو۔ بدن پر ہلکی ہلکی ٹپکی ٹپکی ٹپکی ٹپکی۔ جوں جوں وقت گزرتا جا رہا تھا، جسم کی گویا جان نکلتی جا رہی تھی۔ پولیس کی ایک موبائل وہاں پہنچی تو دونوں جیسے کرتے کرتے بچے۔ موبائل نے ایک چکر لگایا ان کی جانب دیکھا بھی نہیں تھا، لیکن گاڑی کی آواز میں دھمک رہی تھی۔ بس یہ احساس ہو رہا تھا کہ ابھی پولیس والے پہنچے ہوں گے، دونوں کو گردنوں سے پکڑیں گے اور اٹھا کر گاڑی میں بٹھا لیں گے۔ دو خطرناک بلیک لیمر گرفتار ہو گئے۔ اخبارات میں تصاویر چھپیں گی۔ گھر والے حیرت سے سوچیں گے کہ یہ لوگ یہ کاروبار کر رہے تھے۔ نہ جانے کیا کیا خیالات دل میں آ رہے تھے۔ موبائل چلی گئی تو دونوں کی جان میں جان آئی۔ شاہ میر نے کہا۔

”یار! وقت کتنا آہستہ آہستہ گزر رہا ہے آج تو یوں لگتا ہے کہ ایک ایک لمحہ ایک ایک گھنٹا ہو گیا ہے۔“

”کچھ نہیں، اصل میں ہم بہت زیادہ خوفزدہ ہو گئے ہیں، یار سنبھالو اپنے آپ کو اس طرح کاروبار ہوگا یا رہا ہلا وہ عامی لڑکی ہمارا کیا بگاڑے گی۔ اگر کسی ایسے برنس میں یا صنعت کار کو بلیک میل کرنا پڑا جس نے بڑی رقم ملنے کی توقع ہو تو کیا اس طرح کام کریں گے ہم لوگ؟“

”لغت ہے ہم پر۔“

دونوں اپنے آپ پر لغتیں بھیجے گئے اور اپنی کیفیت درست کرنے لگے۔ منصور نے کہا۔

”یار! مجھے ہلکے لگی ہے۔“

”ابے چپ ہو جلد کھانی لیں گے تو بدن بھاری پڑ جائیں گے نہ جانے کیسے حالات کا سامنا کرنا پڑے۔ آدی کو ہلکا ہلکا ہونا چاہیے، بس ٹھیک ہے برداشت کرو۔ بیٹے پچاس ہزار روپے کی کمائی آپ کیسے نہیں ہوتی۔“

وقت گزرتا رہا، پھر خدا خدا کر کے وہ مقررہ وقت آیا۔ دونوں نے ہانک کاٹی فاصلے پر ایک جگہ کھڑی کی ہوئی تھی، پھر لڑکی بچے اتر آئی۔ چست سال لباس پہنے ہوئے تھی۔ ہال ایک مخصوص اعزاز میں باندھے ہوئے تھے۔

بیروں میں نہایت نرم کیڑوں کی ٹپکی ٹپکی۔ وہ اپنی جگہ کھڑی ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگی پھر آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اس جگہ پہنچ گئی جہاں اس کی تصاویر بنائی گئی تھیں۔ اس کی نگاہیں چاروں طرف بھٹک رہی تھیں اور دونوں اس کا گہرا جائزہ لے رہے تھے۔ لڑکی کی نگاہوں سے بچنے کی کوشش بھی کر رہے تھے پھر جب یہ اطمینان ہو گیا کہ کوئی خطرناک صورت حال نہیں ہے تو دونوں آہستہ آہستہ اس کی جانب بڑھے اور کچھ دیر بعد اس کے سامنے پہنچ گئے۔ لڑکی نے چونک کر انہیں دیکھا۔ دیکھتی رہی اور پھر اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

”آپ لوگ بلیک میلر ہیں؟“ اس نے سوال کیا۔

”زیادہ ہوشیار بننے کی کوشش نہ کرو، رقم لائی ہو؟“

”ہاں، آپ لوگ ٹھیکو اور تصویر لائے ہیں؟“

”دونوں کا تبادلہ ایک ساتھ ہی ہوگا، پہلے رقم دو۔“

”ذرا تصویریں تو دکھاؤ کیسی آئی ہیں؟“ لڑکی نے سوال کیا۔

”تم اس کا حق نہیں رکھتیں لڑکی..... وقت ضائع کرنے کی کوشش مت کرو۔ صرف ایک منٹ، اس کے بعد ہم لوگ یہاں سے چلے جائیں گے۔“

”ارے ارے۔ یہ تمہاری آواز کیوں کانپ رہی ہے۔“

”افوہ تم پر تو لرزہ طاری ہو رہا ہے۔ اس طرح کرتے ہیں بلیک میلنگ..... کب سے یہ دھندا کر رہے ہو؟“

”تم مسلسل کبواس کیے جا رہی ہو، میں پوچھتا ہوں پیسے لائی ہو یا نہیں؟“ منصور وہاں تو لڑکی کے منہ سے ہنسی چھوٹ گئی۔

”اپنی حالت تو سنبھالو، آٹاڑی معلوم ہوتے

ہو، ایسے کرتے ہیں بلیک میلنگ؟ کوئی ڈھنگ کا کام کیوں نہیں کرتے۔ نوکری و نوکری کر دینا تمہاری عمریں ایسی ہیں اور نہ تمہاری شکل و صورت۔“

”میں دس تک گنتی گنتا ہوں، بس اس کے بعد جو کچھ ہوگا اس کی ذمہ داری خود ہوگی۔“

”دیکھو، یہ سب بہت برا ہے۔ بعض اوقات اس کے نتائج غیر متوقع نکل آتے ہیں۔ یہ پتا نہیں کس گدھے نے تمہیں اس کاروبار کا مشورہ دیا ہے۔ چلو خیر اس کے بعد آئندہ ایسی کوئی حرکت نہ کرنا۔ شاہاں۔“

”ایک نوڈتین چار پانچ.....“

”نہیں نہیں۔ گنتی گنتے میں بہت جلدی کر رہے ہو، اصل میں تمہیں تمام صورت حال سمجھنا چاہی تھی۔“

”لڑکی نے کہا اور دو پناشاؤں سے اتار کر کمر پر رکھ لیا۔ اس نے ایک طرف کمرے ہو کر جوتے بھی اتار دیے تھے۔ منصور نے انہیں پھاڑ کر اسے دیکھا اور پھر شاہ میر کو دیکھنے لگا جو خود بھی لڑکی کی ان حرکات پر حیران تھا۔ لڑکی نے اچانک ہی ملنے سے کچھ آواز نکالیں اور دونوں ہاتھ سیدھے کر کے کھڑی ہو گئی پھر اس نے کہا۔

”اب تم دونوں اپنی بڑیاں پہلیاں ترواؤ بغیر یہاں سے نہیں جا سکو گے، اصل میں، میں ایک ٹیک کام کر رہی ہوں۔ تمہیں میرے راستے پر چلنے سے روک رہی ہوں۔“

”کک..... کیا کبواس ہے تم کیا بد فیئر کی کر رہی ہو؟“

”کرانے سینئر سے میں بلیک میلٹ ہوں، یقیناً نہ آئے تو یہ دیکھو۔“

اچانک ہی لڑکی اپنی جگہ سے اچھلی اور اس نے کرانے کا ایک ہاتھ شاہ میر کے شانے پر مارا، شاہ میر کا گھٹنا زمین سے ٹک گیا تھا۔ منصور کے منہ سے کوئی آواز بھی نہیں نکل سکی تھی کہ لڑکی کی لات اس کی کمر پر پڑی اور وہ اچھل کر شاہ میر پر جا گرا۔ شاہ میر نے اسے زور سے دھکا دیا اور پھر کھڑا کیا لیکن لڑکی نے پھر پلٹ کر ان پر حملہ کر دیا۔ اس کے ملنے سے مسلسل ہانپنے کی آوازیں نکل رہی تھیں اور اس کے ساتھ ہی دونوں کی پٹائی ہو رہی تھی۔ چار چھ ہاتھوں میں دونوں کے منہ بٹھائے۔ وہ انہی کی کوشش کرتے تو لڑکی کی ایک نہ ایک لات انہیں بھر زمین پر گرا دیتی۔ دونوں اسے پکڑنے کی کوشش بھی کر رہے تھے۔ انہوں نے ہاتھ پاؤں بھی چلائے تھے، لیکن جو ڈر کرانے سے ان کی کوئی واقفیت نہیں تھی۔ نسوانی ہاتھوں میں یہ کرکٹل ناقابل یقین تھی۔ منصور کی ہمت جواب دے گئی۔ اس نے ایک ہی چلاک

لگائی اور شاہ میر سے بچ کر ہولا۔

”بھاگو، دوڑو.....“ شاہ میر خود اس مصیبت میں گرفتار تھا، لڑکی کھڑا ہونے دیتی تو وہ بھاگنے کی ہمت کرتا، منصور کو یہ موقع مل گیا تھا۔ دفعتاً ہی شاہ میر نے زور سے آواز نکالی۔

”نہیں۔“

لڑکی ایک لمحے کے لیے دوسری جانب متوجہ ہوئی اور اس موقع سے فائدہ اٹھا کر شاہ میر نے بھی دوڑ لگا دی۔ لڑکی پیٹ پکڑ پکڑ کر بس رہی تھی اور وہ دونوں ہانک کی جانب دوڑ رہے تھے، پھر بڑی بدحواسی کے عالم میں انہوں نے ہانک اشارت کی۔

منصور ہانک چلا رہا تھا اور اس وقت اپنی شاندار مہارت کا ثبوت دے رہا تھا۔ انہوں نے راستے میں کوئی ایسا رخ اختیار نہیں کیا تھا جہاں سے وہ لڑکی تعاقب کر کے انہیں پکڑ لے۔ دونوں کے جسموں پر شدید ضربیں پڑی تھیں اور یقینی طور پر وہاں سو جن پیدا ہو گئی تھی۔ چہرے بے وقار تھے، یہی خیمت تھا۔

بالآخر وہ کافی دور نکل آئے لیکن شکر تھا کہ لڑکی نے ان کا پچھا نہیں کیا تھا۔ دونوں کی حالت خراب تھی۔ بلیک میلنگ کی پہلی ہی کوشش کا یہ نتیجہ نکلے گا، اس کا انہوں نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ ایک ہوش میں پہنچنے کے بعد انہوں نے لباس وغیرہ درست کیے۔ حالت بری ہو رہی تھی۔ ایک دوسرے سے کچھ کہہ نہیں پا رہے تھے۔ کچھ دیر بعد منصور نے بھراہی ہوئی آواز میں کہا۔

”تقدیر ہی خراب ہے، کبھت بلیک میلٹ لگی۔“

”اس کو چھوڑو، یہ بتاؤ ہوگا کیا۔ اس نے ہمیں پہچان بھی لیا ہوگا۔ جہاں بھی ملے گی پولیس کے حوالے کر دے گی۔“

”میرا خیال ہے اس نے جو کچھ خود کر لیا ہے وہی کافی ہے۔ پولیس سے مدد لینے کی ہملا اس جیسی لڑکیوں کو کیا ضرورت پیش آ سکتی ہے؟“

”لیکن چھوڑیں گے نہیں..... اسے زمانے بھر میں رسوا کر کے چھوڑیں گے۔“

”ہمارے پاس اس کے خلاف مواد موجود ہے۔“

”چاہے منگواؤ یا نہ۔“

”ہاں منگواتا ہوں۔“

”کچھ کھانے کو بھی منگوا لیں، صبح سے کچھ بھی نہیں کھایا۔ میں تو دو دوس اور ایک پیالی چائے پی کر چلا تھا۔“

”تمہیں نے کون سے انڈے پرائے کھائے تھے۔“ منصور نے کہا اور اس کے بعد انہوں نے ایک ایک بن کھن چائے کے ساتھ منگوا کر کھایا اور چائے کی حرید ایک ایک پیالی اور لی تا کہ کم از کم کچھ تو تعویت پہنچے۔ جسم کے مختلف حصے درد کر رہے تھے۔ شاہ میر نے کہا۔
”یاد رکھو اور کرائے کیسے چاہئیں۔“
”اے نبواس مت کہ اب فیصلہ یہ کرنا ہے کہ ہمارا آئندہ کا قدم کیا ہوگا۔ اگر اس فیصلہ میں بھی ناکام رہے تو پھر کیا کر دو گے؟“

”بیٹے میں نہ کہتا تھا کہ جو لوگ یہ سب کچھ کرتے ہیں وہ ہمارے جیسے معمولی لوگ نہیں ہوتے۔ جانے کیا کیا جتن کرنے کے بعد وہ اپنے اندر اتنی ہمت پیدا کرتے ہیں۔ مذاق اڑا رہی تھی کہ ہم کانپ رہے ہیں۔“
”ایسے نہیں چھوڑیں گے اسے۔ اس نے ہمارے ساتھ جو سلوک کیا ہے اس کا انتقام تو لیں گے اس سے۔ رسوا کر دیں گے اسے زمانے بھر میں۔ سختی کیا ہے کرائے ماسٹر خود کو۔“
”بالآخر یہ فیصلہ کیا گیا کہ اب اس کے گھر پہنچ کر اس کے لواحقین سے رابطہ قائم کیا جائے۔ پچاس ہزار کے مطالبے کو کسی قیمت پر نہیں چھوڑا جائے گا۔“

☆☆☆

”سوچ لو مہوش، اس میں واقعی کوئی مذاق کا پہلو نہیں ہے۔۔۔ اور تمہیں یہ سب کچھ نہایت ہوشیاری سے کرنا ہوگا۔ جلد بازی بالکل مت کرو۔ میں ایک بار پھر تمہیں سوچنے کا موقع دیتی ہوں۔ سوچ کچھ کر فیصلہ کرنا۔“
رومانہ نے مہوش سے کہا، مہوش بہت پرجوش ہو رہی تھی۔ کہنے لگی۔
”خدا کی قسم میں بالکل سنجیدہ ہوں، تمہیں شاید میری کیفیت کا صحیح اندازہ نہیں ہے۔ پچھلے دنوں کی بارخوشی کے بارے میں سوچ چکی ہوں۔۔۔ زندگی سے عاجز ہوں، زندگی گزارنے کا کوئی راستہ نہیں ہے میرے سامنے۔“

”نہیں مہوش خود کوئی حرام ہے۔ انسان کو اپنی زندگی میں۔۔۔ جدوجہد کرنی چاہیے۔۔۔ اگر اس میں بھی ناکامی ہو تو پھر خود کوئی کرنے کا بہترین طریقہ ہے کہ کسی اور کو ہلاک کر دو خود کیوں مرد۔“

”تم میری زندگی کے تمام حالات جانتی ہو رومانہ، میں نہ تو محنت و محنت کی ماری ہوئی ہوں، نہ میرے حالات ایسے ہیں کہ دور دور تک کوئی سنہری مستقبل میرے سامنے ہو۔ اصل میں خود آگے بڑھ کر جام اٹھانے کی ہمت نہیں تھی مجھ میں، لیکن اگر کوئی ایسا مسئلہ میرے سامنے ہے تو

اپنی تمام تر صلاحیتیں صرف کر دوں گی۔ میں بالکل مذاق نہیں کر رہی۔ تم دیکھ لینا کسی بھی مرحلے پر کمر درمیں پڑوں گی تم سے۔“

”تو پھر ڈیڑی سے تمہاری ملاقات کرادوں؟“
”بالکل کرادو۔ ان سے کہہ دو کہ تم نے مجھے اچھی طرح ٹھونک بجا کر دیکھ لیا ہے۔ میں ان کی خواہش کے مطابق کام کرنے پر تیار ہوں۔“
رومانہ نے فاروق بیک صاحب سے اس موضوع پر بات کی اور وہ دلچسپی سے بولے۔

”تم نے اسے کیا بتایا، ذرا مجھے تفصیل سے بتاؤ؟“
”میں نے اس سے یہی کہا ہے ڈیڑی کہ اسے ایک شخص سے مشق کا ڈراما چاہنا پڑے گا۔ وہ شخص مستقبل میں کروڑ پتی ہونے والا ہے۔ مہوش کو اس سے محبت کی چٹکیں بڑھانی ہیں اور اسے اپنے جال میں گرفتار کرنا ہے۔ اسے اس شخص سے شادی بھی کرنی ہوگی۔ فی الحال وہ کیسے ہی حالات کا شکار ہے اس پر توجہ نہ دی جائے۔ بس ایسا کر لیا جائے کہ وہ مہوش کے قہقہے سے نکل نہ سکے۔ میں نے اسے تمام تفصیل بتادی ہے ڈیڑی۔۔۔ وہ پوری خوشی کے ساتھ تیار ہے۔“

”تم نے اسے یہ بتادیا ہے کہ جو دولت اس شخص کے ذریعے حاصل ہوگی، اس پر اس کی فیصلہ ہمارا قبضہ ہوگا۔“
”ہاں ڈیڑی میں نے اسے بتادیا ہے۔“
”تو پھر اسے کسی وقت مجھ سے ملوادو۔“

”ایک سوال میرے ذہن میں اور آتا ہے ڈیڑی۔ وہ یہ کہ مہوش تو اس کام کے لیے فرض کیجئے تیار ہو جائے گی لیکن آپ اس نوجوان کو کیسے تیار کریں گے؟ دولت تو اسی کے نام پر ہوگی نا۔“

”یہ ذمہ داری تم مجھ پر چھوڑ دو، میں یہ کام اپنے طور پر کر لوں گا۔“

رومانہ نے مہوش کو فاروق بیک کے سامنے پیش کر دیا۔ فاروق بیک بڑے سرد انداز میں اس سے ملے۔ انہوں نے بھاری آواز میں کہا۔

”تمہیں رومانہ نے تمام تفصیل بتادی ہے اور یہ بات بھی تمہارے علم میں ہے کہ میں قانونی آدمی ہوں، کوئی بھی کام مجھے بنیادوں پر نہیں کر سکتا۔ یہ مضمون بتایا ہے میں نے تمہارے لیے۔ اسے اپنی تحریر میں نقل کر دو۔ اس میں تم نے ایک بھیا تک جرم کے ارتکاب کا اعتراف کیا ہے۔ یہ مضمون میرے پاس موجود رہے گا اور اگر تم نے اپنی بات سے پھر نے

.... کی کوشش کی تو میں سمجھ لو کہ جیل کی سلاخوں کے علاوہ اور کچھ تمہاری زندگی میں نہیں ہوگا۔“

”ٹھیک ہے بالکل، آپ مطمئن رہیں۔ میں رومانہ کو بتا چکی ہوں کہ میں کس حد تک جا چکی ہوں۔ میں آپ کے ہر حکم کی تعمیل کے لیے تیار ہوں۔“
”تو پھر یہ سمجھ لو کہ تمہاری پوری زندگی بہترین گزرے گی۔ اس کا ذمہ میں لیتا ہوں۔ لو یہ مضمون اس کاغذ پر نقل کر دو۔“

فاروق بیک صاحب نے درحقیقت مہوش کو پوری طرح اپنے قبضے میں بکڑ لیا تھا اور اس کا اس قبضے سے لگنا ممکن نہیں تھا۔

”بس اب آخری کام اور رہ گیا ہے، اس نوجوان کی تلاش۔۔۔۔۔ اور یہ مشکل نہیں ہوگا۔ کسی طرح اکبر حسین سے ہی اس بارے میں معلومات حاصل کروں گا۔ اس کے بعد اس ڈرامے کی ڈائریکشن تمہارے سپرد کر دی جائے گی۔“

☆☆☆

”تیار ہو؟“ منصور نے شاہ میر سے پوچھا۔
”ہاں بالکل۔۔۔۔۔ جب ادھل میں سر دیا ہے تو موسلوں کا کیا ڈر۔ ہم ایسے تو نہیں چھوڑیں گے اسے، بکثت اتنی خوبصورت ہے، بظاہر نرم و نازک دکھائی دیتی ہے لیکن ہاتھ تھے کہ فولاد۔“ منصور ہنسنے لگا۔

دونوں پوری طرح رضامند تھے کہ لڑکی کو کم از کم کیفر کردار تک پہنچا کر ہی دم لیا جائے۔ دونوں پوری طرح تیار ہو کر فاروق بیک کی کوئی پہنچ گئے۔ پہلے ایک جگہ سے ٹیلی فون کر کے معلوم کر لیا گیا تھا کہ فاروق بیک گھر پر موجود ہیں یا نہیں۔ بہر حال فاروق بیک کے گھر تک پہنچنے میں انہیں کوئی خاص دقت نہیں ہوئی تھی۔ فاروق کے ملازم نے انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ ہر ستر صاحب یہی سمجھے کہ کوئی کلائنٹ کیس لے کر آیا ہے۔ بڑے کردار سے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے اور دونوں نوجوانوں کو دیکھا لیکن اچانک ہی ان کے چہرے کی رنگیں بچ گئیں۔ بالنگ نگاہ آدمی تھے ایک نظر میں بہت کچھ بنا ہوا لیتے تھے۔ انہوں نے شاہ میر کو دیکھا، ان کا اندازہ بالکل غلط نہیں تھا۔ یہ وہی نوجوان تھا جس کی تصویر اکبر حسین نے اپنے بیٹے کی حیثیت سے دکھائی تھی۔ فاروق بیک حرمت سے ایک لمبے کے لیے ٹنگ رہ گئے۔ پھر انہوں نے نہایت ترچاک انداز میں دونوں نوجوانوں سے ہاتھ ملایا اور بیٹھ گئے۔

”آپ کا نام فاروق بیک ہے؟“

”ہاں سیر فاروق بیک، کیسے میں آپ لوگوں کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“

”جناب آپ ایک مشکل میں پھنسنے والے ہیں۔ ہم نیک دلی سے آپ لوگوں کو مشکل سے نکالنا چاہتے ہیں۔“
”خیریت، آج تک تو میں لوگوں کو مشکلات سے نکال آیا ہوں، آپ پہلے لوگ ہیں جو مجھے کسی مشکل سے نکالنے آئے ہیں، تاہم وہ مشکل کیا ہے، آپ بتانا پسند کریں گے؟“
جواب میں منصور نے جیب سے ایک لفافہ نکالا اور کچھ تصویریں ان کے سامنے ڈال دیں، فاروق بیک ان تصویروں کو اٹھا کر دیکھنے لگے۔ ایک لمبے کے لیے۔۔۔ وہ چونکے تھے لیکن دوسرے لمبے نازل ہو گئے تھے۔

”آپ نے پہچان لیا ہوگا کہ یہ آپ کی صاحبزادی ہیں؟“
”ہاں اور اس کا نام رومانہ ہے۔“
”آپ کو ان کے ساتھ اس نوجوان کو دیکھ کر تعجب نہیں ہوا؟“

”بالکل نہیں کیونکہ میری بیٹی کے ساتھ جو نوجوان ہے، وہ میرا ہونے والا داماد ہے، سنی میری بیٹی کا سنگتیران کی لکھی پچھلے سال ہی کی ہے میں نے۔“
دونوں کے منہ بھاڑی طرح کل مل گئے تھے، چہرے فق ہو گئے تھے اور آنکھوں سے مایوسی چھپنے لگی تھی۔
”دو۔۔۔۔۔ داماد۔“

”جی ہاں۔۔۔۔۔ ماشاء اللہ ڈاکٹر ہے اور ابھی ہاؤس جاب کر رہا ہے۔ بہت جلد اس کا ہاؤس جاب مکمل ہو جائے گا اور کچھ عرصے کے بعد میں ان دونوں کی شادی کر دوں گا لیکن یہ تصویریں آپ کے پاس کہاں سے آئیں؟“

دونوں کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ وہ امتحان کی طرح بیٹھے ایک دوسرے کی صورت دیکھتے رہے، جب فاروق بیک نے کہا۔

”میں اس سے آگے جانا چاہتا ہوں نوجوان، بے دھڑک ہو کر آگے کی بات کرو۔ او ہو کیا تم مجھے یہ بتانے تو نہیں آئے کہ میری بیٹی چمپ چمپ کر سکی نوجوان سے ملاقات کرتی ہے۔“

ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ دروازے سے رومانہ اندر داخل ہوئی۔ اسے دیکھ کر دونوں کے اوسان خفا ہو گئے۔ رومانہ نے بھی انہیں دیکھا اور اس کے منہ سے جتنی ہوئی سی آواز نکلی۔

”تم۔“

”رومانہ اب میرے معزز مہمان ہیں۔ بیٹھو بیٹھو۔۔۔۔۔ تم

”ڈاڑھی بلیک مگلر ہیں یہ دونوں۔ انہوں نے میری کچھ تصاویر بنائی ہیں اور اس کے بعد مجھے فون کر کے بلیک مگلر کرنا چاہتے تھے۔ میری ان سے ایک ملاقات ہو چکی ہے، ان تصویروں کے عوض پچاس ہزار روپے کا مطالبہ کر رہے تھے۔ اوہو..... شاید تصویریں لے کر آپ کے پاس پہنچ گئے ہیں۔“

”اور میرے ہاتھوں ماد کھانے کے بعد شاید تم میرے ڈیڑی کو یہ بتائے آئے ہو..... گند۔ ڈیڑی! اب یہ ان تصویروں کے عوض آپ سے رقم کا مطالبہ کریں گے۔“

”مہمان ہیں ہمارے رومانہ، بچے ہیں، میں ان کی اس حرکت پر ناخوش نہیں ہوں۔ بلیک میلنگ کرنے پر اتر آئے ہیں، نہ جانے اس کی کیا وجوہات ہوں۔ بھیجی تو جو ان نسل اس وقت بڑی مشکلات کے زور سے ہے۔ ہم ان جو جالوں کو اس کا قصور وار قرار نہیں دیتے۔ تم بھول جاؤ اس بات کو کہ انہوں نے جنہیں بلیک میل کرنے کی کوشش کی تھی۔ ویسے بلیک میلنگ کے لیے تھی رقم طلب کی تھی انہوں نے تم سے؟“

”بھئی چائے وغیرہ پلاؤ ان لوگوں کو، نہ جانے کیوں مجھے ان سے بڑی محبت کا احساس ہو رہا ہے۔“

فاروق بیک نے کسی قدر خشک لہجے میں کہا اور روانہ پاؤں بٹختی ہوئی اٹھ گئی، یہ مشکل تمام منصوبہ کے منہ سے نکلا۔
 ”نن..... نہیں جناب! ہم معافی چاہتے ہیں، بس

”بیٹھو۔“ قاروق بیک کرخت لہجے میں بولے تو دونوں اس طرح بیٹھ گئے جیسے ٹانگوں کی جان نکل گئی ہو، ان کے چہرے نفی ہو رہے تھے۔

”یہی بات ہے جناب! خدا کی قسم ب..... ہاں کل یہی بات ہے۔ ہم طویل عمر سے بیروزگار ہیں، نوکری کی ممکن کوشش کر ڈالی۔ لیکن نوکری ملنے کا نام نہیں لیتی، یوں سمجھ لیجئے کہ اب خودکشی کرنے پر آمادہ ہیں۔“

”میں جانتا ہوں بچہ! میں جانتا ہوں۔ وقت بہت سخت ہے حالات بہت مشکل ہیں، جن کو ایک منٹ۔“ فاروق بیک نے کہا اور اٹھ کر ڈرائنگ روم سے باہر نکل گئے۔

”سبب..... بھاک لو ورنہ پتہ..... پولیس آتی

ہوئی۔ "منصور نے کہا: "ہاں کل چلو، جب..... بڑے مہاں
لیس ہی کو ٹیلی فون کرنے گئے ہیں۔ وہ جالاکی سے ہمیں
گرفتار کرنا چاہتے ہیں۔" دونوں برق رفتاری سے اٹھے
خود کار دروازہ قاروق بیک کے جانے
کے بعد بند ہو گیا تھا۔ لیکن انہیں یہ اندازہ نہیں تھا کہ اسے
ہر سے بند کر دیا گیا ہوگا۔ اندر سے اسے کھولنے کی کوشش
کامیاب رہی اور دونوں کی حالت حریہ خراب ہو گئی، وہ پکڑانے
لگے۔ شاہ میر نے آہستہ سے کہا۔

”دروازہ پاہر سے بند کر کے گئے ہیں۔“
”بیوقوف تھوڑی ہیں کہ ہمیں بھاگنے کا موقع فراہم
کر دیتے۔“

”اب کیا ہوگا؟“
”پچھس گئے، بس اور کیا ہوگا۔ تصویریں بھی ہمارے
س موجود ہیں، ہر گئے ہاتھوں چڑے گئے ہیں۔ گئے سال
س سال کے لیے۔“

”خدا نہ کرے، م..... میری تو ماں میرے بغیر مر
اے گی۔“ شاہ میر نے رندھی ہوئی آواز میں کہا اور منصور
سے ہمدردی کی نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

ایک درخت کی شاخ پر ایک چڑیا اور چڑیا
چمچہارہ تھے، اچانک چڑیا نے چڑے سے سوال کیا
..... آج کا انسان اس قدر پریشان کیوں نظر آتا ہے؟

چڑے نے جواب دیا۔ رزق کی تلاش میں
چڑیا یوں، رزق کی تلاش میں تو ہم بھی رہے ہیں، ہم
پریشان تو نہیں رہے۔ چڑیا بلا دراصل ہم اللہ پر
بھروسہ کرتے ہیں اور جانتے ہیں کہ رزق اسی کی
طرف سے ملتا ہے لیکن انسان اپنے آپ پر بھروسہ
کرتا ہے اور پھر ایک بات اور..... ہمیں پیٹ بھرنے
کو تھوڑا بہت مل جاتا ہے، ہم اسے پاکر اللہ کا شکر ادا
کرتے ہیں لیکن انسان زیادہ سے زیادہ پانے کی لالچ
میں ہے یہی وجہ ہے کہ ہر وقت پریشان رہتا ہے۔
چڑیا یوں، اللہ کا شکر ہے کہ ہم انسان نہ تھے۔

بانگ پر بیٹھ کر منصور نے شاہ میر سے کہا۔ ”کیا اس دور میں بھی ایسے فرشتوں کا وجود ہے شاہ میر؟“

”پاروانی یقین نہیں آ رہا۔“

☆☆☆

قادر حق ایک انتہائی سرور انداز میں ڈراما نگاروں سے باہر نکل آئے اور درویشانہ کے لباس پہن گئے۔ درویشانہ اپنے کمرے میں منہ پھلے بیٹھی ہوئی تھی۔

”بھئی، مجھ میں کچھ آٹا نہیں ڈیڑی۔ وہ کجنت ایک میل کرنا چاہتے تھے مجھے۔ میں نے مار لگا دی تھی انہیں، چنانچہ وہ یہاں آپ تک پہنچ گئے اور آپ نے ان کے ساتھ یہ سلوک کیا۔“

”احق تو تم بالکل احق ہو۔ تم سمجھتی نہیں ہو۔ یوں سمجھ لو کہ بیٹھے دولت ہمارے پاس آگئی ہے۔“

”ان میں سے ایک نوجوان اکبر حسین کا بھتیجا ہے۔“
”کیا؟“ رومانہ اچھل پڑی۔

”ہاں، وہ جس کا نام شاہ میر ہے، میں نے اس کا ہاتھ
 وغیرہ معلوم کر لیا ہے۔“

”اوہ..... ڈیڑی..... کیا واقعی؟“

”ہاں.....“ قاتر قریب نے جواب دیا پھر کہنے لگے۔

”اصل میں جب کوئی کام ہونا ہوتا ہے تو پھر اس کے لیے حالات بنتے چلے جاتے ہیں۔ ہمارا سہرا مستقبل بلکہ اگر

”ویسے اس میں کوئی شک نہیں ہے دودست کہ برے کام کے برے ہی نتائج ہوتے ہیں۔ ہم ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جنہیں یہ زندگی راس آ جاتی ہے۔“

”بیٹھ جاؤ، اب تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ جو تقدیر میں ہو گا وہی ہو جاتا گا۔“ کچھ دیر کے بعد دروازے پر آئیں

”میں اور فاروق بیک کمرے میں داخل آ گئے۔ ان کے ہاتھ میں بائج سو کے نوٹوں کی ایک گڈی تھی۔ انہوں نے اسے ان کے سامنے پڑھ کر دکھایا گڈی دیکھ کر دونوں کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ فاروق بیک صوفے پر بیٹھے ہوئے بولے۔

”مجہودہ وقت کی مشکلات میں اچھی طرح جانتا ہوں، یہ تم نے ان تصویروں کی قیمت پچاس ہزار روپے ہی سے، ایک بزرگ کا تختہ بھری کر اصل میں، میں بہت کشادہ بہن کا مالک ہوں اور بھر پوری بنی تعلیم یافتہ بھی ہے۔ وہ اپنے بگیتے کے ساتھ آزادانہ گھوم پھر سکتی ہے۔ آئندہ سال تو مجھے ان دونوں کی شادی کر دی دینی ہے۔ اس لیے میں نے اسے اجازت دے دی ہے۔ یہ کوئی ایسا کیس نہیں ہے جس سے فاروقی بیک کو بلیک میل کر سکو۔“ دونوں انتہائی شرمندگی سے فاروقی بیک کی صورت دیکھنے لگے، فاروقی بیک نے کہا۔

”یہ نوٹ اٹھا کر جیب میں رکھ لو، میں تم سے درخواست کرتا ہوں۔ اور بیٹے مجھے اپنا ہاتھ وغیرہ بتا دو، پریشان نہ ہو۔ میں تمہاری ملازمتوں کے لیے بھی کوشش کروں گا۔ کسی قسم کی غلط فہمی کا شکار نہ ہونا، اس کے نتائج بہتر نہیں ہوتے۔“

دوئوں کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ایسے ہمہرد انسان کا اس دور میں تصور نہیں کیا جاسکتا تھا۔ رومانو تو اس کے بعد نہیں آئی، ملازم چائے لے کر آگیا۔ فاروق بیگ نے ان دوئوں کو چائے وغیرہ پلائی۔ ان سے ان کا پاپا چھاوڑ دوئوں نے اپنے اپنے پتے دہرا دیے۔ فاروق بیگ ٹھوڑی دیر کے بعد انہیں رخصت کرنے دروازے تک آئے تھے۔ دوئوں سے بات چلتا ہوا انہوں نے کہا۔

”یہ بچاس ہزار روپے فی الجاہل تمہاری معاونت کر رہے تھے اور غرض نہ کرنا کہ یہ رقم ہو جائے اور اس وقت تک تمہیں کوئی ملازمت نہ ملے تو فی الجاہل مجھ سے ہر ماہ یہ رقم لے لیا کرو۔ میرے لیے مشکل نہیں ہوگی۔ اگر تم نیک راستوں کے راہی بن جاؤ تو میرے لیے اس سے زیادہ خوشی کی بات اور کہی نہیں ہوگی۔“

میں یہ کہوں کہ تمہارا سنہرا مستقبل برقی رفتاری سے تمہاری جانب بڑھ رہا ہے، تو غلط نہیں ہوگا۔ ورنہ اس نوجوان کو تلاش کرنے کے لیے خاصا کام کرنا پڑتا۔ بہر حال وہ دولت مند شخص اچھا نہیں ہے، کسی سوچ پر محسوس بھی کر سکتا تھا۔ اس دوران میں جب تک ہم اپنے دوسرے کام شروع کریں۔ مہوش کو اپنا کام شروع کرونا چاہیے، وقت سے پہلے اگر یہ سب کچھ ہو جائے تو بہت عمدہ رہے گا۔

”پروگرام کیا رہے گا ڈیڑی؟“

”مہوش اس اپنے پر جانے گی، کسی کو معلوم کرتے ہوئے اور اگر شاہ میرا سے نہ بھی ملے تو وہ اس کی ماں سے راہ و رسم پوچھا سکتی ہے اور اس کے بعد وہ وہاں جاتی رہے۔ اس قسم کے کام جس اعزاز میں ہوتے ہیں مہوش کو وہی اعزاز اختیار کرنا ہوگا۔ تم اس کی تربیت کرتی رہو۔“

”فیک ہے ڈیڑی، میں ابھی مہوش کو تلاش کرتی ہوں۔“

”رومانہ نے کہا۔ مہوش کو تلاش کرنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ رومانہ مسکرا کر اس کے گلے لگ گئی اور اس نے ہنسنے لگا۔

”اب تو تمہاری بہت خدمت کرنی ہوگی ہمیں کیونکہ تم مستقبل کی بہت دولت مند لڑکی بننے والی ہو۔“ مہوش نے منہ نیڑھا کر کے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

”یقین نہیں ہے، اصل میں تقدیر نے کسی ایسے موقع پر ایسا کوئی ساتھ نہیں دیا۔ اس لیے سوچتی ہوں کہ کہیں یہ سلسلہ بھی ناکام ہی نہ رہے۔“

”نہیں مہوش! ہم لوگوں نے جو پروگرام بنایا ہے وہ بہت موثر ہے۔ لیکن شرط یہی ہے کہ اب تم اپنی کارگیری کا ثبوت دو۔“

”ان لوگوں کا..... میرا مطلب ہے اس نوجوان کا کوئی پتا تو ملے؟“

”پتا کھل گیا ہے؟“ رومانہ نے جواب دیا۔

”کیا؟“ مہوش اچھل پڑی۔

”ہاں، اس کا پتا چل گیا ہے اور اب میں تمہیں جو کچھ بتاؤں تمہیں اسی کے مطابق کام کرنا ہوگا۔“

”پتا بتاؤ۔“ مہوش بولی اور رومانہ نے وہ پتا ہر دایا جو فاروق بیگ نے اسے دیا تھا مہوش کو اس سلسلے میں تمام تفصیلات سمجھانے لگی اور اس کے بعد بولی۔

”تو پھر تم کب سے کام شروع کر رہی ہو؟“

”آج سے لگتا ہے۔“ مہوش نے دیر کے بعد۔ میں سمجھ رہی ہوں کہ مجھے کیا کرنا ہے۔“

”ہاں..... تم اس علاقے کے گھر کے مخصوص دروازے پر دستک دو گی۔ ہو سکتا ہے شاہ میر نہیں مل جائے۔ وہ نہ بھی ملا تو اس کی ماں ضرور گھر ہوگی۔ اس سے اس محبت بھرے اعزاز میں گفتگو کرنا کہ وہ تمہاری گرویدہ ہو جائے، ماں تک پہنچنے کے بعد بیٹے تک رسائی مشکل کام نہیں ہوگا۔“

”اب تم مجھے یہ نہ سمجھاؤ، تعلیم پانچ ہوں جاہل نہیں ہوں۔ زندگی بنانے کے لیے محنت کرنی ہوں اور کوشش یہ کروں گی کہ اس میں مجھے کامیابی حاصل ہو۔“

”تم اگر چاہو تو میں تمہیں کسی قریبی جگہ ڈراپ کر سکتی ہوں۔“

”یہ زیادہ اچھا ہوگا۔“

”ویسے تو ڈرے پیسے بھی رکھ لو۔ ظاہر ہے اس دوران میں تمہارے اخراجات بھی ہوں گے۔“

”سٹی اور پوچھ پوچھ۔“ مہوش نے ہنس کر کہا۔ کچھ دیر کے بعد رومانہ نے اسے ایک ایسی جگہ اتار دیا جہاں سے وہ اس علاقے میں جا سکتی تھی جہاں شاہ میر کا گھر تھا۔ رومانہ کہنے لگی۔

”ہمیں اس دوران ایک دوسرے سے خاصا دور رہنا ہوگا۔ کم از کم میرا بھی خیال ہے۔ اس بارے میں ڈیڑی سے مزید مشورہ کر لوں گی۔ ایک ساتھ دیکھ جانے سے بہت خطرات لاحق ہو سکتے ہیں۔“

”او کے..... میرے لیے نیک خواہشات کی دعائیں کرنا۔“

مہوش نے کہا اور اس کے بعد وہ مطلوبہ ایڈریس کی جانب چل پڑی۔ پتا تلاش کرنے میں اسے زیادہ جدوجہد نہیں کرنی پڑی تھی۔ چند لمحات کے بعد وہ مطلوبہ گھر کے دروازے پر دستک دے دی تھی۔

☆☆☆

ڈیشان کی ہاؤس جاب مکمل ہوئی تھی۔ وہ ان دنوں بہت بچھا بچھا سفر آتا تھا۔ رومانہ سے اس کی ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں۔ اس وقت بھی وہ ایک ریستوران میں بیٹھے ہوئے تھے اور ڈیشان اپنے مستقبل کی باتیں کر رہا تھا۔ رومانہ نے ہنسنے لگا۔

”تو جاب ڈاکٹر صاحب! اب کیا ارادہ ہے آپ کا؟“

”بس رومانہ بہت بدول ہوں ان حالات سے۔“

”کیوں؟“

”ملازمت کی تلاش جاری ہے، اصل میں انسان مر

کے ساتھ ساتھ ہی تجربہ حاصل کرتا ہے۔ میڈیکل کالج میں داخلے کے لیے بھی طبی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا جنہیں ان کا علم ہے، اس کے بعد جس طرح زندگی کو آگے بڑھایا وہ بھی یقینی طور پر تمہارے علم میں ہے، سوچنا تھا کہ بس امتحان پاس کر لوں اس کے بعد دوبارے بنارے ہوں گے لیکن اب جب بالغ نگاہ سے اس دنیا کو دیکھا ہے تو یوں ہی محنتوں کا انکشاف ہوا ہے۔“

”سب سے پہلی چیز تو یہ کہ ملازمت کا ملنا ہی محال نظر آتا ہے، ہر سال بے شمار ڈاکٹر باہر نکلتے ہیں ان کی کچھ انتہائی مشکل کام ہے، جن حالات سے گزر کر اور طبی شدید محنت کرنے کے بعد وہ ڈاکٹر بننے ہیں، تصور تو یہی ہوتا ہے ان کے ذہنوں میں کہ بس اب ایک سنہرے مستقبل کا منتظر ہے لیکن پھر جب باہر قدم نکالتے ہیں تو ہر طرف تاریکیاں ہی تاریکیاں بھری نظر آتی ہیں۔“

”تم اتنے مایوس کیوں ہو ڈیشان؟“

”نہیں مایوس نہیں ہوں۔ بس یہ سوچ رہا ہوں کہ جو خواب دیکھے تھے ان کی تعبیر مشکل ہے۔“

”میں تمہارے خوابوں کی تعبیر ہوں ڈیشان۔ میں تمہیں کلینک بنا کر دوں گی تمہاری پسند تمہاری مرضی کے مطابق۔“

ڈیشان نے جیب کی ٹاکا ہوں سے رومانہ کو دیکھا پھر بولا۔

”نہیں رومانہ ہم محبت کا سودا کر رہے ہیں، کاروبار نہیں کر رہے۔ ظاہر ہے یہ سب کچھ میرا سزا صاحب کے لیے بھی ممکن نہیں ہے۔ میں ان پر کوئی ایسا بوجھ نہیں ڈالوں گا جس سے ان کی کٹروٹ جائے اور پھر کلینک بنانا معمولی کام نہیں ہے۔“

”خیر آنے والا وقت اس کا صحیح فیصلہ کرے گا۔ میں تم سے صرف اتنا کہہ سکتی ہوں کہ تم بدول نہ ہو۔ بہت دیر تک رومانہ ڈیشان کو دلا سے دیتی رہی۔ پھر اس شام اس نے فاروق بیگ سے بھی اس موضوع پر گفتگو کی۔

”ڈیڑی! آپ کو علم ہے کہ ڈیشان کی ہاؤس جاب مکمل ہو گئی ہے۔ وہ بہت مایوس ہے۔“

”کیوں؟“

”بس وہی اس کا پتا نظر ہے، ویسے بھی اس وقت اتنے ڈاکٹر موجود ہیں ہمارے ملک میں کہ ان کی کچھ مشکل ہو گئی ہے۔“

”ڈیشان کا مستقبل روشن ہے، تقدیر ہمارا ساتھ دے رہی ہے، بس اب تمہارا ہی وقت گزر رہا ہے کہ ہمارا کام مکمل ہو جائے گا۔ ویسے مہوش کس پوزیشن میں ہے؟“

”میں ابھی اس کا پتا نظر ہے، ویسے بھی اس وقت اتنے ڈاکٹر موجود ہیں ہمارے ملک میں کہ ان کی کچھ مشکل ہو گئی ہے۔“

”ڈیشان کا مستقبل روشن ہے، تقدیر ہمارا ساتھ دے رہی ہے، بس اب تمہارا ہی وقت گزر رہا ہے کہ ہمارا کام مکمل ہو جائے گا۔ ویسے مہوش کس پوزیشن میں ہے؟“

”میں ابھی اس کا پتا نظر ہے، ویسے بھی اس وقت اتنے ڈاکٹر موجود ہیں ہمارے ملک میں کہ ان کی کچھ مشکل ہو گئی ہے۔“

”ڈیشان کا مستقبل روشن ہے، تقدیر ہمارا ساتھ دے رہی ہے، بس اب تمہارا ہی وقت گزر رہا ہے کہ ہمارا کام مکمل ہو جائے گا۔ ویسے مہوش کس پوزیشن میں ہے؟“

”میں ابھی اس کا پتا نظر ہے، ویسے بھی اس وقت اتنے ڈاکٹر موجود ہیں ہمارے ملک میں کہ ان کی کچھ مشکل ہو گئی ہے۔“

”ڈیشان کا مستقبل روشن ہے، تقدیر ہمارا ساتھ دے رہی ہے، بس اب تمہارا ہی وقت گزر رہا ہے کہ ہمارا کام مکمل ہو جائے گا۔ ویسے مہوش کس پوزیشن میں ہے؟“

”میں ابھی اس کا پتا نظر ہے، ویسے بھی اس وقت اتنے ڈاکٹر موجود ہیں ہمارے ملک میں کہ ان کی کچھ مشکل ہو گئی ہے۔“

”ڈیشان کا مستقبل روشن ہے، تقدیر ہمارا ساتھ دے رہی ہے، بس اب تمہارا ہی وقت گزر رہا ہے کہ ہمارا کام مکمل ہو جائے گا۔ ویسے مہوش کس پوزیشن میں ہے؟“

”انتہائی شاعر جا رہی ہے۔ میں اکثر اس کا تعاقب کرتی رہتی ہوں۔ شاہ میر کے ساتھ سوز سائیکل پر نظر آتی ہے۔ بھی کسی پبلک مقام پر، بھی کسی پارک میں، بھی کسی ہوٹل میں۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ وہ نہایت برقی رفتاری سے اپنا کام سرانجام دے رہی ہے۔“

”دیری لڈ، دیری لڈ! آج شام کو اسے بلا لو۔“

”کوئی خاص بات؟“

”ہاں اس دوران اس سے ملاقات نہیں ہوئی ہماری، میں چاہتا ہوں کہ اس سے ایک ملاقات کر لی جائے۔“

مہوش کے لیے رومانہ نے پیغام چھوڑ دیا تھا اور مہوش نے فون کر کے کہا تھا کہ آج رات وہ شاہ میر کے گھر کھانے پر مدعو ہے۔ کل جس وقت بھی وہ کہے مہوش آجائے گی۔ فاروق بیگ نے شام کو پانچ بجے کا وقت دے دیا تھا۔ یہی وقت ان کی تمام مصروفیات سے فرمت کا وقت ہوتا تھا۔

دوسرے دن شام پانچ بجے مہوش پہنچ گئی۔ اس کے چہرے پر کھسار گیا تھا اور اس کی شخصیت خاصی بدلی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ باپ بیٹی نے اس کا پڑ جوش خمر مقدم کیا۔ فاروق بیگ کہنے لگے۔

”اس وقت تم ہماری امیدوں کا مرکز ہو مہوش۔ کچھ تمہارا کام کیسا جا رہا ہے؟“

”نہایت شاعر اٹکل! میں ہر ممکن کوشش کر رہی ہوں جس سے میری اس خواہش کی تکمیل ہو جائے۔“

”ہاں، میں اب بھی چاہتا ہوں کہ بہت جلد اس ڈرائے کا ڈراپ سین ہو جائے۔ ہم کسی کی زندگی پر قادر نہیں ہوتے۔ یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ اگر برسیں کتنے عرصے زندہ رہے گا؟“

”یہ سوال میرے ذہن میں بار بار گردش کرنے لگتا ہے اٹکل کہ سارے کام تو ہو جائیں گے لیکن اس کام کی تکمیل تو اگر حسین کی موت کے بعد ہی ہوگی۔“

”بے شک اور میں تم سے اسی لیے ملاقات کرنا چاہتا تھا کہ ذرا تمہارے کام کی تفصیلات معلوم کر لوں۔“

”اٹکل! آپ نے مجھے جو ہدایت کی ہے اس کے مطابق میں سارے کام کر رہی ہوں۔“

”شاہ میر کا کیا نظریہ ہے تمہارے بارے میں؟“

”وہ ملازمت کی تلاش میں ہے اور کہتا ہے کہ جو جی

ا سے ملازمت مل جائے گی، وہ پہلا کام یہی کرے گا۔“

”یعنی تمہارے ساتھ شادی؟“

”جی۔“ مہوش نے سر جھکا کر کہا۔

”ہوں..... اس کا مطلب ہے کہ اب ہمیں اپنے کام کا آغاز کر دینا چاہیے۔“

”آپ اس کی پچھل کس طرح کریں گے انکل؟“

”مہوش نے سادگی سے پوچھا تو قاروق بیک کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ پھر انہوں نے کہا۔“

”اکبر حسین ہائی بلڈ پریشر کا مریض ہے۔ اسے بعض اوقات شدید ہائی بلڈ پریشر ہو جاتا ہے۔ ایک دو بار اس سلسلے میں اسپتال میں بھی داخل ہو چکا ہے، ڈاکٹروں نے اسے شدید احتیاط کی ہدایت کی ہے۔ میں نے بھی گولیاں نہیں کھیں، بس انتظار کر رہا تھا کہ کم اپنا کام مکمل کر لو تو میں اپنے کام کا آغاز کروں۔“

”آپ کیا کریں گے انکل؟“ مہوش نے سوال کیا۔

”میرا تجربہ یہ ہے بی بی اور اب ہم جبکہ ایک ہی راستے کے مسافر ہیں تو میں تمہیں اپنے منصوبے سے آگاہ کر دیتا ضروری سمجھتا ہوں۔ ہائی بلڈ پریشر کا مریض عموماً بلڈ پریشر کم کرنے کی دوائیں نہیں کھاتا رہتا ہے لیکن دواؤں میں ایسی ہوتی ہیں جنہیں آپس میں ملا کر ہائی بلڈ پریشر کے مریض کو استعمال کرا دی جائیں تو اس کا بلڈ پریشر انتہائی کم ہو جاتا ہے اور اس وقت اگر اسے فوری طبی امداد نہ ملے تو پھر یوں سمجھو کہ بات زندگی کے اختتام پر ہی ختم ہوتی ہے۔ اب جبکہ تم اس بات کا سکتھل دے چکی ہو کہ تم نے اپنا کام مکمل کر لیا ہے اور شاہ میراب پوری طرح تمہارے قبضے میں ہے تو پھر میں اپنا کام شروع کیے دیتا ہوں۔“

”یعنی..... یعنی آپ.....“

”ہاں..... میرے اکبر حسین سے اچھے تعلقات ہیں، ابھی اس کی وصیت کا سلسلہ چل رہا ہے۔ میں کسی بھی سلسلے میں اس سے ملاقات کر سکتا ہوں۔ چائے کی فرمائش کر سکتا ہوں۔ بس یہ دونوں دوائیں ملا کر مجھے اپنے پاس رکھنا ہوں گی اور ملاقات کے دوران چائے کی نشست میں اس کی چائے میں چند قطرے دوا ملا دوں گی اور پھر اسی رات کسی بھی لمحے ہمیں اس کی موت کی اطلاع مل جائے گی۔“

”ہم..... مگر یہ تو قتل ہوگا انکل؟“

”بے بی! دیوے بھی وہ دل کا مریض ہے۔ کوئی بھی لمحہ اس کا موت کا لمحہ ہو سکتا ہے۔ ہم اگر اس کی یہ مشکل آسان کر دیں تو کیا برا ہوگا، ظاہر ہے ضرورت ایجاد کی ماں ہوتی ہے، ہمیں یہ سب کچھ کرنا ہے۔ اب اس کی موت کا انتظار تو نہیں کیا جاسکتا۔ بعض اوقات دل کے مریض بھی سالہا سال زندہ رہتے ہیں۔ ہو سکتا ہے اکبر حسین بھی طویل

عرسے تک زندہ رہے۔ ہم انتظار نہیں کر سکتے مہوش۔ ظاہر ہے اس کے بعد تم بھی اپنے کمین مستقبل کا آغاز کرو گی۔“

”لیکن انکل سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آپ فرض کیجیے اکبر حسین کو راستے سے ہٹا دیتے ہیں؟“

”ہاں پھر؟“

”اس کے بعد لازمی امر ہے کہ شاہ میر کو تلاش کرنے کا مسئلہ ہوگا۔ حالانکہ آپ اس کے بارے میں جانتے ہیں لیکن پھر بھی آپ کو پورا پھیل ہی ملے گا۔ فرض کیجیے میری اور شاہ میر کی شادی ہو جاتی ہے تو اس کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ اس کی دولت فوراً ہی میرے قبضے میں آجائے اور پھر جب اسے دولت مل جائے گی تو وہ اسے اپنی تحویل میں رکھے گا، وہ دولت ہم تک کیسے منتقل ہو سکتی ہے؟“

”اس لیے تو کہتا ہوں کہ کام کا آغاز جلد از جلد ہونا چاہیے۔ پچھل بے شک لمبا ہے مگر اس کے نتیجے میں حاصل ہونے والی دولت بھی بہت ہے، چنانچہ پہلے اکبر حسین کی چھٹی کی جائے گی، اس کے بعد وہ دولت شاہ میر کو منتقل ہو جائے گی اور پھر بی بی ہمیں اپنا کام سرانجام دینا ہوگا۔“

”یعنی انکل..... یعنی.....“ مہوش نے مضطربانہ انداز میں کہا تو قاروق بیک ہنسنے لگے۔

”اصل میں یہ دور بہت جدید ہے، جو لوگ اس دور میں بھی پستول کی گولی یا بھجے سے کام لیتے ہیں یا کسی کو گردن دبا کر ہلاک کرتے ہیں، میری نگاہ..... میں امتحان لوگ ہیں۔ کسی سندرت دوتا تو جوان کو اگر صرف ایک ماہ تک کچھ ایسی دوائیں استعمال کرا دی جائیں جو کسی بھی طور پر نہ ثابت ہوں، لیکن اس کے لیے زہر سے زیادہ قاتل ثابت ہوں تو پھر ہم اسے اس پوائنٹ پر لے آتے ہیں جہاں کسی بھی لمحے کسی بھی وقت اس سے پھنکارا حاصل کیا جاسکتا ہے۔ شاہ میر کو ہلاک کرنا ہوگا تاکہ اس کی دولت تمہاری جانب منتقل ہو جائے۔“

”اوہ ڈیڑی! اتنا لمبا کام ہے یہ۔ یعنی ابھی ہمیں ایک نا معلوم عرسے تک انتظار کرنا ہوگا۔“ رومانہ نے پریشان لہجے میں کہا۔

”تم فکرت کرو بی بی، جس قدر جلد ممکن ہو سکے گا ہم یہ کام منٹالیں گے اور اس کے بعد تم سب کی نئی زندگی کا آغاز ہوگا۔ ہمیں اندازہ ہے یہ سب کچھ میں اپنے لیے نہیں کر رہا، بس میری نگاہوں کے سامنے تم لوگوں کا مستقبل ہے۔“

رومانہ خاموش ہو گئی۔ مہوش کے چہرے پر بھی عجیب

سے تاثرات پھیلے ہوئے تھے۔

☆☆☆

بیر سٹر قاروق بیک کی کار اکبر حسین کی کونٹھی میں داخل ہو گئی۔ اکبر حسین اس وقت بھی بیرونی حصے کے لان میں بیٹھے ہوئے تھے۔ بیر سٹر قاروق بیک نے ابھی تھوڑی دیر قبل انہیں ٹیلی فون کیا تھا اور اکبر حسین صاحب نے کہا تھا کہ وہ آتے ہیں۔ چنانچہ بیر سٹر قاروق بیک کیل کانٹے سے لیس ہو کر بیٹھے۔

اکبر حسین نے مسکراتی نگاہوں سے بیر سٹر صاحب کو دیکھتے ہوئے ان کا استقبال کیا اور بیر سٹر صاحب کمری پر بیٹھ گئے۔ انہوں نے کہا۔

”آپ کی صحت خاصی بہتر محسوس ہو رہی ہے اکبر حسین صاحب!“

”ہاں ملال، بس تنہا زندگی ہے، کبھی جی چاہتا ہے تو خوش ہو جیتے ہیں کسی بات پر رونہ اور ہے کیا ہماری زندگی میں۔ خیر چھوڑیے۔ آپ سنا ئیے، کیسا چل رہا ہے آپ کا کاروبار؟“

”دعائیں ہیں اکبر حسین صاحب! اصل میں آپ سے اس وصیت کے بارے میں مزید کچھ تفصیلات معلوم کرنی تھیں۔ میں آخری بار پھر آپ سے کہنا چاہتا ہوں کہ اگر چاہیں تو اس پر نظر ثانی کر لیں۔“

اکبر حسین کا چہرہ تن گیا، انہوں نے کرفٹ لہجے میں کہا۔

”آپ عجیب آدمی ہیں بیر سٹر صاحب! آخر آپ مجھے سمجھانے کا کیا حق رکھتے ہیں؟ میرا ہانا ہے سب کچھ، میں اس کے بارے میں جو بھی فیصلہ کروں گا، آپ اس میں مداخلت کیوں کر رہے ہیں؟“

”تمہیں میں مداخلت نہیں کر رہا۔ بس اپنے طور پر آپ سے آخری بار گفتگو کرنا چاہتا تھا تاکہ اسے فائنل کر دوں۔“

”آپ میری خواہش کے مطابق اس وصیت کو فائنل کر دیجئے اس میں کسی قسم کی کوئی مچائش نہیں ہے۔“

”جیسا آپ پسند کریں، مجھے اعتراض نہیں ہے۔“

”اس کے علاوہ میرے لائق اور کوئی خدمت؟“

”نہیں، بس بہت عرصے سے آپ سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ میں نے سوچا کہ آپ سب مل لوں، اس موضوع پر بھی بات کر لوں، چائے پلو ایسے بہت عمدہ ہی۔“

”ہاں ضرور۔“ اکبر حسین صاحب نے کہا اور پھر

اپنے اس ملازم کو آواز دی جو کھیار یوں پر کام کر رہا تھا۔ انہوں نے اسے چائے لانے کے لیے کہا۔ بیر سٹر قاروق بیک کی پیشانی پر بار بار پینا آ جاتا تھا جسے وہ رومال سے خشک کر لیتے تھے۔ اکبر حسین نے کہا۔

”مگر اتنی تو نہیں ہے، آپ کی پیشانی بار بار پیسے میں کیوں ڈوب جاتی ہے؟“

”پچھلے دنوں سے شاید مجھے بھی کچھ بلڈ پریشر کی شکایت ہو گئی ہے، آپ کی کیفیت کیا ہے؟“

”بس بیر سٹر صاحب! ہم تو دائمی مریض ہیں، ہماری کیفیت کیا ہوئی؟“

”آپ یقینی طور پر بہتر ہو جائیں گے، یہ مرض پچھا نہیں چھوڑتا لیکن اگر اس کی صحیح طور پر نگہداشت کر لی جائے تو نازل ضرور ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر نے یقینی طور پر آپ کو اس سلسلے میں بہت سے مشورے دیے ہوں گے۔“

”ہاں کیوں نہیں؟“

مختلف امور پر گفتگو ہوتی رہی۔ اکبر حسین خاصی بہتر حالت میں تھا لیکن بیر سٹر صاحب کو بار بار پینا آرہا تھا اور اب انہوں نے خوف سے پینا خشک کرنا بھی چھوڑ دیا تھا کہ اکبر حسین کو کسی قسم کا شہ نہ ہو جائے۔ کچھ دیر کے بعد ملازم چائے لایا۔ اکبر حسین نے ملازم سے ہی چائے پنانے کے لیے کہا اور اس نے نفاس سے چائے کی دو پچالیاں بنا کر سامنے رکھ دیں۔ اب بیر سٹر صاحب اس مشکل کا شکار تھے کہ اپنی کارروائی کیسے سرانجام دیں۔ وہ بھی شیشی ان کی جب میں موجود تھی جس میں خصوصی قسم کی دوا تیار کر لی گئی تھی۔ یہ مشکل بھی اکبر حسین نے خود مل کر دی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھے اور بیر سٹر صاحب سے ایک لمحے کے لیے معذرت کر کے کونٹھی کے اندرونی حصے کی جانب چل پڑے۔ بس اتنا موقع کافی تھا۔ بیر سٹر صاحب نے بڑی ہوشیاری سے اکبر صاحب کی چائے میں دوا کے چند قطرے شامل کر دیے تھے۔

کچھ دیر کے بعد اکبر حسین صاحب واپس آئے تو ان کے ہاتھ میں ایک خوبصورت چھوٹا سا شیپ ریکارڈنگ ڈیا ہوا تھا۔ شیپ ریکارڈنگ ڈیا انہوں نے میز پر رکھ دیا۔ پھر اکبر صاحب نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔

”معاف کیجئے گا، اصل میں میری خواہش ہے کہ میں اپنی وصیت ریکارڈ کر کے آپ کے حوالے کر دوں تاکہ مزید پچھل ہو جائے۔“

”آپ کے ذہن میں یہ خیال کیوں آیا ہے؟“

”آپ میری ذہنی کیفیت نہیں جانتے۔ بہت شدت پسند آدمی ہوں اور یہ جانتا ہوں کہ جو کچھ میں کر رہا ہوں وہ بھرپور ہواور اس میں کسی قسم کا کوئی شبہ نہ ہے۔“

”جی۔“ بھیر ستر صاحب نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

اکبر حسین نے انہیں چائے کی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہا۔

”آپ اپنی چائے کیوں ٹھنڈی کر رہے ہیں، براہ کرم لیجیے۔“

”ہاں پلیز۔“ بھیر ستر صاحب نے اکبر حسین صاحب کو ان کی چائے کی پیالی کی جانب متوجہ کرتے ہوئے کہا۔ بھیر ستر صاحب نے اپنی پیالی کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ اکبر حسین صاحب نے ان کا ہاتھ روک دیا۔ اپنے سامنے رکھی ہوئی چائے کی پیالی انہوں نے بھیر ستر صاحب کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

”آپ یہ لیسنہ مجھے دیں۔“

”جی.....“ فاروق بیگ کا سانس اڑا کر اوپر اور نیچے کا نیچہ کر گیا۔

”ہاں، ایک ہی بات ہے کوئی حرج نہیں ہے۔“ اکبر صاحب نے اپنے سامنے رکھی ہوئی وہ پیالی جو انہوں نے بدل لی تھی، اٹھا کر ہونٹوں سے لگاتے ہوئے کہا اور پھر فاروق بیگ کو اشارہ کر کے کہا۔

”لیجیے پلیز۔“

فاروق بیگ ہلکا ہانپتے ہوئے تھے۔ ان کی چھٹی حس خطرے کی گھنٹی بج رہی تھی۔ یہ ایک ناقابل یقین سی بات تھی۔ بہت حیران کن بات۔ فاروق بیگ کو یوں محسوس ہوا جیسے اکبر حسین ان کی حرکت سے واقف ہو گئے ہوں۔

”چائے لیجیے۔ ٹھنڈی ہو رہی ہے۔ بھیر ستر صاحب۔“ اس بار اکبر حسین کا لہجہ کچھ سخت تھا۔ بھیر ستر صاحب چونک پڑے۔ انہوں نے جب میں ہاتھ ڈال کر پتول نکال لیا اور اس کا رخ فاروق بیگ کی طرف کر دیا۔

”چائے لیجیے۔“ بھیر ستر صاحب ورنہ..... ورنہ میں پتول کی گولیاں آپ کے سینے میں بیوست کر سکتا ہوں، چائے لیجیے۔“

فاروق بیگ نے بے اختیار چائے کی پیالی کی طرف ہاتھ بڑھایا اور پھر کانپ کر رہ گئے۔ ”میں کچھ سمجھا لیکن..... یہ کچھ..... پتول.....“

”آپ مجھے نہیں چلے میں آپ کو سمجھائے دیتا ہوں۔“ اکبر حسین صاحب نے کہا اور سامنے رکھے ہوئے ٹیپ ریکارڈنگ کا وہ مین واپس دیا جس سے کیسٹ پلے ہو جاتا

تھا۔ بھیر ستر صاحب کی نگاہیں خوفزدہ انداز میں ٹیپ ریکارڈنگ کی جانب اٹھ گئیں۔ ٹیپ ریکارڈر پر آواز سنائی دی۔ یہ ان کی اپنی آواز تھی اور اس آواز میں وہ مہوش کو ہدایات جاری کر رہے تھے۔ اسے بتا رہے تھے کہ اب اسے اپنا کام مکمل کر لینا چاہیے اور وہ خود بہت جلد اپنے کام کی تکمیل کر لیں گے۔ یہ مہوش سے ہونے والی آخری گفتگو تھی جس کے بعد انہوں نے مہوش سے کہہ دیا تھا کہ اب وہ ان سے ملاقات نہ کرے، ان کے اور مہوش کے درمیان فاصلہ ہونا چاہیے تاکہ کسی کو ان کے رابطے کی خبر نہ ہو۔ بھیر ستر فاروق بیگ صاحب کو فوراً یہ احساس ہو گیا کہ کیسٹ پر ریکارڈ شدہ گفتگو ان کی گردن میں پھاسی کا پھندا ڈالنے کے لیے کافی ہے۔ اکبر حسین کے ہاتھ میں پتول موجود تھا اور صبح معنوں میں بھیر ستر فاروق بیگ کا بلڈ پریشر اس وقت بہت ہائی ہو گیا تھا، ان کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔

اکبر حسین صاحب کچھ دیر انہیں دیکھتے رہے پھر ملاقات آئینہ لہجے میں بولے۔

”بھیر ستر صاحب! آپ اپنے پیٹے سے واقف ہیں؟ وکالت کرتے ہیں آپ ان پریشان حال لوگوں کی جو اپنی مشکلات کا حل آپ کے پاس تلاش کرنے آتے ہیں۔ بے گناہوں کو مصیبت سے بچانے والے ایک شخص کا کردار اتنا گھناؤنا ہوتا ہے تو آپ کا کیا خیال ہے اس کے بارے میں؟ آپ نے میرے خلاف سازش تیار کی۔ بد قسمتی سے وہ آپ ہی کی گردن کا پھندا بن گئی۔ آپ کو یہ سن کر نہایت افسوس ہوگا کہ آپ کی ساری چالیں آپ ہی کی حرکتوں کی وجہ سے ناکام ہو گئی ہیں۔ لیکن میں آپ کا ایک لحاظ سے شکر یہ بھی ادا کرتا ہوں کہ آپ نے میری آنکھیں کھول دیں۔ مجھے یہ احساس دلایا کہ خون بہہ رہا حال خون ہوتا ہے اور میں نے ساری زندگی غلط فیوض میں گزار دی ہے اور اپنی انجمنی غلط فیوض نے مجھے ساری کائنات میں تباہ کر دیا ہے۔ میرے سوچنے کا انداز غلط تھا۔ بھیر ستر صاحب! آپ نے اس انسانی کونج راستہ دکھا دیا ہے، لیکن بہت برے انداز میں۔ آپ کو یہ سن کر نہایت افسوس ہوگا کہ وہ لڑکی مہوش جو آپ کی بیٹی کی دوست تھی، آپ کی بیٹی ہوئی سازش کے تحت جب میرے پیچھے شاہ میر حسین کی رہائش گاہ پر گئی تو وہاں شاہ میر کا دوست منصور بھی موجود تھا۔ آپ کی بد قسمتی سے منصور مہوش کا کلاس فلورہ چکا تھا۔ دونوں ایک دوسرے سے متاثر بھی تھے لیکن حادثہ زمانہ نے انہیں کالج سے لگنے کے بعد یہ مہلت نہ دی کہ وہ پھر ایک دوسرے سے

ملتے۔ وہاں مہوش کی ملاقات منصور سے ہوئی اور مہوش کو ظلم ہوا کہ منصور، شاہ میر کا دوست ہے۔ مہوش کے ضمیر نے ملاقات کی اور اس نے پوری کہانی منصور اور شاہ میر حسین کو سنا دی۔ دونوں ششدر رہ گئے۔ شاہ میر کی دل اور میری بھانج، وہ عورت جسے میں نے ہمیشہ غلط گناہ سے دیکھا ہے داستان سن کر تڑپ گئی۔ حالانکہ میں نے ان لوگوں کے لیے ہمیشہ برے انداز میں سوچا تھا۔ اس نے مہوش ہی کی موجودگی میں اپنے بیٹے سے سوال کیا کہ کیا وہ اس سازش میں حصہ لگا تو شاہ میر نے قہقہہ لگا کر کہا کہ تو کیری کی تلاش کرنے اور اس مشکل زندگی کو گزارنے میں جو حصہ ہے، وہ کسی کو گل کر کے اس کی دولت پر قبضہ جمانے میں نہیں ہے۔ اور پھر وہ شخص جس کے خلاف سازش کی جارہی ہے اس کا اپنا خون ہے، اپنا تانا بوتا..... وہ اس کے لیے زندگی دے تو سکتا ہے، اس کی زندگی لے نہیں سکتا۔ یہ مشرقی عورت کی، ایک مسلمان، ایک پاکستانی عورت کی حریت تھی اپنی اولاد کے لیے دونوں بچے بھیر دزدگاری کا شکار ہو کر جرم کی دنیا کی طرف جارہے تھے لیکن ان کے ضمیر زندہ تھے۔ شاہ میر اس لیے میرے پاس نہیں آیا کہ نہیں میں نے نہ سمجھوں کہ وہ اس سازش کا انکشاف کر کے مجھ سے کچھ مراعات حاصل کرنا چاہتا ہے۔ لیکن اس نے اپنے دوست منصور کو پوری تفصیل بتا کر میرے پاس بھیجا اور مجھے ہوشیار کیا کہ میں فاروق بیگ کی سازش کا شکار نہ ہوں۔ جو باتیں مجھے بتائی گئیں وہ وہی تھیں۔

”یعنی میں نے اپنی دولت فرسٹ کرنے کی وصیت کی تھی آپ کو۔ ساری کہانی میں اس قدر سچائی تھی کہ کہیں بھی جھوٹے کا کوئی عنصر نہیں تھا۔ چنانچہ میں اپنی بھانج اور پیچھے سے ملا اور اپنے خون کو میں نے گلے لگا لیا جس نے میرے خلاف سازش میں حصہ لینے کے بجائے میرے لیے زندگی تلاش کی۔ میں نے اپنی بھانج سے معافی مانگی اور اپنے بھائی کی موت پر ہلکا ہاتھ آسنا بہائے۔ غلط فیوض وصل گئیں اور میں نے آپ کو اس سازش کی سزا دینے کا فیصلہ کر لیا۔ جناب بھیر ستر صاحب! لوگ اپنی نیت سے دولت کماتے ہیں وہ اس قدر احمق نہیں ہوتے کہ آپ جیسے لوگوں کی سازشوں کا شکار ہو جائیں۔ وہ سازش آپ پر الٹ دی گئی۔ مہوش اس میں براہ کرم شریک تھی۔ ہم سب مل کر کام کر رہے تھے کیونکہ مجھے معلوم ہوا تھا کہ آپ نے مہوش سے ایک ایسی خیر لے لی ہے جس کے تحت آپ اسے کسی جرم میں ملوث کر سکتے ہیں چنانچہ اس کا توڑ بھی ضروری تھا۔ نتیجے میں مہوش سے آپ کی آخری ملاقات کے وقت مہوش کو ایک

چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈر دیا گیا تھا جس میں اس نے آپ کی وہ تمام آواز ریکارڈ کر لی اور اس کے بعد بالآخر آپ یہاں تک پہنچ گئے۔ غالباً آپ کو یہ تفصیل بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ اس کے بعد کیا کیا ہوا البتہ آپ کی اس حرکت نے بلاشبہ میری زندگی بڑھادی ہے۔ جسے ساری عمر کی تنہائی کے بعد کچھ اپنے دل چاہیں تو اس کی زندگی میں اضافہ کیوں نہ ہوگا۔ لیکن اب آپ اپنے بارے میں فیصلہ کیجیے اس سازش کے نتیجے میں آپ کو کیا کیا مصیبتیں اٹھانی پڑیں گی۔ آپ کو اس کا کچھ اندازہ ہے۔ بھیر ستر صاحب! میں نے ایک نظریہ قائم کیا ہے۔ اس نئی نسل کے بارے میں سوچیں۔ جرم کے دوسرے طریقوں سے جرائم کے خاتمے کی کوشش کی جاتی ہے، لیکن ان نوجوانوں کے لیے وہ سب کچھ مہیا نہیں کی جاسکتی جن سے انہیں زندگی گزارنے کے لیے بہترین مواقع فراہم ہوں۔ یہ پلورپ نہیں ہے جہاں جرم تفریحا ہوتا ہے۔ یہاں مجرم بد قسمتی کے سہارے قتل پاتے ہیں۔ ہاں آپ جیسے لوگ جو اس معاشرے کے اقدار کو اپنی نگاہ میں کیے ہوئے ہیں اصل مجرم ہیں، ہلاتا ہوں میں ان لوگوں کو، ملے ان سے..... آؤ تم لوگ باہر آ جاؤ۔“

اکبر حسین صاحب نے زور دار آواز میں کہا اور مہوش، منصور اور شاہ میر تینوں اندرونی صے سے باہر آ گئے۔ بھیر ستر صاحب کے بدن میں ہلکا ایک قطرہ بھی نہیں رہ گیا تھا۔ ان کے جسم کا کھونٹک ہو گیا تھا۔ تینوں نے بڑے ادب سے فاروق بیگ کو سلام کیا لیکن وہ جواب کیا دیتے، وہ تو گھر گھر بیٹھے ان کی صورت دیکھتے رہے۔

”فاروق بیگ صاحب! یہاں پولیس بھی ہو سکتی تھی لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔ آپ کی وجہ سے میری بھانج اور پیچھے بیٹھیل گئے ہیں۔ ہاں آپ کی زندگی حرام ہو سکتی ہے، اٹھیے اور میری خیر کردہ وصیت اور مہوش سے لکھوایا ہوا وہ کاغذ لے کر فوراً یہاں پہنچ جائیے۔ میں صرف ایک گھنٹا دیتا ہوں۔ اس ایک گھنٹے میں اگر آپ کی واپسی نہ ہوئی تو آپ کی آواز کا یہ کیسٹ اور چائے کا یہ پیچھل جس میں آپ نے وہ دوا شامل کی ہے، دونوں چیزیں پولیس کی تحویل میں پہنچ جائیں گی کیڑے ہو جائیں گے۔“

بھیر ستر صاحب فوراً اٹھڑے ہو گئے۔

”سنی دیر میں آپ کی واپسی ہو جائے گی؟“

”ایک..... ایک گھنٹے میں۔“ انہوں نے جواب دیا اور کار کی جانب سر ہٹ دوڑ گئے۔

غرقِ محبت

طاہر حباویہ مختل

جب جذبات میں ہلچل ہو اور دل کی دھڑکنوں میں تلاطم بہا ہو لیکن آنکھیں محبوب کا عکس قید کیے اسے ساری دنیا سے چھپا لیتا چاہتی ہوں تو ایسے میں ہزاروں سوال روح میں چھید کر دیتے ہیں... جسے یہ تحاشا چاہا جائے اور اس کی یہ خبری میں دل و جان فدا ہو جائیں تو دل سے اٹھنے والی ایک سرگوشی جیسے پوری کائنات میں ایک بھونچال لے آتی ہے... ”تم کب تک مجھ کو بھولو گے“ جسے چاہا جائے اور اپنایا نہ جاسکے... ایسی لمبی مسافت پیروں میں آبلے ڈالنے کے باوجود مسافر کو آگے بڑھنے سے روک نہیں سکتی۔ وہ بھی خود کو نہ روک پایا۔ اگرچہ چلنا محال تھا مگر ارادوں کی پختگی بنا منزل کی آس لیے چلنے پر مجبور کرتی رہی لیکن... قدرت کے اپنے ہی اصول ہوتے ہیں کچھ بھی ”یہ وجہ“ ہونے کی اس کے پاس کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ پھر کیسے اس کا سفر محبت رائگاں جاتا... کسی کے دل میں اٹھنے والا خاموش طوفان یہ ثابت کر دیتا ہے کہ محبت اپنے رستے خود بناتی ہے۔ وہ جو سارے موسم اپنے اندر سموئے محبوب کی آمد کا منتظر تھا... وہ لمحہ آیا اور ایک ہی پل میں گویا اپنی پوری زندگی جی گیا...

روح کا روح سے سیل تال اور محبتوں کے

بے مثال اور لازوال جذباتوں کی حیرانگیں و داستان



سب پر فتح ہو رہی تھی اور شام ہو لے ہو لے اپنے سر کی پر کھول رہی تھی۔ سب پر فتح ہو رہی تھی اور شام ہو لے ہو لے اپنے سر کی اور اس ہوا چلتی گئی جوں پر یکساںی ملاتے میں ریت کے ذروں کو یہاں سے وہاں لے جاتی تھی۔ اس اور اس ہوا میں ایک ساتھ جیسے..... دور بیابانوں میں بارسری کے لطیف سروں پر کوئی اجنبی سالم بکھرے لے رہا ہو، ستائے کا آن دیکھا پھیلاؤ اسے اچھا لگتا تھا۔ ستائے کی آن ہی تھیں اس کے دل کے تار چمیرتیں، اسے گدگداتی تھیں۔ تنہائی اس کی جنم بھوی تھی۔ ماں جیسی شفیق ہستی سے وہ آشنائی نہیں ہوا تھا۔ اس نے جانا ہی نہ تھا کہ باپ کا سایہ کیا ہوتا ہے؟ بہن بھائی، رشتے دار، یہ سب کچھ اس کے لیے بے معنی تھا۔ وہ جیسے تنہا آسمانوں سے پھینکا گیا تھا۔ شاید وہ کسی اور سیارے کی مخلوق تھا جو غلطی سے اس کرۂ ارض پر اتار آیا تھا۔

وہ ناشی کی طرف نگاہ دوڑاتا تو بچپن کی جو پہلی یاد اس کے ذہن میں آتی تھی، وہ بھی تھی کہ وہ ایک کھیت کے کنارے کھالے کے فٹنڈے پانی میں ہاتھ پاؤں چلا رہا ہے اور تیرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ایک احساس اسے بتاتا تھا کہ اگر اس نے ہاتھ پاؤں نہ چلائے تو وہ پانی کے اندر چلا جائے گا اور یہ اچھا نہیں ہوگا۔ اب اس بات کو بروس بیت چکے تھے۔ وہ کھالے پھر کا ایک مضبوط لوجوان تھا۔ اس کی چھائی ابھری ہوئی اور سڈول تھی۔ اس کے بازو معمول سے لیے اور مسل مضبوط تھے۔ اس کی بڑی بڑی خوبصورت آنکھوں میں جیسے ایک بے قراری سی گردش لیتی رہتی تھی۔ وہی بے قراری جو بندے کو کسی جگہ ٹکے نہیں دیتی۔ وہ بھی کہاں ٹکتا تھا۔ لاہور میں تھا تو اس نے دو تین ٹکٹے بدلے تھے۔ پھر وہ پنڈی چلا گیا۔ پنڈی میں ایک بندے سے اس کا جھگڑا ہوا۔ جھگڑے نے طول پکڑا تو وہاں سے بھی نکل آیا۔ کراچی کے ساحل نے چار سال تک اس کے پاؤں پکڑے رکھے مگر اس کی بے یقین طبع نے اسے وہاں بھی مستقل ڈیرا نہیں ڈالنے دیا۔

ہاں، تنہائی اس کی جنم بھوی تھی۔ اجنبی ستائے سے اس کا پہلا شوق تھا۔ تنہائیوں، ستانوں اور اجنبی ویرانوں کی بہترین جگہ ریکستان کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتی تھی اور اب وہ وہاں پہنچ چکا تھا۔ پچھلے چار پانچ ماہ سے وہ چولستان میں تھا..... ترنڈا کا ایک قریبی گاؤں منڈ بھیرو اس کا مسکن تھا۔ پنڈی کے ایک پرانے دوست نے کراچی میں اسے دیکھ لیا تھا اور اپنے ساتھ منڈ بھیرو لے آیا تھا..... اور اب پچھلے ڈیڑھ دو ماہ سے وہ اس کے ساتھ اس کے تہا شدہ مگر کی

جیت تھیر کرنے میں اس کی مدد کر رہا تھا۔

ہاں تو سہ پہر فتح ہو رہی تھی اور شام ہو لے ہو لے اپنے سر کی پر کھول رہی تھی۔ وہ ایک ریتیلی پہلے پر نیم درواز دور افتادہ ستانوں سے اٹھنے والی بارسری کی غم انگیز آواز سن رہا تھا۔ اس نے نشیب میں دیکھا جہاں پانی ذخیرہ کرنے والے وسیع تالاب نما جو بڑا پانی سورج کی روشنی میں ٹٹکارے مار رہا تھا۔ اس نے ایک جیب دیکھی جو دھول اڑاتی، تیزی سے تالاب کے پاس سے گزر رہی تھی پھر اچانک کچھ مجب ہوا۔ تیز رفتار جیب نے ایک دو بھگولے کھائے۔ بری طرح لہرائی پھر ایک خوفناک منظر سامنے آیا۔ جیب نے باقاعدہ قلابازی کھائی اور ایک زبردست چمپا کے کے ساتھ پانی میں جا گری۔ وہ آڑی گری تھی، اس کے دونوں مقبض پیچھے نظر آ رہے تھے لیکن پھر دیکھتے ہی دیکھتے سہ دونوں پیچھے بھی اوچھل ہو گئے اور صرف پچھلا پھر اور اسکرین وغیرہ ہی پانی سے باہر ہو گئے۔

آس پاس کوئی نہیں تھا بلکہ دور دور تک کوئی ڈی فیس نظر نہیں آتا تھا۔ دلاور نے دائیں بائیں دیکھا۔ اس نے جیب اٹھنے وقت دور سے مدھم سی نسوانی بیچ بھی سنی تھی۔ وہ اٹھا اور کسی چھلاوے کی طرح بے ساختہ ڈھلان پر دوڑتا چلا گیا۔ اس کے چوڑے مضبوط پاؤں جیسے ریت پر بھجور سے بنا رہے تھے۔ تالاب تک تقریباً 100 میٹر کا فاصلہ تھا جو اس نے آٹا فافا لے کر ایک اور ایک جست لیتا ہوا پانی میں کود گیا۔ وہ اس تالاب کی گہرائی سے واقف تھا۔ آڑی تر بھی جیب اب مکمل طور پر پانی میں ڈوب چکی تھی۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید ہاتھ پاؤں مار کر وہ جاتا لیکن وہ لہروں کا شکار تھا، پانی میں اترا اور اس سے لڑتا جاتا تھا۔ اس نے سانس باہر نکالی اور دوسرے بارہ فٹ نیچے چلا گیا۔ ایک لڑکی کے بال اس کے ہاتھ میں آئے۔ وہ اسے کھینچتا ہوا پانی سے باہر لے آیا اور کنارے پر ڈال دیا۔ لڑکی چند سیکنڈ سے زیادہ پانی میں نہیں رہی تھی مگر مکمل طور پر بے ہوش تھی۔ اس کی بے ہوشی کی وجہ اس کے سر پر لگنے والی کوئی چوٹ تھی۔ وہ خوبصورت تھی اور فیشن ایبل لباس میں تھی۔ لگتا تھا کہ شہر کی رہنے والی ہے۔

شاید دلاور ابھی کچھ دیر مزید اسے دیکھتا رہتا مگر وہ جانتا تھا کہ ابھی کم از کم ایک فرد اور پانی کے اندر ہے۔ اس نے دوبارہ پانی میں جست کی اور غوطہ کھجی تک پہنچ گیا۔ دروازہ مکمل جانے سے لڑکی تو خود بخود پانی میں گر گئی تھی مگر اس کا سامی ابھی تک جیب میں پھنسا ہوا تھا۔ اس

غریب محبت

کروں نے اور روی کی مست کر دینے والی ہوا نے انہیں حسین ترین بنا دیا تھا۔

وہ ٹھنک کر چمکے بٹا، اس کا دل اتنی شدت سے دھڑک رہا تھا کہ لگتا تھا پھلپلاں تو ڈر کر باہر نکل آئے گا۔ مدھوش کی سی کیفیت تھی لیکن اس کے اندر سے ایک طرح کی طاقت کا احساس بھی نمودار ہو رہا تھا۔ وہ ایسا تو نہیں تھا، پھر اس سے یہ کیسے ہوگا؟

اچانک اسے خیال آیا کہ چھٹ کے فاصلے پر وہ لوجوان بھی اوجھل پڑا ہے جسے اس نے موت کے منہ سے نکالا ہے اور جس کو ابتدائی طبی امداد کی فوری ضرورت ہے۔ وہ پلٹا اور اس لوجوان پر جھک گیا۔ اس کے پیٹ اور پیچھڑوں میں یقیناً پانی بھرا ہوا تھا۔ وہ اس کی کمر پر ہاؤ ڈال کر اس کے اندر سے پانی نکالنے لگا۔ کافی پانی نکلا۔ تب اس نے اسے سیدھا کیا اور اس کے دل کی دھڑکن سننے کی کوشش کی دھڑکن بہت مدھم تھی، جیسے کسی اتھاہ کنویں میں پانی بکھرے لے رہا ہو۔ وہ اس کے سینے پر ہاؤ ڈال کر دل کو پپ کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ بے ہوش لوجوان کے جسم میں حرکت پیدا ہوئی۔ اس کو کھانسی کا شدید دورہ پڑا، پھر اس نے دو لٹائیں کھیں..... وہ زندگی کی طرف لوٹ رہا تھا۔ دلاور کی مسلسل کوشش نے شرف نہیں رہی تھی۔ اس دوران میں خورہ لڑکی بھی ہوش میں آ چکی تھی۔ وہ خالی خالی نظروں سے ارد گرد دیکھ رہی تھی پھر اس کی نگاہ بے ہوش لوجوان پر پڑی۔

”شاہ زمان..... شاہ زمان!“ وہ چلائی ہوئی آغوش اور اس سے لپٹ گئی۔ وہ اس کے پیچھے بالوں میں اگھایاں چلا رہی تھی۔

دلاور نے حوصلہ کر کے لڑکی کو مخاطب کیا۔ ”میزم! آپ حوصلہ رکھیں۔ یہ جلد ہوش میں آ جائیں گے..... یہ دیکھیں..... ان کی پلکوں میں حرکت ہو رہی ہے۔“

”اوہ گاڈ..... پر کیا ہو گیا ہمارے ساتھ۔“ لڑکی بھی اپنے ساتھی کی طرف اور بھی اس تالاب کی طرف دیکھتی تھی جہاں ان کی جیب پانی کے اندر گئی تھی۔ کچھ دیر بعد لوجوان کے حواس بھی بحال ہونے لگے۔ وہ بھی پچھی آنکھوں سے تالاب کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے جسم پر کچھ چوٹیں آئی تھیں لیکن چہرے پر کوئی ایسا خاص نشان نہیں تھا۔ دلاور کو لڑکی کا نام سوبرا معلوم ہوا۔ اس نے جدید تراث کی شلوار قمیض پہن رکھی تھی۔ اس کو جو واحد چوٹ لگی تھی وہ اس کے سر پر تھی۔ تین کی طرف ایک کو مڑ بن گیا تھا جس میں سے خون بھی رس رہا تھا۔

نے سیفی بیٹ بھی لگا رکھی تھی۔ دلاور نے دیکھا کہ اس کی گردن ایک طرف ڈھلک چکی ہے اور آنکھیں بند ہیں، وہ شدید خطرے میں تھا۔ دلاور نے اس کی سیٹ بیٹ کھولنے کی کوشش کی مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ بیٹ بری طرح بکلیں میں پھنسی ہوئی تھی۔ بکلی کو تو ذکر یا بیٹ کو کٹ کر ہی اس شخص کو آزاد کرایا جاسکتا تھا۔ یہ لمبے اس شخص کی زندگی کے لیے بڑی قیمتی تھے۔ دلاور کا سانس سینے میں گھٹنا شروع ہو گیا۔ اگر وہ تازہ سانس لینے کے لیے سرخ آب پر چلا جاتا تو پھر شاید رہ جاتا۔ وہ پانی میں ہی رہا اور دیوانہ وار سیٹی بیٹ سے اچھٹا رہا۔ آخر مجبور ہو گیا۔ دلاور کے زور لگانے سے بالکل کچھ ٹوٹ گیا اور بے ہوش شخص اس جان لیوا بندش سے آزاد ہو گیا۔ دلاور نے اسے کھینچ کر جیب سے نکالنے کی کوشش کی۔ جیب کے اٹنے سے اسٹیرنگ کا اینگلی ایسا ہو گیا تھا کہ وہ شخص بہ آسانی ڈرائیونگ سیٹ سے جدا نہیں ہو پا رہا تھا۔ دلاور نے کسی نہ کسی طرح یہ مشکل بھی آسان کی اور اس شخص کو اپنے ساتھ کھینچتا ہوا سرخ آب پر لے آیا۔ قریباً چھ منٹ بعد، پچھڑی ہوئی ہوا دیوانہ وار اس کے پیچھڑوں میں دھکی اور اس کے جسم و جاں میں پھر سے زندگی دوڑ گئی۔

اس نے ارد گرد نگاہ دوڑائی، دور دور تک کوئی دکھائی نہیں دیا۔ بس درخت اور ریتیلی زمین کے نشیب و فراز تھے۔ وہ بے ہوش لوجوان کو اپنے ساتھ کھینچتا ہوا کنارے پر لے آیا اور لٹا دیا۔ تب اس کی نگاہ دوبارہ خورہ لڑکی پر پڑی۔ اس کی قمیض جھک کر اس کے جسم سے چمک گئی تھی۔ بال متحرک تھے اور پھٹکی لٹل بل کھا کر ایک رخسار کو ڈھانچے ہوئے تھیں۔ سورج کی ترنہ کی روشنی اس چہرے کو کچھ یوں منور کر رہی تھی کہ وہ دیکھتا ہی چلا گیا۔ کچھ لمبے بڑے انقلاب آفریں ہوتے ہیں۔ ان میں صدیوں کی وسعت ہوتی ہے اور کوئی ایسی توانائی ہوتی ہے جو پلک جھپکتے میں پوری زندگی کا احاطہ کر لیتی ہے۔ یہ بھی کوئی ایسی ہی سامئیں تھیں۔ دلاور سب کچھ بھول بھال کر اس چہرے کو دیکھتا چلا گیا۔ کوئی نا دیدہ کشش تھی جو اسے اس چہرے کے بالکل قریب لے گئی۔ اس قدر قریب کہ وہ سانسوں کی آہٹ تک محسوس کرنے لگا۔ وہ جب سوئی جا گی سی کیفیت تھی۔ اسے اتنا یاد تھا کہ وہ بے ساختہ آگے کو جھکا تھا۔ پھر کیا ہوا، کیسے ہوا، سب کچھ ایک سحر انگیز دھندلے میں چھپا ہوا تھا۔ اس نے ان ہونٹوں کو اپنے ہونٹوں سے چھوا تو شاید دنیا میں سب سے حسین ترین تھے۔ یا پھر وہ سب سے حسین ترین نہیں تھے لیکن اس جادو کی ماحول نے، سورج کی ان ترنہ

اسی دوران میں قریبی گولڈ سے بہت سے لوگ بھاگتے ہوئے جانے حادثہ پر پہنچ گئے۔ ان لوگوں کو کبریاں چرانے والے ایک چودہ پندرہ سالہ لڑکے نے حادثے کی اطلاع دی تھی۔ آغا خان شاہ زمان اور سورا کو ایک اونٹ گاڑی پر بٹھا کر گولڈ میں ایک ڈیرے پر پہنچا دیا گیا۔ پاؤں کی شدید چوٹ کی وجہ سے شاہ زمان کو چلنے میں سخت دشواری محسوس ہو رہی تھی۔

گولڈ کا چودھری ”رجیم سامیں“ شاہ زمان کے بڑے بھائی کو اچھی طرح جانتا تھا۔ فوری طور پر ان کو طبی امداد دی گئی۔ سورا کو ڈیرے سے تھوڑی دور ایک حویلی کے زنان خانے میں بھجوا دیا گیا۔ سورا کی ایک کھانسی پر گہری خراش دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے علاوہ بھی چھوٹی موٹی خراشیں تھیں لیکن شاہ زمان کی حالت پتلی تھی۔ اس کا ایک بازو نہیں مل رہا تھا، جبکہ گلنے کے قریب گھبرا ڈھم آیا تھا۔ اس زخم کی وجہ یہ تھی کہ جب اگلے وقت یہ پاؤں بریک پینڈل میں پکس کیا تھا۔

رجیم سامیں نے فوری طور پر گاؤں کے ماہر کیاؤنڈر کو بلایا اور اپنے سامنے شاہ زمان کے گلنے اور بازو کی ڈریسنگ کروائی۔

رات آٹھ بجے کے لگ بھگ ڈیرے پر دو چیمیں آکر کھڑی ہوئیں۔ اُنہیں سے دھڑا دھڑ لوگ اترنے لگے۔ وہ سب کے سب رات تھے۔ ان کی قیادت کرنے والا بھر فضل تھا۔ بھاری تن و دوش، گہری گندری رنگت، سفید چھدری ڈاڑھی اور سر پر مخصوص چولستانی پکڑی۔ وہ سیدھا شاہ زمان کے پاس آیا۔ شاہ زمان نیم دراز تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر شاہ زمان کو اپنے ساتھ لگا یا اور ساتھ پڑی کرسی پر بیٹھ کر بولا۔ ”دھی رانی تو ٹھیک ہے نا؟“

”ہاں چاچا! وہ ٹھیک ہے، بس معمولی چوٹ آئی ہے۔“ وہ غمازت سے بولا۔

”گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ تو بھر شر ہے۔ میں نے چپ پانی میں سے لگوائی ہے۔ اپنے بندے مارچوں کی روٹی میں گندی کا سائے کر رہے ہیں۔ ایک ٹائر میں ہوا نہیں ہے۔ کبھی کوئی فائر شاز تو نہیں لگا؟“

”نہیں چاچا! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“

”تو پھر ہوا کیا ہے؟“

”بس قسمت میں یہ چوٹیں لگی تھیں۔ اسپید تھوڑی سی تھڑکی۔ ایک کھڑے کی وجہ سے چپ اچھلی اور کنٹرول سے باہر ہو گئی؟“

”جتنے کتنے دفعہ کہا ہے پتر! گڈی کو گڈی سمجھا کر ہوا کا گھوڑا نہ سمجھا کر۔“ وہ اپنی بھاری مونچھوں پر ہاتھ پھیر کر بولا۔ اسی دوران میں اس کی نگاہ قریب کھڑے دلاور پر پڑی۔ دلاور بڑے دھیان سے ساری کھٹکوں پر ہاتھ پڑا۔

”یہ منڈا کون ہے؟“ بھر فضل، دلاور کو بغور دیکھ کر بولا۔

”نہی تو ہے چاچا۔ جس نے ہم دونوں کو موت کے منہ سے نکالا ہے۔“ شاہ زمان نے جذباتی لہجے میں کہا۔

”کیا نام ہے تمہارا۔۔۔۔۔ اور کہاں کے رہنے والے ہو؟“ بھر فضل کا لہجہ اچانک نرم پڑ گیا۔

”دلاور نام ہے جی۔۔۔۔۔ میں منڈ بھیرو۔۔۔۔۔ میں رہتا ہوں۔“

”یہاں کے تو نہیں گلتے۔ کہاں سے آئے ہو؟“ بھر فضل نے پوچھا۔

”میرا دوست مجھے کراچی سے یہاں لایا ہے۔ چند مہینے سے یہاں اس کا مہمان ہوں۔“

اسی دوران میں ڈیرے کا مالک رجیم سامیں اپنے مسلح کارندوں کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ بھر فضل نے کھڑے ہو کر اس سے معافہ کیا اور اچھے الفاظ میں اس کا شکریہ ادا کیا۔

رجیم سامیں نے کہا۔ ”بچوں کی جان بچ گئی ہے، اس سے بڑی خوشی کی بات اور کوئی نہیں اور اس خوشی میں سے یہ خوشی بھی نکلے ہے کہ آپ لوگ ہمارے قریب خانے پر تشریف لائے ہیں۔ یہ بڑے بخت کی بات ہے۔“

رجیم سامیں اور بھر فضل ساتھ ساتھ بیٹھے۔ ان کے بیٹھنے کے ساتھ ہی میزوں پر کھانا جن دیا گیا۔ بھر فضل کے بے حد اٹکار کے باوجود انہیں کھانے کی دعوت قبول کرنا پڑی۔ شاہ زمان کی طبیعت ابھی پوری طرح بحال نہیں تھی۔ اس نے بس چند تھپتھپے لینے پر اکتفا کیا۔ کھانے کے دوران میں جب دلاور کو ٹیکہ دے کھانا دیا جانے لگا تو شاہ زمان نے منع کر دیا اور اسے اپنے برابر میں بٹھا کر کھانا کھلایا۔

شاہ زمان خاموش تھا مگر تھوڑی تھوڑی دیر بعد بڑی عجیب نگاہوں سے دلاور کی طرف دیکھتا تھا۔ ان نگاہوں میں احسان مندی کے رنگ لہریں لیتے تھے اور احسان مندی کیوں نہ ہوئی۔ جان بچانے والا تو اللہ ہوتا ہے لیکن جو کچھ دلاور نے کیا تھا، شاید کوئی اور نہ کر سکتا۔ چپ تو عمل ڈوب چکی تھی۔ وہ اپنی جان کی پروا کیے بغیر گھر سے فوٹے میں گیا تھا اور سخت کوشش کر کے پہلے سورا اور پھر اسے نکال لایا تھا۔ اگر اس کا سانس ٹوٹ گیا ہوتا تو پھر۔۔۔۔۔ شاید

عزری مصیبت

اپنے احسان مند میزبانوں کے ساتھ چلے پر رانی ہو گیا۔ منڈ بھیرو کے جنوب مغرب میں تقریباً بیس کلومیٹر کے فاصلے پر یہ ایک ریگستانی گاؤں تھا۔ ”چوڑیو“ نامی اس گاؤں کی خاص بات وہ خوبصورت گلستان تھا جو ریگستانی پٹی کے ساتھ ساتھ چودہ پندرہ کلومیٹر تک چلا گیا تھا۔ وہاں مال موٹی جرتے تھے۔ قریب بیس بیس آزادانہ گھومتی تھیں اور خاص قسم کی بھڑی تھیں جن کے منہ سفید ابلے اور جسم پر خوبصورت چمکے دھبے سے تھے۔ قریب ایک ہزار نفوس پر مشتمل یہ ایک خوبصورت گاؤں تھا۔ بڑے سامیں کی قریب پانچ ایکڑ پر پھیلی ہوئی حویلی مظاہر دور کے کسی قلعے کی یاد دلاتی تھی۔ بلند فصیلیں، تین فٹ چوڑی دیواریں، اصلیل، نایاب گولڈوں کے جتے، دو کوہانی سفید اونٹ، شکاری کتے، چھیل چھیلی ملازماؤں کی چھل چھل، دست بستہ ملازموں اور ہر کاروں کی فون۔۔۔۔۔ دلاور نے یہ شاندار حویلی دیکھی اور بس دیکھتا رہ گیا۔

درحقیقت دلاور کے پاؤں سے بگولے بندے ہوئے تھے۔ وہ آزاد مریج رکھتا تھا۔ کسی ایک جگہ تک کر رہتا شاید اس کے لیے ممکن ہی نہیں تھا۔ دوسرے نفلوں میں وہ کسی بندن میں نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ شتر بے مہار تھا۔ اسی لیے اس نے پٹری چھوڑا، اسی لیے شہر لاہور کے گھس بنہور، جو بہت سوں کو بکڑ کر منطوق کر دیتے ہیں، اس کا راستہ نہ روک سکے، اسی لیے شاید وہ کراچی کے ساحل کی گیلی ریت کو پاؤں سے دھکیلا ہوا وہاں سے بھاگ نکلا۔

اور اب وہ یہاں اس حویلی میں تھا۔ منڈ بھیرو سے چلنے وقت دلاور نے اپنے دوست مہانی کو بھی اپنے ساتھ لے جانے کی خواہش ظاہر کی تھی اور مہانی بھی اس کے ساتھ ہی یہاں پہنچا تھا۔ بھر فضل تو حویلی میں داخل ہوتے ہی اپنے دو گن میں لے کر حویلی کے جنوب کی طرف چلا گیا۔ شاہ زمان اس عظیم الشان عمارت میں داخل ہوتے ہی سرتاپا ”بڑا سامیں“ نظر آنے لگا تھا۔ اس کے استقبال کے لیے بہت سی خواتین کھڑی تھیں۔ اس کی کرسی جب برآمدے میں رکھی گئی تو وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ شاہ زمان کا رنگ گورا، بال ہلکے، بھوس موٹی اور آپس میں ملی ہوئی تھیں۔

چوڑے جڑے اس کی سخت حرا می کو غابر کرتے تھے۔ وہ لنگڑا ہوا خواتین کی طرف بڑھا۔ سب سے پہلے آگے بڑھ کر جس عورت نے اس کا ہاتھ چاا، وہ ادھیر مرزا پا صوفیہ تھی۔ سب انہیں بڑی آ پا کہتے تھے۔ وہ شاہ زمان کے بڑے بھائی شاہ فرمان کی سب سے بڑی بیوی تھیں۔ وہ

تالاب سے تین لاشیں ہی نکلتیں۔

بھر فضل کھانے سے فارغ ہو کر بھر فضل نے سارا سارا لیا اور موہاں فون پر شاہ زمان کے بڑے بھائی شاہ فرمان کو خیر خبریت کی اطلاع دی اور بتایا کہ وہ لوگ جب کوئی الحال نہیں پر چھوڑ رہے ہیں تاکہ اسے چلنے کے قابل بنایا جاسکے۔ اس کے بعد بھر فضل اور شاہ زمان نے رجیم سامیں کا پھر شکریہ ادا کیا اور سورا کو بلوانے کا کہا۔

سورا کا نام سن کر یکبارگی دلاور کا دل زور سے دھوک اٹھا۔ تھوڑی دیر بعد جب سورا بڑی سی چادر میں لپیٹی لپٹائی باہر برآمدے میں آئی تو بھر فضل نے آگے بڑھ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور بولا۔ ”جیوندی رہو مہی رانی۔“

سورا نے سر جھکا کر پیار وصول کیا۔ اسی دوران میں کریم کرکری بھولدار چادر میں لپیٹی ہوئی سر و قد سورا نے ذرا ترمیمی نظر سے دلاور کی طرف دیکھا۔ یہ نظر پیچھے کسی دورے کی طرح دلاور کے سینے سے آ رہا ہو گئی۔ وہ بس ”ایک“ نگاہ ہی تھی۔ اس کے بعد وہ لوگ جتنی دیر وہاں کھڑے رہے، سورا بے لگال لائق رہی۔

وقت و رخصت رجیم سامیں نے مٹھائی کے دو بڑے بڑے قاتل بھر فضل کو پیش کیے اور صدقے کے طور پر ایک کالے بکرے کی قربانی ان کے سامنے کی۔

شاہ زمان کو کرسی پر بٹھا کر دو کارندوں نے اٹھالیا۔ جب میں بیٹھنے سے پہلے شاہ زمان نے ایک کارندے سے کہا۔ ”دیکھو، دلاور کہاں ہے؟“

دلاور جب کپ کی دوسری جانب کھڑا تھا۔ کارندہ دلاور کو بلالایا۔

شاہ زمان دلاور کو خاموشی سے دیکھتا رہا۔۔۔۔۔ پھر جیسے وہ کسی نتیجے پر پہنچ گیا۔ بیٹھے لہجے میں بولا۔ ”دلاور! اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو ہمارے ساتھ چلو۔ دو چار دن حویلی میں ہمارے مہمان رہو۔ تمہارے ساتھ کچھ وقت گزار کر ہم سب کو بہت اچھا لگے گا۔“

دلاور کے کانوں میں جیسے شادیانے سے بج اٹھے۔ ایک بار پھر وہی چہرہ اور وہی ہونٹ اس کی آنکھوں کے سامنے آ گئے۔ وہ کیا لہجے سے؟ وہ کیا جاود تھا؟ وہ سب کچھ کیوں ہو گیا تھا؟ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ کوئی متناہیں ساتھ تھا جو اپنی بے پناہ طاقت سے اسے اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔۔۔۔۔ اور اس کی قمتا کے عین مطابق اسے چلنے کی دعوت دی گئی تھی۔

اس نے پہلے تو تھوڑی سی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیا، پھر

دلاور کو ایک باوقار اور نہایت زیرک عورت لگیں۔ ایک ایسی خاتون جس نے بہت دکھ سہہ کر اور زمانے کا بہت سا "سرگرم" دیکھ کر اب اپنی زندگی کے لیے مناسب راستے ڈھونڈ لیے ہوں۔

انہوں نے دراز قد شاہ زمان کے دونوں کندھوں پر ہاتھ پھیرا اور بولیں۔ "آپ صدمہ تو کھینچتے تو تھے؟"

شاہ زمان بولا۔ "بڑی آپا! خدا کا شکر ہے، اس نے نئی زندگی دی ہے ہم دونوں کو۔"

بڑی آپا نے شاہ زمان کے سر پر ہاتھ پھیرنے کے بعد سویرا کو گلے سے لگالیا۔ وہ بچپن کے ساتھ رونے لگی۔ دلاور قافلے پر کھڑا یہ سب دیکھ رہا تھا۔ اس کی نگاہ جتنی بار بھی سویرا پر پڑی تھی، بس وہیں جم کر رہ گئی تھی۔ اسی دوران میں حویلی کی دیگر خاتون آگے بڑھ کر سویرا اور شاہ زمان کی بلا لگیں لیتے لگیں۔ دلاور کو ابھی تک معلوم نہیں ہوسکا تھا کہ سویرا اور شاہ زمان کا آپس میں کیا رشتہ ہے؟

اسی دوران میں شاہ زمان نے دلاور کو اشارے سے اپنے پاس بلا لیا اور بڑی آپا کو بتایا کہ کبھی وہ بندہ ہے جس کے ویسے آج ان دونوں کی جان بچ پائی ہے۔ بڑی آپا نے دلاور کو سر تا پا دیکھا پھر بڑے شائستہ انداز میں اس کے لیے شکر ہے اور اعریف کے الفاظ ادا کیے۔ بڑی آپا نے دلاور کی طرف دیکھ کر شاہ زمان کے کان میں ایک دو سرگوشیاں بھی کیں۔

دلاور اور ملتان کو بڑی محبت کے ساتھ مہمان خانے کے ایک شاندار کمرے میں ٹھہرایا گیا۔ ان کی میزبانی میں کسی طرح کی کوئی کسر اٹھانیں نہ تھی۔ ملتان خوش خوراک تھا۔ موجودہ صورت حال اس کے لیے بہت اطمینان بخش تھی۔ ملتان کو اخبار پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ کھانے والی اشیاء کے اشتہار وہ خاص رجعت سے دیکھتا تھا۔ ویسے وہ پانچ چھ جماعتیں ہی پڑھا تھا۔ اس کے برعکس دلاور نے بیچ تان کر ایف اے پاس کر رکھا تھا۔ وہ صرف کھانے کے اشتہاروں کے لیے اخبار نہیں دیکھتا تھا بلکہ اسے پڑھتا بھی تھا۔

اگلے روز ملتان حویلی میں تھوڑا سا گھوما پھرا۔ اس نے ملازمین سے باتیں کیں اور تھوڑی بہت سن گن بھی لی۔ اسے پتا چلا کہ شاہ زمان کے بڑے بھائی شاہ فرمان نے چار شاویاں کر رکھی ہیں۔ اس کی سب سے بڑی بیوی آپا صوفیہ اور سب سے چھوٹی جو حال ہی میں بیاہی گئی ہے، شاہدہ کے نام سے جانی جاتی ہے۔ شاہ زمان حالانکہ چھوٹا ہے مگر کبھی اسے بڑا سا مین کہا جاتا ہے اور وہ اس لیے کہ وہ

بڑے بھائی سے زیادہ قائل اور سمجھدار ہے۔۔۔۔۔ اور چوڑی رو کے لوگ اس کی بے پایاں صلاحیتوں کی وجہ سے اسے ہی بڑا سمجھتے ہیں، جبکہ اصل بڑا یعنی شاہ فرمان زیادہ تر نشے میں غرق رہتا ہے۔ شاہ زمان کے بارے میں ملتان کو معلوم ہوا کہ وہ ابھی تک غیر شادی شدہ ہے لیکن جلد ہی اس کی شادی رچنے والی ہے۔

شام کے وقت دلاور نے کمرے کی کھڑکی میں سے باہر کی طرف دیکھا۔ وہاں شاہ زمان کھڑا تھا۔ نئی پاؤں کی وجہ سے اس نے ہاتھ میں دو انگلی ایک تمام رکھی تھی۔ اس کے قریب وہی ماہ رخ، پری بیکر تھی جس نے پلک جھپکتے ہی دلاور کے دل کی دنیا زیر و زبر کر ڈالی تھی۔ ہاں وہ سویرا تھی۔ لمبے بال کر تک چارے تھے، ریشمی اوڑھنی ان بے بہا لباسوں کو سنبھالنے میں ناکام تھی۔ وہ شاہ زمان سے بات کر رہی تھی۔ شاہ زمان مونچھوں پر انگلی پھیر رہا تھا اور بڑی پرجوش نظروں سے سویرا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ شرانے والے انداز میں مسکراتی اور پھر مگر پھر کر سنبھلاؤں کی کیماری کی طرف متوجہ ہو گئی۔ ایک خاص دلچسپی اس کے نقوش میں۔

دلاور کے دل میں جیسے ایک کانٹا سا چبھ گیا۔ تو کیا سویرا ہی وہ لڑکی تھی جس سے شاہ زمان کی شادی کی تیاری ہو رہی تھی؟ وہ بے ساختہ سویرا کی طرف دیکھتا چلا گیا۔ آس پاس کا سارا منظر جیسے فیڈ آؤٹ ہو گیا۔ اس کے سامنے بس وہ دلکش سر میں مورتی رہ گئی جو کسی بات پر مسکرا رہی تھی۔ اس کی مسکراہٹ اس کی مجموعی خوبصورتی کی طرح لا جواب تھی۔ اس نے سوچا۔۔۔۔۔ بے پناہ خوبصورت لوگوں کی فہمی بھی ایسی ہی لا جواب ہوتی چاہیے۔ اچانک اس نے خود کو اس "فرائس" میں سے نکالا۔ یہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا تھا؟ وہ ایسا تو نہیں تھا؟ وہ تو کسی کی بھی پروا نہیں کرتا تھا۔ پھر یہ کیا منہ زور چہرہ تھا جو اسے اپنے ساتھ بھانے چلا جا رہا تھا۔ یہ کیسی کشش تھی جو اس کے وجد کی مٹائیں سمجھ رہی تھی؟

شاید کچھ محاطات انسان کے بس میں ہی نہیں ہوتے۔ کچھ بے پناہ لمحے ایسے ہوتے ہیں جو انسان کو بے بس کر دیتے ہیں۔ کچھ احساسات، جن کی ڈوریاں دستِ فیض سے حرکت میں آتی ہیں۔

سویرا آسمان پر چمکتا ہوا چاند تھی اور دلاور زندگی کے صحرائی اڑنے والاریت کا ایک ڈوہ۔ وہ چوڑی رو کی امیر زادی تھی اور وہ مگر مگر گھوٹے والا بنجارا جسے اپنی ابتدا، اپنے ماضی کا بھی علم نہیں تھا۔ انجانے میں ایک جذبہ تھا جو

شرقی مہبت

دلاور کے دل میں مو پا چکا تھا۔ انسان کے اندر کوئی بھی تبدیلی رونما ہوتی ہے تو اس کا ادراک سب سے پہلے خود اسی کو ہوتا ہے۔ دلاور کچھ چکا تھا، کوئی بہت بڑی تبدیلی احساسات میں آ چکی ہے۔

یہ دوسری رات کی بات ہے، وہ ایک لمحے کے لیے بھی سو نہ سکا۔ بیڈروم بہت شان دار تھا۔ ملتان نے مرغ پلاؤ اور خالص دودھ کی کھیر بہت سیر ہو کر کھائی تھی۔ اب وہ سویرا کا رچھہ اوندھے منہ پڑا خزانے لے رہا تھا مگر دلاور کی آنکھوں سے نیند روکھ چکی تھی۔ وہ جونہی آنکھیں بند کرتا، دو گلابی ہونٹ اس کی آنکھوں میں جھلکاتے اور وہ ایک جھپکے سے اٹھ بیٹھتا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے بھی یہی ہوا تھا، وہ اچانک بستر سے اٹھ بیٹھا تھا۔ اس نے سبک سر مر کی تپائی سے جگ اٹھایا، پانی گلاس میں ڈالا اور ایک ہی بار میں پی گیا۔ اسے گرمی محسوس ہونے لگی، دل گھبرانے لگا۔ وہ بیڈ سے اترتا، ہولے سے دروازہ کھولا اور باہر نکل آیا۔ رات کا شاید پچھلا پھیرا تھا۔ مشرق کی طرف سے ہلکی سحرانی ہوا چل رہی تھی۔ وہ صحن میں آیا۔ یہاں زنانے اور مردانے حصے کے درمیانی احاطے میں ایک طرف دو جوہلے لگے ہوئے تھے۔ اس سے آگے کافی وسیع گراسی لان تھا جہاں انواع و اقسام کے پھول اور پھل دار پودے تھے جن میں سے زیادہ تر جنوبی پنجاب سے منگوا کر یہاں لگائے گئے تھے۔

لان کے اقتضام پر اینٹوں کی سونگ دالا ایک اور احاطہ تھا جہاں چھینیں اور دیگر گازیان کھڑی کرنے کے لیے جگہ بنائی گئی تھی۔ اس سے آگے ملازمین کے رہائشی کوارٹرز تھے۔ کوارٹرز کی پائیں جانب زنانے حصے کی دمنزلہ عمارت تھی جو درختوں کے پیش منظر میں آدمی چھین، آدمی ظاہر ہو رہی تھی۔ اسی عمارت کی بالائی منزل کے کچھ کمروں میں مدیم روٹی تھی جو بیش قیمت پردوں سے چھن چھن کر باہر آ رہی تھی۔ اس نے سوچا ایسے ہی کسی کمرے میں سویرا سو رہی ہوگی۔ وہ بے حس شخص سوتے میں کیسا لگتا ہوگا؟ کیا حسن کے سونے کا انداز بھی حسین ہوتا ہے؟ ایک بار پھر وہی دو لب۔۔۔۔۔ تھوڑے سے فم۔۔۔۔۔ تھوڑے سے گرم اس کے تصور میں آن دھمکے۔ اس نے سوچا اگر اس وقت تالاب کے کنارے، کوئی اسے یہ حرکت کرتے دیکھ لیتا تو کیا ہوتا؟

اس نے جبر جمری سی لی اور خیالات کے نرٹھے سے باہر آنے کی کوشش کرنے لگا۔ چہل قدمی کرتا ہوا وہ ملازمین کے کوارٹرز سے آگے چلا گیا۔ وہاں مجبوروں کے بہت سے درخت تھے۔ وہ ابھی

دلاور کے دل میں مو پا چکا تھا۔ انسان کے اندر کوئی بھی تبدیلی رونما ہوتی ہے تو اس کا ادراک سب سے پہلے خود اسی کو ہوتا ہے۔ دلاور کچھ چکا تھا، کوئی بہت بڑی تبدیلی احساسات میں آ چکی ہے۔ یہ دوسری رات کی بات ہے، وہ ایک لمحے کے لیے بھی سو نہ سکا۔ بیڈروم بہت شان دار تھا۔ ملتان نے مرغ پلاؤ اور خالص دودھ کی کھیر بہت سیر ہو کر کھائی تھی۔ اب وہ سویرا کا رچھہ اوندھے منہ پڑا خزانے لے رہا تھا مگر دلاور کی آنکھوں سے نیند روکھ چکی تھی۔ وہ جونہی آنکھیں بند کرتا، دو گلابی ہونٹ اس کی آنکھوں میں جھلکاتے اور وہ ایک جھپکے سے اٹھ بیٹھتا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے بھی یہی ہوا تھا، وہ اچانک بستر سے اٹھ بیٹھا تھا۔ اس نے سبک سر مر کی تپائی سے جگ اٹھایا، پانی گلاس میں ڈالا اور ایک ہی بار میں پی گیا۔ اسے گرمی محسوس ہونے لگی، دل گھبرانے لگا۔ وہ بیڈ سے اترتا، ہولے سے دروازہ کھولا اور باہر نکل آیا۔ رات کا شاید پچھلا پھیرا تھا۔ مشرق کی طرف سے ہلکی سحرانی ہوا چل رہی تھی۔ وہ صحن میں آیا۔ یہاں زنانے اور مردانے حصے کے درمیانی احاطے میں ایک طرف دو جوہلے لگے ہوئے تھے۔ اس سے آگے کافی وسیع گراسی لان تھا جہاں انواع و اقسام کے پھول اور پھل دار پودے تھے جن میں سے زیادہ تر جنوبی پنجاب سے منگوا کر یہاں لگائے گئے تھے۔ لان کے اقتضام پر اینٹوں کی سونگ دالا ایک اور احاطہ تھا جہاں چھینیں اور دیگر گازیان کھڑی کرنے کے لیے جگہ بنائی گئی تھی۔ اس سے آگے ملازمین کے رہائشی کوارٹرز تھے۔ کوارٹرز کی پائیں جانب زنانے حصے کی دمنزلہ عمارت تھی جو درختوں کے پیش منظر میں آدمی چھین، آدمی ظاہر ہو رہی تھی۔ اسی عمارت کی بالائی منزل کے کچھ کمروں میں مدیم روٹی تھی جو بیش قیمت پردوں سے چھن چھن کر باہر آ رہی تھی۔ اس نے سوچا ایسے ہی کسی کمرے میں سویرا سو رہی ہوگی۔ وہ بے حس شخص سوتے میں کیسا لگتا ہوگا؟ کیا حسن کے سونے کا انداز بھی حسین ہوتا ہے؟ ایک بار پھر وہی دو لب۔۔۔۔۔ تھوڑے سے فم۔۔۔۔۔ تھوڑے سے گرم اس کے تصور میں آن دھمکے۔ اس نے سوچا اگر اس وقت تالاب کے کنارے، کوئی اسے یہ حرکت کرتے دیکھ لیتا تو کیا ہوتا؟

اس نے جبر جمری سی لی اور خیالات کے نرٹھے سے باہر آنے کی کوشش کرنے لگا۔ چہل قدمی کرتا ہوا وہ ملازمین کے کوارٹرز سے آگے چلا گیا۔ وہاں مجبوروں کے بہت سے درخت تھے۔ وہ ابھی

☆☆☆

مشرقی ہاں نما کرے گا تھا۔ بیش قیمت قالین، شاندار مسمری، دلکش فانوس، کنوئیں پر بھاری کاہار پروے۔ سویرا گرمیوں کے ہلکے ہلکے لباس میں تھی۔ وہ مسمری کے پاس ہی غالیچے پر آلتی پالتی مارے بیٹھی تھی۔ اس کی بھانجی زادہ رشا، مسمری پر یوں بیٹھی تھی کہ اس کے پاؤں سویرا کی گود میں تھے۔ سویرا اس کے پاؤں کے ناخنوں پر کیونٹس لگا رہی تھی۔

ریشا نے کہا۔ ”یہ بندہ کوئی نئی شے ہی لگتا ہے۔ کل میں نے اسے زمان بھائی کے ساتھ پانیچے میں گھومتے دیکھا تھا۔ لگتا تھا کہ بی بی وی کی کسی سیریل سے کوئی پینڈو ہیرا لٹھ کر ہماری حویلی میں چلا آیا ہے۔“

”تو تیرے کیا ارادے ہیں؟“ سویرا نے ذرا شوخی سے کہا۔

”اگر تیری طرح میرے گلے میں بھی معنی والی ری نہ ہوتی تو ہوسکتا تھا میں اسے..... تین لفظ بول دیتی۔ وہ“

”حاجہ انداز میں بولی۔

”ہائیں، تین لفظ؟“ سویرا نے آنکھیں لٹکائیں۔

”یعنی شادی سے پہلے ہی اسے طلاق طلاق کہہ دیتیں۔“

”رف بھی تین لفظ نہیں ہوتے۔ آئی تو یو بھی تو تین لفظ ہوتے ہیں۔“ ریشا نے کہا اور شرمانے کی اداکاری کرنے لگی۔

”دو لفظ نہ تیرا..... اور تیری عقل کا بھی۔“ سویرا نے اطمینان سے کہا۔

”اور تیری عقل بھی کوئی آسمان کو نہیں چھو رہی۔ یہ طلاق والا لفظ عورتیں نہیں بولیں۔ انہیں کچھ کہنا ہی پڑے تو بھرکتی ہیں۔ طلع..... طلع..... طلع.....“

”اچھا کیوں بند کر رہی۔“ سویرا نے قدرے بیزاری سے کہا۔

ریشا نے مسمری چھوڑی اور دھبے سے سویرا کے سامنے غالیچے پر آ بیٹھی۔ سویرا کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ ”میں تجھے ایک بات بتانا تو بھول ہی گئی۔“

”کیا؟“

”میں کل بچن سے کل رہی تھی کہ راجا جک بڑی آپا کی آواز کان میں پڑی۔ وہ تمہاری شادی کی بات کر رہی تھی، بے جے بی جے۔“

”کیا کہہ رہی تھیں؟“ سویرا نے نظریں جھکائے

کہا تھا..... اور وہ یہ سب کچھ بتا بھی کیسے سکتا تھا؟ یہ تو ایک ایسا سنہری راز تھا جسے وہ زندگی کی آخری سانس تک اپنے سینے میں چھپا کر رکھنا چاہتا تھا۔

گفتگو کے دوران میں سویرا نے اچانک کہا۔

”دلاور! کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم ہمارے ساتھ یہاں اس حویلی میں ہی رہو۔ شاہ زمان صاحب کوئی بھی مناسب کام تمہارے اور ملتان کے ذمے لگا سکتے ہیں؟“

کل شاہ زمان نے بھی اس سے کئی جلدی بات کی تھی مگر دلاور کوئی جواب نہ دے پایا تھا۔ پتا نہیں کیوں اس حوالے سے اس کی دلی کیفیت کچھ عجیب سی تھی۔ کبھی تو اس کا دل

چاہتا تھا کہ اس حویلی کو اور اس میں ”رہنے والی کو“ ایک پل کے لیے بھی اپنی گاہوں سے اوصل نہ ہونے دے..... اور

کسی وقت دل میں آتا تھا کہ کہیں دور بھاگ جائے اور پھر بھول کر بھی ان راہوں پر قدم نہ رکھے جو اسے اس حویلی کی

طرف اور اس کے کینوں کی طرف لٹکائیں۔ اب بھی وہ سویرا کو کوئی ٹھوس جواب نہ دے پایا اور صرف اتنا کہا کہ ان کی

مہربانی کا بہت شکریہ۔ وہ اس بارے میں سوچتے گا۔

ملازمہ گفتگو ناشتے کے برتن اٹھا کر چلی گئی۔ کچھ دیر بعد سویرا بھی اپنے سٹل فون پر کال سنتی ہوئی باہر نکل گئی۔

دلاور اور ملتان وہیں بیٹھے رہے۔ ملتان کو یہاں جو کچھ کھانے کو مل رہا تھا، اس نے اس کی ساری سوچیں اس کے حوصلے

میں جمع کر دی تھیں۔ وہ آج کل جیسے دماغ سے نہیں حوصلے سے سوچ رہا تھا۔ اس نے دلاور کو گردن سے پکڑ کر ذرا

جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔ ”اوائے نا چھارہ کیوں عزت کی روزی روٹی کو لات مار رہا ہے۔ دو گلے کے لوگ نہیں ہم اور

یہاں ہمیں سر آٹھوں پر بٹھایا جا رہا ہے۔ اگر یہ لوگ آخر کر رہے ہیں تو مان جا۔ اگر کچھ زیادہ نہ کہی ہو تو ان کا چپٹا

ملازمہ تو ضرور بن جائے گا تو..... اور چپیتے ملازموں کو یہ ڈٹے لوگ اپنی جان سے لگا کر رکھتے ہیں۔“

دلاور جیسے ملتان کی بات سن ہی نہیں رہا تھا۔ وہ کھوئے کھوئے انداز میں حویلی سے آگے، درختوں سے

پرے..... مشرق کی جانب اس دشت کو دیکھنے لگا جسے مقامی لوگ روہی کہتے تھے۔ ان ریٹیلے راستوں پر تندہ ہوا میں

گشت کرتی تھیں۔ گرم جھوکوں کی چش میں ایک بے نام سی اداسی اور تپ مچھی رہتی تھی۔ یہ ہوا میں اجنبی سانسوں کی

کوکھ سے جتن جتن تھیں..... اور اجنبی سانسے..... اس کا پہلا عشق تھے۔ اب یہ بے وجود عشق ایک بوسے کی مثل اختیار

کر رہا تھا، ایک چہرے میں ذہل رہا تھا۔

سپینس ڈائجسٹ

جون 2017ء

گھومتے ہو۔“

وہ کچھ عجیب سا گیا۔ اسی دوران میں سویرا نے چائے کا کپ اس کی طرف بڑھایا۔ وہ بڑی احتیاط سے کپ

سویرا کے ہاتھ سے لیتے ہوئے بولا۔ ”نہیں..... پہلے وہ چارون مشکل پیش آتی ہے، پھر میں عادی ہو جاتا ہوں۔“

سویرا کی تیز نگاہیں دلاور کی حرکات و سکنات کو بغور دیکھ رہی تھیں۔ وہ کچھ نرس سا ہونے لگا۔ اپنی گھبراہٹ کو

دور کرنے کے لیے اس نے بیڑوم کی طرف رخ کر کے ملتان کو آواز دی۔ اس دوران میں سویرا نے ایک جیم کی

طرف ہاتھ بڑھایا تو اس کی کلائی میں ہفت رنگ چوڑیاں کھٹکتا گئیں۔ وہ ایک سلاکس پر جیم لگاتے ہوئے بولی۔

”دلاور! تم کچھ پریشان نظر آتے ہو؟“

”نہیں..... نہیں..... ایسی تو کوئی بات نہیں۔“

سویرا نے ملازمہ سے کہا کہ وہ بیڑوم سے ملتان کو بلا لائے۔ ملازمہ جو بھی کرے سے نکل، سویرا تھوڑا آگے ہوئی

اور اس نے نہایت بے لنگھی اور احماد سے اپنا ہاتھ دلاور کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ بڑے جذباتی لہجے میں بولی۔ ”تھیک ہو

ویری بیچ دلاور! تم نے ہم دونوں کی جان بچا کر ہم پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ بچانے والا تو جیک اور پر بیٹھا ہے مگر وہ

بچانے کا کام اپنے ہی بندے کو سونپتا ہے نا۔“

دلاور کا سارا وجود جیسے اس نرم و نازک ہاتھ کے بوجھ تلے دبا ہوا تھا۔ اس کا دل چاہا، گھڑیاں ختم جائیں، وقت

رک جائے..... اور وہ اسی مہرباں بوجھ تلے بزار ہے۔ اس نے سویرا کی بات کا جواب دیتے ہوئے بے مشکل کہا۔ ”میں

کسی قابل نہیں ہوں سویرا بی بی! بس اوپر والے نے مجھ سے یہ کام لیتا تھا، لے لیا.....“

سویرا کی کینٹی پر آئی تک ایک چھوٹی سی بیڈنچ موجود تھی۔ وہ بے دھیانی میں اپنی اس چوٹ کو سہلاتے ہوئے

بولی۔ ”جب جیب پانی میں گری، تم اس وقت کہاں تھے؟“

دلاور نے اسے تفصیل سے سب کچھ بتایا۔ کیسے اس نے جیب کو کھرا تے اور زوردار آواز سے پانی میں گرتے دیکھا۔

کیسے وہ پانی میں اترا، غوطہ کھایا، دونوں کو باہر لانے کے لیے اس نے کیا کیا کوشش کی۔ اس نے سب کچھ بتایا مگر ان

جادوئی لمحوں کے بارے میں کچھ نہیں بتایا جب اس نے سویرا کو بالکل سیدھا، ریت پر لیٹے دیکھا تھا..... اس کی

نگاہیں، اس کے دلکش چہرے پر ہر ہست ہو کر رہ گئی تھیں اور پھر وہ کچھ ہوا تھا جس کا اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ وہ ارد گرد

کی ہر چیز کو فراموش کر کے اس کے بے شکل چہرے پر ہر جگہ

اپنی جگہ چھوڑ دی۔ مہمان خانے میں پہنچا تو ملتان جاگ چکا تھا اور اس کی غیر حاضری پر بے حد پریشان دکھائی دے رہا تھا..... دلاور کو دیکھتے ہی بولا۔ ”کہاں غائب ہو گئے تھے؟“

”میں ذرا چہل قدمی کے لیے نکلا تھا۔ پیٹ میں اینٹن سی ہو رہی تھی۔“

ملتان بولا۔ ”کہنا تو میں ڈٹ کر رکھتا ہوں اور اینٹن جہارے پیٹ میں ہونے لگتی ہے۔“

”نیکو تو بچی دوستی کا ثبوت ہے۔“ دلاور نے ہنسنے پر کرتے ہوئے کہا۔

ملتان تو تھوڑی دیر باتیں کرنے کے پھر بعد سو گیا مگر دلاور جاگتا رہا۔ اس کا ذہن بار بار تہ خانے والے واقعے کی

طرف جارہا تھا۔

صبح دلاور کے لیے بے حد خوبصورت تھی۔ بیڑوم سے نکل کر جب وہ نشست گاہ میں آیا تو سویرا ایک ملازمہ

کے ساتھ ایک چھوٹی ٹیبل پر بیٹھا لیے بیٹھی تھی۔ چہرہ پرسوں رات سے بھی زیادہ چارہ اور روشن دکھائی دیتا تھا۔ یوں لگتا

تھا جیسے وہ دودھ اور میدے سے نہا کر نکلے ہوئے ملازمہ ہو چکے کرناشتے کی چیزیں ترتیب سے میز پر رکھ رہی تھی۔ سویرا

جھمکتے سے بیٹھی مسکرا رہی تھی۔ اب تک کے مشاہدے میں دلاور نے نوٹ کیا تھا کہ سویرا نہ صرف پڑھی لکھی اور روشن

خیالات والی لڑکی ہے بلکہ کافی حد تک صاف گو اور بے تکلف بھی ہے۔ بے شک حویلی کا ماحول جاگیردارانہ رنگ

ڈھنگ کا تھا مگر سویرا اپنے طبع سے لے کر اپنی بول چال تک بالکل ماڈرن لگتی تھی۔

”ہلو مسٹر دلاور۔“ وہ دلکش انداز میں مسکرائی۔

”جہار اوت کیا کر رہا ہے؟“

دلاور کا دل یکبارگی اسے طرح دھڑک اٹھا۔ وہ کتنی بے تکلفی سے اسے مخاطب کر رہی تھی۔ وہ مودب انداز میں

اس کے سامنے بیٹھ گیا اور بولا۔ ”سویرا بی بی! آپ کی مہمان نوازی کا بہت شکریہ لیکن..... آج رات میں.....

ایک پل کے لیے بھی نہیں سکا۔“

وہ تھوڑی پریشان ہوئی۔ ”کیوں؟ کوئی مسئلہ تھا؟“

وہ کہنا چاہتا تھا..... سب سے بڑا مسئلہ تو آپ ہیں سویرا بی بی..... لیکن کہ نہیں سکا۔ ”اصل میں مجھے نی جگہ نیند

نہیں آتی۔“ اس نے نگاہیں جھکاتے ہوئے کہا۔

”پھر تو تمہیں بڑی مشکل پیش آتی ہوگی..... میرا مطلب ہے، تم نے خود ہی بتایا ہے کہ تم شہر اور بستی بستی

جھکائے پوجھا۔

”دل میں لٹو چھوٹے لگے ہیں نا..... دیکھو دیکھو ذرا..... میری سوتیلی سہیلی کا کھڑا کیسے لال گلابی ہوتا جا رہا ہے۔“

”اپنی چوچ بند کر اور اگر کوئی بات ہے تو بتا۔“

”بڑی آپا، بے بے بے جی سے کہہ رہی تھیں۔ وڈے بھاشا (شاہ فرمان) نے کہا ہے، دبیر میں بہت سے کاروباری مسئلے ہیں، زمینوں کے ٹھیکے وغیرہ دینے ہیں اور بھی کئی کام ہیں، شاہ زمان کی شادی دبیر کے بھائے اکتوبر میں ہی رکھ لی جائے۔“

سویرا کے دودھیا چہرے پر اب واقعی سرفی دودھنی۔ یہ شرم کی سرفی تھی۔ اس کا سر جیسے بے ساختہ جھک گیا۔

رمشا خاموشی سے اسے دیکھنے لگی پھر اس نے ایک گہری سانس لی اور ایک دم بخود ہوتے ہوئے بولی۔ ”سویرا! تمہیں یقین ہے کہ شاہ زمان تمہیں بہت چاہتا ہے؟“

”اس میں کوئی شک نہیں۔“ سویرا نے بھی سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔

”تم شہر کی بڑی لکھی لڑکی ہو۔ شاہ زمان بھی کوئی ان پڑھ نہیں ہے لیکن جو کچھ بھی ہے، وہ زمینداری والا ذہن رکھتا ہے۔ یہاں جو بلی کا ماحول بھی تم سے کوئی ڈھکا چھپا نہیں ہے۔“

”کیا کہنا چاہتی ہو؟“

”اس کے مزاج کو اور یہاں کے رسم و رواج کو بدل پاؤ گی؟“

”ارادہ تو مضبوط ہے۔“ وہ ہلے سے مسکرائی۔

رمشا کچھ دیر خاموشی سے اسے دیکھتی رہی پھر بولی۔ ”اور اگر..... کچھ غلط ہو نا شروع ہو گیا تو؟ میرا مطلب ہے..... شلالا..... اگر..... دو چار سال بعد..... اپنے بزرگوں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے شاہ زمان نے بھی.....“

سویرا نے اس کا جملہ مکمل نہیں ہونے دیا اور تیز لہجے میں بولی۔ ”نہیں رمشا! میں نے کہا ہے نا کہ ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ زمانہ بدل گیا ہے..... جو بلی بھی بدل رہی ہے۔ ہمیں ابھی کی امید رکھنی چاہیے اور یہ امید میرے اندر موجود ہے۔“

”لیکن..... فرض کرو..... ایسا ہو گیا تو..... کچھ عرصے بعد تم سے شاہ زمان کو بانٹنے کے لیے کوئی اور آگئی تو؟“

”جہیں کہا ہے نا کہ ایسا نہیں ہوگا۔ اگر ہو گیا تو سب کچھ ختم ہو جائے گا۔“ شاید سویرا کچھ اور بھی کہتی لیکن اسی دوران میں کہیں پاس سے وڈے بھاشا فرمان کی بھاری

پھر کم آواز سنائی دی اور دونوں لڑکیاں جیسے ڈر کر خاموش ہو گئیں۔

☆☆☆

دلاور بہت بے چینی میں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جو کچھ اس کے سینے میں پھنس رہا ہے، وہ کسی بھی صورت میں ہونٹیں سکنا۔ وہ محلوں میں پلنے والی شہزادی کی، وہ ایک بے نام بے ہنر بے کار انسان تھا۔ ان کا کیل ہوتا بھی تو کیسے؟ اس نے اس کی جان بچائی تھی، وہ اس کی عزت کرنی تھی، اسے خاص اہمیت دینی تھی مگر یہ کوئی فطری توجہ نہیں تھی کہ وہ اس کی محبت میں گرفتار ہو جاتی۔ اپنی فطرتی ترداد جی اور اس کے ساتھ کھیتوں کھلیوں میں محبت کی چٹائیں بڑھانے لگتی۔ کسی وقت وہ سوچنے لگتا تھا کہ جو بھی شاہ زمان کا دس واہیں آئے گا، وہ اس سے سیدی سیدی بات کرے گا اور اس سے جانے کی اجازت طلب کرے گا۔

کسی وقت اس کے دماغ میں وہ تہ خانے اور کھڑی کے ڈبوں والے مناظر بھی پکرانے لگتے تھے۔ اس کا فطری تجسس بیدار ہوتا اور وہ سوچنے لگتا کہ وہ کیا تھا۔ اب بھی رات کا دوسرا پہر چل رہا تھا اور وہ انہی سوچوں میں کم مہمان خانے کے دست پر آدھے میں پکرا رہا تھا۔ اس کے قدم جیسے بے ساختہ اس تہ خانے کی طرف اٹھ گئے۔ ابھی وہ تہ خانے سے کافی فاصلے پر ہی تھا کہ اسے دو پرچھائیاں بڑی تیزی سے محبت پر حرکت کرنی نظر آئیں۔ یہ یہاں کے پہریدار تو نہیں ہو سکتے تھے۔ انہیں اس طرح بھانسنے کی کیا ضرورت تھی۔ اچانک تہ خانے کی بیڑھیوں کی طرف کوئی بلند آواز سے لگا رہا۔ ”اوئے..... کون ہو تم..... کون ہو.....“ اس کے ساتھ ہی ایک فائر کی آواز آئی۔ تاریکی میں شعلہ سا چمک کر رہ گیا۔ آٹھویں راتل کا فائر ایک زبردست ہنگامے کی شروعات ثابت ہوا۔ ایک دم ہی جیسے جو بلی کا سناٹا چٹکا چور ہو گیا تھا۔ بھاگو دوڑو کی آوازیں آئیں، دروازے دھڑ دھڑائے، کھڑکیاں کھلیں، بلب روشن ہوئے اور پھر جیسے کھرام سا بج گیا۔ ایک دم ہی اندھا دھند فائرنگ ہونے لگی۔

دلاور نے خود کو ایک چوکور ستون کی اوٹ میں کر لیا۔ ہر طرف چنگاریاں سی بھڑ رہی تھیں۔ اسٹیل کی طرف گھوڑے جھپٹا رہے تھے اور رکوالی کے کتے شور مچا رہے تھے۔ ملانی بھاگتا ہوا باہر نکلا۔ وہ بدحواس بھیننے کی طرح مین کوئیوں کی زد میں جا رہا تھا۔ دلاور نے عقب سے اس کی نہیں کا کارڈ پوچھا اور کھارک ایک چٹائی پر پھینک دیا۔

شرعی محبت

ملانی ہراساں آواز میں بولا۔ ”یہ کیا ہو رہا ہے دلاور؟“

”برات روانہ ہو رہی ہے تیری..... دیکھ نہیں رہا، فائرنگ ہو رہی ہے۔ سر نیچے رکھ۔“ آخری الفاظ دلاور نے چار کر کہے اور خود بھی ستون کی اوٹ میں سٹ گیا۔

چند گولیاں سنسناتی ہوئی ان کے بالکل پاس سے گزریں۔ ایک ایک شخص بھاگتا ہوا آیا اور اندھے منہ ان سے دس پندرہ فٹ کے فاصلے پر گرا۔ دلاور نے پہچان لیا۔ یہ جو بلی کا ہی ایک کارندہ تھا۔ گولی غالباً اس کی کمر میں لگی تھی اور وہ گرتے ہی بے حرکت ہو گیا تھا۔

وہ جس جگہ پڑا تھا، وہاں اسے کسی بھی وقت مزید گولیاں لگ سکتی تھیں لیکن اسے وہاں سے ہٹانا بھی آسان نہیں تھا۔ ہٹانے والا براہ راست گولیوں کی زد میں آ جاتا۔ آخر دلاور کی فطری دلیری نے اسے ہمیز کیا۔ وہ ستون کی اوٹ سے نکلا اور جھک کر..... اور ایک کر، مضروب تک پہنچ گیا۔ اس نے اس کا ایک بازو پکڑا اور کھینچا ہوا محفوظ آڑ میں لے آیا۔

یہی وقت تھا، جب جبر فضل بھی اپنا کانپتا دہاں پہنچ گیا۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹی نال والی راتل تھی اور آٹھویں شعلے برسا رہی تھیں۔

”شاباش دلاور! تم نے بڑی بہت دکھائی۔ ورنہ یہ مارا جاتا۔“ اس کا اشارہ زخمی کارندے کی طرف تھا۔

”یہ کیا ہو رہا ہے فضل صاحب؟“ دلاور نے پوچھا۔

”حضور چاندیو کے بندے کھس آئے ہیں۔“ حرا حرا دے پکیرہ لینے آئے ہیں۔ پکیرہ تو ان کو ملے گا ایسا کہ ساری زندگی یاد رکھیں گے۔“

اسی دوران میں دو کارندے زخمی کارندے کو اٹھا کر مہمان خانے کے اندرونی کمروں کی طرف لے گئے۔ جو بلی کا خاص کارندہ شیر و دوڑتا ہوا آیا۔ اس کی راتل کی نال سے دعوں خارج ہو رہا تھا۔ بھاری بھر کم چہرہ جھٹایا ہوا تھا۔ وہ تہ خانے کی طرف سے آیا تھا۔ اس نے جھٹائے چہرے کے ساتھ جبر فضل کو اطلاع دی۔ ”پکیرہ کو کچھ نہیں ہوا تھی۔ وہ پکیرہ بیڑھیوں تک تو آ گئے تھے مگر اندر نہیں جا سکے۔“

دو گولیاں شیر و کے بالکل قریب دیوار پر لگیں اور بہت سا پائترو اکھڑ کر برآمدے کے فرش پر جا گرا۔

شیر و نے دانت پس کر ایک گلابی دی اور جوابی فائرنگ کرتا ہوا آگے نکل گیا۔ جبر فضل نے بھی اپنے کارندوں کو اشارہ کیا۔ انہوں نے برآمدے کے آخری سرے پر جا کر مختلف جگہوں پر پوزیشنیں لے لیں۔ اسی

دوران میں جبر فضل کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ اس نے کال ریسیو کی..... پھر گرج کر بولا۔ ”حضور چاندیو کے بندے ہیں۔ آج ان بدعاشوں کو ایسا حرا دے چکا دو پھر بھی ایسی جرأت نہ کریں۔“ وہ بات کرتا ہوا اور دیوار کی آڑ لیتا ہوا آگے نکل گیا۔

دلاور کم مہم کھڑا تھا۔ حضور چاندیو، تہ خانہ..... پکیرہ..... یہ سب کچھ گورکھ دھندا تھا۔ اچانک اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ کہیں کھڑی کے ان ڈبوں میں پکیرہ یعنی پرنے تو بند نہیں تھے۔ ڈبوں میں سوراج تھے اور اس رات دلاور کو ایک ڈبے سے پھر پھڑا ہٹ بھی سنائی دی تھی۔ اگر یہاں کسی پرنے کے کی بات ہو رہی تھی تو پھر وہ کیا ہو سکتا تھا؟ نہیں یہ کوئی باز یا عقاب قسم کی چیز تو نہیں تھی؟ اسے معلوم تھا کہ یہ زمیندار وڈیرے باز عقاب اور شاہین وغیرہ کے شکار کے شوقین ہوتے ہیں۔

اچانک دلاور کو بالائی منزل سے چلانے کی آواز آئی۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ بالائی برآمدے میں اسے بڑی آ پا دکھائی دیں۔ وہ ایک حملہ آور پرچھائی تھیں اور اس سے راتل چھیننے کی کوشش کر رہی تھیں۔ راتل بردار نے ہٹا کر بڑی آ پا کو زور سے دھکا دیا۔ وہ بیڑھیوں سے لڑھکتی ہوئی کئی فٹ نیچے گر گئیں۔ یہ سٹریکٹر اور نے بھی دیکھا تھا اور جس نے دیکھا تھا، وہ کٹھن سے دیوانہ ہو کر حملہ آور پر جھپٹ پڑا تھا اور یہ جھپٹنے والا کوئی اور نہیں تھا سویرا تھی۔ وہ شیرنی کی طرح اس ”حملہ آور“ پر آئی جس نے بڑی آ پا کو دھکا دیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں اس کی تھی۔ اس نے یہ ہاکی پورے زور سے حملہ آور کی کلائی پر ماری۔ اس کے ہاتھ سے راتل چھوٹ کر جھنگے سے ٹکرانی اور پھر نیچے احاطے میں جا گری۔ سویرا نے دوسرا حملہ آور کے سر پر کیا۔ یہ دار حملہ آور نے اپنے ہاتھوں پر روکا اور سویرا سے ہاکی چھیننے کے لیے اس سے ٹکرم کھا ہوا گیا۔ دلاور نے یہ سٹریکٹ کیا تو اپنی جگہ کھڑا نہ رہ سکا۔ وہ یہ سب کچھ کیسے دیکھ سکتا تھا۔ دیکھ ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ تو اس کی جان تھی۔ اس کی رگوں میں لہو بن کر دوڑ رہی تھی۔ سانس بن کر اس کے سینے میں چل رہی تھی۔ وہ برآمدے میں اندھا دھند بھاگتا ہوا بیڑھیوں تک پہنچا۔ کئی گولیاں اس کے آس پاس سے گزری ہوں گی لیکن اسے کچھ پتا نہیں چلا۔ وہ بیڑھیاں پھلتا ہوا بالائی برآمدے میں آ گیا۔

جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا، حملہ آور کی ایک کلائی ٹوٹ گئی تھی۔ حملہ آور سویرا سے ہاکی چھین نہیں پایا تھا۔ وہ

اب بے دریغ اسے پیٹ رہی تھی مگر وہ اس بات سے بے خبر تھی کہ حملہ آور کا ایک ساتھی اس کی مدد کے لیے پہنچ چکا ہے۔ اس کے ہاتھ میں قریباً نو انچ لمبے پھل کا تیز دھار چاقو تھا۔ وہ سویرا پر بھپٹ رہا تھا جب دلاور اس کے راستے میں دیوار بن گیا۔ حملہ آور نے دیوار وار ہاتھ چلایا۔ چاقو دلاور کی چھاتی کو افقی رخ پر چڑھا ہوا نکل گیا۔ ایک آتشیں کبیر سی دلاور کے سینے سے لے کر کندھے تک چلی گئی۔ پہلا وار سینے کے بعد اس نے دوسرے وار کا موقع نہیں دیا اور دشت کے عالم میں چاقو بردار کورودی کی طرح دھنک ڈالا۔ دلاور کے سر کی ایک خوفناک ضرب اپنے چہرے پر کھانے کے بعد چاقو بردار، جھنگے سے ٹکرانے کے بعد کوئی پندرہ فٹ نیچے پختہ صحن میں گر ا اور پھر بری طرح ٹنگڑا ہوا ایک طرف اداہل ہو گیا۔ فائرنگ کی شدت اب حویلی کے عقبی گیٹ کی طرف تھی اور اس صورت حال سے پتا چل رہا تھا کہ باقی حملہ آور بھی تیزی سے پسپا ہو رہے ہیں۔

سویرا نے اسی اثنا میں حملہ آور کی ایک دو ہڈیاں مزید توڑ ڈالی تھیں۔ پھر حویلی کے مسلح محافظ وہاں پہنچ گئے اور انہوں نے زخمی کو دوبو لیا۔ یہی وقت تھا جب سویرا کی نگاہ دلاور کے خون سے لت پت سینے پر پڑی۔ چاقو گہرائی میں تو نہیں گیا تھا مگر اس کے سینے کے گوشت کو چوڑائی کے رخ پر ایک طویل کٹ لگا گیا تھا۔ سویرا ملازموں کی طرف دیکھ کر پکاری۔ ”ان کو اسپتال لے جاؤ۔ جلدی کرو۔۔۔۔۔۔ بہت خون نکل رہا ہے۔“

☆☆☆

دلاور کو بہادپور کے بڑے اسپتال میں لے جایا گیا۔ وہاں اس کی چھاتی پر کافی سارے ٹانگے لگے اور خون کی ایک بوتل بھی دینا پڑی۔ اگلے روز سویرا اور شاہ زمان اس کی تیمارداری کے لیے اسپتال بھی آئے۔ یہ شاہ زمان کا اثر سورج تھا کہ اسپتال کا عملہ اور ڈاکٹرز وغیرہ اس کے سامنے نیچے جا رہے تھے۔ اس کے ساتھ مسلح گارڈز کی ایک فوج تھی۔ کچھ اسپتال کے اندر تھے، کچھ باہر۔

شاہ زمان نے مسکراتے ہوئے دلاور کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بولا۔ ”تم ہمارے لیے بڑے لگی ثابت ہو رہے ہو۔ شاید تم بروقت وہاں نہ پہنچتے تو سویرا کو کوئی نقصان پہنچ جاتا۔“

شاہ زمان کی بات پر دلاور بس اٹھات میں سر ہلا کر رہ گیا۔ اس نے یہ نہیں بتایا کہ وہ نہ صرف بروقت وہاں پہنچا تھا بلکہ اس نے سویرا کی طرف بڑھنے والا مہلک چاقو بھی

اپنی چھاتی پر جمیلا تھا۔ غالباً سویرا کو بھی پتا نہیں چل سکا تھا کہ وہاں ان لوگوں میں اصل صورت حال کیا ہوئی تھی۔ دلاور نے بات بدلتے ہوئے کہا۔ ”بڑی آپا صاحبہ کا کیا حال ہے؟“

”وہ سیزجیوں سے گر کر بے ہوش ہو گئی تھیں۔ مگر اللہ کا شکر ہے کہ تھوڑی دیر بعد ہوش میں بھی آ گئیں۔“ سویرا نے جواب دیا۔

”اللہ نے بڑا کرم کیا ہے۔“ دلاور نے بدول سے کہا۔ ”اب ہم نے تمہیں کہیں جانے نہیں دینا۔ تم واقعی ہمارے لیے بہت لگی ہو۔“ شاہ زمان نے کہا۔

”میں کس قابل ہوں گی۔“ تو آپ کی نظر کی مہربانی ہے۔“ ”اگر میں یہ کہوں کہ میں تمہیں حویلی میں کوئی ملازمت دینا چاہتا ہوں، تو تمہارا جواب کیا ہوگا؟“

”آپ مجھے جس کام کے قابل بھی سمجھیں گے میرے لیے بڑی خوشی کی بات ہو گی لیکن۔۔۔۔۔۔“

”لیکن نہیں۔۔۔۔۔۔“ شاہ زمان نے اس کی بات کاٹی۔

”لیکن کے بعد بہانہ شروع ہو جاتا ہے۔“ پھر وہ اپنی ٹھنی مونچھوں کو سہلا کر بولا۔ ”تم نے ہمارے لیے بہت کچھ کیا ہے۔ میں اب نہیں چاہتا کہ تم ہماری نظروں سے دور ہو۔“

اس نے دوبارہ دلاور کو سر تا پا دیکھا۔ جیسے نظروں میں اس کی جسمانی طاقت اور ذہنی چستی کو تول رہا ہو۔ اس کی نگاہوں میں دلاور کے لیے چاہت تو تھی لیکن اس چاہت میں مفاد اور ملکیت کا احساس بھی جھلک دکھایا تھا۔

اس کے ساتھ ایک طرح کا احسان بھی تھا۔ جیسے وہ خاموشی کی زبان میں کہہ رہا تھا۔۔۔۔۔۔ تمہاری حیثیت اور حسب نسب اس قابل تو نہیں کہ تمہیں اپنے اتنا قریب رکھا جائے لیکن چونکہ حالات نے تمہیں ہماری ایک بے مثال ”خدمت“ کا موقع دیا ہے اس لیے تمہیں برداشت کیا جاسکتا ہے۔۔۔۔۔۔ اور آگے بڑھنے کے موقع بھی دے دیے جاسکتے ہیں۔۔۔۔۔۔

وہ بولا۔ ”تم اسپتال سے ڈسچارج ہو کر سیدھے حویلی جاؤ گے۔ سمجھو یہ تمہارے لیے میرا پیارا بھرا کھم ہے۔ میں بھائی صاحب (شاہ فرمان) سے بات کروں گا۔ وہ تمہیں اور تمہارے دوست کو مستقل طور پر حویلی میں رکھنے کا انتظام کر لیں گے۔“

دلاور نے خاموش رہنے میں ہی عافیت سمجھی۔

شاہ زمان نے مختصر الفاظ میں دلاور کو بتایا کہ حویلی میں تمہیں کس قدر نگہ کرنے والے ان کی ایک مخالف پارٹی کے لوگ تھے۔ ان کو قراقرظی جواب ملا ہے۔ ان کا ایک

حلقے کے وقت سویرا کو ایک حملہ آور سے دست و گریباں دیکھا تھا اور ایک دم تڑپ سا لگتا تھا۔ اب بھی سویرا نے اپنی پیاری بابتا یا تھا تو اس کا دل جیسے کسی غم کے اندھیرے کنوئیں میں ڈوب گیا تھا۔ وہ بے تابی سے بولا۔
”سویرا! آپ اپنا دھیان رکھا کیجیے۔ آپ کمزور لگ رہی ہیں۔“

دلاور کی پریشانی سویرا سے بھی زیادہ تھی۔ وہ ایک تک ایسے دیکھتی رہی۔۔۔۔۔ بھر سکرانے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”انتا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اب ٹھیک ہوں۔ دیکھیں خود پر زیادہ دھیان دینے کی ضرورت ہے۔“ وہ کی پھر بولی۔ ”ظفر بتا رہا تھا تمہارا زخم پہلے سے بہتر ہے۔“

”جی! میں کل چل کر باہر تک بھی گیا تھا۔“ دلاور اندرونی کشش کو احتیال پر لانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ دلاور کی اندرونی کیفیت کو سویرا نے جیسے اس کے چہرے سے پڑھا تھا۔ دلاور خود میں پشیمان ہوا جا رہا تھا۔ اسی سخت کوہنٹانے کی خاطر اس نے فوراً گھٹکوار رخ پھیرنے کی کوشش کی اور بولا۔ ”سویرا! ایک بات پوچھوں، آپ بڑا تو نہیں متا میں گی؟“

”ہاں یولو۔۔۔۔۔“
”تھوڑے دن پہلے حویلی میں جو کچھ ہوا وہ سب کیا تھا؟“ سویرا ایک دم سے خاموش ہو گئی جیسے وہ اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔ دلاور جواب کا انتظار کرتا رہا، سویرا خاموش رہی تو وہ بولا۔ ”لگتا ہے۔۔۔۔۔ آپ اس موضوع کو نہیں چھیڑنا چاہتیں۔“

اس کے جواب میں سویرا نے بڑی تیزی سے لٹی میں سر ہلایا جس سے دو پٹا کھسکا اور چند نسواری زلفیں چہرے پر پھیل گئیں۔ اس نے ہاتھ سے انہیں سر پر جھلیا۔ دو پٹا سر پر سیدھا کیا اور تھوڑا مسکراتے ہوئے بولی۔ ”میں نہیں کہہ چکی ہوں۔۔۔۔۔ دوست سے کوئی بات چھپائی نہیں جاتی۔۔۔۔۔ تو میں اس پر قائم ہوں۔“

سویرا نے جھلا اور مختصر لفظوں میں جو کہانی سنائی، وہ کچھ اس طرح سے تھی کہ حویلی پر حملہ ”شوکت سیال“ نے کر دیا تھا۔ وہ رحیم یار خان کے ایک ایم پی اے حضور چانڈیو کا بھگڑی دوست تھا۔ شوکت سیال نہایت بد مزاج، منہ پٹ اور بات بات پر لڑنے مرنے پر اتار آنے والا بندہ تھا۔ اسے حضور چانڈیو کی پوری پشت پتائی حاصل تھی۔ حویلی پر حملہ ”باز“ کو چرانے کے لیے کیا گیا تھا۔ خیال

ظاہر کیا جا رہا تھا کہ وہ ”باز“ نہایت قیمتی اور تربیت یافتہ ہے۔ پولیس کے کیچھے ہی حملہ آور اپنے دوزخی ساتھیوں کے ساتھ فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے تھے جبکہ ان کا ایک ساتھی دھرا لیا گیا تھا۔ قیمتی باز محفوظ رہا تھا۔

حویلی پر حملے کا سن کر شاہ فرمان اپنی نئی ٹوپی بچی کے ساتھ فوراً کراچی سے واپس آ گیا تھا جبکہ شاہ زمین ایک دن بعد تڑا اسے واپس پہنچا تھا۔ سویرا بات مکمل کر چکی تو دلاور کا کافی سنبھل چکا تھا، بولا۔ ”سویرا! کیا یہ باز بہت زیادہ قیمتی ہے؟“

”ہاں شاید۔۔۔۔۔ سدھائے ہوئے عقاب قیمتی ہوتے ہیں۔“
”آپ کے خیال میں کیا قیمت ہوگی اس کی۔۔۔۔۔؟“ دلاور نے کہا تو سویرا نے لمبی دچکھی سے دلاور کی طرف دیکھا اور بولی۔ ”سننے میں آ رہا ہے۔۔۔۔۔ آٹھ۔۔۔۔۔ دس لاکھ کے قریب قریب ہوگی۔“

”مگر مجھے اس کے پیچھے کوئی اور کہانی ہی معلوم ہوتی ہے۔ آٹھ دس لاکھ کے باز کے پیچھے حویلی پر اتنا بڑا حملہ۔۔۔۔۔ اور آپ کے خیال کے مطابق حملہ شوکت سیال اور حضور چانڈیو نے مل کر کر دیا ہے۔۔۔۔۔ دس لاکھ ایسے لوگوں کے لیے بہت بڑی رقم تو نہیں ہے۔“

سویرا نے غور سے دلاور کی طرف دیکھا اور بولی۔ ”مجھے لگتا ہے۔۔۔۔۔ تم کسی سراغ رساں۔۔۔۔۔ فرم کے لیے کام کرتے رہے ہو۔“ لہجے میں شوخی تھی۔ آج کی سویرا اور تھوڑے دن پہلے والی سویرا میں بہت فرق تھا۔ وہ دلاور سے یوں ردائی سے باتیں کر رہی تھی جیسے اسے برسوں سے جانتی ہو یا شاید یہ کوانٹیکیشن یونیورسٹی کے ماحول کا اثر تھا۔ دلاور ہنس دیا بولا۔ ”میں تو خود آج تک کم شدہ ہوں۔ میں کسی کا سراغ کیا لگاؤں گا۔“

دن گزرنے لگے۔ ہر روز ایک نیا ہنگامہ ہوتا۔ ایک علیحدہ کہانی ہوتی۔ ایک دن سویرا اپنی ڈائری لے کر آئی۔ اس پر نثر اور شاعری کی مشق کی تھی۔ اس میں ایک آزاد نظم تھی۔

تم کب تک مجھ کو بھولو گے
اس دشت کی تنہا راتوں میں اک درد جو ظہر ہوا ہے
وہ درد بھی طینے دیتا ہے، چپ چاپ سسکیاں لیتا ہے
اک ٹیس بھی اٹھ کے کہتی ہے
تم کب تک مجھ کو بھولو گے
لحم دلاور کے دل کو چھو گئی۔ وہ ہر لمحہ اس کی گردان

غریب صحبت

کرنے لگا۔ جس ڈر نے تھوڑے دن پہلے اس کے دل میں جگہ بنائی تھی، وہ اسے بہت پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ وقت نے اسے درغلاپا تھا۔ حالات نے اسے خاموش طوفانوں سے بے خبر کر دیا تھا۔ وہ عشق کی منزل میں بڑی بے خبری سے طے کرنے لگا تھا۔ سویرا نے جو رومال اسے دیا تھا، وہ اس نے سنبھال کر رکھا تھا۔ اسے یوں لگتا تھا جیسے سویرا کی خوشبو رومال کے راستے اس کے پیچھے چھوڑوں میں داخل ہو کر اور اسے مدھوش سا کر دیتی ہے۔ پتا نہیں کیوں اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ دن بدن سویرا کے عشق میں ڈوبتا چلا جا رہا ہے۔ وہ سب کچھ جانتا بوجھتا تھا پھر بھی عشق کی بے پناہ آگ کی طرف بڑھتا چلا جا رہا تھا۔

وہ دھوپ بھرا بڑا پچھلیا ریکستانی دن تھا۔ دلاور کا کافی حد تک صحت یاب ہو چکا تھا۔ وہ بستر کی چادر درست کر رہا تھا کہ سویرا آن لگئی اس نے بے بی پنگ ٹکڑا کا سوٹ پہن رکھا تھا جس پر اسی طرح کا کیش کا ڈوپٹا تھا۔ آدھے بازو کے کناروں پر میرمن کلر کے موتی جھول رہے تھے۔ ان کپڑوں میں سویرا کا حسن قیامت ڈھا رہا تھا۔

وہ جبکہ کپڑے کی چادر درست کر دیتے ہوئے بولی۔ ”دلاور! جو کام تم کر رہے ہو، کام مگر دن میں غور میں کرتی ہیں۔“ ”میرا کوئی گھر ہوتا۔۔۔۔۔ تو شاید کوئی عورت بھی ہوتی اور اگر عورت ہوتی تو وہ چادر درست کرنے والا کام ضرور کرتی۔“ دلاور نے مسکرا کر کہا۔ ”نہی تو میں کہہ رہی ہوں۔ عورت ہے۔۔۔۔۔ کہاں؟“ وہ چادر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے شوخی سے بولی تو دلاور کا دل جیسے غمی میں آ گیا۔

وہ کچھ اور کہنا چاہتی تھی مگر خاموش ہو گئی۔ باریک دوپٹے کو سر پر درست کرتے ہوئے بولی۔ ”تم نے پوچھا ہی نہیں میں اس وقت تمہارے کمرے میں کیوں آئی ہوں۔ حالانکہ دوپہر کے کھانے میں آئی دو گھنٹے باقی ہیں۔“ ”آپ خور ہی بتا دیجیے۔“ دلاور نے نظریں جھکا کر کہا۔ ”صبح۔۔۔۔۔ شاہ زمان نے تمہیں بلایا ہے۔۔۔۔۔ تم نے کیا فیصلہ کیا ہے۔۔۔۔۔؟“ ”کس بارے میں۔۔۔۔۔؟“ ”حویلی میں رہنے کے بارے میں۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے مستقل طور پر رہنے کے بارے میں؟“

دلاور اسے کہنا چاہتا تھا۔ ”سویرا! اب اس حویلی کے سوا تو میرا کوئی ٹھکانا ہی نہیں رہا ہے۔ حویلی بھی اس لیے کہ اس میں تم رہتی ہو۔ تمہاری خوبصورت باتوں کی چھکراہ اس

حویلی کی فضاؤں میں رقص کرتی ہے۔ تمہاری خوبصورتی کے رنگوں کی توس قزح اس ماحول میں گھم رہی ہوئی ہے۔ جس ہوا کو میں اپنے پیچھے چھوڑوں میں اتارتا ہوں، اس ہوا میں تمہاری سانسوں کی خوشبو ملی ہوئی ہے۔ تمہارے چہرے کی ہنسی کے ٹکٹے گلاب میرے دل میں تھمکے جاتے ہیں۔ اب تم ہی مجھے بتاؤ میں حویلی چھوڑ کر کہاں جاؤں گا۔“

وہ یہ سب کچھ اسے نہ کہہ پایا۔ نہایت دھیمی دھیمی سی آواز میں بولا۔ ”مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اب مجھے حویلی سے چلے جانا چاہیے۔“

”خبردار! ایسی بات دوبارہ کی تو۔۔۔۔۔ جنہیں یہیں اسی حویلی میں رہنا ہے۔ یہی بات میں نہیں کہنے آئی گی۔۔۔۔۔“ دلاور کا دل بھرا آیا بولا۔ ”کس حیثیت سے۔۔۔۔۔ کہنے آئی ہیں مس؟“

”ایک دوست کی حیثیت سے۔۔۔۔۔“ ”اگر نہ رہوں۔۔۔۔۔؟“

”دوست کا دل ٹوٹ جائے گا۔۔۔۔۔ اور ایسے دوست کا۔۔۔۔۔ جو خود کو تمہارا فرض دار بھی سمجھتا ہے اور اپنی زندگی تک سمجھتا رہے گا۔“ سویرا نے بھرانے ہوئے لہجے میں کہا اور تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔

چند لمبے دلاور خاموشی سے اس دروازے کو کھٹکا رہا جہاں سے تھوڑی دیر پہلے سویرا گئی تھی۔ بھر دھول پر ایک زوردار چوٹ پڑی۔۔۔۔۔ ایک، دو، تین، چار۔۔۔۔۔ دھن دھن دھن دھن۔۔۔۔۔ دھن دھن دھن دھن۔۔۔۔۔ دھول کی تھاپ پر پہلے میں رقص کرنے والا ٹنگ جیسے دیوانہ وار خون کی آبیاری کرنے والی رگوں میں دھامکیں ڈالنے لگا۔ دلاور کا انگ انگ ٹپٹنے لگا۔ اس کا دل پھڑکنے لگا۔ سویرا خاص طور پر اسے کہنے آئی تھی کہ اسے حویلی میں برصورت رہنا ہے۔ وہ تو چاہتا ہی یہ تھا۔ وہ تو حویلی سے اب دور رہی ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ تو یوں ہی۔۔۔۔۔ تنگنا سویرا کو حویلی سے جانے کا کہہ رہا تھا۔ کس کا فرکویاں سے جانا تھا۔ صبح وہ شاہ زمان کے روبرو پیش ہوا۔ شاہ فرمان بھی وہیں تھا۔ اس کے چہرے پر سسکتی اور بے رحمی کا کھچاؤ سا تھا۔ کٹرتے سے نوٹھی سے آنکھوں کے نیچے کا ماس ابھرا آیا تھا۔ دلاور چند منٹ دیاں بیٹھا۔ بات ہو گئی۔ معاملات طے ہو گئے۔ دلاور کو ڈرائیور کم محافظ کی صورت میں رکھ لیا گیا۔ ڈرائیور کی وہ بہت اچھے سے جانتا تھا۔ پنڈی میں جس دوست کے ساتھ مل کر کام کرتا تھا، اس کی کار دلاور ہی ڈرائیور کرتا تھا۔

ان دنوں دلاور میں انقلابی تبدیلیاں آئیں جن پر وہ

خود بھی حیرت زدہ رہ گیا۔ کم گو شریلا دلاور ہاتھوں اور خوش اخلاق ہو گیا۔ مشتق نے اس کے دل میں جوت جگائی تھی اور وہ سودا کی ہو گیا تھا۔ جیسے صوفی اور ملک ہو گیا تھا۔ وہ ہر کسی کی خوشی کا خیال رکھتا تھا۔ وہ ہر کسی کی مدد کے لیے کمر بستہ رہنے لگا تھا۔

ایک دن وہ گاڑی چکا رہا تھا۔ زبان خانے کی سواریوں کو لانے کے جانے کی ڈیوٹی اسی کی تھی۔ بڑی آپا نے ”زعرور“ چاہا تھا۔ ان کے ساتھ ایک عورت آئی جو ایک ٹانگ سے معذور تھی۔ اس نے آدھے چہرے کا نقاب بھی کیا ہوا تھا۔ دلاور نے اچھٹی نگاہ ڈالی تو نقاب کے نیچے کچھ جیسب سامعوس ہوا۔ جیسے ناک والی جگہ پر ناک نہ ہو۔ کوئی خلا سا ہو۔ سارے رستے بڑی آپا دلاور سے باتیں کرتی رہیں، وہ ان کے جواب دیتا رہا۔ اپنی پرانی کہانیاں بھی سناتا رہا مگر اس کا ذہن نقاب والی عورت میں اٹکا رہا۔ وہ عورت سارے رستے ایک دفعہ بھی نہیں بولی۔ آخر دلاور سے نہ رہا گیا بولا۔ ”بڑی آپا! گستاخی معاف۔ مجھے کوئی حق تو نہیں پہنچتا مگر پھر بھی میں پوچھ رہا ہوں۔ یہ محترمہ کون ہیں؟“

خاموشی کا ایک طویل وقفہ آیا یہاں تک کہ دلاور کو پشیمانی ہونے لگی کہ اس نے یہ سوال کیوں کیا۔ پھر اچانک بڑی آپا کی کبیرہ آواز گونجی۔ ”یہ شاہ فرمان کی تیسری بیوی اور میری سوتیلی بیوی ہیں۔“

دلاور آگے کچھ نہ بول سکا۔ واپسی کا رستہ بھی خاموشی سے گزرا۔
 فطری دلاور کا روم میٹ اور حویلی کا پرانا ملازم تھا۔ وہ دلاور سے کافی مانوس ہو چکا تھا۔ اس رات سوتے وقت دلاور نے داہنی طرف کروٹ لی اور فطری سے بولا۔
 ”فطری! یار! یہ عجیبہ بی بی کون ہیں؟“
 ”تو نے اسے کہاں دیکھا؟“ فطری حیرت سے بولا۔
 ”بڑی آپا کے ساتھ آج ”زعرور“ تک گئی تھی۔“
 ”یہ بڑی بلی اور دردناک کہانی ہے۔“ وہ بلی سانس کھینچ کر بولا۔

”تو بھرتانا۔۔۔ میرا آج جلدی سونے کا موڈ نہیں ہے اور تو۔۔۔ تو آدھی رات تک جاگ رہا تھا۔“
 فطری دلاور کی بات پر ہنس دیا اور بولا۔ ”یار! چوڑی دھوپ کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ یہ سمجھ لو کہ چوڑی دھوپ کے بڑے یوڑھوں کی ایک قدر مشترک تھی۔ وہ تم سے چار شادیاں کرتے تھے۔ یہ ریت ابھی تک چلی آ رہی

ہے۔ شاہ زمان تو ابھی جوان ہوا ہے۔ شاہ فرمان بڑا ہے اور اب تک چار بیویاں چکا ہے۔“

”چار بیویاں۔۔۔“ دلاور نے حیرت سے پوچھا۔
 ”ہاں۔۔۔ ہاں چار بیویاں۔۔۔ اور پانچ بچوں کی باری بھی جلدی آ جائے گی۔ شاہ فرمان کی پہلی شادی بڑی آپا سے ہوئی جن سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ اگر اولاد ہوتی تو بھی وہ دوسری، تیسری، چوتھی شادی ضرور کرتا۔ دوسری شادی رخشندہ سے ہوئی۔ جو بے اولاد ہی میں ہی شادی کے تیسرے سال مر گئی۔ تیسری شادی عجب سے ہوئی۔ اور اب چوتھی شادی شاہدہ سے ہوئی ہے۔“

”حویلی کی کوئی عورت نقاب نہیں کرتی مگر یہ عجیبہ بی بی۔۔۔ تو پوری کی پوری پردے میں تھیں، یہ کیا جڑا ہے؟“
 فطری کے چہرے پر خوف پھیل گیا بولا۔ ”یار! یہ شاہ فرمان بڑا عالم بندہ ہے۔ چوتھی شادی پر کھینچنے سے داویلا چلایا اور طلاق مانگی تو شاہ فرمان نے اپنے ہاتھ سے اس کی ناک اور ہونٹ کاٹ ڈالے۔“ فطری کانوں کو ہاتھ لگانے لگا۔
 ”اور کھینچنے احتجاج نہیں کیا؟“

”اوہ حو، سائیں۔۔۔ احتجاج کی وجہ سے ہی تو ناک اور ہونٹ کاٹے گئے تھے۔ اور ایک اور قسم عربی سنو۔ حویلی کی کوئی بہن طلاق لے سکتی ہے، نہ حویلی سے بھاگ کر کہیں جاسکتی ہے۔ یہ چوڑی دھوپ کی کا صدیوں پرانا اصول ہے۔ جو ابھی تک چلا آ رہا ہے۔“

”فطری! شاہ زمان کو سب بڑے سائیں کیوں کہتے ہیں؟ حالانکہ وہ شاہ فرمان سے دس بارہ سال چھوٹا لگتا ہے۔“
 فطری بولا۔ ”بزرگوار!۔۔۔ شاہ فرمان شروع سے ہی آوارہ اور بے پردہ تھا۔ ”بڑے سرکار“ نے اپنی آخری وصیت میں شاہ زمان کو اپنا گدی نشین چنا تھا۔ اسی وجہ سے اب شاہ زمان ”بڑے سائیں“ کہہ دیے پر فائز ہیں۔“
 ”شاہ فرمان بڑا ہے، اسے بھی شرمندگی محسوس نہیں ہوتی جب سب لوگ اس کے سامنے چھوٹے بھائی کو ”بڑا سائیں“ کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔“ دلاور نے کہا۔
 ”میرا ابھی خیال اس سے شاہ زمان کو کوئی فرق پڑتا ہو

بلکہ میرے خیال سے وہ اس میں خوش ہے۔ بڑے سائیں کھلو ان میں بڑی قحطیاں ہیں۔ بہت سی پابندیاں ہیں۔ ایسی پابندیاں جو شاید شاہ فرمان جیسا عیش پرست بندہ نہیں نبھاسکتا۔۔۔ اب اس دن حویلی پر ہونے والا حملہ ہی دیکھ لو۔۔۔ وہ سب کچھ شاہ فرمان کی غلطی کی وجہ سے ہی ہوا تھا۔“
 ”شاہ فرمان کی غلطی کی وجہ سے؟ میں تمہارا مطلب

نہیں سمجھا۔۔۔“ دلاور نے الجھن سے کہا۔ فطری بستر سے اٹھ کر بیٹھ گیا اور اس نے سگریٹ سلگایا۔ گہرا کش لے کر اسی سگریٹ سے دوسرا سگریٹ سلگا کر دلاور کو پکڑاتے ہوئے بولا۔

”یار! اس حویلی کے ایک تہ خانے میں۔۔۔ جیتی پکیرو کچھ عتاب ٹائپ چیزیں رکھی جاتی ہیں۔ بعد میں سدھائے ہوئے قیمتی پکیرو۔۔۔ عرب ملکوں میں بیچے جاتے ہیں اور عرویں سے لاکھوں کمائے جاتے ہیں۔ یہ سب کام شاہ فرمان کرتا ہے۔ ”بڑے سائیں“ یہ سب جانتے ہوئے بھی جان بوجھ کر آنکھیں موندے ہوئے ہیں بلکہ کچھ لوگوں کا تو یہ بھی خیال ہے کہ ”بڑے سائیں“ بھی اس وعدے میں برابر کے شریک ہیں۔ صرف دنیا کو دکھانے کے لیے انجان بنے ہوئے ہیں۔“

”اچھا تو حویلی پر جو حملہ ہوا، وہ لوگ جیتی پکیرو چرانے آئے تھے۔“ دلاور نے کہا۔

فطری مسکرایا دایمیں بائیں سرکونی میں حرکت دیتے ہوئے رازدارانہ لہجے میں بولا۔ ”چرانے نہیں آئے تھے بلکہ اپنا چراگے لایا ہوا ایک قیمتی ”باز“ داپس لے آئے تھے۔“
 ”چراگے لایا ہوا باز۔۔۔ میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا؟“
 ”اوہ یار!۔۔۔ ایک تو ہمیں بات بڑی دیر سے سمجھ میں آتی ہے۔ شاہ فرمان نے اپنے سب سے خطرناک کارندے ”شیر“ سے رجم یا خارخان کے ایک گوتھ سے ایک باز چوری کر دیا اور حویلی میں لے آیا۔“

دلاور باز کے متعلق سویرا سے سن چکا تھا پھر بھی انجان بننے ہوئے بولا۔ ”کیا۔۔۔ وہ باز۔۔۔ قیمتی ہے؟“

”قیمتی نہیں بلکہ بہت قیمتی ہے۔ بلکہ یوں سمجھو۔۔۔ وہ ایک ساوہ چیک ہے۔“ فطری نے کہا۔
 ”ایسی کیا بات ہے اس میں؟“

”یہ بہت اندر کی باتیں ہیں۔۔۔ رہنے دو۔۔۔“

دلاور نے خاموشی اختیار کر لی تو فطری خود ہی بولا۔
 ”تم پوچھو گے نہیں۔۔۔ اندر کی بات کیا ہے؟“

دلاور ہنس دیا، بولا۔ ”خود ہی تو تم نے کہا تھا۔۔۔ رہنے دو۔۔۔ میں نے رہنے دیا۔۔۔“

”اوہ حو سائیں! انھیں اپنا یار کہا ہے اور یار سے کوئی چیز بھی چھپائی نہیں جاتی۔ حویلی میں بہت کم لوگوں کو اس بات کا علم ہے کہ ”شان“ نامی باز اتنا اہم اور قیمتی کیوں ہو گیا ہے۔ اصل میں اس کی وجہ دو شیخوں کی لڑائی بیان کی جا رہی ہے۔“

غریب محبت

”دو شیخوں کی لڑائی۔“

”ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ ایک شارچہ کا کوئی بڑا بزنس میں ہے۔۔۔ دوسرا دعی کا عرب بچی امیر زادہ ہے۔ دونوں کی آپس میں محبت تھی ہے۔ دونوں شاہ دعوے دار ہیں اور اسے حاصل کرنے کے لیے من مانگی قیمت دینے کے لیے تیار ہیں۔“ فطری باتیں کرتے کرتے سو گیا۔ دلاور اس کا منہ دیکھتا رہ گیا۔ فطری کو دو بجے سے پہلے نیند نہیں آتی تھی مگر دو بجتے ہی اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں اور وہ بیٹھے بیٹھے غرائے لینے لگا۔ دلاور نے سکراب کر اسے دیکھا، بستر پر اسے سیدھا کیا اور خود دوسری طرف کروٹ لے کر لیٹ گیا۔ آج رات نیند آئی مشکل تھی اسے صبح سویرا کو یونیورسٹی لے کر جانا تھا۔ وہاں سے پھر سویرا کو بازار جانا تھا۔ وہ وقت کا حساب لگانے لگا۔ دو ڈھائی گھنٹے کی ڈرائیو تو بن جاتی تھی۔ وہ گاڑی تھوڑی سیست چلاتا تو تین گھنٹے بھی لگ سکتے تھے۔ ڈھائی تین گھنٹے بہت وقت تھا۔ وہ سوچنے کا سویرا سے کیا کیا باتیں کرے گا۔ سویرا کے بارے میں سوچنے کے ساتھ ساتھ وہ اس ”باز والی بات“ میں بھی الجھا ہوا تھا۔

مگر صبح اس کے تمام ارمانوں پر اوس پرگنی۔ وہ صبح سے گاڑی چکانے جا رہا تھا، وہ اس سیٹ کو بار بار صاف کر رہا تھا جہاں سویرا نے آکر بیٹھا تھا۔ سویرا تو آتی ہی مگر اس کے ساتھ بچہ عالیہ بھی تھیں۔ سویرا نے بہت ہلکا میک اپ کر رکھا تھا، یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ابھی تازہ تازہ کوئی گلاب کی کلی کھلی ہے۔ گاڑی میں جیتنی تو ہر سو اس کی خوشبو بکھرنی۔ دلاور نے بیک مرر پہلے سے سیٹ کر رکھا تھا۔ سفر شروع ہوا۔ وہ بار بار کن انھیں سے اسے دیکھنے لگا۔ سویرا کے چہرے پر سوچ کی پرچھائیاں تھیں۔ وہ کچھ خاموش تھی۔ سفر خاموشی میں گزرا۔ جو کچھ اس نے رات جاگ کر سوچ رکھا تھا، سب اس سے الٹ ہو رہا تھا۔ ایک دو دفعہ اس نے خود بات کرنے کا سوچا مگر دونوں کی کبیرہ خاموشی دیکھ کر اس کی ہمت نہیں پڑی۔ اس سے پہلے وہ جب بھی حویلی سے کسی کو لے جاتا تھا تو بے ٹکان ہوتا تھا۔ بچہ عالیہ، سویرا، رمشا، بڑی آپا سب سے بے تکلفی سے بات چیت کرتا تھا بلکہ سب مستورات اس کی ڈرائیو تک سے زیادہ اس کی خوش اخلاقی اور خوش گفتاری سے خوش تھیں مگر آج کچھ گڑبڑ تھی۔۔۔ دونوں عورتوں کی کبیرہ تاکے بیچے کچھ ناپسندیدہ حالات کی پرچھائیاں نظر آتی تھیں۔
 یونیورسٹی آئی تو بچہ عالیہ اور سویرا اندر چلی گئیں۔ ان کی داپس آدھے گھنٹے بعد ہوئی۔ دلاور نے اتر کر پارکی

باری دونوں دروازے کھولے۔ پہلے سویرا بیٹھی بعد میں پچھو عالیہ بیٹھیں مگر انہوں نے گاڑی کا دروازہ بند نہیں کیا۔ ایک لمبے کے لیے کچھ سوچا پھر گاڑی سے پیچھے اترتے ہوئے بولیں۔ ”سویرا! بون کروم! کیلی بازار ہوا؟“..... مجھے واپسی پر یہاں سے پک کر لیا۔ ”سویرا نے خاموشی سے اشارات میں سر ہلایا۔ دروازہ بند ہوا اور گاڑی آگے بڑھ گئی۔ ذمہ کی قحط پر دھماکے والے دلاور بھٹکنا دلاور کے وجود میں بھٹکے ڈالنے لگا۔ اسے کالوں کے قریب ذمہ کی دھماکیں دھماکیں سنائی دینے لگی۔ سویرا اس کے ساتھ گاڑی میں اکیلی گئی۔

”سویرا! آج آپ کو اس طرح دیکھ کر میرا دل دکی ہے۔“ دلاور ہمت کرتے ہوئے بولا۔

”تم کیوں دکی ہو۔۔۔ پریشان تو میں ہوں۔“ سویرا نے سہاٹ لیجے میں کہا۔

”دوست کو پریشان دیکھ کر دوست تو دکی ہوگا۔“

”ہاں۔۔۔ شاید۔۔۔“ سویرا گاڑی کے شیشوں سے پار کہیں دور دیکھتے ہوئے بولی۔

”بڑے کہتے ہیں کہ شیز کرنے سے پریشانی کم ہو جاتی ہے۔ بوجھل دھڑتوں کو فرار آ جاتا ہے۔“

”تم ٹھیک کہتے ہو۔۔۔ پریشانی کم ہو جاتی ہے۔ مگر دھماکوں کا کوئی علاج نہیں ہے۔ یہ بل بل دیتے ہیں۔“ سویرا نے عجیب سے دکھ بھرے لہجے میں کہا تو۔ دلاور سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے آج سے پہلے سویرا کو یوں منتشر نہیں دیکھا تھا۔ اس نے ایک لمحے میں فیصلہ کیا اور شروع ہو گیا۔ ”سویرا بی بی۔۔۔ دیکھیں۔۔۔ (اس نے جان بوجھ کر بی بی کا اضافہ کیا تھا)

”وہم کا علاج لقمان حکیم کے پاس بھی نہیں تھا بلکہ اس کے دادا کے بڑا دادا کے پاس بھی نہیں تھا۔ یہ ایک منی جنڈ ہے جو بدگمانی سے جنم لیتا ہے۔ زندگی بہت مختصر ہے، اتنی مختصر جیسے ایک سانس آگئی ہے۔ دوسرے پل میں نہیں۔ اتنی چھوٹی زندگی کے لیے اتنی فکر۔۔۔ اتنی پریشانی۔۔۔ کیوں؟ ہمیشہ مثبت سوچو۔ ہمیشہ۔۔۔ اچھا سوچو۔“

ایک دیوار میں دلاور نے دیکھا کہ سویرا کے خزان رسیدہ چہرے پر دھمکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی ہے۔

دلاور کے دل میں خوشی تاج اُٹھی۔ وہ بولا۔ ”اچھا آپ ساری باتیں چھوڑیں۔۔۔ مجھے صرف ایک بات کا جواب دیں۔“

”ہاں پوچھو۔۔۔؟“ سویرا نے دوپٹا سر پر سیدھا کرتے ہوئے کہا۔

”اتنی دلکش لڑکی۔۔۔ واپس۔۔۔ اور اندیشوں سے اس قدر پریشان کیسے ہو سکتی ہے۔ اس کی آنکھوں میں تو دنیا کے سب سے خوبصورت رنگ اترتے ہیں۔ ان پیارے رنگوں سے دکھ کا رنگ میل نہیں کھاتا۔۔۔ اس بد صورت رنگ کو اپنی آنکھوں سے ہٹا دیجیے۔“

سویرا کے چہرے پر خفق کے رنگ بکھر گئے۔ چہرہ شرم سے گلنار ہو گیا۔ منصف نازک کو خود کی تعریف اچھی لگتی ہے۔ یہ ایک فطری عمل ہے اور دلاور نے یہ کام ایسے وقت میں کیا تھا جب سویرا اٹھیں تھی۔ تیرنٹا سے پریشا تھا۔ سویرا کی پریشانی جو کئی بھی تھی، وہ ایک لمحہ اس پریشانی کو کافور کرنے میں کامیاب ہوا تھا۔ سویرا اپنی اصل حالت میں واپس لوٹ آئی۔

وہ واقعی ایک سن موچی لڑکی تھی۔ وہ بازار گئی۔ اس نے بھرپور شاپنگ کی۔ دلاور کے لیے خوبصورت سی گھڑی خریدی۔ واپس آ کر خود اپنے ہاتھ سے اس کی کلائی پر باندھی اور بولی۔ ”شکر ہے دلاور۔۔۔ تم ایک بہترین دوست ہو۔۔۔“

”مگر۔۔۔ شاید۔۔۔ یہ بہت قیمتی گھڑی ہے۔ میں اسے۔۔۔“

سویرا نے اسے روک دیا۔ ”خاموش رہو۔۔۔ یہ تم سے زیادہ قیمتی نہیں ہے۔۔۔ YOU MAKE MY DAY“

واپس پر دلاور خفے کے بوجھ تلے دبا رہا۔ یونیورسٹی پہنچنے سے تھوڑی دیر پہلے سویرا نے خاموشی توڑی، شوشی سے بولی۔ ”اگر تم مجھے لاہور نہیں لے کر گئے تو میں تمہیں بھی معاف نہیں کروں گی۔ میں تمہارا گھر تمہاری جہم بھوی دیکھنا چاہتی ہوں۔“

”میں تفصیل بتاؤں گا تو آپ ارادہ ترک کر دیں گی۔“ دلاور بھی شوشی کے موڈ میں آ گیا۔

”ایسی کیا بات ہے؟“ وہ بچوں کی طرح منہ پھلا کر ایک ادا سے بولی۔

”جس لگی سے آپ کو گزرتا پڑے گا، وہاں سے دو انسان اکٹھے نہیں کر سکتے۔“

”تو کیا ہوا۔۔۔ میں تمہارے پیچھے چل پڑوں گی۔ تم مجھ سے آگے چلنا۔“

”اس لگی میں اندر میرا اور سلیٹن زدہ ہو ہوگی۔ ایک سائڈ پر گندہ نالی ہوگی جہاں اکثر بچے رعب حاجت کرتے ہوئے دکھائی دیں گے۔ یہ نگارہ سہ پائیں گی آپ۔۔۔؟“ دلاور کی ہنسی چھوٹ گئی۔ سویرا نے ایک

جبر جبری کی لی۔۔۔

دلاور، سویرا کو اچھی طرح جان گیا تھا۔ وہ کسی کے ہاتھ کا کٹا پھل نہیں کھاتی تھی۔ جس گلاس کو کسی نے چھوا ہوتا۔ وہ اس میں پانی نہیں پیتی تھی۔ پچھو عالیہ اسے برہمن کتنی تھیں مگر وہ عادت سے مجبور تھی۔ مگر وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ کسی نے اس کی خبری میں اس کے ہونٹوں کو بہت دیر تک چھوا ہے۔

یونیورسٹی کا موڑ آنے والا تھا جب سویرا نے پیچھے سے ہاتھ بڑھا کر اس کا بایاں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور بولی۔ ”تم نے پوچھا ہی نہیں کہ میں نے تمہیں بہترین دوست کیوں کہا؟“

دلاور کو خاموشی پا کر بولی۔ ”اس لیے کہ تم نے میرے کہنے پر حویلی سے جانے کا ارادہ ہٹو کر دیا اور اتنا بڑا فیصلہ کیا بہترین دوست ہی کر سکتا ہے۔“

دلاور کی زندگی نے یکا یک ایک بہت بڑا موڑ لیا تھا۔ یہ موڑ اتنا بڑا تھا کہ دلاور خود بھی چکر اکر رہ گیا تھا۔ اس نے ہنڈی چھوڑا تھا، لاہور کو خیر آباد کہا تھا۔ کراچی سے بھاگ نکلا تھا مگر وہی کی فضاؤں میں کوئی عرصہ تھا۔ چولستانی ہواؤں کے جھونکوں میں ایک غیر مرئی گرفت تھی جن سے آزادی ناممکن تھی۔

وہ پورا کا پورا سویرا کے عشق میں بیگ چکا تھا۔ بات دور نکل چکی تھی۔ واپس ناممکن تھی وہ سوچنے لگا۔ جس شدت سے وہ سویرا کو چاہنے لگا تھا، کیا سویرا کے دل میں بھی، اس کے لیے کوئی جذبہ موجود ہے؟ جواب ”ہاں“ میں آیا۔ سویرا نے کچھ خوبصورت اشارے دیے تھے۔ اس نے کہا تھا۔ ”دلاور! تمہیں حویلی میں رہنا ہے۔ میں یہی بات تم سے کہنے کے لیے آئی تھی۔“ پھر اس نے کہا تھا۔ ”دوست کا دل ٹوٹ جائے گا۔ ایسے دوست کا جو خود کو تمہارا قرض دار سمجھتا ہے۔ اور رہتی زندگی تک بھگتا رہے گا۔“ اس نے ایسا کیوں کہا تھا؟ اس کے دل میں کیا نہیں تھا۔ آج اس نے دلاور کو ایک خوبصورت سی گھڑی خفے میں دی تھی اور کہا تھا۔ ”تم بہترین دوست ہو۔۔۔“ اس نے دلاور کو اپنا بہترین دوست کیوں کہا تھا؟ کیا اس کے دل کا موسم تبدیل ہو چکا تھا؟ اس کے اور شاہ زمان کے درمیان کوئی دراڑ پیدا ہو چکی تھی؟ عورت کی دوستی سے غلط مطلب تو مرد لیتے ہی ہیں۔ کہیں وہ بھی تو غلط مطلب نہیں لے رہا تھا؟

ساری رات وہ جاگتا رہا۔ باتوں کی کڑیاں ملتا رہا۔ صبح تک اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ لکھتا جاتا تھا۔ جو

باتیں زبان بیان نہیں کر سکتی تھی، اس نے غلط میں لکھ دیں۔

کافزہ ذکر کے جیب میں رکھ لیا۔ دل میں فیصلہ کیا کہ جس دن سویرا کا موڑ سب سے اچھا ہوگا۔ وہ سارے اندیشے ہلائے طاق رکھ کر اس دن وہ کافزہ کا گھوڑا سویرا کو حمدا دے گا۔ اس کے بعد جو بھی ہو دیکھا جائے گا۔

مگر اگلے آٹھ دس دن میں بھی وہ موقع پیدا نہ ہوسکا۔ پانچ دن کے لیے اسے شاہ زمان کے ساتھ رحیم یار خان جانا پڑا۔ وہی قیمتی بازو الا ماحول تھا۔ شاہ زمان کی معاملہ فہمی اور سمجھداری سے یہ مسئلہ ختم ہونے کے قریب تھا۔ چھ دن پہلے لوگ حویلی واپس آ گئے۔ دیکھا ہوا کافزہ اس کی جیب میں ہی تھا۔ وہ دن میں کئی دفعہ ٹول کر اس کی موجودگی کا اندازہ لگا تھا۔ حویلی پہنچ کر اسے پاپسی ہوئی۔ اس نے رحیم یار خان میں پانچ دن کا ٹول بھر کے تھے۔ اب حویلی پہنچ کر مطمئن ہوا کہ سویرا رشاک کے ساتھ فورٹ عباس رشاک کی کزن کے گھر گئی ہوئی ہے۔ سویرا کے بغیر اسے حویلی سونی سونی لگی۔ ایک دم غالی اور بکواس۔ سویرا کی واپسی جو تھے دن ہوئی۔ مگر اگلے تین دن بھی سویرا کی شکل نظر نہیں آئی۔ دلاور کے حلق میں گھٹنیں آنسوؤں کا ڈانڈہ مل گیا۔ بجلی دفعہ اسے سویرا پر فضا آ۔۔۔ وہ مرنا پانا انتظار بنا بیٹھا تھا اور سویرا کو جیسے کوئی پردہ ہی نہیں تھی۔ وہ رات اس نے آنکھوں میں کاٹ دی۔ اگلا سارا دن بھی گزر گیا مگر سویرا نہیں آئی۔ انتظار کی تاریکی طویل ہوئی چلی گئی۔ دیدار کا اجالہ نہیں پھیلا۔ اس کا وجود مسلسل انتظار کی چشم سے بھٹکتا لگا۔ رگ رگ میں آگ سی بھرنے لگی۔ ایک دو دفعہ اس کا دل چاہا خط کو نکالے اور اس کے کھڑے کر کے پھینک دے۔

وہ ایک دھندلی شاید سیاہ دوپہر تھی۔ صحرا کے جنوب کی سمت سے دور کچھ بگولے سے اٹھتے تھے جنہوں نے سورج کی روشنی کا راستہ روک لیا تھا۔ یہ صحرانی بگولے حویلی سے کئی میل دور دکھائی دے رہے تھے۔ یہ بگولے اوپر ہی اوپر اٹھ رہے تھے جیسے سورج کو چھوٹا چاہتے ہوں۔

ظہری کرے سے نکل کر حویلی کے جنوب کی طرف بھاگ گیا تھا۔ کرے سے نکلنے وقت اس نے دلاور سے کہا تھا۔ ”مجھے لگتا ہے۔۔۔ ابھی تھوڑی دیر بعد طوفان آنے والا ہے۔۔۔ میں سیبوں والی حویلی کے دروازے بند کر آؤں۔“ سیبوں والی حویلی اچالے کے اندر ہی ایک طرف واقع تھی۔

ظہری کو گئے ابھی تھوڑی دیر ہوئی تھی کہ دروازہ کھلا

وہ سویرا کو پریشان نہیں دیکھ سکتا تھا، گوگیر لہجے میں بولا۔ ”سویرا! پلیز مجھے معاف کر دیں۔ مجھے آپ کے ساتھ ایسا برا نہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اصل..... میں.....“

بطحا

جزل وارڈ میں ایک صاحب سے جن کا ابھی ابھی آپریشن ہوا تھا برابر میں لیٹے ہوئے مریض نے پوچھا۔ ”آپ کو آپریشن کے بعد کوئی تکلیف تو محسوس نہیں ہو رہی؟“

وہ صاحب بولے۔ ”امی کیا پوچھتے ہو۔ پیٹ میں بڑا درد ہو رہا ہے۔“

پڑوسی مریض بولا۔ ”یہ ڈاکٹر صاحب دراصل ہیکلو ہیں۔ ایک آپریشن کے بعد انہیں مریض کا پیٹ دوبارہ کھولنا پڑا کیونکہ وہ اس کے پیٹ میں پتلی بھول گئے تھے، دوسرے مریض کے پیٹ میں چاقو بھول گئے تھے۔“

اسنے میں ڈاکٹر صاحب گھبرائے ہوئے وارڈ میں داخل ہوئے اور گھبرا کر بولے۔ ”بھئی کسی نے میری پتھری تو نہیں دیکھی؟“ اتنا سنا تھا کہ آپریشن والے صاحب بے ہوش ہو گئے۔

مرسلہ: وزیر محمد خان، محل ہزارہ

تھی۔ ایک جوان چومری کی حیثیت سے شاہ زمان ”نظر بازی“ سے بھی باز نہیں آتا تھا۔

شام کا وقت تھا۔ شاہ زمان اور سورا دلان میں بیٹھے چائے سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ چائے کا سامان میز پر ترتیب سے رکھنے والی ملازمہ ماروی تھی۔ اس نے اپنا جسم پارک دوپٹے میں لپیٹ رکھا تھا۔ اس کے جسم کا رنگ ایک چمچ کر دیکھنے والے کو اپنی طرف متوجہ کر دیتا تھا۔ شریف سے شریف انسان کی آنکھیں بھی اس کے قیامت خیز جسم سے گھرائے بنائیں رہ سکتی تھیں۔

اس کا رنگ گندی چہرے کے نقوش جیسے تھے۔ لانی آنکھوں میں لگے کاہل میں حسن کی ایک داستان رقم تھی۔ اس کا حسن بھی کسی پارسا کا بیزا غرق کر سکتا تھا۔

وہ جبک کر چائے بناری بھی اور شاہ زمان سو فحشوں کو تاؤ دیتا ہوا دھاقا فوٹا اسے دیکھ رہا تھا۔ سورا کی لالچی کے دوران جتنی دفعہ اس کی نظر ماروی کی طرف اٹتی، نگاہ کی پیش پہلے سے بڑھی ہوتی۔ عورت چار آنکھیں رکھتی ہے۔ سورا اب جانتے ہوئے بھی انجان بنی رہی۔ شاہ زمان نے اس کے انجان بنے رہنے کو اپنا کارنامہ سمجھا اور مزید دلیر ہو گیا۔ وہ باتیں تو سورا سے کر رہا تھا مگر اس کی نگاہوں کا مرکز ماروی تھی۔ آخر سورا زنج ہو گئی۔ اس نے تھوڑے سخت لہجے میں ماروی کو دہاں سے جانے کا اشارہ کیا تو شاہ زمان یوں انجان بن گیا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

تھوڑی دیر پہلے سورا بہت اچھے موڈ میں تھی مگر شاہ زمان کی نظر بازی نے سورا کے موڈ کا ستائیاں کر دیا۔ باقی وقت وہ خاموش رہی، صرف ہوں ہاں سے شاہ زمان کی باتوں کا جواب دیتی رہی۔

اگلی رات، ڈنر میں کھانا سر کرنے والی بھی ماروی تھی۔ بڑے ٹیبل پر کھانا لگایا گیا تھا۔ سب لوگ کھانا کھا رہے تھے اور بظاہر شاہ زمان، شاہ فرمان سے باز کے سلسلے میں کوئی گرا کر مبحث کر رہا تھا مگر اس کی نگاہیں ماروی کا طواف کر رہی تھیں۔ کھانا سورا کے حلق میں اٹکنے لگا۔ ابھی تو اس کی شادی کو ڈھائی تین ماہ کا عرصہ ہی ہوا تھا۔ شاہ زمان یہ کیا کر رہا تھا۔ آدمی عورتوں کی جانب دیکھتے ہیں مگر اس طرح دیکھنے اور شاہ زمان کے اب والے دیکھنے میں بڑا فرق تھا اور یہ فرق سورا کو بری طرح محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے اپنے دل کو لاکھ بھانے دے کر بھلایا کہ وہ یوں ہی شکی مزاج ہو رہی ہے۔ آدمی عورتوں کی طرف دیکھتے ہی ہیں۔ اسے شاہ زمان کی نظر پیچانے میں غلطی ہوئی ہے لیکن۔

پھر..... من پسند مکمل شروع ہو گیا..... وہ روز سیبوں والی حویلی میں آتا اور بہت دیر تک اپنا پسندیدہ مکمل کھیلتا۔ دم توڑتی چمچلی پانی لٹے سے دوبارہ جی اٹتی ہے۔ وہ بھی جیسے دوبارہ زندہ ہونے لگا تھا، دن بدن بہتری کی طرف بڑھنے لگا تھا۔ پہلے دو ہر دم نشے میں رہتا تھا مگر اب نشے والی حالت میں کی ہونے لگی تھی۔ اسی دوران میں ایک روز ایک عجیب واقعہ پیش ہوا۔ تالاب میں غوطہ زن رہنے کے بعد دلاور پانی کی سطح پر ابھر اٹوٹھک کر رہ گیا۔ چند قدم کے قافلے پر بڑی آبا، کئی ناک والی ٹھیکہ بیگم اور سورا دھیرہ کھڑی تھیں۔ وہ بالکل غیر متوقع طور پر باغ کی سیر کو آئی تھیں۔ دلاور کا بالائی جسم عریاں تھا۔ بڑی آبا کی نگاہ سیدی دلاور کی چھاتی پر پڑی۔ وہاں اچھی رنگ پر دی دس بارہ انچ لمبا زخم تھا جو سورا کو بچاتے ہوئے دلاور کے سینے پر آتا تھا۔ دلاور صرف شلوار میں تھا، اس نے باہر نکل کر جلدی سے چادر میں اپنا جسم لپیٹا اور مودب کھڑا ہو گیا۔ بڑی آبا نے کہا۔ ”دلاور! کافی لمبا پٹ لگا ہوا ہے تجھے، شکر کرتی جان بچ گئی۔“ دلاور نے کہا۔ ”جی ہاں، پٹ تو لگا ہے..... لیکن اب پرانا ہو گیا ہے۔“

بڑی آبا کے پیچھے کھڑی ایک ملازمہ کالوں کو ہاتھ لگا کر بولی۔ ”توبہ اللہ جی۔ بڑی خطرناک لڑائی تھی وہ۔ جب چائڑیو کے بندے نے چاقو چلا یا تو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ مجھے تو لگتا ہے جی کہ اگر اس دے دے دلاور سامنے نہ آتا تو یہ چاقو..... اللہ نہ کرے سورا اب اپنی کوئی لگتا تھا۔“

دلاور کو لگا جیسے اس کا کوئی قیمتی راز افشا ہو گیا ہے۔ اسے محسوس ہوا کہ جیسے سورا نے چوبک کر اس کی طرف دیکھا ہے۔ عورتیں اس واقعے کی تفصیل بیان کرنے لگی پڑیں۔ دلاور موقع دیکھ کر دہاں سے ہٹ گیا۔

☆☆☆

شادی کے بعد دو تین ماہ لگ بھگتے میں گزر گئے۔ سورا، شاہ زمان کی ہر ضرورت کا خیال رکھتی تھی۔ وہ ایسی ہیوی ثابت ہوئی تھی جو اپنی اطاعت، ناز و ادا اور موقع محل کے مطابق بات چیت سے غافلہ کا دل جیت لیتی ہے۔ شاہ زمان اس کے حسن کا بہترو پہلے سے تھا۔ اب اس کی سیرت کا گردیدہ بھی ہو چلا تھا مگر ان سب باتوں کے ساتھ ساتھ اس کی رنگوں میں جاگیر دارانہ خون بھی دوڑتا تھا۔ وہ کسی وقت رات کو حویلی میں راگ رنگ کی مٹھل بھی بجالیتا تھا۔ سورا اپنی زبان میں امتزاس کرنے کے بعد خاموش ہو جاتی

کپڑوں سمیت تالاب میں اتر گیا..... وہ گھر سے پانی کی مچھلی تھا۔ گھر سے پانی کی مچھلی جو لاکھوں ٹن پانی کے دباؤ میں بھی زندہ رہتی ہے جس دباؤ پر چیزیں پھٹ کر پڑ پڑ رہ ہو جاتی ہیں، وہ سکون سے تیرتی ہے۔ دباؤ کی زیادتی اس کی زندگی..... دباؤ کی کمی اس کی موت ہوتی ہے۔ وہ سینے سے سانس نکال کر تالاب کے پینے میں جا بیٹھا۔ تالاب دس فٹ کے قریب گہرا تھا۔ اسے یوں لگا جیسے وہ یہاں دنیا کی مصیبتوں، اس کے رنج و غم سے دور ہو گیا ہو۔ ٹہلی بھی سرگوشیوں جیسی آوازیں تھیں جو اس کی سماعت سے گرائی تھیں..... آدھے سفید آدھے ہندی لگے بالوں والی عورت کے گھر اکثر وی آدی آیا کرتا تھا۔ آہستہ آہستہ دلاور کو اندازہ ہوا تھا کہ وہ اس کا گھر والا ہے۔ اس کا نام سرفرد تھا، مگر سب اسے سرفرد گھٹ کہتے تھے۔ وہ راوی کے پانیوں کا کنبہ تھا۔ کہا جاتا تھا کہ وہ بغیر سانس لیے پندرہ منٹ تک پانی کے اندر رہ سکتا ہے۔ وہ جب بھی اس گھر میں آتا دلاور گواہ بنے ساتھ دہرائے راوی لے جاتا۔ خود پانی میں اترتا، اسے بھی غوطہ لگانے پر مجبور کرتا۔ اس وقت دلاور کی عمر سات آٹھ سال ہوئی (دلاور کا نام..... دلاور بھی اسی نے رکھا تھا) پانی کے اندر شروع شروع میں دلاور کی حالت بری ہو جاتی۔ وہ کھانسا، فوٹے کھاتا، پانی ناک میں داخل ہو کر اس کا ٹوٹا ہوا دیتا، اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوتے مگر سرفرد گھٹ کو اس پر دم نہ آتا۔ ان لمحات میں سرفرد گھٹ، دلاور کو دنیا کا سب سے ظالم انسان لگتا مگر اس سختی کے پیچھے ایک تربیت بھی ہوتی تھی..... پتا نہیں کیوں سرفرد گھٹ جاتے جاتے اپنا تن دلاور میں منتقل کر گیا۔ سخت، جان لیوا تربیت میں دلاور کو پتا بھی نہ چلا کہ وہ کب گھر سے پانی کی مچھلی بن گیا ہے۔ سرفرد گھٹ کی تربیت قریباً تین سال تک جاری رہی۔ دلاور کو پالنے والی عورت کے مرنے کے ساتھ ہی یہ سلسلہ بھی منقطع ہو گیا۔ وہ عورت دنیا سے گیا گئی، سرفرد گھٹ بھی جیسے دنیا سے رخصت ہو گیا۔ اس کے بعد دلاور نے اسے بھی نہیں دیکھا مگر تب تک ایک نایاب ہنر دلاور میں منتقل ہو چکا تھا۔

وہ جب حد سے زیادہ پریشان ہوا کرتا تو راوی کے پانی میں کود جاتا۔ کنارے پر کسی جڑ کو پکڑ کر تین چار منٹ تک زیر آب رہتا۔ جب سینے میں رکی سانس اس کے پیچھے پڑوں کو چھینچھونے لگتی، وہ سرخ آب پر آ جاتا۔ سانس لے کر دوبارہ زیر آب چلا جاتا۔ آج بھی وہ ہمیشہ سے زیادہ دھکی تھا۔ حویلی میں تالاب نظر آتا تو جیسے وہی اٹھا اور

سپینس ڈائجسٹ

ایک آوارہ لٹ کو اٹھی پر کھاتے ہوئے بولی۔ جواب میں دلاور کچھ نہیں بولا، اپنے کام میں منہمک رہا۔ ماروی نے ڈیش بورڈ سے پستول اٹھالیا، دلاور کی جانب کرتے ہوئے بولی۔
”اور اگر تم نے مجھ سے چچا پھڑانے کی کوشش کی تو میں تمہیں گولی مار دوں گی۔“ وہ ایک آنکھ بند کیے اس کا نشانہ لے ہوئے تھی۔

دلاور نے جھٹ کے اس سے پستول چھینا تو وہ ایک دم سہم گئی۔ دلاور نے اسے بے نقطہ سا ڈالیں۔ پہلے وہ خاموش ہوئی پھر چہرے کے تیرنگہ بڑے۔ نچلا ہونٹ ڈھیلا چھوڑ کر کھلی آنکھوں میں آنسو لے آئی۔ اس نے تیزی سے اس سے پستول چھینا تھا اسی دوران اس کے خنوں سے ماروی کا ہاتھ زخمی ہو گیا تھا۔ دلاور کا دل نرم نہ رہا۔ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اس کے زخم کو دیکھنے لگا۔ اسی دوران شاہ زمان اندر سے برآمد ہوا۔ اس کا دھیان گاڑی میں اگلی سیٹ پر بیٹھی ماروی پر پڑا۔ ماروی نے چونک کر دلاور سے اپنا ہاتھ پھرا یا اور گاڑی سے نکل کر سر پر دوپٹا ٹھیک کرتی ہوئی وہاں سے رونے پھر ہو گئی۔ شاہ زمان نے جاتی ہوئی ماروی کو بڑی گہری اور فضیلی نظروں سے دیکھا اور گاڑی کی طرف آ گیا۔ دلاور نے بڑی سرعت سے شاہ زمان کے لیے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھولا۔ شاہ زمان بڑے کر دفرے سے گاڑی میں سوار ہوا اور گاڑی تیزی سے چوٹی کے صدر دروازے سے باہر نکل گئی۔ چند منٹ خاموشی کے گزر گئے پھر شاہ زمان کی بھاری آواز گونجی۔

”اب تم کیسے ہو۔۔۔؟“

”اللہ کا کرم ہے بڑے سائیں۔۔۔ پہلے سے بہت بہتر ہوں۔۔۔“

”اسپتال سے جو رپورٹس آئی تھیں، ان کا کیا بنا۔۔۔“
”بڑے سائیں۔۔۔ رپورٹس آگئی تھیں۔ اللہ کا کرم ہے، سب ٹھیک ٹھاک ہے۔“ رپورٹس کے بارے میں دلاور نے جھوٹ سے کام لیا تھا اور اس جھوٹ کا مشورہ بھی دلاور کو ملانی نے ہی دیا تھا۔ نہ ہی کوئی ٹیسٹ ہوا تھا، نہ ہی کسی رپورٹس نے آتا تھا مگر حویلی میں یہی مشہور کیا گیا تھا کہ ملانی، دلاور کی تیار سے متعلق خون کے ٹیسٹ لے کر گیا ہوا ہے۔

چند لمے پھر خاموشی سے گزر گئے پھر شاہ زمان نے بھوین اچکاتے ہوئے کہا۔ ”یہ کڑی تمہاری گاڑی میں کیا کر رہی تھی؟“

دلاور گڑبڑا گیا۔ ”کون سی کڑی۔۔۔ بڑے سائیں۔۔۔“
شاہ زمان کا لہجہ قدرے ترش ہو گیا۔ ”اوسے۔۔۔“

دعی۔۔۔ جو میرے آنے پر گڈی سے نکل کر بھاگی تھی۔“
”بڑے سائیں! میں تو اسے ٹھیک سے جانتا بھی نہیں ہوں۔ تھوڑے دن سے میرے پیچھے بڑی ہوئی ہے۔ میں جہاں جاتا ہوں وہاں پہنچ جاتی ہے۔ میں تو اب تنگ آ گیا ہوں۔“ شاہ زمان پُرسوج انداز میں عقب نما شیشے میں دلاور کو دیکھنے لگا۔ مومچوں کو تاؤ دیتے ہوئے بولا۔
”وہ تمہاری گاڑی میں کیا کر رہی تھی؟ تم نے اس کا ہاتھ بھی پکڑ رکھا تھا۔“

”بڑے سائیں! کیا بتاؤں۔۔۔ یہ لڑکی جو تک کی طرح چٹ گئی ہے۔ فلی بائیں کرتی ہے۔ کبھی بے جہادری شکل میرے باپو سے ملتی جلتی ہے۔ بابو کو اپنا منگھیر بتاتی ہے جو تین سال پہلے کسی ایکسپنٹ میں مارا گیا تھا۔ اب بھی میں گاڑی کا ڈیش بورڈ صاف کر رہا تھا کہ میری بے خبری میں اندر مٹس آئی۔ میں نے اپنا پستول ڈیش بورڈ پر رکھا ہوا تھا۔ اس نے اٹھا کر میری طرف اس کا رخ کر دیا اور فلول ایکٹنگ کرنے لگی۔ میں گھبرا گیا جھپٹ کر اس سے پستول چھینا تو میرے ناخن اس کے ہاتھ پر نشان چھوڑ گئے۔ خون رسنے لگا تو مجھے اس پر ترس آ گیا۔ میں نے اس کا ہاتھ تمام لیا۔ اوپر سے آپ آ گئے۔“ دلاور نے سب صاف صاف بیان کر دیا۔

شاہ زمان بڑی گہری سوچ میں غرق ہو گیا۔ اس کی آنکھوں کی پتلیاں تیزی سے حرکت کرنے لگیں، وہ مومچوں کو تاؤ دیتا گیا اور سوچنا چلا گیا۔ جانے کیوں دلاور کو محسوس ہو رہا تھا کہ شاہ زمان کا دل ماروی پر آیا ہوا ہے۔

☆☆☆

سویرا نے اپنے ہاتھوں سے شاہ زمان کے لیے دودھ کی باداموں والی سردی بنا لی تھی۔ وہ شام سے ہی اس کا انتظار کر رہی تھی مگر شاہ زمان رات گئے دلاور کے ساتھ واپس آیا۔ آرام گاہ میں پہنچا تو کانی کھا ہوا دکھتا تھا۔ سویرا نے آگے بڑھ کر اس کی داسٹن اتاری۔ بستر پر بیٹھا تو اس کے جوتے اتار کر جرائیں اتارنے لگی۔

”لگتا ہے، آج آپ بہت تھک گئے ہیں۔“
شاہ زمان جواباً کہہ نہیں بولا۔ بیڈ پر بیٹھ کر سر پیچھے لٹکا دیا۔ سویرا نے ٹھنڈی سردی لکڑی میں انڈلی اور شاہ زمان کو پیش کر دی، بولی۔ ”میں نے اپنے ہاتھوں سے بنائی ہے۔“
شاہ زمان تین گھنٹوں میں ساری سردی اندر انڈلی لیا۔

”آپ کچھ پریشان دیکھتے ہیں۔“ سویرا انگریزی میں بولی تو شاہ زمان سیدھا کھو کر بیٹھا اور بولا۔

”میں پریشان ہوں نہیں اس سے کیا۔ تم کھیل

غری محبت

بتایا تھا تیری ماں نے اپنے گاؤں کا؟“

”بڑے سائیں۔۔۔ ترنا۔۔۔“

”تیرا باپ کیا کام کرتا ہے؟“

”بڑے سائیں! ہم لوگ ٹھوری ہیں۔ میرا باپ بکریاں چراتا ہے۔ ہمارے گاؤں کے ساتھ ہی جتنی گودھ

ہے۔۔۔ وہ وہاں منڈی میں ہوتا ہے۔“

”توکل۔۔۔ گاڑی میں کیا کر رہی تھی؟“ اچانک شاہ

زمان نے سوال کیا تو ماروی یکدم سے گڑبڑائی۔ لرزاتے

لہجہ میں بولی۔

”وہ۔۔۔ وہ بڑے سائیں۔۔۔ م۔۔۔ م۔۔۔ م۔۔۔“

”کیا میں۔۔۔ میں لگتی ہوئی ہے۔ ٹھیک سے

جواب دے۔“ شاہ زمان کا لہجہ سخت ہو گیا۔ وہ ماروی کے

ہاتھ کی انگلیاں بری طرح مروڑ رہا تھا۔

”وہ جی۔۔۔ بی بی جی۔۔۔ نے مجھے بھیجا تھا۔۔۔“

کا بچی آواز میں اس نے کہا۔

”کس کام کے لیے؟“ لہجہ بدستور تلخ تھا۔

ماروی کو کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کیا جواب دے پھر

ایک دم سے بولی۔ ”بازار سے کچھ سامان منگوانا تھا جی۔“

تکلیف کے سبب اس کی آواز کاب رہی تھی۔

شاہ زمان سوچ میں غرق ہو گیا۔ اس نے ماروی کا ہاتھ

چھوڑ دیا۔ ہاتھ کے اشارے سے بولا۔ ”اچھا۔۔۔ اب تو

جا۔“ شاہ زمان نے دور سے آتی بڑی آپا کو دیکھ لیا تھا۔

بڑی آپا مسکراتے ہوئے شاہ زمان کے برابر والی

کرسی پر بیٹھ گئیں، بولیں۔ ”میرے چھوٹے دیر کی طبیعت تو

ٹھیک ہے نا آج کل۔“

”میں بالکل ٹھیک ہوں بڑی آپا۔۔۔“ وہ خوش دلی

سے مسکرایا۔

”تیرا بھائی کیا ہے؟ زخم پورا ہو گیا ہے نا۔۔۔“

”ہاں۔۔۔ ہاں بڑی آپا۔۔۔ اب تو جی پورا پورا وزن

پڑتا ہے۔“

”وہ باز والا معاملہ کہاں تک پہنچا؟“ بڑی آپا حویلی

کے حالات سے آگاہ رہتی تھیں اور کسی حد تک اس

معاملات میں انوالوگ رہتی تھیں۔

”بڑی آپا۔۔۔ وہ باز ہماری سوچ۔۔۔ یہی یاد ہے۔“

”شاہ زمان جی آنکھوں میں پتک لپٹا لی تھی

”تمہارے خیال سے کیا ہے۔“

”بڑی آپا آپ کو یہ تو بات۔۔۔“

کیلوا اپنے۔۔۔“

سویرا دم بخود رہ گئی۔ پریشانی سے اس کا چہرہ کھج گیا۔

”بہ شکل بولی۔“ کیا۔۔۔ کھل کھلا ہے۔۔۔ میں نے۔۔۔؟“

”تم ابھی طرح جانتی ہو۔۔۔ حویلی میں کیا بکریاں رہے

ہیں۔۔۔ کسی چالیس چلی چار ہی ہیں۔ اندھا نہیں ہوں میں۔“

”میں اب بھی آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔۔۔ میں نے کونسا

جرم کیا ہے جس کی خبر مجھے نہیں ہے۔“ وہ درہاکی ہو گئی۔

”وقت آنے پر سب معلوم پڑ جائے گا۔۔۔ ابھی مجھ

سے اس بارے میں کوئی سوال مت پوچھو۔“

”مگر۔۔۔ میں۔۔۔“ اس نے کچھ کہنا چاہا۔

شاہ زمان سویرا کی بات کا کٹ کر بہت زور سے دھاڑا

اتنی زور سے کہ سویرا کو کمرے کی دیواریں لرزتی ہوئی محسوس

ہوئیں۔ ”میں نے ایک بار کہا نا۔۔۔ اس بارے میں مجھ سے

ابھی کوئی سوال مت پوچھو۔“

سویرا سہم گئی۔ خاموش ہو گئی۔ سندھ پونیورسٹی

میں کلاس فیلڈ کے ساتھ چہلپیں کرنے والی، رومانوی

شاعری کرنے والی۔۔۔ بات بے بات قہقہے لگانے والی

سویرا خاموش ہو گئی۔ عورت کو اپنا گھر بچانے کے لیے کیا

کچھ نہیں کرنا پڑتا۔۔۔ اس کا تاواں دل کچھ بہت لرزتا ہے،

ہل ہل دھڑکاتی ہے، سہم جاتی ہے۔

سویرا کی وہ رات خاموشی میں آنسو بہاتے ہوئے

مزر گئی۔ صبح ناشتے میں بھی شاہ زمان کا رویہ سویرا سے

ٹھیک نہیں رہا۔۔۔ وہ آدھا ناشتا کر کے باغیچے میں چلا گیا

۔۔۔ لنگراتے ہوئے حویلی کا چکر کاٹا۔ شاہ زمان نے نشست

گاہ میں ایک بڑھٹا طویل منگھو کی۔ پھر گیارہ

سائے گیارہ کے قریب باغیچے میں واپس آ گیا۔ اس نے

ایک ملازمہ کو ماروی کو بلانے کے لیے بھیجا۔ تھوڑی دیر

بعد ماروی سبزی سنی اس کے در پر تھی۔

”سر میں تیل کی مائل کر لیتی ہو۔“ شاہ زمان سخت

لہجہ میں بولا۔

”جج۔۔۔ جی بڑے سائیں۔۔۔ وہ ہکلاتے ہوئے بولی۔

”تو جاؤ پھر تیل لے آؤ۔“

ماروی دوڑتی ہوئی گئی اور دو منٹ میں واپس آ گئی۔

اس کے ہاتھ میں تیل کی بڑی بوتل تھی۔ اس نے احتیاط سے

سر میں تیل ڈالا اور مائل کرنے لگی۔

شاہ زمان کی آنکھوں میں جج کی چمک تھی۔ وہ تپتی

گردن کے ساتھ بڑے کر دفرے سے کرسی پر بیٹھا مائل کروا رہا

تھا۔ عادت سے مجبور مومچوں کو تاؤ دے کر بولا۔ ”کیا نام

شعخوں کے درمیان لڑائی کی وجہ بنا ہوا ہے۔“

”ہاں..... مجھے تمہوڑا بہت اس بارے میں پتا چلا تھا.....“

”شعخوں کی وہ لڑائی عروج پکڑ گئی ہے۔ وہ اب ایک ضد اور انا بن گئی ہے۔ نڈل ایسٹ پاکستان نہیں ہے جہاں ڈنڈے کے زور پر..... دھونس..... دھاندلی سے کوئی چیز حاصل کر لی جائے..... وہاں پر یہ سب چیزیں نہیں ہوتیں..... دونوں فتح یہ سب دنگا فساد نہیں کر سکتے مگر..... جو وہ کر سکتے ہیں ڈنڈے کی چوٹ پر کر رہے ہیں۔ سننے میں یہ خبریں بھی آ رہی ہیں کہ شان نامی بازی بولی ستر سے اتنی لاکھ ریال تک لگ گئی ہے۔“

”بڑی آپا کی آنکھیں حیرت سے پھل گئیں..... وہ تقریباً ہکلاتے ہوئے بولیں۔“ ستر..... اتنی لاکھ ریال..... یہ..... کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟“

”ہو سکتا ہے..... یہ خبر جھوٹی ہو..... یا بڑھا چڑھا کر بتائی گئی ہو..... مگر بڑی آپا..... اس میں ایسی کوئی انہونی بات بھی نہیں ہے۔ یہ سچ اپنے عیش و آرام اور کبھی کبھی تفریح طبع کے لیے لاکھوں ریال خرچ کر دیتے ہیں..... تو جہاں..... ضد اور انا کا مسئلہ پیدا ہو جائے..... وہ..... شاہ زمان نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

بڑی آپا کی آنکھوں میں بے پناہ چمک ابھر آئی..... شاہ زمان سے تمہوڑا قریب ہوتے ہوئے سرگوشی کے انداز میں بولیں۔ ”وہ باز..... اب ہے..... کہاں.....؟“

شاہ زمان آنکھوں سے بولا۔ ”بڑی آپا..... وہ ہمارے کنٹرول میں ہے۔ حضور جانڈو اور شوکت سیال کے حویلی پر کیے جانے والے حملے کے بعد..... وہ باز ہم نے یہاں سے ترنڈا بھیج دیا ہے۔ تھوڑے دن پہلے جو میں ترنڈا کیا تھا..... اسی سلسلے میں کیا تھا۔ سفید حویلی کے خانے میں ”شان“ اس وقت محفوظ ہاتھوں میں ہے۔ چار گارڈز اس کی حفاظت کر رہے ہیں۔“

”مگر..... شوکت سیال.....؟“ بڑی آپا نے فحہر ادھورا چھوڑ دیا۔

”حویلی پر بلا بول کے انہوں نے جو غلطی کی ہے، ان کی جان اتنی جلدی نہیں چھوٹنے کی۔ ابھی بھی میں بھائی جی سے اسی کیس کے بارے میں بات کر کے آیا ہوں..... حویلی پر حملے کے بعد جو پرچہ ہم نے کٹوایا تھا، اس میں ہم نے ایک قتل بھی شوکت سیال پارتی پر ڈال دیا تھا۔ عدالت میں کیس چل رہا ہے۔ آپ کو پتا ہے شوکت سیال کی

پشت پناہی کرنے والا حضور جانڈو ہے۔ ایکشن سر پر ہیں۔ فی الحال حضور جانڈو کوئی ایسا کام نہیں کرے گا جس سے اس کی پارتی کی ساکھ کو نقصان پہنچے۔ سننے میں آ رہا ہے کہ وہ تو حویلی پر کیے جانے والے حملے پر بھی مچھتا رہا ہے۔ اس کا خیال تھا۔ اس کے تربیت یافتہ کارندے گور بلا ایکشن کر کے بڑی صفائی سے باز ڈالے جائیں گے..... اور کسی کو خبر بھی نہ ہوگی مگر ہمارے بندوں نے نام صرف بیرونی خطرے پر آنکھیں کھلی رکھیں بلکہ حملہ آوروں کو بھرپور جواب بھی دیا۔ حضور جانڈو کی سازش بے نقاب ہوئی۔ اس کو لینے کے دینے پڑ گئے..... اب وہ کیس ختم کرنا چاہ رہا ہے اور ہم لوگ کیس کو طول دے رہے ہیں۔“

بڑی آپا متنی خیر انداز میں مسکرائیں، بولیں۔ ”اس کا مطلب ہے تم لوگ وہ باز دواہس کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے۔“

”نہیں بڑی آپا..... ہم نے کیا باز کا چار ڈالنا ہے۔ باز تو ہم حضور جانڈو پارتی کو دواہس کریں گے مگر کڑی شرائط پر۔“

”مگر تجھے تو کچھ ایسی خبر پہنچی تھی کہ وہ باز تمہارے ”بھائی جی“ نے شیر دے کے ذریعے چوری کر دیا تھا۔“

شاہ زمان آنکھ بچ کے بولا۔ ”بڑی آپا..... یہ چوڑی دھوہی کی سب سے خفیہ خبر ہے۔ کہتے ہیں دیواروں کے کان بھی ہوتے ہیں۔ اسی لیے خاموشی بہتر ہے۔“ وہ کرسی پر سیدھا ہوا۔ سرگوشی کے انداز میں بولا۔ ”وہ باز بھائی جی نے شیر دے کے ذریعے ہی حاصل کیا ہے مگر عدالت میں..... شیر دے پیش ہو کر اپنا بیان ریکارڈ کر دیا ہے کہ وہ باز اس نے ریم یار خان کے قریب ”ست پار“ گھر سے رانا قوم کے ایک بندے ”سٹی بار“ سے خریدی ہے۔“

”اور عدالت نے یہ سب سچ مان لیا.....؟“

”اور کیا تو نہیں..... عدالت کو سچ ماننا پڑا.....“ شاہ زمان زیر لب مسکرایا..... بڑی آپا کا سوالیہ انداز دیکھ کے بولا۔ ”ہم نے سٹی بار کو عدالت میں پیش کر دیا اور اس نے اقبالی بیان میں صاف کہہ دیا کہ یہ باز اس نے شیر دے کو فروخت کیا تھا۔“

”یہ سب کیسے ممکن ہے.....؟“ بڑی آپا کی حیرت عروج پر تھی۔

شاہ زمان نے ایک قہقہہ لگایا، بولا۔ ”بڑی آپا..... روپیہ..... یہ دنیا کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ اس سے آپ خوشیاں خرید سکتے ہو..... خواہشیں خرید سکتے ہو..... ایمان خرید سکتے ہو..... لوگ خرید سکتے ہو..... آپ کا کیا خیال ہے؟ سیاسی پارٹیوں کے آگے آگے چلنے والے

..... گھاپڑا کر خمرے لگانے والے لوگ اپنے لیزروں کے ساتھ ہوتے ہیں..... نہیں..... نہیں..... وہ نامراد و پیر ہوتا ہے جو انہیں اپنے پر مجبور کرتا ہے۔“

”مٹی باہر کے بیان سے تو حضور چاندیو پارٹی بری طرح پھنس جائے گی.....“ بڑی آباہنے کہا۔

”پھنس جائے گی کیا..... پھنس گئی ہے..... اب وہ دن دور نہیں جب شوکت سیال اور حضور چاندیو کھٹے کھٹے ہوئے چوڑی روحی آئیں گے..... کیس قسم گرانے اور باز کی اداسی کے لیے ہمارے ترے کرنے!“

بڑی آباغاموش تھیں۔

☆☆☆

وہ نیم دراز تھی اور سوچوں کے پتلی پر لگا کر اڑ رہے تھے۔ دور ریستان کے بیابانوں سے ایک ہوک سی اٹھتی تھی اور پورے ماحول پر چھا جاتی تھی یا شاید یہ ہوک اس کے اپنے کمن میں کرا لاتی تھی..... جس دن سے وہ دلاور کے کمرے میں گئی تھی اور اس نے لکڑی کے بس میں بڑی ہوئی وہ چیزیں دیکھی تھیں، اک احساس جرم نے اسے گھیر لیا تھا۔ اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے ایک ہی سوچ اس کے ذہن پر سوار رہتی تھی، کہیں اس کی بے وقوفی نے کسی کی زندگی عذاب تو نہیں بنادی تھی۔

دروازے پر کھکا ہوا تو وہ اندھ کر بیٹھ گئی۔ رخساروں کے پاس کسی چیز کا احساس جاگا۔ اس نے انگلی سے جھوٹو حیران رہ گئی..... وہ آنسو تھے جو بنا دسک دیے اس کی آنکھوں سے پھسل آئے تھے۔ آنسو تو کسی جذبے، کسی دکھ کے ساتھ آنکھوں سے چھٹکتے ہیں مگر یہ کیا ہوا تھا؟ اسے خود کو بھی پتا نہ چلا تھا اور اسے پتا بھی کیسے چل سکتا تھا..... یہ آنسو بالکل اس کی لامی محبت کی طرح غیر محسوس تھے جو اس کے وجود میں کسی بلنگی کی چنگاری کی صورت پنپ رہی تھی۔ اس نے جلدی سے اپنے آنسو صاف کر ڈالے۔ دروازے پر دسک ہوئی اور پھر ماروی اندر داخل ہو گئی۔

..... ”بیٹھ جاؤ۔“ سویرا ایک لگا کر بیٹھتے ہوئے بولی.....

..... ”تمہارا کام کہاں تک پہنچا؟“

..... ”بی بی جی! مجھے لگتا ہے بڑے سائیں کو شک پڑ گیا ہے۔“ وہ ہاتھ مروڑتے ہوئے بولی۔

..... ”کیا مطلب ہے تمہارا..... انہوں نے تجھ سے کچھ کہا؟“ سویرا کی پیشانی پر ٹپ پڑ گئے۔

..... ”میں اس دن دلاور کی گاڑی میں جا بیٹھی۔ بڑے سائیں نے مجھے دیکھ لیا..... بڑی غصے والی نظروں سے گھور

رہے تھے جی مجھے۔“

..... ”انہوں نے تجھ سے کوئی بات کی.....؟“

..... ”بات دانت تو نہیں کی جی..... پرانے دن مجھ سے کہنے لگے میرے سر میں تل کی مائل کرو۔“

..... ”تو پھر.....“ سویرا کال بہت زور سے دھرنے لگا تھا۔

..... ”میں نے کردی مائل..... مائل کر داتے ہوئے غصے سے پوچھنے لگے..... اس دن تو گڈی میں دلاور کے ساتھ کیا کر رہی تھی..... میری تو ٹانگیں کا پٹنے لگیں بی بی جی..... مجھے سمجھ نہ آئی کیا جواب دوں، پھر میں نے بہانہ بنایا کہ بی بی جی نے مجھے بھیجا تھا..... بازار سے کچھ چیزیں منگوائی تھیں۔“

..... ”آگے سے کیا بولے تمہارے بڑے سائیں۔“

..... ”بولے وہ لے کچھ نہیں..... غصے سے مونچھوں کو تازہ دیتے رہے اور بڑی گہری سوچ میں ڈوبے رہے۔“ سویرا کال ڈوبنے لگا۔ اسے شاہ زمان کا اس دن والا رویہ یاد آنے لگا۔ ”تم کھیلو..... کھیل اپنے..... تم ابھی طرح جانتی ہو حویلی میں کیا پکڑ چل رہے ہیں۔ اندھا نہیں ہوں میں.....“

تو کیا شاہ زمان باخبر ہو چکا تھا؟

اس نے ماروی کو جانے کا کہا اور کمرے کی لائٹ بند کر کے نیم دراز ہو گئی..... شاہ زمان نے کہا تھا۔ ”تم کھیلو کھیل اپنے.....“ ہاں تو وہ کھیل رہی تھی..... یہ کھیل کیونکہ وہ ایک کمزور عورت تھی.....

وہ سب کچھ برداشت کر سکتی تھی..... شاہ زمان کو کسی کے ساتھ بات نہیں کر سکتی تھی..... شاہ زمان جن نظروں سے ماروی کی جانب دیکھتا تھا..... وہ نظریں یہ اندازہ لگانے کے لیے کافی نہیں کہ..... بہت جلدی نہ تھی، ویر سے ہی کسی..... شاہ زمان ماروی سے ”بر طرح“ کے تعلقات استوار کر لے گا..... اور ”ضرورت“ پیش آنے پر اس سے بیاہ بھی پرجا لے گا..... ماروی عام لڑکی ہوتے ہوئے بھی عام نہیں تھی۔ اس کا خوبصورت چہرہ اور قیامت ڈھاتے جسمانی نشیب و فراز کسی کا بھی ایمان خراب کر سکتے تھے۔ اس سے پہلے کہ شاہ زمان کا ”ایمان“ خراب ہو جاتا..... سویرا..... ماروی کو دلاور کے ساتھ بھی کر دیتا چاہتی تھی۔

سویرا نے ہی ماروی کو اعتماد میں لے کر دلاور کے پیچھے لگا لیا تھا۔ ایک طرف وہ ماروی کو شاہ زمان سے دور رکھنا چاہتی تھی..... دوسری طرف تا بھی میں جو خطی اس سے ہوئی تھی، وہ اس کا ہوا کرنا چاہتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ دلاور..... ماروی کی طرف مائل ہو جائے اور دل میں لپٹے

والے مٹنی جذبوں سے چھٹکارا حاصل کر لے۔ وہ جذبے جن کا تعلق خود سویرا سے تھا۔ کچھ چیزیں بس منظر میں ہوتی ہیں، نظر نہیں آتیں۔ کچھ قیامتیں سمندر کی گہرائی میں ہوتی ہیں جو نگاہوں سے پوشیدہ ہوتی ہیں۔ سویرا، ماروی کو شاہ زمان سے دور رکھنا چاہتی تھی۔ دلاور کے قریب لانا چاہتی تھی۔ بظاہر تو وہ ایسا ہی چاہتی تھی مگر اس کے دل کے کہاں خانوں میں ایک چھوٹی سی ”ندی“ بھی بہتی تھی اور اس نندی کے پانی سے جیسے آواز آتی تھی۔

تم کب تک مجھ کو بھولو گے

اس دشت کی کنار اتوں میں اک درد جو ظہر ا ہوتا ہے

وہ درد بھی طے دیتا ہے

رہو کہ سسکیاں لیتا ہے

ایک نہیں بھی اٹھ کے کہتی ہے

تم کب تک مجھ کو بھولو گے

☆☆☆

وہ ابھی تک نہیں سمجھ پایا تھا۔ ماروی کیوں اس کے پیچھے ہاتھ دھو کے پڑ گئی ہے۔ جس دن سے اس نے بڑے سائیں کے ساتھ ماروی والی بات کی تھی، اس دن سے ماروی کی پیش قدمی ست ہو گئی تھی۔ وہ موقع کی تاک میں رہتی تھی۔ جب بڑے سائیں حویلی میں نہیں ہوتے تھے، وہ پنجم سے دلاور کے دروازے پر کھڑی ہوتی تھی۔

اس دن بھی وہ سیبوں والے باغ کی طرف سے چلا آ رہا تھا کہ وہ اچانک اس کے سامنے آ گئی۔ دلاور اس سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔ اس نے لمبے بالوں کی چٹائیں تجرے لگا رکھے تھے۔ ایک ادا سے دلاور کی طرف دیکھ کر بولی۔

..... ”تم بڑے ظالم ہو.....“

..... ”میں نے تو تجھے کچھ نہیں کہا۔ میں ظالم کہاں سے ہو گیا؟“

..... ”اے! وجہ تو تو تجھے ظالم کہہ رہی ہوں۔ تو مجھے کچھ کہتا ہی نہیں ہے۔“ وہ ادا سے ہراتے ہوئے بولی۔

..... ”کیا کہوں تجھے؟“ دلاور آج، دل لگی کے موڈ میں تھا۔

..... ”میری طرف غور سے دیکھ..... میرے حسن کی تعریف کر..... میرے بارے میں کچھ کہہ..... حویلی کا کون سا ایسا مرد ہے جو میرے حسن کی تعریف نہ کرے گا۔ بس ایک تو ہے جو پتا نہیں کس خیالی دنیا میں رہتا ہے۔ ایسا ٹھنڈا مرد میں نے بھی نہیں دیکھا۔“

..... ”تو آج صبح تیرا میرے سے چاہتی کیا ہے؟“

..... ”سے گا۔ تو ترپ جائے گا۔“

غریب محبت

”میں ترپنا چاہتا ہوں“

..... ”تو سن.....“ وہ ایک لمبے لمبے لہریلی، ایں لہ

دلاور کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ بولی۔ ”میں تجھ سے محبت کرتی ہوں..... تجھ سے شادی کرنا چاہتی ہوں“

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

..... ”تجھ نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

کی دھاریوں سے باز رہی اور اپنے اہل و عیال
جس اشکان سے وہ دار رہا، اگلی صبح ۱۰ صبح
ہو گیا..... وہ کپ پہنے گاڑی میں بیٹھا ڈرائیونگ ہوا صاف
کر رہا تھا کہ اچانک پچھلا دروازہ کھلا اور خبیو کا ایک جمونہ
گاڑی میں داخل ہو گیا۔ یہ وہ خاص مہک تھی جو دلاور سے
دم کی نہیں بھول سکتا تھا۔ یہ دلربا مہک تب پہلی مرتبہ اس
کے متعلق سے لکرائی تھی جب ڈوٹیج سویرا کو اس نے لا کر
تالا ب کے کنارے لٹایا تھا اور خبیو اس وقت تھیر تہوگی
تھی جب..... اس نے اپنے ہونٹ اس کے لبوں پر شبت
کے تھے۔

ہاں، وہ سویرا ہی تھی جو دوپٹا گلے میں ڈالے، بال
لہراتی گاڑی میں داخل ہوئی تھی۔
وہ سر جھکا کر میٹ بیگ میں سے کچھ تلاش کرنے لگی۔
اس کے کھلے بالوں نے اس کے چہرے کو ڈھانپ لیا۔ وہ
دلاوری سو جوگی سے لاعلم ہوئی۔ "اسلم! جلدی چلو..... مجھے
یونیورسٹی جانا ہے۔" اسلم اس ڈرائیور کا نام تھا جو ہمیشہ پر کیا
ہوا تھا۔

”بی بی! کون سی یونیورسٹی.....؟“ دلاور دھیمی آواز میں بولا تو مجھے سویرا ایک بجنے کے کسی خواب سے بیدار ہو گئی..... اس کی نسواری بالوں کی لٹیس گالوں پر بحمول رہی تھیں اور حیرت سے دہن تھوڑا سا کلارہ گیا تھا۔ یہ ادا نہیں تھی، فطری تاثر تھا..... مگر یہ تاثر قیامت ڈھار ہا تھا..... دلاور نے ایک لمبے کے لیے یہ قیامت دیکھی تھی اور پھر فوراً نظریں جھکا لیں۔

”دلدار... تم...؟“
 ”جی جی بی بی!“
 سیرا اپنے دیر کے لیے غاموش ہو گئی۔ اس کا دل
 بڑی تیزی سے دھڑکنے لگا تھا پھر وہ خود کو اعتدال پر لاتے
 ہوئے بولی۔ ”بہادر پور یونیورسٹی جانا ہے۔ رستہ معلوم ہے
 تمہیں...؟“

”بہت عرصہ پہلے آپ کو لے کر گیا تھا۔ کچھ کچھ یاد ہے۔“
 ”دوسرا ڈرائیور اسلم کھر ہے۔؟“
 ”میرا خیال ہے وہ چھٹی پر ہے۔ بڑے سامعین نے
 اس کی جگہ میری ڈپٹی لگا رکھی۔“

جاؤ..... بھول جاؤ گے تو میں بتا دوں گی۔“ دلاور نے ایک جھٹکے سے گاڑی آگے بڑھادی۔ سویرا اور دلاور معاشرتی تفاوت کے باوجود کبھی اچھے دوست تھے مگر وقت نے دراز

آج بھی وہ پتہ قدیری کے نیچے بیٹھا تھا۔ آٹھ گھنٹے
تھیں۔ شاہ زمان کسی کام کے سلسلے میں ٹھوڑے دنوں کے
لے لے کر اچھ گیا ہوا تھا..... حویلی کی عورتوں کا ڈرائیور بیوی کی
دھجکی کی وجہ سے جھمی پر تھا اور شاہ زمان جاتے ہوئے دلاور
کی ڈیوٹی ڈرائیور خانے کی ڈرائیونگ پر لگا گیا تھا۔ اس نے
بہت ہاتھ پاؤں مارے تھے مگر کوئی بہانہ نہ چل سکا تھا۔

دلاور بہت رات تک پتہ قدیری کے نیچے بیٹھا رہا اور سوچتا رہا..... سویرا کی ایک ایک بات اس کی ساعت میں گونجنے لگی..... اس کی ہر ہر حرکت..... ہر ہر ادا..... گلابی ہونٹ جسے جن کے گداز میں اس کا دل دھستا چلا جا رہا تھا۔ یہ صرف نرم و نازک ہونٹ نہیں تھے، ایک دلدل مٹی جس میں وہ ناک تک ڈوب چکا تھا۔ ہاتھ پر بندھتے تھے..... پورا جسم منطوق تھا۔ صرف ناک سے سانس کی آہد رفت جاری تھی۔ اس کا دل بوجھل تھا۔ سانس اندر کھینچنے سے پورے جسم میں درد جاگ اٹھتا تھا۔

یگانہ اس نے تیر سانس کھینچنا شروع کر دیے۔
دلدل اسے نگل رہی تھی۔ وہ اچانک اتنی زور سے چیخا کہ اس
کی آواز دور دریا بانوں تک سفر کرتی چلی گئی۔ اجنبی ستانوں
تک پھیلتی چلی گئی۔ اس نے گمراہی کی ایک شاخ
تھام لی۔ یہ کانڈوں والی بیڑی تھی۔ کئی کانڈے اس کی پھلتی
اور اگلیوں میں جھومتے ہوئے تھے۔ وہاں ایک تیز جھونکا آ
اور رات کے اس سے ریت کے کئی ڈرتے اس کی ٹمنا کہ
آغموں میں گھر گئے۔ مرد تھا۔ رونا نہیں چاہتا
تھا۔ مگر ریت کے ڈروں نے ایک جواز پیدا کر دیا تھا۔

تم کب تک مجھ کو بھولو گے
اس دشت کی تنہا راتوں میں اک درد جو ٹھہرا ہوتا ہے
وہ درد بھی طعنہ دیتا ہے
ایک ٹیس بھی اٹھ کے کہتی ہے
تم کب تک مجھ کو بھولو گے.....

☆☆☆

پچھلی رات بہت دیر تک وہ روئے میں رہا تھا۔ اس نے دانستہ ایسا کیا تھا۔ وہ جانتا تھا کسی بھی وقت وہ استحقاق شروع ہو سکتا ہے جس سے وہ اتنے عرصے سے نظر کی چڑا آیا ہے..... دلدار کے عشق کی کہانی بھی کتنی عجیب و غریب تھی۔ وہ یہاں سے فرار چاہتا تھا..... محرومی طبعی چھوڑ کر اب بھی نہیں چاہتا تھا۔ وہ سویرائی نظروں سے اوجھل رہنا چاہتا تھا مگر اس کی قربت کی خوشبو میں معطر بھی رہنا چاہتا تھا۔ شام بلندی کے دیواروں کے اندر کے نقائص اور ستے..... شیخ

دلدار اکثر شاہ زمان یا پھر فضل کی گامی ڈرائیو کرتا تھا۔
 ”بہاری“ سے ٹھیک ہونے کے بعد یہ ڈیوٹی اس نے خود
 بڑے سامعین سے سفارش کر کے گواہی لی۔ وہ سیر کی گامی
 ڈرائیو کرتے نہیں چاہتا تھا۔ وہ اس کا سامنا کرتے نہیں چاہتا تھا مگر
 عجیب بات تھی کہ یہاں سے جا بھی نہیں چاہتا تھا۔

وقت پر لگا کر اڑنے لگا تھا۔ بارہی اب بھی وقتا فوقتا اس سے ملنے آتی تھی مگر وہ بھی جان چکی تھی کہ ان تینوں میں تیل نہیں۔ مجبوراً سویرا بی بی کے کہنے پر اسے یہ ڈیوٹی سہرہاں واپس گئی۔ حضور چاند بڑے کیس زور و شور سے چل رہا تھا جس میں شاہ زمان کا پلڑا بھاری تھا۔ "شان نامی باز" ترنہ میں سفید حوٹلی کے تہ خانے میں بالکل محفوظ تھا۔ وہ ایک ہلینک چمک تھا۔ شاہ فرماں کی غیر قانونی اسمگلنگ جاری تھی۔ ایک دو بار اس نے سوچا کہ اس شان نامی باز کے سلسلے میں دونوں شیخوں سے خود سودا کیا جائے مگر ایسا کرنے سے اسے شاہ زمان اور پیر فضل نے باز رکھا تھا۔ ان کا کہنا تھا اس سے بہت سی پیچیدگیاں پیدا ہونے کا خدشہ ہے۔

شاہ زمان کا ماروی سے آگے نہکا مسلسل جاری تھا۔ یہ سویرا اور شاہ زمان کے درمیان ایک سرد جنگ تھی۔ سویرا ماروی کو شاہ زمان سے دور رکھنے کے لیے جو کر سکتی تھی، وہ کر رہی تھی..... جبکہ شاہ زمان ماروی سے قربت کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا۔

ملتان دو چار دفعہ دلاور سے ملنے حویلی آیا تھا پھر واپس پنڈی چلا گیا تھا۔

دلاور کا کئی دفعہ سویرا سے آنا سامنا ہوا تھا اور وہ کسی پہاڑ سے کسی کٹر اگر گزرا جاتا تھا۔ اس کے دل کا جس جب بعد سے بڑھا جاتا تھا تو وہ رات کے وقت روپی کی طرف نکل جاتا تھا۔ فخری اسے اکثر منع کرتا کہ رات کے وقت چھڑائیوں اور نیکری کے جڑوں میں سانپ بھی ہوتے ہیں۔ پر وہ کسی کی سنتا کب تھا۔ شیشے کی بلند پوئیاں اور کے اندر کچھ نائی نہیں دیتا تھا۔ وہ رات کے وقت اکثر چلتا ہوا اور تک اٹھ جاتا۔ لیکٹس کے پودوں سے پتہ چاتا۔ نیکر کے رختوں سے ہمکا ہوتا وہ ایک ریتیلے نیلے سے پار ایک سے قد بھری کے نیچے جا بیٹھا۔ یہ جگہ اس کی جائے پناہ تھی۔ اس سے آگے روپی کی بے آب و گیاہیں اور وسعتیں تھیں۔ یہاں اجنبی ستائے "بستے" تھے۔ اجنبی ستائے جو اس کا پہلا شوق تھے۔ ان ستانوں اور سویرا کے عشق میں کتنی مہمات تھیں۔ سویرا کا عشق بھی پہلے عشق کی طرح خاموش، پر اسرار راجا لیا تھا۔

..... مگر بڑی بڑی فولادی بیڑیاں ہیں جو میرے پاؤں میں پڑی ہوئی ہیں۔ میں بھاگتا ہوں اور منہ کے بل گر جاتا ہوں۔ پھر اٹھ کے دوبارہ کوشش کرتا ہوں پھر گر پڑتا ہوں۔ میری ٹانگیں زخمی ہو چکی ہیں، میرا سارا جسم چھلنی ہو چکا ہے۔..... رادوی۔ تم نے کسی ایسا پرندہ دیکھا ہے جو آگ میں جل رہا ہو..... وہ اڑنا چاہے تو نہ اڑ پائے..... اور نہ ہی موت سے اس کی غلامی ہو.....“ دلاور بھائی نے انداز میں بول رہا تھا اور آنسوؤں کی کمی اس کی آنکھوں میں بکھورے لے رہی تھی۔

ماروی کے جسم میں واضح کچکی طاری ہو چکی تھی.....
اس کا وہاں بیٹھنا محال ہو رہا تھا۔ اس نے کوئی بہانہ بتایا اور
وہاں سے بھاگ نکلی.....

☆☆☆
اس دن کے بعد ماروی نے دلاور کے پاس جانا کم
کروایا۔ سویرانے وجہ پوچھی تو ماروی نے صاف کہہ دیا۔
”بی بی جی..... میں نے ہر طریقہ استعمال کر کے دیکھ لیا
ہے۔ وہ بندہ تو اس سے مس نہیں ہوتا..... کسی مجب مٹی کا بنا
ہوا ہے بلکہ اب تو مجھے اس سے خوف آنے لگا ہے۔ بڑی
اول جلول سی باتیں کرتا ہے جی وہ.....“

”کیا کہتا ہے.....؟“ سویرا کے لہجے میں تجسس تھا۔
 ”وہ..... مجھ کی نہیں کسی کیسی باتیں کرتا
 ہے۔ کسی عشق کی..... کسی برف کی..... کبھی کہتا ہے تم نے
 زندہ لاش چلی پھرتی دیکھی ہے۔ میرے پلے تو کچھ نہیں
 پڑتا لی بی بی.....“

سویرا کی آنکھوں میں دکھ گہرا ہو گیا..... انگلی میں
پڑی انگوٹھی کوسروڑتے ہوئے بولی۔ ”اور کیا کہتا تھا۔؟“
”کہتا ہے میں برف کا آدی ہوں۔ اس کی باتیں
سن کر تو میں کانپ گئی تھی..... بی بی جی آپ..... آپ.....
یہ کام اور کسی گودے دیں۔ دلاور بڑا اور ٹائپ کا
بندہ ہے۔ چاہئیں کن پکڑوں میں سے۔“

حویلی کا ہر مرد اسے یوں دیکھتا تھا کہ ابھی کھا جائے گا۔ ان مردوں میں سویرا کا خاندن سرفہرست تھا اور کیوں نہ ہوتا..... وہ اس حویلی کا بڑا سا مین تھا اس سے زیادہ حق ماروی بر کی کسی کا نہیں جانتا تھا۔ وہ اسے نوج کر بھی کھا جاتا تو کسی کی مجال نہیں تھی۔ سویرا کا دل کوئی پھٹلی میں لے کر مٹنے لگا۔ وہ ایک تیرہ سے دو ڈکار کرنا چاہتی لیکن لگتا تھا کہ ایک بھی نہ کر سکے گی۔

☆☆☆

ایک جھجک پیدا کر دی تھی دونوں کے بیچ..... دس پندرہ منٹ کی ڈرائیونگ کے بعد بالآخر وہ جھجک سویرا نے ہی دور کی۔ وہ دنڈا سکرین سے پار کھلے بے آباد میدانوں کی جانب دیکھتے ہوئے بولی۔ ”دلدار! تمہیں معلوم ہے، میں تم سے سخت خفا ہوں۔“

دلدار کا تاثر ایسا تھا جیسے اس نے سویرا کی بات سنی ہی نہیں..... وہ صرف جواباً ”اچھا جی.....“ کہہ کر خاموش ہو گیا۔

”تم یہ نہیں پوچھو گے کیوں خفا ہوں.....؟“ سویرا کہیں دور دیکھتے ہوئے بولی۔

”آپ خود ہی بتا دیجیے.....“ اس نے مختصر جواب دیا۔ ”تم میری شادی میں کیوں نہیں آئے..... میں خاص طور پر تمہیں کارڈ بھیجی دے کر گئی تھی.....“ اس کی ذات میں موجود شیشی کی بلند دیواروں کے اندر ایک دم سے بھونپال آ گیا۔ شیشے دھڑا دھڑ بچنے لگے..... اندر کی زہریلی فضا میں اذیت بڑھ گئی..... وہ ہنسنے لگا۔

”بی بی جی! میں نے آپ کو بتایا تھا۔ ان دنوں میں سخت بیمار تھا..... اس لیے نہیں آ سکا۔“

”بعد میں بھی تم نے مبارک دینے کی زحمت نہیں کی..... کیا ناراض تھے مجھ سے؟“ آخری جملہ بڑی دلربائی سے کہا گیا تھا۔ دلدار کے وجود کا سارا بوجھ اس کے دل میں اکٹھا ہو گیا۔ دل دھڑا دھڑ بچنے لگا۔ وہ بولا۔

”نہیں بی بی جی!..... میری آپ سے کسی ناراضی۔“

”تم نے یہ بی بی جی..... کی کیا رٹ لگائی ہوئی ہے۔“ سویرا نام سے میرا..... وہ معذرتی سے بولی۔

”نہیں بی بی جی..... اب نہیں.....“ وہ روٹا ہوا لہجہ لگا۔

”کیا اب نہیں.....؟“ وہ حیرت سے بولی۔

”اب آپ ہمارے بڑے سائیکس کی ٹیم صاحبہ ہو.....“

”اب میں آپ کو نام سے نہیں پکار سکتا۔“

”کیا اسٹوڈنٹس پائس کرتے ہو.....“

”آپ جو مرضی کہیں جی..... اب اس منہ سے آپ کا نام ادا نہیں ہوگا۔“ دلدار نے بے پروائی سے کہا تو یکدم سے سویرا کے دل کو ایک دھچکا سا لگا..... یہ ایک الارم تھا..... ہلکا سا اپنی ٹیبلت تھا..... اس کے دل کے نہاں خانے میں جو ایک جھپٹی سی ندی بہتی تھی، اس کی لہروں میں تلاطم پیدا ہوا تھا۔ سویرا تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو گئی۔ گم غم ٹیبلٹ دنڈا سکرین سے باہر تیزی سے گزرتے ہوئے مناظر کو دیکھتی رہی۔ پھر جیسے کسی خیال سے جاگتے ہوئے بولی۔

”دلدار! باروی کے ساتھ تمہارا کیا پکڑ ہے.....؟“ وہ پھٹکی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ”بی بی جی! مجھے نہیں معلوم وہ لڑکی کیوں ہاتھ دھو کر میرے پیچھے بڑی ہوئی ہے۔ کئی دفعہ تو یوں لگتا ہے وہ مجھے نوکری سے نکال دے گی.....“

آخری بات دلدار نے اپنے پاس سے جان بوجھ کر لگا لی تھی۔ سویرا ایک دم سے سیدھی ہو گئی، تھوڑے جو شیشے لہجے میں بولی۔ ”تم بالکل پروا نہ کرو..... تمہیں یہاں نوکری سے کوئی نہیں نکال سکتا..... اس کی گارنٹی میں تمہیں دیتی ہوں..... اور دوسری بات یہ کہ تم یہاں نوکری ہو سکتی نہیں..... تمہاری حیثیت کچھ اور ہے۔“ اس نے چند لمبے توقف کر کے بات جاری رکھی۔ ”اور اگر تم واقعی باروی میں دلچسپی رکھتے ہو تو میں اس سلسلے میں تمہاری مدد کر سکتی ہوں۔“

”آپ میری کیا مدد کریں گی.....؟“

”میں تمہاری شادی باروی سے کروانے میں مدد کر سکتی ہوں۔ ویسے ایک دوست ہونے کے ناتے میں کہوں گی..... باروی دل کی بہت اچھی لڑکی ہے..... تم دونوں ایک ساتھ بہت اچھے لگو گے۔“ سویرا کی آنکھوں میں جھک سی تھی۔

دلدار سر جھکا کر تھوڑا سا کھانا جس سے گلے میں لگا بے بسی کا پسند اکل گیا۔ وہ بولا۔ ”بی بی جی! آپ کے غلوں اور تقانون کا بے حد شکریہ..... مگر میں شادی نہیں کرنا چاہتا۔“

”باروی سے نہیں کرنا چاہتے..... یا.....“

”میں شادی ہی نہیں کرنا چاہتا۔“ پتا ہے بی بی جی..... یہ سب دل کا مکمل ہے۔ جب دل مر جاتا ہے تو ہر چیز، ہر جذبہ ایک سی تل پر آ جاتا ہے۔ ہونے..... نہ ہونے میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ زندگی اور موت میں کوئی فرق نہیں رہتا۔“

سویرا کا دل گھبرانے لگا۔ وہ جلدی سے بات کا رخ موڑتے ہوئے بولی۔ ”آگے کسی بازار پر گاڑی روکنا، مجھے کچھ چیزیں خریدنی ہیں۔“

آگے بیٹروں پپ کے ساتھ ایک اسٹیک پر تھا سویرا اندر گئی اور تھوڑی دیر بعد واپس لوٹ آئی اس کے ہاتھ میں بڑا شاپنگ بیگ تھا جس میں جنک فوڈ ٹاپ بہت سی چیزیں تھیں۔

دلدار نے نہ جان سکا کہ سویرا کو اپنا من بھانپ کر کے آئی ہے۔ اس کی آنکھوں کے نیچے چوٹنے..... گھائی دیکھنے لگے تھے۔ باقی سفر خاموشی سے گزرا۔ دو گھنٹے کی مسافت کے بعد وہ بہاولپور یونیورسٹی پہنچ گئی۔ یونیورسٹی کے ساتھ ساتھ بہت سے کوارٹرز بنے ہوئے تھے۔ سویرا بڑا شاپر لے کر ایک کوارٹر میں گھس گئی..... اس کی وہاں سے واپسی قریباً

شرقی صحبت

یہاں سے رخصت تو نہ ہوتی.....“

”تو بہت بے غیرت آدمی ہے۔ جب وہ تیری بھابی ہوتی۔“ دلدار نے ہنس کے کہا تو حیرت سے اس کا منہ کھل گیا کھینا سا ہو کر بولا۔

”یار! میں تھوڑا اجنبات میں آ گیا تھا۔ پھر تو وہ واقعی ہماری بھابی بن جاتی..... سویری! مجھے معاف کر دے۔ یہ عورت ذات بڑی فتنے کی چیز ہے اور اگر خوبصورت ہو..... تو.....“

دلدار نے کہا۔ ”ظفری! ایک بات میری سمجھ میں نہیں آتی..... بڑے سائیکس اور شاہ فرمان کراچی کی کام سے گئے ہوئے ہیں۔ جیہ فضل بیون شریف عرس کی تقریبات میں مصروف ہیں۔ پیچھے سے ماروی کا نکاح۔“

”اس میں کون سی انہونی بات ہے۔ ماروی کی ماں تو بچپاری بڑے عرصے سے ماروی کی شادی کے لیے گھر مند تھی..... ماروی کی خوبصورتی نے اس کی راتوں کی نیندیں اڑا رکھی تھیں..... بھلا وہ سویرا بی بی کی جانوں نے خود آگے بڑھ کر یہ فرض ادا کیا ہے..... مالک ہوں تو ایسے ہوں۔“

دلدار ظفری کی بات سن کر خاموشی سے اسے دیکھتا رہا پھر بولا۔ ”بڑے سائیکس اور شاہ فرمان دونوں کچھ دنوں سے کراچی میں ہیں۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا۔ دونوں بھابی ہی حویلی سے غائب ہیں۔“

”تو حویلی میں رہتے ہوئے بھی حویلی میں نہیں ہوتا۔ مجھے لگتا ہے جو تورات بہت دیر تک روپی کے ویرانوں میں بٹھا رہتا ہے، اس نے تیرے دماغ پر اثر کیا ہے۔ ایسی کھلی جگہوں پر بھوت پریت ہوتے ہیں..... آدمی کو نقصان پہنچاتے ہیں۔“

دلدار ہنس دیا بولا۔ ”ان سے زیادہ نقصان مجھے انسانوں نے پہنچایا ہے۔ تو حویلی کے اندر والی بات بتا۔ جو میں حویلی میں رہتے ہوئے بھی نہیں جانتا۔“

ظفری دلدار کی بات پر مسکرا دیا۔ انکشاف آمیز لہجہ میں بولا۔ ”وہ بازار والا معاملہ تو جانتا ہی ہے نا.....“

دلدار نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”اسی سلسلے میں دونوں بھابی کراچی میں ہیں۔ رنیم سائیکس بھی کراچی میں ہیں۔ تم نہیں جانتے ہو کہ رنیم سائیکس..... یہ منڈیمیر کے پاس ایک گھٹھ کے مالک ہیں۔“

دلدار، رنیم سائیکس کو جانتا تھا مگر خاموش رہا۔ رنیم سائیکس وہی تھے جنہوں نے جیب ٹاپ میں ان کے..... زنجی شاہ زمان اور سویرا کی مدد کی تھی.....

آدھے گھنٹے بعد ہوئی۔

وہ واپس آئی تو قدرے خوش تھی۔ بولی۔ ”چلو دلدار..... ہمیں اب صرف چند منٹ کے لیے مین بازار میں رکنا ہے۔ پھر حویلی واپس چلیں گے۔“

شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے جب وہ لوگ حویلی پہنچے گاڑی سے اترتے ہوئے سویرا بولی۔ ”دلدار! تم مجھے بی بی جی..... کہو..... یا جو مرضی کہو..... میری نظر میں پہلے بھی تم میرے دوست تھے، آج بھی میں تمہیں وہی دلدار سمجھتی ہوں۔ خود کو سنبھالو..... پہلے والے دلدار بن جاؤ..... جوڑ میروں باتیں کرتا تھا۔ ہر کسی کا دل لگانے لگتا تھا۔“

وہ خاموشی سے سر جھکا کر رہ گیا۔

☆☆☆

ایک دن دلدار بستر پر پڑا سو نے کی تیاری کر رہا تھا کہ ظفری مسنی خیر انداز میں مسکراتا ہوا اس کے پاس آ گیا۔ دانت نکالتے ہوئے بولا۔ ”ایک خوش خبری ہے..... اور ایک بری خبر ہے۔ بول پہلے کون سی باتوں.....“ ایک لمبے کے لیے رک کر اس نے سر پر ہاتھ مارا بولا۔ ”یار..... خبر اصل میں ایک ہی ہے مگر وہ کسی کے لیے اچھی ہے..... کسی کے لیے..... دل دکھانے والی۔“

”پہیلیاں کیوں بھجوا رہا ہے..... بات بتا کیا ہے؟“

”بات اصل میں یہ ہے کہ حویلی کی رونق، حویلی سے رخصت ہو گئی..... ہوئی بڑی خبر اور اچھی خبر یہ ہے کہ ماروی سے تیری جان چھوٹ گئی ہے۔“

دلدار کا منہ کھلا رہ گیا۔ ”واقعی؟“

”ہاں..... واقعی..... سویرا بی بی نے ماروی کا نکاح بہاولپور میں ایک بندے سے کر دیا ہے۔ ان کی ایک کلاس فیلو کا کزن بہاولپور یونیورسٹی کے کوارٹرز میں رہتا ہے۔ خوش شکل اور مختصر ہے۔ ہے بھی ماروی کی برادری کا۔ سویرا بی بی نے ماروی کی ماں سے بات کی۔ اندھے کو کیا چاہیے دو آنکھیں..... اس نے فوراً ہائی بمرلی..... دو چادر دنوں میں یہ سارا پیکر چلا اور ماروی ساری حویلی کو سوتا کر گئی۔“ ظفری فحش ذی سانس بچھ کر بولا۔

دلدار کو یاد آئے لگا۔ سویرا اسی کے ساتھ تو بہاولپور گئی تھی۔ تو کیا وہ ماروی کے رشتے کے سلسلے میں گئی تھی؟ وہ انہی سوچوں میں تھا کہ ظفری نے اسے کندھوں سے پکڑ کر بیچوڑ ڈالا۔

”یار!..... تو بھی بتائیں کیا مر دے..... وہ تیرے آگے پیچھے پھرنی رہ گئی اور تو نے اس کو کھاس تک نہیں ڈالی۔“

”کھاس ڈال کے کیا کرتا.....؟“

”اس سے شادی کرتا۔ کم از کم حویلی کی رونق.....“

”بڑے سامیں! وہ..... وہ..... اس کی ماں..... جو ہے..... اس نے پچھلے مہینے نکاح کر دیا ہے اس کا..... وہ چلی گئی ہے یہاں سے.....“

یہ انکشاف نیشے میں دعت شاہ زمان کے لیے دھماکے سے کم نہیں تھا۔ وہ اپنی نشست سے اٹھ کھڑا ہوا سناٹا میل پر پڑائیش قیت گلدان کھما کر زمین پر دے مارا۔ شیشے کا وہ گلدان کرچی کرچی ہو گیا۔ وہ ناقابل یقین غراتے لہجے میں بولا۔ ”لاؤ بلا کر اس کی ماں کو میرے پاس.....“

اگلے چند منٹوں میں ماروی کی آدمی سوئی، آدمی جاگی ماں شاہ زمان کے سامنے کھڑی تھی۔ اس نے بکھرے بالوں کو چادر میں لپیٹ رکھا تھا۔ وہ حواس باختہ تھی۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اتنی رات گئے اسے کیوں بلایا گیا ہے۔ ٹوٹے گلدان کو دیکھ کر اس کی ری سکی ہمت بھی جواب دے گئی تھی۔ شاہ زمان کی آنکھوں میں لہو اڑا ہوا تھا۔ وہ آنکھوں کو سکیڑتے ہوئے، گہری خونخاک نگاہوں سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ ”ماروی! کہاں ہے؟“

”بڑے سامیں! اس کی شادی ہو گئی ہے..... اب وہ بہاؤ پور اپنے سرسراں میں ہے.....“

ماروی کی ماں نے کانپتے لہجے میں کہا تو شاہ زمان ناقابل یقین تیزی سے آگے بڑھا۔ اس نے اس یوزمی کمزور عورت کے بال اپنی مٹھی میں جکڑ لیے، ایک جھٹکا دیا جس سے اس کی چادر اتر گئی۔ وہ درد سے کراہ اٹھی بالوں کی گرج سے لہجے میں بولا۔ ”تیری مجال کیسے ہوئی اس کی شادی کرنے کی..... بڑے سامیں کے حکم کے بغیر تو یہاں پتا بھی نہیں جاتا..... اور تو نے..... اتنا بڑا کام مجھ سے پوچھے بغیر کر دیا.....“

شاہ زمان نے ایک جھٹکے سے اسے پرے پھینکا۔ وہ نہایت قیمتی پانچ فٹ اونچے پلر گلدان پر گر گئی۔ گلدان گرا اور ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ ماروی کی ماں کی کلائی زخمی ہو گئی۔ گلدان ٹوٹنے سے وہ اور پیش میں آ گیا یا اسے بہانہ مل گیا۔ اس نے یوزمی عورت کو فوکر پر رکھ لیا۔ وہ چیختی گئی۔ خدا رسول کے واسطے دینے لگی۔ مگر الکحل کے زیر اثر شاہ زمان کے کان پر جوں تک نہ رہی۔ اس کے ہاتھ اور پاؤں اس وقت رکے جب اس عورت کے منہ سے سویرا بی بی کا نام نکلا۔ وہ رزاں رو تے لہجے میں بولی۔

”بڑے سامیں!..... امیری کیا مجال میں آپ کے حکم کے بغیر لڑکی کی شادی کر دوں..... وہ تو..... سویرا بی بی نے جلدی جلدی سارا انتظام کیا..... میں نے تو ایک دو دفعہ

روسی کی ریشمی زمین میں دنگ بچا دیا تھا۔ ایک جوان..... ملے رنگ کا سرانگی جس نے سر پر شیشوں والی ٹوپی پہن رکھی تھی اور جس کا سیلا چہرہ بھی جڑی کی تیز روشنی میں لٹکتا تھا، کان پر ہاتھ رکھ کر کوئی تان لگا رہا تھا۔

طوائفوں پر جوں جوں ٹوٹ نچھاور کے جاتے تھے، ان کے پیرو اور زیادہ تیزی سے حرکت کرنے لگتے تھے۔ ”شان“ باز تین کروڑ کے عوض حضور چاندیو کو داپس کیا جاتا تھا۔ جرگے میں ملے ہوا تھا کہ رقم پہلے ادا کر دی جائے گی، بازمین دن بعد حضور چاندیو کے کوطھ میں خود شاہ فرمان پہنچا کر آئے گا۔ اس پر بہت اعتراض تھا۔ حضور چاندیو نے کہا تھا کہ باز رقم ادا کرتے وقت ہمارے حوالے کیا جائے۔ جس پر دونوں بھائی متفق نہیں ہوئے۔ بہت لمبی چوڑی بحث کے بعد رجیم سامیں کی گارنٹی کے ساتھ یہ معاملہ طے ہو گیا۔

رقم چوڑی روحویلی والوں کے اکاؤنٹ میں پہنچ چکی تھی۔ جن دو بندوں کا تبادلہ ہونا تھا، وہ بھی ہو چکا تھا۔ جو آدمی حضور چاندیو سے رہا ہو کر آ یا اس کا نام ”ٹریکٹر“ تھا۔ اب رقم چیک میں منگرو ہونے کے بعد فوری طور پر اس جشن کا اہتمام کیا گیا تھا۔

جشن ختم ہونے کے بعد اس رات نیشے میں دعت شاہ زمان حویلی میں داخل ہوا۔ مہمان خانے میں اکڑ کر بیٹھے ہوئے بولا۔ ”جاؤ شیر! ماروی کو بلا کر لاؤ۔“ اس کا لب ولہجہ بالکل شان تھا۔

”مگر سامیں..... اس وقت..... اس وقت آپ سو جائیں۔“ شیر نے فقرہ ادھر اچھوڑ دیا۔ ”رات کا ایک بج رہا ہے۔“

”بکواس کرتے ہو..... زبان چلاتے ہو..... بڑے سامیں کے آگے..... جس کو احرا دے کی مجال ہے..... جو میرے حکم کو نہ مانے..... بلاؤ..... اس ناگن کو..... جس نے..... یہاں.....“ وہ اپنے دل پر ہاتھ رکھ کے بولا۔ ”یہاں ڈنگ مارے ہیں..... آج میں حساب برابر کرنا چاہتا ہوں۔“

”بہت اچھا بڑے سامیں!“ شیر یہ کہتا ہوا پچھلے پاؤں پلٹ گیا۔ اس کی داپس چند منٹ بعد ہوئی۔ وہ تھوڑا ٹھہرا یا ہوا تھا۔ لرزتے لہجے میں بولا۔ ”وہ..... وہ بڑے سامیں..... ماروی تو یہاں نہیں ہے۔“

شاہ زمان گردن نیچر کر کے بخور لہجے میں بولا۔ ”یہاں نہیں ہے..... یہ کیا بکواس کر رہا ہے..... تو.....؟“

اپنے ڈیرے پر لے آئے تھے۔ ان کی مرہم پٹی کروائی تھی، بعد میں انہیں کھانا بھی کھلایا گیا تھا۔

ظفری کی بات جاری تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”رجیم سامیں سچ میں پرکڑ حضور چاندیو اور بڑے سامیں کی صلح کروا رہا ہے۔ خبریں یہ آ رہی ہیں۔ رجیم سامیں کافی حد تک کامیاب ہو گیا ہے۔ بڑے سامیں بھاری رقم کے عوض شان باز داپس کرنے پر راضی ہو گئے ہیں اور جو کس عدالت میں چل رہا ہے، اسے بھی داپس لیا جا رہا ہے۔“

ظفری کچھ دیر خاموش رہا پھر اٹھوڑا لیتے ہوئے بولا۔ ”یار! یہ ہمارے صاحب لوگ دیسے پیسے کے بڑے بھاری ہیں۔ دیکھو.....“ ”شان“ باز خود چوڑی کروایا اور بعد میں بھاری رقم کے ساتھ اب داپس کیا جا رہا ہے۔ حضور چاندیو پارٹی سے حویلی پر حملے والی غلطی ہوئی جس کی وجہ سے وہ پھنس گئے۔ اب دیکھو یہ کیس چھ مینے چٹا رہا۔ کیس ختم کروانے کے لیے علیحدہ سے رقم لی ہے بڑی سامیں اور شاہ زمان نے.....“

”وہ کیسے؟“..... دلدار حیرت سے بولا۔

”خون بہا..... شاہ فرمان نے عدالت میں جو بیان دیا تھا، اس میں اپنا ایک بندہ متوکل بیان کیا گیا تھا۔ اسی لیے تو یہ کیس حضور چاندیو کے گلے کا پھندا بنا رہا تھا۔ اب یہ کیس ختم ہو گیا ہے یا ہونے کے قریب ہے۔ حضور چاندیو سے اس بندے کا خون بہا لیا جا رہا ہے۔ جو بھی قتل ہوا ہی نہیں، کیسی لطفے والی بات ہے۔ دو بندوں کا تبادلہ بھی ہوگا ایک وہ جو حویلی پر حملے میں پکڑا گیا تھا۔ اس کے بدلے شاہ فرمان وغیرہ اپنا ایک خاص بندہ چھڑوا دیں گے۔“

”ہاں شاید دنیا ایسی ہی ہے..... دلدار نے کہا۔ بلند شیشوں سے پارسورج چمک رہا تھا، ہوا میں چل رہی تھیں۔ زندگی سانس لے رہی تھی۔

☆☆☆

آج دلدار کی جائے پناہ پر کچھ اور لوگ قابض ہو گئے تھے۔ ڈھولکی بج رہی تھی۔ دف بج رہے تھے۔ مٹھکھڑکی کی چمکانا پیت قدبیری کے آس پاس قفس کمر رہی تھی۔ وہ چار طوائفیں تھیں جن کے جوان بھسوں سے پینا چھوٹ کر ان کی ایڑیاں بھگور رہا تھا۔ ان کے کمانوں کی طرح تھے، جنگ کپڑوں میں پہنے، وحشی بدن میوزک کی دھن پر جلوے نکھیر رہے تھے۔ رات کے اس سے جزیر کی آواز ڈھولکی اور دف کی آواز میں مدغم ہو رہی تھی۔ شراب پانی کی طرح بہاٹی جاری تھی۔ یہ حضور چاندیو سے بھاری رقم وصول کرنے کا جشن تھا۔ حیدر آبادی طوائفوں نے ناچ ناچ کر

انہیں کہا بھی تھا کہ بڑے سامیں کی اجازت کے بغیر شادی کرنا مجھے شیک نہیں لگ رہا..... انہوں نے یہ جواب دیا کہ اگر بڑے سامیں نہیں ہیں..... تو کیا ہوا..... میں تو ہوں نا.....“

شاہ زمان اپنی جگہ بھگد ہو گیا۔ اس کے دیرے پیسے ہوئے تھے اور آنکھوں کی غیر معمولی چمک میں کسی آنے والے طوفان کی پیش گوئی تھی..... شاہ زمان نے رخ دوسری طرف پھیر لیا۔ شیر نے جلدی سے آگے بڑھ کر اس عورت کو اٹھایا، چادر اسے تھمائی اور اشارہ کیا کہ جلدی سے یہاں سے نکل جاؤ.....

دو تین دن بالکل خاموشی سے گزر گئے۔ شاہ زمان نے کوئی رد عمل ظاہر نہیں کیا..... بس وہ ہر روز دلدار کے ساتھ ”فیروزہ“ نکل جاتا تھا۔ فیروزہ لیاقت پور اور جتی کوٹھ کے پاس ایک خوبصورت بستی تھی۔ شاہ زمان فیروزہ میں ایک دو منزلہ عالی شان مکان میں جاتا اور تین چار گھنٹے بعد وہاں سے نکلتا..... دلدار اتنی دیر باہر چھاؤں میں سستا رہتا۔ ایک دن شاہ زمان دو منزلہ مکان سے باہر آیا تو اس کے ساتھ بڑی سی گڈولی والا ایک ساتھ بیٹھ سالہ شخص بھی تھا۔ اس نے شوارٹس پہن رکھی تھی۔ پاؤں میں پشادری جوتی تھی اور ہاتھ پاؤں غیر معمولی بڑے تھے۔ چہرے مہرے سے پختون لگتا تھا۔ رخصت ہوتے وقت گڈولی والے نے شاہ زمان سے مصافحہ کیا اور رواج کے مطابق اس کے گالوں کا بوسہ لیا۔ شاہ زمان کافی ہشاش بشاش تھا۔ چوڑی دیکھتے تک وہ پچھلی سیٹ پر بڑسکون انداز میں نیم دراز رہا۔ انداز سے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس نے کوئی نہایت اہم سبب مکمل عبور کر لیا ہے۔

☆☆☆

وہ چوڑی روحویلی کی ایک جیس زوہ شام تھی۔ سیبوں والی حویلی میں بھنگ گھونٹی جاری تھی۔ حویلی کے کاندے نیچے ٹریکری خوشی میں اپنے انداز میں جشن منانے کا ارادہ رکھتے تھے۔ شاہ زمان بھی وہاں پر موجود تھا۔ وہ بھنگ کا ریا تو نہیں تھا..... مگر بھی کھار شوق پورا کر لیا کرتا تھا۔ بھنگ بڑی بڑی تین، چار ”دور یوں“ میں گھونٹی جاری تھی۔ دلدار ظفری کے ساتھ وہاں موجود تھا۔ اس حویلی میں آنے کے بعد اور سویرا سے ”دُغم“ کھانے کے بعد اس نے ہر نش کا ڈانٹہ چکھا کھانے کی دیواریں کھڑی کر کے اپنے بعد اس نے یہ سب چھوڑا تو نہیں تھا..... مگر حاضر و رہا ہوا۔

”مناہیں تو کچھ عرض کروں۔“

”وہ دلاور کی طرف دیکھئے بغیر بولا۔“ ”ہاں۔۔۔۔۔ بولو۔۔۔۔۔“
”بڑے سائیں! آپ نے مجھ سے کہا تھا۔۔۔۔۔ تم سے بہت ضروری کام لینا ہے۔ مجھے یہاں رہتے ہوئے بہت عرصہ ہو گیا ہے۔ نہ آپ نے مجھ سے وہ کام لیا اور نہ ہی اس کے حقائق کچھ بتایا۔“

شاہ زمان کے چہرے پر سوچوں کا ایک جال بنا ہوا تھا۔ وہ ہاتھ کی انگلی ماتھے پر مرگڑتے ہوئے بولا۔ ”بہت جلد۔۔۔۔۔ میں تمہیں بتاؤں گا۔۔۔۔۔ بس تم اپنی تیاری رکھو۔“
”بڑے سائیں! آپ حکم کریں۔ میں ہر دم تیار ہوں۔“

اسی دوران دھماکے سے دروازہ کھلا اور اذیتور عمر شاہ فرمان شیرد کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ شاہ فرمان کے تہہ بگڑے ہوئے تھے۔ وہ شاہ زمان کے برابر والی نشست پر بیٹھ گیا۔ ماتھے پر تھوڑی ڈالتے ہوئے بولا۔ ”چاچا جیہ فضل کی حضور چاندیو سے بات ہوئی ہے۔ چاہے نے ان کو حوصلہ دینے کو کہا ہے اور یہی بتایا ہے کہ ہم چوڑی ردوالے کبھی اپنی زبان سے نہیں پھرتے۔“

”تو کیا کہا حضور چاندیو۔۔۔۔۔ نے۔۔۔۔۔“ شاہ زمان کے لہجے میں بھی پریشانی تھی۔

”کہا کیا ہے۔ وہ جو حرام کا حکم۔۔۔۔۔ شوکت سیال ہے نا۔۔۔۔۔ وہ چاندیو کو اتار رہا ہے۔ معاملے کو بگاڑنے کے لیے بڑھاوا دے رہا ہے۔ بات کو۔۔۔۔۔ کئی دفعہ تول میں آتا ہے اس شوکت سیال کا ہاتھ صاف کروں بیچ میں سے۔“

”نہیں۔۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔۔ ہم نے ایسی کوئی بے وقوفی نہیں کرنی۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں نے۔۔۔۔۔ فریگر کو تیار کیا ہے۔ وہ جائے گا کچے کے علاقے میں۔۔۔۔۔ فریگر نے ہی کافی معلومات بھی اکٹھی کی ہیں۔ کھراڈھونڈ لیا ہے اس نے۔“
”اس کا وہاں اکیلے جانا ٹھیک ہوگا؟“ شاہ فرمان نے سوال اٹھایا۔

”نہیں۔۔۔۔۔ دو بندے اور بھی اس کے ساتھ جائیں گے۔ وہ دونوں کچے کے چتے چتے سے واقف ہیں۔“

”ان کی روانگی کب تک ہوگی؟“
”دو چار دن لگ جائیں گے۔ ایک۔ ہفتہ بھی لگ سکتا ہے۔“ شاہ زمان نے کہا۔
”کھم۔۔۔۔۔ حضور چاندیو۔۔۔۔۔؟“

”اب اتنا انتظار تو اسے کرنا پڑے گا۔“ شاہ زمان پُرسوج لہجے میں بولا۔

(باقی اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں)

ایک سوکے بدن کا لہراترنگ کارندہ بڑے کڑا ہے میں دودھ پھینٹ رہا تھا کہ اچانک سیبوں والی حویلی کے صدر دروازے سے دھول اڑائی ہوئی جیب اندر داخل ہوئی۔۔۔۔۔ اس میں شاہ فرمان اور شیرد سوار تھے۔ دونوں بڑی جلدت میں جیب سے اترے۔ چہرے بتارہے تھے کہ کوئی خبر نہیں ہے۔ شاہ فرمان، شاہ زمان کو نہیں دیکھ سکا۔ دھاڑتے ہوئے بولا۔ ”اوئے۔۔۔۔۔ یہ تم لوگوں نے کیا تجربہ خانہ لگا رکھا ہے۔ اٹھاؤ یہاں سے سب کچھ۔۔۔۔۔“ اس نے ایک میز کو ٹھوکر ماری، ایک کرسی کو اٹھا کے پرے پھینکا۔ اسی دوران میں شاہ فرمان کے گہرے تہہ رو دیکھا ہوا شاہ زمان اٹھ کھڑا ہوا۔

وہاں موجود تمام کارندوں کے چہرے دھماں دھواں ہو رہے تھے۔ اسی اثنا میں شاہ فرمان کی نظر شاہ زمان پر پڑ گئی۔ وہ تیزی سے اس کی جانب بڑھا اور اس کے کان میں سرکوشی کی۔ شاہ زمان بڑے بھائی کی بات سنا گیا اور اس کے چہرے کا رنگ بدلا گیا۔ جواب میں اس نے بھی شاہ فرمان سے آہٹگی سے کوئی بات کی جس کا جواب شاہ فرمان نے ہاتھ ہلاتے ہوئے دیا۔ شاہ زمان کے چہرے پر پریشانی کے سائے منڈلا رہے تھے۔ اس نے دھاڑتے ہوئے کارندوں کو حکم دیا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے تین جیمیں مسلح جوانوں سے لہجے میں اور دھول اڑائی ہوئی وہاں سے رخصت ہو گئیں۔

دلاور منہ کھولے ظفری کی جانب دیکھنے لگا۔ مگر ظفری بھی اس صورت حال سے اتنا ہی لاعلم تھا جتنا کہ دلاور۔۔۔۔۔ رات گئے تک حویلی میں چڑھ گئیاں ہوتی رہیں۔ مگر اصل صورت حال کا کسی کو اندازہ نہ ہو سکا۔

اس دن کے بعد حویلی کی فضا میں اک بے نام ستارہ پیدا ہو گیا۔ دہلی دہلی سرگوشیاں سر اٹھانے لگیں۔ ملازمین آپس میں مختلف قیاس آرائیاں کرنے لگے۔ اصل صورت حال کو چھپا یا جارہا تھا۔ مگر سب جانتے تھے، اہم باتیں زیادہ دیر چھپی نہیں رہ سکتیں۔ اس بات کو بھی جلد ہی کھلتا تھا۔

بارودی کی شادی والے معاملے کے بعد شاہ زمان خاموش تھا اس نے سویرا کے سامنے کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا تھا اور وہ کرنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ وہ سیدھا وار کرنا چاہتا تھا۔۔۔۔۔ اسی سلسلے میں دلاور کے ساتھ فیروزہ پکرگ تارہا تھا۔ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ عفریب ایک خوب روڑکی اس حویلی میں سویرا بی بی کی سوتن بن کر آنے والی ہے۔

ایک دن دلاور نشست گاہ میں شاہ زمان کے پاس اکیلا بیٹھا تھا۔ موقع دیکھ کر بولا۔ ”بڑے سائیں! برا نہ